کلیاتِ پریم چند

7

مرتبہ
مدن گوپال

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی

کلیاتِ پریم چند

7
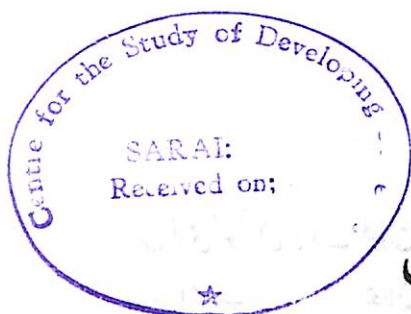
میدانِ عمل

مرتبہ

مدن گوپال

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل (حکومتِ ہند)
ویسٹ بلاک ۱، آر۔ کے۔ پورم نئی دہلی

Kulliyat -e- Premchand- 7

Edited by: Madan Gopal
Project Assistant: Dr. Raheel Siddiqi
Project Coordinator: Dr. Md. Ahsan

سنہ اشاعت : جولائی، ستمبر 2001 شک 1923

پہلا اڈیشن : 1100

قیمت : =/132

سلسلہ مطبوعات : 871

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 1- آر کے پورم نئی دہلی 110066

طابع: ویپ انٹر پرائزز گرین پارک، نئی دہلی 110016

پیش لفظ

اردو زبان و ادب میں پریم چند کو خاص مقبولیت حاصل ہے۔ عرصۂ دراز سے ان کی تصانیف مختلف سطحوں کے تعلیمی نصابوں میں شامل رہی ہیں۔ ایک عرصے سے ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ پریم چند کی تمام تصانیف کے مستند اڈیشن یکجا صورت میں منظرعام پر آئیں۔ بالآخر قومی اردو کونسل نے پریم چند کی تمام تحریروں کو "کلیاتِ پریم چند" کے عنوان سے مختلف جلدوں میں ایک مکمل سِٹ کی صورت میں شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ کلیات 22 جلدوں پر مشتمل ہوگا جس میں پریم چند کے ناول، افسانے، ڈرامے، خطوط، تراجم، مضامین اور اداریے بہ اعتبارِ اصناف یکجا کیے جائیں گے۔جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

ناول : جلد 1سے 8 تک ، افسانے : جلد 9 سے جلد 14 تک، ڈرامے :
جلد15 و جلد 16 ، خطوط : جلد17، متفرقات : جلد 18 سے جلد 20 تک،
تراجم : جلد 21 و جلد 22 تک

"کلیاتِ پریم چند" میں متون کے استناد کا خاص خیال رکھا جا رہا ہے۔ مواد کی فراہمی کے لیے مختلف شہروں کے کتب خانوں سے استفادہ کیا گیا ہے اور پریم چند سے متعلق شخصیتوں سے بھی ذاتی طور پر ملاقات کرکے مدد لی گئی ہے۔ اس سلسلے میں پریم چند کے پسرزادے پروفیسر آلوک رائے نے بہت سی مفید معلومات بہم پہنچائیں۔

"کلیاتِ پریم چند" کی ترتیب میں یہ التزام رکھا گیا ہے کہ ہر صنف کی تحریریں زمانی ترتیب کے ساتھ شاملِ اشاعت ہوں اور ہر تحریر کے آخر میں اول سنِ اشاعت، جس میں شائع ہوئی ہو، اس رسالہ کا نام اور مقامِ اشاعت بھی درج ہو۔ اس سے مطالعہ پریم چند کے نئے امکانات پیدا ہوں گے۔ ہماری کوشش ہے کہ "کلیاتِ پریم چند" میں شامل تمام تحریروں کا مستند متن قارئین تک پہنچے۔

"کلیاتِ پریم چند" کی شکل میں یہ منصوبہ نقشِ اولیں ہے ہماری پوری کوشش کے باوجود جہاں تہاں کوئی کوتاہی راہ پاسکتی ہے۔ مستقبل میں پریم چند کی نودریافت تحریروں کا

خیر مقدم کیا جائے گا اور نئی اشاعت میں ان کا لحاظ رکھا جائے گا۔ کلیات سے متعلق قارئین کے مفید مشوروں کا بھی خیر مقدم کیا جائے گا۔

اردو کے اہم اور بنیادی کلاسیکی ادبی سرمایے کو شائع کرنے کا منصوبہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی ترجیحات میں شامل ہے۔ ان ادبی متون کو انتخاب کرنے اور انھیں شائع کرنے کا فیصلہ قومی کونسل کی ادبی پینل کی کمیٹی کے ذریعے لیا گیا ہے۔ اس کمیٹی کے چیئرمین پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی اور ارکان پروفیسر شمیم حنفی، جناب محمد یوسف ٹینگ، جناب بلراج پوری، پروفیسر نیّر مسعود، جناب احمد سعید ملیح آبادی اور کونسل کے نائب چیئرمین جناب راج بہادر گوڑ کے ہم ممنون ہیں کہ انھوں نے اس پروجکٹ سے متعلق تمام بنیادی امور پر غور کرکے اس منصوبے کو تکمیل تک پہنچانے میں ہماری معاونت فرمائی۔ "کلیاتِ پریم چند" کے مرتب مدن گوپال اور ریسرچ اسسٹنٹ ڈاکٹر رحیل صدیقی بھی ہمارے شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے پریم چند کی تحریروں کو یکجا کرنے اور انھیں ترتیب دینے میں بنیادی رول ادا کیا۔

ہمیں امید ہے کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی دیگر مطبوعات کی طرح "کلیاتِ پریم چند" کی بھی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائرکٹر
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومتِ ہند،
نئی دہلی

دیباچہ

منشی پریم چند کے اگلے ناول کرم بھومی (میدانِ عمل) کی شروعات 1928 کے آخر میں ہوئی۔ 28 فروری 1929 کے خط میں انھوں نے دیانرائن نگم کو لکھا تھا کہ وہ گالزردی کے ڈراموں کا اردو ترجمہ (جو نگم نے انھیں سونپا تھا) نہیں کرسکیں گے (انصاف کے علاوہ) دوسری کتابوں کے متعلق میں یہی عرض کروں گا کہ آپ خود ہی کرلیں۔ اگر اسے کرتا ہوں تو میرا پردۂ مجاز رہا جاتا ہے۔ اگر صبح کرتا ہوں تو کرم بھومی میں رُکاوٹ ہوتی ہے، کرم بھومی کے مسودہ کے ایک صفحے پر 16 اپریل1931 تاریخ درج ہے۔ پریم چند نے اسے سرسوتی پریس بنارس سے شائع کیا۔ اشاعت نومبر1932 میں ہوئی۔

کرم بھومی کی تخلیق کے زمانے میں پریم چند لکھنؤ میں ماہنامہ مادھوری کے مدیر تھے۔ اس دوران ماہنامہ ہنس بھی بنارس سے نکالتے تھے۔ ملک میں سیاسی تحریکوں نے زور پکڑنا شروع کردیا تھا کانگریس نے لاہور کے دسمبر1929 کے اجلاس میں ریزولیوشن پاس کیا تھا کہ ہندوستان کو مکمل آزادی چاہیے ڈومینین اسٹیٹس نہیں۔ لاجپت رائے پر لاٹھیاں پڑیں انتقام کے لیے بھگت سنگھ اور دوسرے نوجوان آگے بڑھے۔ شیو رانی دیوی بھی گرفتار ہوئیں۔ گول میز کانفرنس شروع ہوئی انگریز حکمرانوں کی کوشش تھی کہ ہندوستان کے عوام کو تین جماعتوں میں بانٹا جائے۔ ہندو مسلم اور پچھڑے جماعت کے لوگ، مہاتما گاندھی نے فاقہ کیا اور پونا پیکٹ نے اس بحث مباحثہ کو ختم کیا۔ ہریجنوں کو مندر میں جانے کی اجازت دی گئی۔ ایسا تھا ماحول جب یہ ناول لکھا گیا۔ اس ناول کا خاکہ بھی پریم چند نے انگریزی میں بنایا تھا۔

خیر مقدم کیا جائے گا اور نئی اشاعت میں ان کا لحاظ رکھا جائے گا۔ کلیات سے متعلق قارئین کے مفید مشوروں کا بھی خیر مقدم کیا جائے گا۔

اردو کے اہم اور بنیادی کلاسیکی ادبی سرمایے کو شائع کرنے کا منصوبہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی ترجیحات میں شامل ہے۔ ان ادبی متون کو انتخاب کرنے اور انھیں شائع کرنے کا فیصلہ قومی کونسل کی ادبی پینل کی کمیٹی کے ذریعے لیا گیا ہے۔ اس کمیٹی کے چیئرمین پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی اور ارکان پروفیسر شمیم حنفی، جناب محمد یوسف ٹینگ، جناب بلراج پوری، پروفیسر نیّر مسعود، جناب احمد سعید ملیح آبادی اور کونسل کے نائب چیئرمین جناب راج بہادر گوڑ کے ہم ممنون ہیں کہ انھوں نے اس پروجکٹ سے متعلق تمام بنیادی امور پر غور کرکے اس منصوبے کو تکمیل تک پہنچانے میں ہماری معاونت فرمائی۔ ''کلیاتِ پریم چند'' کے مرتب مدن گوپال اور ریسرچ اسسٹنٹ ڈاکٹر رحیل صدیقی بھی ہمارے شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے پریم چند کی تحریروں کو یکجا کرنے اور انھیں ترتیب دینے میں بنیادی رول ادا کیا۔

ہمیں امید ہے کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی دیگر مطبوعات کی طرح ''کلیاتِ پریم چند'' کی بھی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائرکٹر
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومتِ ہند،
نئی دہلی

دیباچہ

منشی پریم چند کے اگلے ناول کرم بھومی (میدانِ عمل) کی شروعات 1928 کے آخر میں ہوئی۔ 28 فروری 1929 کے خط میں انھوں نے دیانرائن نگم کو لکھا تھا کہ وہ گالزردی کے ڈراموں کا اردو ترجمہ (جو نگم نے انھیں سونپا تھا) نہیں کرسکیں گے (انصاف کے علاوہ) دوسری کتابوں کے متعلق میں یہی عرض کروں گا کہ آپ خود ہی کرلیں۔ اگر اسے کرتا ہوں تو میرا پردۂ جاز رہا جاتا ہے۔ اگر صبح کرتا ہوں تو کرم بھومی میں رُکاوٹ ہوتی ہے، کرم بھومی کے سودہ کے ایک صفحے پر 16 اپریل1931 تاریخ درج ہے۔ پریم چند نے اسے سرسوتی پریس بنارس سے شائع کیا۔ اشاعت نومبر1932 میں ہوئی۔

کرم بھومی کی تخلیق کے زمانے میں پریم چند لکھنؤ میں ماہنامہ مادھوری کے مدیر تھے۔ اس دوران ماہنامہ ہنس بھی بنارس سے نکالتے تھے۔ ملک میں سیاسی تحریکوں نے زور پکڑنا شروع کردیا تھا کانگریس نے لاہور کے دسمبر1929 کے اجلاس میں ریزولیوشن پاس کیا تھا کہ ہندوستان کو مکمل آزادی چاہیے ڈومینین اسٹیٹس نہیں۔ لاجپت رائے پر لاٹھیاں پڑیں انتقام کے لیے بھگت سنگھ اور دوسرے نوجوان آگے بڑھے۔ شیو رانی دیوی بھی گرفتار ہوئیں۔ گول میز کانفرنس شروع ہوئی انگریز حکمرانوں کی کوشش تھی کہ ہندوستان کے عوام کو تین جماعتوں میں بانٹا جائے۔ ہندو مسلم اور پچھڑے جماعت کے لوگ، مہاتما گاندھی نے فاقہ کیا اور پونا پیکٹ نے اس بحث مباحثہ کو ختم کیا۔ ہریجنوں کو مندر میں جانے کی اجازت دی گئی۔ ایسا تھا ماحول جب یہ ناول لکھا گیا۔ اس ناول کا خاکہ بھی پریم چند نے انگریزی میں بنایا تھا۔

خاکہ پیش ہے:

1. Amarkant awakened. The whole outlook is transformed. His past life reviewed—His up at once.
2. While working scene Amar finds Sakina and Munni both there and a scene of humiliation and shame comes upon him. He falls at their feet and begs forgiveness.

(i) Scene be fine—the municipal resolution passed (Prisoners set free).

(ii) Governor's visit of inquiry—His decision.

(iii) Amarkant awakened. The whole outlook transformed. While working Scene—orders for release arrive just them. Jubilation.

(iv) All proceed to Hardwar. Naina and Rein and all the others come from Benaras to welcome.

مسودہ کے حصّہ اوّل میں لکھا تھا:

Sukhada forms her ministry. Amar co-operates whole heartedly. No ill will. They work together, talk together, form plans together, but their privateselves are apart with one another. Mani devotes herself to the personal comforts of Amar. (اِسے کاٹ دیا گیا)

The two bills are brought before the council. Both are defeated by Jobbery and underhand dealings. Some most reliable friends succumb to temptations. The ministry is short-lived and dissolved and the interested parties find Amar their most uncompromising enemy and plot to assassinate him. Amar remains undaunted. The murderous attack comes. Mani saves Amar. This brings to the husband and wife the much sought reconciliation.

They are then disappointed with democracy and (begin to work to... set up a missionary institution of selfless workers with no wheels to grind. This is the hope of the future.

Samar Nath gives away his all in charitable objects. His fortune is the nucleous of the funds required for new movement.

Naina is leading her life of renunciation.

جیوں جیوں کہانی آگے بڑھتی گئی۔ پلاٹ میں تبدیلی آتی گئی۔ قارئین دیکھیں گے کہ بنیادی خاکہ اور مکمل ناول میں کافی اختلاف ہے۔

'کرم بھومی' ایک بہت اہم ناول ہے، اس کے اردو متن کے بارے میں پریم چند کے خط و کتابت میں خاص ذکر نہیں ہے۔ زمانہ مئی1934 میں لکھا تھا کہ میدانِ عمل کے نام سے منشی پریم چند نے حال میں ایک نیا ناول تصنیف کیا ہے۔ جو مکتبہ جامعہ دلّی سے عنقریب ہی شائع ہونے والا ہے۔

لکھنؤ سے بنارس واپس آنے کے بعد پریم چند کو مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا ہنس میں لگاتار گھاٹا ہو رہا تھا۔ جاگرن میں بھی۔ کتابیں بکتی نہیں تھیں۔ لاہور کے ناشر انھیں رائلٹی بھی ٹھیک طرح سے نہیں دیتے تھے۔ پردۂ مجاز، غبن، نرملا، بیوہ کا ترجمہ خود کیا۔ گوشۂ عافیت اور چوگان ہستی کا اردو ترجمہ اقبال ورما سحر ہتگامی سے معاوضہ دے کر کروایا تھا۔ اور معاوضہ دے کر کرم بھومی کا ترجمہ کروانا ان کے لیے محال تھا۔ اس لیے ہر صبح حسبِ معمول گئودان کی تخلیق اور شام کو میدان عمل (کرم بھومی) کا مسودہ تیار کرتے تھے۔ اشاعت کے لیے میدان عمل کو مکتبہ جامعہ کو دیا گیا اور یہ1934 کے آخیر یا 1935 کے شروع میں شائع ہوا۔ اس جلد کا متن چوتھے ایڈیشن (1960) پر مشتمل ہے۔

مدن گوپال

پہلا حصّہ

(۱)

ہماری تعلیم گاہوں میں جتنی سختی سے فیس وصول کی جاتی ہے اتنی سختی سے شاید کاشتکاروں سے مالگذاری بھی وصول نہیں کی جاتی۔ مہینے میں ایک دن وصولی کے لیے معیّن کردیا جاتا ہے۔ اس دن فیس کا داخل ہوجانا لازمی ہے۔ یا تو فیس دیجیے یا نام کٹوائیے۔ یا جب تک فیس نہ داخل ہو روز کچھ جرمانہ دیجیے۔ کہیں کہیں ایسا بھی قاعدہ ہے کہ اگر اس معیّن تاریخ تک فیس وصول نہ ہوئی تو دوگنی کردی جاتی ہے اور اس کی وصولی کے لیے دوسری تاریخ مقرر کردی جاتی ہے۔ اس تاریخ کو فیس وصول نہ ہوئی تو یقیناً نام کٹ جائے گا۔ دہلی کے گورنمنٹ کالجیٹ اسکول میں یہی قاعدہ تھا۔ ساتویں تاریخ کو فیس نہ دو تو اکیسویں تاریخ کو دوگنی فیس دینی پڑتی تھی یا نام کٹ جاتا تھا۔ ایسے جابرانہ قواعد کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے کہ غریبوں کے لیے مدرسے کے دروازے بند کردیے جائیں۔ وہی ناہمدرد دفتری حکومت جو دوسرے صیغوں میں نظر آتی ہے، ہمارے مدرسوں میں بھی ہے۔ وہ کسی کے ساتھ رعایت نہیں کرتی۔ کوئی عذر نہیں سنتی۔ اس معیّن تاریخ کو فیس دینی پڑے گی۔ یہ قطعی امر ہے۔ قرض لو، گھر کے برتن بیچو، چوری کرو مگر فیس ضرور دو۔ ورنہ دُگنی دینی پڑے گی یا نام رجسٹر سے خارج ہوجائے گا۔ زمین اور جائداد کے مطالبوں کی وصولی میں تو کبھی کبھی رعایت کی جاتی ہے۔ ہماری تعلیم گاہوں میں نرمی ممنوع ہے۔ وہاں مستقل طور پر فوجی قانون برتا جاتا ہے۔ عدالتوں میں پیسے کا راج ہے۔ ہمارے مدرسوں میں

بھی پیسے کا راج ہے، اس سے کہیں زیادہ سخت کہیں بے رحم۔ دیر میں آئیے تو جُرمانہ۔ غیر حاضر ہو جائیے تو جُرمانہ۔ کتابیں نہ خرید سکے تو جُرمانہ۔ کوئی خطا ہو جائے تو جُرمانہ۔ تعلیم گاہ کیا ہے، جُرمانہ گاہ ہے۔ یہی ہماری مغربی تعلیم کا معیار ہے۔ جس کی تعریفوں کے پُل باندھے جاتے ہیں۔ اگر ایسی تعلیم گاہوں سے پیسے پر جان دینے والے، پیسے کے لیے غریبوں کا گلا کاٹنے والے، پیسے کے لیے اپنے ضمیر تک کا خون کرنے والے طلبا نکلتے ہیں تو تعجب ہی کیا ہے۔

آج وہی وصولی کی تاریخ ہے۔ مدرسین کی میزوں پر روپیوں کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ چاروں طرف کھناکھن کی آوازیں آرہی ہیں۔ صرافے میں بھی اتنی خوش آئند جھنکار کم سنائی دیتی ہے۔ ہر ایک مدرس بینک کا منیم بنا بیٹھا ہے۔ جس لڑکے کا نام پُکارا جاتا ہے وہ مدرس کے سامنے آجاتا ہے۔ فیس دیتا ہے اور اپنی جگہ آبیٹھتا ہے۔ مارچ کا مہینہ ہے۔ اسی مہینے میں اپریل، مئی اور جون کی فیس بھی وصول کی جارہی ہے۔ امتحان کی فیس بھی آج ہی داخل ہوگی۔ دسویں جماعت میں ایک ایک لڑکے کو چالیس چالیس روپے دینے پڑرہے ہیں۔

ماسٹر صاحب نے بیسویں لڑکے کا نام پکارا "امر کانت"۔

امر کانت غیر حاضر تھا۔

"کیا آج امر کانت نہیں آیا؟"

ایک لڑکے نے کہا "آئے تو تھے، شاید باہر چلے گئے ہوں۔"

"کیا فیس نہیں لایا ہے؟"

کسی لڑکے نے جواب نہ دیا۔

مدرس کا چہرہ ملول ہوگیا۔ امر کانت ذہین لڑکوں میں تھا افسوس ناک لہجے میں بولے "شاید فیس لینے گیا ہو۔ اس گھنٹے میں نہ آیا تو دونی فیس دینی ہوگی۔ میرا کیا اختیار ہے؟"

دفعتاً ایک لڑکے نے پوچھا "میں باہر جاکر دیکھوں؟"

مدرس نے مسکرا کر کہا۔ "گھر کی یاد آئی ہوگی، خیر جاؤ۔ مگر دس منٹ میں آجانا۔ لڑکوں کو بُلابُلا کر فیس لینا میرا کام نہیں ہے۔"

اس لڑکے نے بے تکلفانہ انداز سے کہا "ابھی آتا ہوں۔ قسم لے لیجیے جو احاطے

کے باہر جاؤں۔"

یہ اس جماعت کے فارغ البال لڑکوں میں تھا۔ بڑا کھلاڑی، بڑا بہانے باز۔ حاضری دے کر غائب ہوجاتا تو شام کی خبر لاتا، ہر مہینے فیس کی دوگنی رقم جُرمانہ دیتا تھا۔ گورا رنگ، کشیدہ قامت، چھریرا بدن، شوقین نوجوان تھا۔ جس کے لیے مدرسہ محض جائے تفریح تھا۔ نام تھا محمد سلیم۔

سلیم اور امرکانت دونوں پاس پاس بیٹھتے تھے۔ سلیم کو حساب کے سوالات حل کرنے یا ترجمہ کرنے میں امرکانت سے خاص مدد ملتی تھی۔ یہ اس کی کاپی سے نقل کرلیا کرتا تھا۔ سلیم کو شعروسخن کا بھی شوق تھا۔ امرکانت اس کی غزلیں بڑے شوق سے سُنتا تھا۔ دونوں میں خاصی بے تکلفی تھی۔

سلیم نے باہر جاکر اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ امرکانت کا کہیں پتہ نہ تھا۔ ذرا اور آگے بڑھا تو دیکھا وہ درخت کی آڑ میں کھڑا ہے۔ پکارا "امرکانت! او بدھولال فیس جمع کرتے ہو یا نہیں۔ ماسٹر صاحب جامے سے باہر ہو رہے ہیں۔"

امرکانت نے اچکن کے دامن سے آنکھیں پونچھیں اور سلیم کی طرف آتے ہوئے کہا۔ "کیا میرا نمبر آگیا؟"

سلیم نے اُس کی طرف دیکھا تو آنکھیں سُرخ تھیں وہ خود اپنی زندگی میں شاید ہی کبھی رویا ہو۔ چونک کر بولا۔ "ارے تم رورہے ہو، کیا بات ہے؟"

امرکانت سانولے رنگ کا میانہ قد، دُبلا پتلا نوجوان تھا۔ عمر بیس سال کی ہوگئی تھی پر ابھی مسیں نہ بھیگی تھیں۔ چودہ پندرہ سال کا لڑکا سا لگتا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک حسرت ناک غم کی جھلک تھی۔ مایوسی سے ملتی جلتی۔ گویا دُنیا میں اس کا کوئی نہیں ہے۔ اس کے چہرے پر کچھ ایسی ذہانت، کچھ ایسا تحمل تھا کہ ایک بار اسے دیکھ کر بھول جانا مشکل تھا۔

اس نے مسکرا کر کہا۔ "خواب دیکھ رہے ہو کیا۔ روتا کون ہے؟"

"آپ روتے ہیں اور کون روتا ہے۔ سچ بتاؤ ماجرا کیا ہے؟"

امرکانت کی آنکھیں پھر آب گوں ہوگئیں۔ لاکھ ضبط کرنے پر بھی آنسو نہ رُک سکے۔ سلیم سمجھ گیا۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔ "کیا فیس نہیں لائے۔ مردِ خدا مجھ سے کیوں نہ کہہ دیا۔ تم مجھے بھی غیر سمجھتے ہو۔ قسم خدا کی بڑے نالائق آدمی ہو۔ ایسے آدمی کو گولی

ماردینی چاہیے۔ دوستوں سے بھی یہ پردہ داری۔ چلو کلاس میں، میں فیس لائے دیتا ہوں، ذرا سی بات کے لیے اتنی دیر سے رورہے ہو۔"

امرکانت کو تشفی تو ہوئی مگر احسان کے بوجھ سے اس کی گردن جھک گئی، شرماتا ہوا بولا۔ "کیا ماسٹر صاحب آج مان نہ جائیں گے؟"

سلیم نے ترشی کے ساتھ کہا۔"جی ہاں آپ کے لیے قاعدوں میں ترمیم ہوگی۔ مگر ہو بڑے شیطان۔ وہ تو خیریت ہوگئی کہ میں روپے لیتا آیا تھا ورنہ خوب امتحان دیتے۔ دیکھو آج ایک تازہ غزل کہی ہے۔ پیٹھ ٹھونک دینا۔

آپ کو میری وفا یاد آئی　　　خیر ہے آج یہ کیا یاد آئی

امرکانت کی طبیعت اس وقت غزل سُننے کو بے تاب نہ تھی۔ لیکن دوست کی خاطر شکنی کیسے کرتا۔ سخن فہمانہ انداز سے بولا۔"نازک چیز ہے۔ خوب کہا ہے۔ تمھاری زبان کی صفائی پر نثار ہونے کو جی چاہتا ہے۔"

سلیم نے شاعرانہ متانت کے ساتھ کہا۔ "زبان ہی تو شعر کی جان ہے۔ بھائی مجھے فارسی ترکیبوں سے نفرت ہے، دوسرا شعر سنو۔

پھر میرے سینے میں ایک ہوک اُٹھی　　　پھر مجھے تیری ادا یاد آئی

امرکانت نے پھر داد دی "لاجواب چیز ہے۔ تاثیر میں ڈوبی ہوئی" ادا کے یاد آتے ہی سینے میں ہوک کا اُٹھنا واقعی امر ہے۔ کس خوبی سے قلب کی کیفیت کو نظم کیا ہے کہ سبحان اللہ۔ تمھیں کیسے ایسے خیالات سوجھ جاتے ہیں؟"

سلیم ہنسا "اسی طرح جیسے تمھیں حساب کا حل اور مضامین کے عنوان سوجھ جاتے ہیں۔ جیسے ایسوسی ایشن میں تقریر کرکے نور سا برسا دیتے ہو۔ آؤ پان کھاتے چلیں۔"

دونوں دوستوں نے پان کھائے اور اسکول کی طرف چلے۔ امرکانت نے کہا "ماسٹر صاحب بڑی ڈانٹ بتائیں گے۔"

"فیس ہی تو لیں گے۔"

"اور جو پوچھیں اب تک کہاں تھے؟"

"کہہ دینا فیس لانا بھول گئے تھے۔"

"مجھ سے تو شاید نہ کہتے بنے۔ میں تو صاف صاف کہہ دوں گا۔"

"تم تو پٹوگے میرے ہاتھ سے۔"

شام کو چھٹی ہوئی اور دونوں دوست گھر چلے تو امرکانت نے کہا۔ "تم نے مجھ پر جو احسان کیا ہے.................."

سلیم نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "خبردار مُنہ سے جو ایک آواز بھی نکلی۔ دوستی میں احسان کا کیا ذکر۔"

"آج جلسے میں آؤگے؟"

"مضمون کیا ہے؟ مجھے تو یاد نہیں۔"

"اجی وہی مغربی تہذیب ہے۔"

"تو مجھے دوچار پوائنٹ بتادو، وہاں میں کہوں گا کیا؟

"بتانا کیا ہے۔ مغربی تہذیب کی بُرائیاں ہم سب جانتے ہی ہیں۔"

"تم جانتے ہوگے۔ مجھے تو ایک بھی معلوم نہیں۔"

"ایک تو تعلیم ہی ہے۔ جہاں دیکھو وہیں دُکانداری، عدالت کی دُکان، علم کی دُکان، صحت کی دُکان، اس ایک پوائنٹ پر بہت کچھ کہا جاسکتا ہے۔"

"اچھی بات ہے آجاؤں گا۔"

(۲)

امرکانت کے والد لالہ سمرکانت بڑے کارپرداز تھے۔ اپنی قوتِ بازو سے لاکھوں کی ثروت پیدا کرلی تھی۔ پہلے ان کی ایک چھوٹی بلدی کی آڑھت تھی۔ بلدی کے بعد گُڑ اور چاول کی باری آئی۔ تیس سال تک ان کے کاروبار کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔ اب آڑھتیں بند کردی تھیں۔ محض لین دین کرتے تھے۔ کہیں روپے جسے نہ ملیں اسے وہ بے دریغ دے دیتے تھے۔ اور کچھ ایسے خوش نصیب تھے کہ ان کی رقمیں ڈوبتی نہ تھیں۔ ایسا جفاکش آدمی بھی کم ہوگا۔ گھڑی بھر رات رہے جمنا اشنان کرنے چلے جاتے اور طلوع کے قبل مندروں میں درشن کرکے دُکان پر پہنچ جاتے۔ منیم کو ضروری کام سمجھا کر تقاضے پر چلے جاتے اور تیسرے پہر لوٹتے۔ کھانا کھا کر دُکان پر آجاتے اور آدھی رات تک جمے رہتے تھے۔ تھے بھی دیوقامت۔ کھانا صرف ایک بار کھاتے مگر خوب ڈٹ کر۔ دو ڈھائی سو مگدر کے ہاتھ ابھی تک پھیرے جاتے تھے۔ امرکانت کی ماں اس کے بچپن ہی میں مرچکی تھی۔ سمرکانت

نے دوسروں کے اصرار سے دوسری شادی کرلی تھی۔ اس سات سال کے بچے نے بڑے جوش سے نئی ماں کا خیر مقدم کیا۔ لیکن اسے جلد معلوم ہو گیا کہ نئی ماں اس کی ضد اور شرارتوں کو اس عفو کی نگاہ سے نہیں دیکھتی جس کی یاد اس کے دل میں ابھی تازہ تھی۔ وہ اپنی ماں کا اکلوتا لاڈلا لڑکا تھا۔ بڑا ضدی، نہایت خودپرور اور بہت ہی شوریدہ سر، جو دُھن سما جاتی اسے پورا کرکے چھوڑتا۔ نئی ماں بات بات پر ڈانتی تھی۔ یہاں تک کہ اسے ماں سے نفرت ہوگئی۔ جس بات کو وہ منع کرتی اُسے وہ ضداً کرتا۔ باپ سے بھی گستاخی کرتا۔ باپ اور بیٹے میں الفت کا وہ رشتہ نہ رہا۔ لالہ جی جو کام کرتے امر اس کا اُلٹا ہی کرتا۔انھیں ملائی سے رغبت تھی۔ بیٹے کو ملائی بالکل نہ بھاتی تھی۔ باپ دین دار آدمی تھا۔ بیٹا اسے ریاکاری سمجھتا تھا۔ وہ پرلے سرے کے حریص تھے۔ لڑکے کی نگاہ میں دولت حقیر چیز تھی۔

لڑکا عموماً باپ کے نقشِ قدم پر چلتا ہے۔ مہاجن کا لڑکا مہاجن، پنڈت کا پنڈت، وکیل کا وکیل، کسان کا کسان ہوتا ہے۔ مگر یہاں اس مغائرت نے مہاجن کے لڑکے کو مہاجن کا دشمن بنا دیا۔ باپ نے جس بات کو منع کیا اس کی پابندی بیٹے پر لازم ہوگئی۔ مہاجن کے ہتھ کنڈے اور ابلہ فریبیاں اس کے علم میں روز ہی آتی رہتی تھیں۔ اسے اس روزگار ہی سے نفرت ہوگئی تھی۔ خیریت یہ ہوئی کہ اس کے کوئی سوتیلا بھائی نہ ہوا۔ ورنہ شاید وہ گھر سے نکل گیا ہوتا۔ سمرکانت اپنی دولت کو لڑکے سے زیادہ بیش قیمت سمجھتے تھے، لڑکے کے لیے دولت کی ضرورت نہ تھی مگر دولت کے لیے لڑکے کی ضرورت تھی۔ نئی ماں کا عندیہ تو یہ تھا ہی کہ اس کے حقوق کو پامال کرکے اپنی چہیتی، اپنی لاڈلی نینا کے لیے راستہ صاف کردے۔ لیکن سمرکانت اس سے متفق نہ ہوئے۔ لطف یہ تھا کی نینا کو بھائی سے محبت تھی اور امرکانت کے دل میں گھر والوں کے لیے کوئی نازک جگہ تھی تو وہ نینا کے لیے تھی۔ نینا کی صورت بھائی سے اتنی مشابہ تھی گویا جیسے وہ اس کی سگی بہن ہو۔ اس مشابہت نے جسم سے گزر کر دلوں میں بھی یک رنگی پیدا کردی تھی۔ ماں باپ کی سرد مہری کو اس بے بہا جنس کے سامنے وہ بھول جایا کرتا تھا۔ گھر میں اور کوئی لڑکا نہ تھا اور نینا کے لیے ایک رفیق کی ضرورت تھی۔ ماں چاہتی تھی نینا بھائی سے دور دور ہے۔ وہ امرکانت کو اس قابل نہ سمجھتی تھی کہ اس کی لڑکی کے ساتھ کھیلے۔ لیکن نینا کی طفلانہ فطرت کو یہ مصلحت اندیشیاں نہ بدل سکیں۔ بھائی بہن میں یہ موافقت یہاں تک بڑھی کہ

بالآخر نینا بھی ماں کی نظروں سے گر گئی اور بدنصیب ماں لڑکے کی آرزو لیے دُنیا سے رُخصت ہو گئی۔

اب نینا گھر میں اکیلی رہ گئی۔ سمرکانت کم سنی کی شادیوں کی بُرائیاں سمجھتے تھے۔ اپنی شادی بھی نہ کی۔ بڑھاپے کی شادیوں کی بُرائیاں بھی سمجھتے تھے۔ امرکانت کا بیاہ کرنا لازمی ہوگیا۔ اب اس کی مخالفت کون کرتا۔ امر کی عمر انیس سال سے کم نہ تھی لیکن جسم اور دماغ کے اعتبار سے ابھی عالمِ طفلی ہی میں تھا۔ جس پودے کو کبھی روشنی اور ہوا نہ ملی ہو وہ کیسے بڑھتا۔ کیسے پھولتا۔ بڑھنے اور پھیلنے کے دن بُری صحبتوں میں گزر گئے۔ دس سال پڑھتے ہوگئے تھے اور ابھی جوں توں کرکے آٹھویں جماعت میں پہنچا تھا۔ لیکن جس برادری میں روزگار ہی خاص پیشہ ہو وہاں دولت علم سے برتر سمجھی جاتی ہے۔ لکھنؤ کے ایک متمول خاندان سے خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہوا۔ سمرکانت کی رال ٹپک پڑی۔ لڑکی کے خاندان میں بیوہ ماں کے سوا کوئی قریبی رشتے دار نہ تھا اور دولت کی بھی کوئی کمی نہ تھی۔ ایسی لڑکی بھاگوانوں ہی کو ملتی ہے۔ اس کی ماں نے بیٹے کی آرزو بیٹی ہی سے پوری کی تھی۔ نفس کشی کی جگہ نفس پروری، نرمی کی جگہ تندی، انکسار کی جگہ خودپروری، نزاکت کی جگہ جسارت کا اسے خوگر بنا دیا تھا۔ سکڑنے اور سمٹنے کا اس نے ریاض نہ کیا تھا اور یہ مردانہ اوصاف کی نازنین بیاہی گئی زنانہ اوصاف کے نوجوان سے۔ جس میں مردانگی کا شائبہ بھی نہ تھا۔ اگر دونوں کے کپڑے بدل دیئے جاتے تو ان کی ہیئت بدل جاتی۔

شادی ہوئے دو سال ہوچکے تھے مگر دونوں میں خلوص کا نام بھی نہ تھا۔ دونوں اپنے اپنے راستہ پر چلے جا رہے تھے۔ دونوں کے خیالات الگ، طور و طریق الگ، دنیا الگ۔ جیسے دو مختلف آب و ہوا کے مخلوق ایک ہی پنجرے میں بند کردیئے گئے ہوں۔ ہاں شادی کے بعد ہی امرکانت کی زندگی میں احتیاط اور عمل کی لگن پیدا ہوگئی تھی۔ اس کی سیرت میں جو حجاب، بے توجہی اور بیزاری تھی وہ رخصت ہوتی جاتی تھی۔ تعلیم سے اسے رغبت ہوگئی تھی۔ حالانکہ لالہ سمرکانت اب اسے گھر کے کام میں جوتنا چاہتے تھے۔ کیونکہ وہ تار وار پڑھنے لگا تھا اور اس سے زیادہ لیاقت کی ان کے نزدیک کوئی ضرورت نہ تھی۔ مگر امرکانت اس مسافر کی طرح جس نے سارا دن تھکن مٹانے میں کاٹ دیا ہو اب اپنی منزل پر پہنچنے کے لیے دونی رفتار سے قدم بڑھا رہا تھا۔

اسکول سے لوٹ کر امرکانت حسبِ معمول اپنی مختصر سی کوٹھری میں جاکر چرخہ پر بیٹھ گیا۔ اس وسیع مکان میں جہاں ایک برات ٹھہر سکتی تھی اس نے اپنے لیے یہی ایک چھوٹی سی کوٹھری پسند کی تھی۔ ادھر کئی مہینوں سے اس نے دو گھنٹے روز سوت کاتنے کا عہد کرلیا تھا۔ اور باپ کے منع کرنے پر بھی اسے نبھائے جاتا تھا۔

مکان تھا بہت وسیع۔ مگر مکینوں کی آسائش کے لیے اتنا موزوں نہ تھا جتنا دولت کی حفاظت کے لیے۔ نیچے کی منزل میں کئی بڑے بڑے کمرے تھے جو گودام کے لیے بہت مناسب تھے۔ ہوا اور روشنی کا کہیں راستہ نہیں۔ جس راستے سے ہوا اور روشنی آسکتی ہے اسی راستے سے چور بھی آسکتا ہے۔ چور کا اندیشہ اس کی ایک ایک اینٹ سے ٹپکتا تھا۔ اوپر کی دونوں منزلیں ہوا دار اور کھلی ہوئی تھیں۔ کھانا نیچے پکتا تھا۔ سونا بیٹھنا اوپر ہوتا تھا۔ سامنے سڑک پر دو کمرے تھے۔ ایک میں لالہ جی بیٹھتے تھے۔ دوسرے میں منیم۔ کمرے کے آگے ایک سائبان تھا۔ جس میں گائیں بندھتی تھیں۔ لالہ جی دین دار آدمی تھے۔

امرکانت سوت کاتنے میں محو تھا کہ اس کی چھوٹی نینا آکر بولی۔ ”کیا ہوا بھیا، فیس جمع ہوئی یا نہیں؟ میرے پاس بیس روپے ہیں لے لو۔ میں کل اور کسی سے مانگ لاؤں گی۔“

امرکانت نے چرخہ چلاتے ہوئے کہا۔”آج ہی تو فیس جمع کرنے کی تاریخ تھی۔ نام کٹ گیا۔ اب روپے لے کر کیا کروں گا؟“

نینا روپ رنگ میں اپنے بھائی سے اتنی ملتی تھی کہ امرکانت اس کی ساری پہن لیتا تو یہ بتانا مشکل ہوجاتا کہ کون یہ ہے کون وہ۔ ہاں اتنا فرق تھا کہ بھائی کی لاغری یہاں نزاکت بن کر نظر فریب ہوگئی تھی۔

امر نے تو مذاق کیا تھا مگر نینا کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ بولی۔ ”تم نے کہا نہیں، نام نہ کاٹیے۔ میں دو ایک دن میں دے دوں گا۔“

امر نے اس کی گھبراہٹ کا مزا اُٹھاتے ہوئے کہا۔ ”کہنے کو تو میں نے سب کچھ کہا لیکن سُنتا کون تھا۔“

نینا نے ماتھے پر بل ڈال کر کہا۔ ”میں تمھیں اپنے کپڑے دے رہی تھی۔ کیوں

نہیں لیے؟"

امر نے ہنس کر پوچھا۔"اور جو دادا پوچھتے تو کیا ہوتا؟"

"دادا کو میں بتاتی ہی کیوں؟"

امر نے زاہدانہ انداز سے کہا۔ "میں چوری سے کوئی کام نہیں کرنا چاہتا نینا! اب خوش ہوجاؤ۔ میں نے فیس جمع کردی۔"

نینا کو یقین نہ آیا بولی۔"فیس نہیں وہ جمع کردی، تمھارے پاس روپے کہاں تھے؟"

"نہیں نینا سچ کہتا ہوں۔ جمع کردیے۔"

"روپے کہاں تھے؟"

"ایک دوست سے لے لیے۔"

"تم نے مانگے کیسے؟"

"اس نے آپ ہی آپ دے دیے، مجھے مانگنے نہ پڑے۔"

"کوئی بڑا شریف آدمی ہوگا۔"

"ہاں بڑا شریف ہے۔ جب فیس جمع ہونے لگی تو میں مارے شرم کے باہر چلا گیا۔ نہ جانے کیوں مجھے اس وقت رونا آگیا۔ سوچتا تھا میں ایسا گیا گزرا ہوں۔ اتنا ہیچ کہ میرے پاس چالیس روپے بھی نہیں۔ وہ دوست ذرا دیر میں مجھے بلانے آیا۔ میری آنکھیں لال تھیں سمجھ گیا۔ فوراً جاکر فیس جمع کردی۔ تم نے کہاں پائے یہ بیس روپے؟"

"یہ نہ بتاؤں گی۔"

نینا نے بھاگ جانا چاہا۔ بارہ سال کی یہ شرمیلی دوشیزہ ایک ہی ساتھ بھولی بھی تھی اور چالاک بھی۔ اسے ٹھگنا آسان تھا۔ اس سے اپنی پریشانیوں کو چھپانا مشکل تھا۔

امر نے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا۔ "جب تک بتاؤگی نہیں جانے نہ پاؤگی، کسی سے کہوں گا نہیں، سچ کہتا ہوں۔"

نینا جھینپتی ہوئی بولی۔ "دادا سے لیے۔"

امرکانت نے آزردہ خاطر ہوکر کہا۔ "تم نے ان سے ناحق مانگے، نینا جب انھوں نے مجھے اتنی بے دردی سے جھڑک دیا تو میں نہیں چاہتا کہ ان سے ایک پیسہ بھی مانگوں۔ میں نے تو سمجھا تھا تمھارے پاس کہیں پڑے ہوں گے، اگر میں جانتا کہ تم بھی دادا ہی سے

مانگوگی تو تم سے اس کا ذکر ہی نہ کرتا۔ دادا کیا بولے؟"

نینا نے معذرت کے انداز سے کہا۔ "بولے تو کچھ نہیں۔ یہی کہتے رہے کہ کرنا دھرنا تو کچھ نہیں روز روز روپے چاہیے۔ کبھی فیس، کبھی کتاب، پھر منیم جی سے کہا بیس روپے دے دو، بیس پھر دے دینا۔"

امر نے برانگیختہ ہو کر کہا۔ "تم روپے لوٹا دینا مجھے ضرورت نہیں۔"

نینا سسک سسک کر رونے لگی۔ امرکانت نے روپے زمین پر پھینک دیے تھے اور وہ ساری کوٹھری میں بکھرے پڑے تھے۔ دونوں میں سے ایک بھی چھونے کا نام نہ لیتا تھا۔ دفعتاً لالہ سمرکانت آکر دروازے پر کھڑے ہوگئے۔ نینا کی سسکیاں بند ہو گئیں۔ اور امرکانت جیسے تلوار کا وار کھانے کے لیے اپنے دل کو تیار کرنے لگا۔ لالہ جی دوہرے بدن کے گیم شحیم آدمی تھے۔ سر سے پاؤں تک سیٹھ۔ وہی گنجا سر۔ وہی پھولے ہوئے گال، وہی نقارے کی سی توند۔ چہرے پر اعتدال کی سُرخی تھی اور آنکھوں میں حرص اور خودغرضی کی جھلک، تند لہجے میں بولے "اچھا چرخہ چل رہا ہے۔ اتنی دیر میں کتنا سوت کاتا ہوگا، کوئی دو چار روپے کا۔"

امرکانت نے استغنا کی شان سے کہا۔ "چرخہ روپیہ کمانے کی مشین نہیں ہے۔"

"تو اور کس مرض کی دوا ہے؟"

"تہذیبِ نفس کی۔"

سمرکانت کے زخم پر نمک چھڑک گیا۔ "آج یہ نئی بات معلوم ہوئی۔ تب تو تم ضرور روشن ضمیر ہوگئے، مگر تہذیبِ نفس کے ساتھ ساتھ کام کرنے کی ضرورت شاید تمھیں نظر نہیں آتی۔ دن بھر اسکول میں رہو۔ وہاں سے لوٹو تو چرخے پر بیٹھو۔ شام کے وقت جلسوں میں جاؤ۔ رات کو مدرسۂ نسواں جاری ہو تو گھر کا کام کون کرے۔ میں بیل نہیں ہوں۔ تمھیں لوگوں کے لیے جنجال میں پھنسا ہوا ہوں کچھ اپنے اوپر لاد کر نہ لے جاؤں گا۔ آخر تمھیں کچھ تو میری مدد کرنی چاہیے۔ بڑے اصول پرور بنتے ہو۔ کیا یہی تمھارا اصول ہے کہ بوڑھا باپ مرا کرے اور جوان بیٹا اس کی بات بھی نہ پوچھے؟"

امرکانت نے ناسعادت مندانہ انداز سے کہا۔ "میں تو آپ سے بارہا کہہ چکا۔ آپ میرے لیے ذرا بھی پریشان نہ ہوں، مجھے دولت کی ضرورت نہیں۔ آپ کا بھی عالمِ ضعیفی

ہے۔ اطمینان سے بیٹھ کر ایشور کی یاد کیجیے۔"

سمرکانت اور بھی طیش میں آکر بولے۔ "دولت نہ رہے گی لالہ تو در بدر بھیک مانگوگے۔ یوں چین سے بیٹھ کر چرخا نہ چلاؤگے۔ یہ تو نہ ہوگا کہ میرا ہاتھ بٹاؤ۔ پست ہمّت آدمیوں کی طرح کہنے لگے، مجھے دولت کی ضرورت نہیں، کون ہے جو دولت سے بے نیاز ہے۔ سادھو، سنیاسی تک تو پیسوں پر جان دیتے ہیں۔ دولت بڑی کاوش سے ملتی ہے۔ جس میں ہمّت اور ارادہ نہیں وہ کیا دولت کمائے گا۔ بڑے بڑے تو دولت کے آستانے پر ماتھے رگڑتے ہیں، تم کس کھیت کی مولی ہو۔"

امر نے اسی شوریدہ سری سے جواب دیا۔ "دنیا دولت کی غلامی کرے مجھے اس کی خواہش نہیں۔ مزدور بھی اپنے مذہب اور ایمان کو قائم رکھ کر زندہ رہ سکتا ہے۔ کم سے کم میں اپنی زندگی میں اس کا امتحان کرنا چاہتا ہوں۔"

لالہ سمرکانت کو بحث کرنے کی فرصت نہ تھی۔ زچ ہوکر بولے۔"اچھا بابا خوب جی بھر کر امتحان کرلو۔ لیکن روز روز روپے کے لیے میرا سر نہ کھایا کرو۔ میں اپنی گاڑھی کمائی تمھارے شوق کی نذر نہیں کر سکتا۔"

لالہ جی چلے گئے۔ نینا کہیں تنہائی میں جاکر خوب رونا چاہتی تھی۔ مگر ہل نہ سکتی تھی۔ اور امرکانت ایسا افسردہ خاطر ہو رہا تھا گویا زندگی سے بیزار ہے۔

اسی وقت مہری نے اوپر سے آکر کہا۔ "بھیّا تمھیں بہو جی بُلا رہی ہیں۔" امرکانت نے بگڑ کر کہا "جا کہہ دے مجھے فرصت نہیں۔ چلی وہاں سے، بہو جی بُلا رہی ہیں۔"

لیکن جب مہری پیچھے کی طرف لوٹی تو اس نے اپنی زود رنجی پر شرمندہ ہوکر کہا "میں تمھیں کچھ نہیں کہا ہے سلّو، کہہ دو ابھی آتا ہوں۔ تمھاری رانی جی کیا کر رہی ہیں؟'

سلّو کا پورا نام تھا کوشلیا۔ سیتلا میں شوہر، لڑکا اور آنکھ جاتی رہی تھی۔ تب سے اس کے دماغ میں کچھ فتور آگیا تھا۔ رونے کی بات پر ہنستی اور ہنسنے کی بات پر روتی۔ گھر کے سب آدمی، یہاں تک کہ نوکر چاکر بھی اس کو ڈانٹتے رہتے تھے۔ صرف امرکانت اسے انسان سمجھتا تھا۔

سلّو خوش ہوکر بولی۔ "بیٹھی کچھ لکھ رہی ہیں۔ لالہ جی بگڑ رہے ہیں۔ اسی لیے تمھیں بُلا بھیجا۔"

امر کانت گویا گر پڑنے کے بعد گرد جھاڑتا ہوا چہرے پر خوشی کا رنگ لیے اوپر چلا۔ سکھدا اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑی تھی۔ اسے دیکھ کر بولی ''تمھارے تو اب درشن ہی نہیں ہوتے۔ اسکول سے آکر چرخہ لے بیٹھتے ہو۔ کیوں نہیں مجھے میرے گھر بھیج دیتے اب کے آئے چھ مہینے ہوگئے۔ میعاد پوری ہوگئی۔ اب تو رہائی ہونی چاہیے۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے ایک طشتری میں کچھ نمکین اور مٹھائی لاکر میز پر رکھ دی اور امر کو لے جاکر کرسی پر بٹھا دیا۔

یہ کمرہ گھر کے اور سب کمروں سے بڑا، ہوا دار اور سجا ہوا تھا۔ دری کا فرش تھا۔ اس پر قرینے سے کئی گدّے دار اور سادی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ بیچ میں ایک چھوٹی سی نقشین گول میز تھی۔ شیشے کی الماریوں میں مجلد کتابیں سجی ہوئی تھیں۔ طاقوں پر طرح طرح کے کھلونے تھے۔ ایک گوشے میں ایک چھوٹی سی میز پر ہارمونیم رکھا ہوا تھا۔ دیواروں پر دھرندھر، روی ورما، اور کئی بنگالی مصوروں کی تصویریں زیب دے رہی تھیں۔ دو پُرانی تصویریں بھی تھیں۔ کمرے کی سجاوٹ سے خوش مذاقی اور فارغ البالی کا اظہار ہوتا تھا۔

دو سال ہوئے امر کی شادی سکھدا سے ہوئی تھی۔ دوبار تو سکھدا ایک ایک مہینے رہ کر چلی گئی تھی۔ اب کے آئے چھ مہینے ہوگئے تھے۔ مگر ان میں اب تک محض سطحی محبت تھی۔ گہرائیوں میں دونوں ایک دوسرے سے جُدا تھے۔ سکھدا نے کبھی افلاس نہ جانا تھا۔ زندگی کی مشکلیں نہ سہی تھیں۔ جانے مانے راستے کو چھوڑ کر انجان راستے پر پاؤں رکھتے ڈرتی تھی۔ عیش اور نمود کو وہ زندگی کی سب سے بیش بہا جنس سمجھتی تھی۔ اور اسے سینے سے لگائے رکھنا چاہتی تھی۔ امر کانت کو وہ گھر کے کاروبار کی طرف مائل کرنے کی کوشش کرتی رہتی تھی۔ کبھی سمجھاتی تھی۔ روٹھتی تھی۔ کبھی بگڑتی تھی۔ ساس کے نہ رہنے کے باعث وہ ایک طرح سے گھر کی مالکہ ہوگئی تھی۔ باہر کے مالک لالہ سمرکانت تھے بھیتر کا انتظام سکھدا ہی کے ہاتھوں میں تھا۔ مگر امر کانت اس کی خواب گاہی فہمائش کو ہنس کر ٹال دیتا تھا۔ اس پر اپنا وقار جمانے کی یا اپنا ہم خیال بنانے کی کبھی کوشش نہ کرتا۔ اس کی عیش پسندی گویا کھیتوں کے ہوّے کی طرح اسے ڈراتی رہتی تھی۔ کھیت میں ہریائی تھی، دانے تھے۔ لیکن وہ ہوّا بے حس و حرکت دونوں ہاتھ پھیلائے کھڑا اس کی طرف گھورتا رہتا تھا۔

اپنی امیدوں اور مایوسیوں، کامیابیوں اور ناکامیابیوں کو وہ سکھدا سے بُرائی کی طرح چھپاتا تھا۔ کبھی کبھی اسے گھر لوٹنے میں دیر ہوجاتی تو سکھدا طعنوں سے محبت کا اظہار کرتی۔"ہاں یہاں کون اپنا بیٹھا ہوا ہے۔ باہر کی دلچسپیاں گھر میں کہاں" اور یہ نیش زنی کسان کی "کڑے کڑے" کی طرح ہوتے کے خوف کو اور مشکل کردیتی تھی۔ وہ اس کی خوشامد کرتا۔ اپنے اصولوں کو لمبی سے لمبی رسّی دیتا۔ لیکن سکھدا اسے اس کی اخلاقی کمزوری سمجھ کر ٹھکرا دیتی تھی۔ وہ شوہر کو رحم کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔ اس کے ترک کی توہین نہ کرتی۔ مگر اس کی حقیقت سمجھنے سے قاصر تھی۔ وہ اگر اس سے ہمدردی کی بھیک مانگتا تو شاید وہ اس کی دلجوئی کرتی۔ اپنی مٹھی بند کرکے وہ اپنی مٹھائی آپ کھاکر اسے رُلا دیتا تھا۔ وہ بھی اپنی مُٹھی بند کرلیتی تھی اور اپنی مٹھائی آپ کھا لیتی تھی۔ دونوں آپس میں ہنستے بولتے، تاریخ اور ادب کے تذکرے کرتے۔ لیکن زندگی کے حقیقی معاملات میں جُدا تھے۔ اِن میں دودھ اور پانی کا میل نہیں ریت اور پانی کا میل تھا۔ جو ایک لمحے کے لیے مل کر الگ ہوجاتے ہیں۔

امرکانت نے اس شکایت کی نزاکت کو یا تو سمجھا نہیں یا سمجھ کر اس کا مزہ نہ لے سکا۔ لالہ سمرکانت نے جو ضرب لگائی تھی اس کے درد سے ابھی تک اس کا کلیجہ کانپ رہا تھا۔ بولا۔"میں بھی یہی مناسب سمجھتا ہوں مجھے پڑھنا چھوڑ کر روزی کی فکر کرنی پڑے گی۔"

سکھدا نے چڑ کر کہا۔"ہاں سُنتی ہوں زیادہ پڑھ لینے سے آدمی پارس ہوجاتا ہے۔"

امر نے لڑنے کے لیے یہاں بھی آستین چڑھائی۔ "تم ناحق یہ الزام لگا رہی ہو۔ پڑھنے سے میں جی نہیں چُراتا۔ لیکن ان حالتوں میں پڑھنا نہیں ہوسکتا۔ آج اسکول میں مجھے جتنا شرمندہ ہونا پڑا بس میں ہی جانتا ہوں۔ اپنے ضمیر کا خون کرکے پڑھنے سے جاہل رہنا کہیں اچھا ہے۔"

سکھدا نے بھی اپنے ہتھیار سنبھالے "میں تو سمجھتی ہوں کہ گھڑی دو گھڑی دکان پر بھی بیٹھ کر آدمی بہت کچھ پڑھ سکتا ہے۔ چرخے اور جلسے میں جو وقت صرف کرتے ہو وہ دوکان پر لگاؤ تو کوئی بُرائی نہ ہوگی۔ پھر جب تم کسی سے کچھ کہو گے نہیں تو کوئی تمھارے دل کی بات کیسے سمجھ لے گا۔ میرے پاس اس وقت بھی ایک ہزار روپے سے کم نہ ہوں گے۔ وہ میرے روپے ہیں۔ میں اسے اُڑا سکتی ہوں۔ تم نے مجھ سے ذکر تک نہ کیا۔ میں

تمھاری دشمن تو نہیں ہوں۔ مجھ سے مانگتے ہوئے تمھاری غیرت کو چوٹ لگتی ہو تو اماں سے لے لو۔ انھیں اس کا ارمان ہی رہ گیا کہ تم ان سے کچھ مانگتے میں تو کہتی ہوں مجھے لے کر لکھنؤ چلے چلو اور بے فکر ہوکر پڑھو۔ اماں تمھیں انگلینڈ بھیج دیں گی۔ وہاں سے اچھی ڈگری لا سکتے ہو۔"

سکھدا نے صاف دلی سے یہ تجویز کی تھی۔ شاید پہلی بار اس نے شوہر سے اپنے دل کی بات کہی ہو۔ لیکن امرکانت کو ناگوار گزرا "مجھے ڈگری اتنی عزیز نہیں ہے کہ اس کے لیے سسرال روٹیاں توڑوں۔ اگر میں اپنی محنت سے کوئی وسیلہ پیدا کرسکا تو پڑھوں گا ورنہ کوئی دوسرا دھندا دیکھوں گا۔ میں اب تک فضول تعلیم کے پیچھے پڑا رہا۔ اسکول اور کالج سے الگ رہ کر بھی آدمی بہت کچھ سیکھ سکتا ہے۔ میں غرور نہیں کرتا لیکن ادب اور تاریخ کی جتنی کتابیں ان دو تین سالوں میں مَیں نے پڑھی ہیں شاید ہی میرے کالج میں کسی نے پڑھی ہوں۔"

سکھدا نے اس قضیے کا خاتمہ کرنے کے لیے کہا۔ "اچھا ناشتہ تو کرلو۔ آج تمھاری میٹنگ ہے۔ نو سے پہلے کیوں لوٹنے لگے؟ میں تو ٹاکی میں جاؤں گی۔ اگر تم لے چلو تو تمھارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔"

امر نے بے اعتنائی سے کہا۔ "مجھے ٹاکی میں جانے کی فرصت نہیں ہے۔ تم جاسکتی ہو۔"

"فلموں سے بھی بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے۔"

"میں تمھیں منع تو نہیں کرتا۔"

"تم کیوں نہیں چلتے؟"

"جو آدمی کچھ کماتا نہ ہو اُسے سینما دیکھنے کا کوئی حق نہیں۔ میں اُسی پیسے کو اپنا پیسہ سمجھتا ہوں جسے میں نے اپنی قوتِ بازو سے کمایا ہو۔"

کئی منٹ تک دونوں گم سم بیٹھے رہے۔ جب امر ناشتہ کرکے اُٹھا تو سکھدا نے محبت آمیز اصرار کے ساتھ کہا۔ "کل سے شام کے وقت دکان پر بیٹھ جایا کرو۔ مشکلوں کو آسان کرنا باہمّت آدمیوں کا کام ہے۔ لیکن مشکلوں کو پیدا کرکے خواہ مخواہ پاؤں میں کانٹے چبھانا کوئی عقلمندی نہیں ہے۔"

امرکانت اس اصرار کا مطلب سمجھ گیا۔ یہ عورت مشکلوں سے کس قدر خائف ہے۔ بولا۔ ”میں بھی غریبوں کا خون چوسوں، ان کا گلا کاٹوں؟“

سکھدا اس کے زاویۂ نگاہ پر صاد کرکے اس پر قابو پاسکتی تھی، ادھر سے ہٹانے کی کوشش کرکے وہ اس کے عزم کو اور بھی مضبوط کر رہی تھی۔ امرکانت اس سے ہمدردی کرکے اپنا رفیق بنا سکتا تھا۔ مگر زاہدانہ ترک کی شکل دکھا کر اسے ڈرا رہا تھا۔

(۴)

امرکانت میٹریکیولیشن کے امتحان میں صوبے میں اوّل آیا۔ لیکن عمر زیادہ ہوجانے کے باعث وظیفہ نہ پاسکا۔ اس سے اسے مایوسی کی جگہ ایک قسم کا اطمینان ہوا۔ کیونکہ وہ اپنے نفس کو کسی طرح کی آڑ نہ دینا چاہتا تھا۔ اس نے کئی بڑی بڑی کوٹھیوں میں انگریزی میں خط و کتابت کرنے کی خدمت تلاش کرلی۔ خوش حال باپ کا بیٹا تھا یہ کام اسے آسانی سے مل گیا۔ لالہ سمرکانت کے اصولِ تجارت سے اکثر ان کے ہم چشم جلتے تھے اور باپ بیٹے میں اس کشمکش کا تماشا دیکھنا چاہتے تھے۔ لالہ جی پہلے تو بہت برہم ہوئے۔ ان کا لڑکا اسی درجے کے آدمیوں کی خدمت کرے۔ یہ ان کے لیے باعثِ تحقیر تھا۔ لیکن جب امرکانت نے سمجھایا کہ محض کاروبار میں مہارت پیدا کرنے کے لیے یہ کام کر رہا ہے، اور لالہ جی نے سمجھا کہ کچھ نہ کچھ سیکھ ہی جائے گا تو کچھ نیم راضی ہوگئے۔ سکھدا اتنی آسانی سے ماننے والی نہ تھی۔ ایک دن اسی بات پر دونوں میں جھگڑا ہوگیا۔ سکھدا نے کہا۔ ”تم دس دس پانچ پانچ روپے کے لیے دوسروں کی خوشامد کرتے پھرتے ہو۔ تمھیں شرم بھی نہیں آتی۔“

امرکانت نے متانت سے جواب دیا۔ ”کام کرکے کچھ پیدا کرنا شرم کی بات نہیں ہے۔ دوسروں کا منہ تکنا شرم کی بات ہے۔“

”تو یہ امیروں کے جتنے لڑکے ہیں سب بے شرم ہیں۔“

”ہیں ہی، اس میں بھی کوئی شک ہے۔ اب دادا خوشی سے بھی روپے دیں تو نہ لوں۔ جب تک اپنی صلاحیت کا علم نہ تھا انھیں تکلیف دیتا تھا اب مجھے معلوم ہوگیا کہ میں اپنے پیروں پر کھڑا ہوسکتا ہوں۔ پھر کسی کے سامنے کیوں ہاتھ پھیلاؤں۔“

سکھدا نے ترش رو ہوکر کہا۔ ”تو جب تم اپنے باپ سے کچھ لینا ذلت سمجھتے ہو، تو

میں کیوں ان کی دست نگر بن کر رہوں۔ اس کا مطلب تو یہی ہوسکتا ہے۔ میں بھی کسی مدرسے میں نوکری کروں یا سینے پرونے کا دھندا اُٹھاؤں۔"

امرکانت کو کوئی معقول جواب نہ سوجھا۔ وہ اسے اتنی ذرا سی بات نہ سمجھا سکا کہ اسے سر کھپانے کی ضرورت نہیں۔ بولا "تمھاری بات اور ہے۔"

"کیوں، میں کھاتی پہنتی نہیں ہوں، گہنے بنواتی ہوں، کتابیں لیتی ہوں، رسالے منگواتی ہوں۔ دوسروں ہی کی کمائی پر تو۔ اس کا مطلب تو یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مجھے تمھاری کمائی پر بھی حق نہیں مجھے خود اپنی گزران کی فکر کرنی چاہیے۔"

امرکانت ایک نرغے میں پھنس گیا تھا۔ یکایک اس سے باہر نکلنے کی ایک ترکیب سوجھ گئی۔ بولا دادا تمھاری اماں تمھاری بات نہ پوچھیں اور میں بھی تمھیں طعنے دوں تو بے شک تمھیں فکرِ معاش کی ضرورت ہے۔"

سکھدا نے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔ "کوئی زبان سے نہ کہے مگر دل میں تو سمجھ ہی سکتا ہے۔ اب تک تو میں سمجھتی تھی تم پر میرا حق ہے۔ تم سے جو کچھ چاہوں گی لڑ کر لے لوں گی۔ لیکن اب معلوم ہوا کہ میرا کوئی حق نہیں۔ تم جب چاہو مجھے جواب دے سکتے ہو۔ یہی بات ہے یا کچھ اور؟"

امرکانت نے زچ ہوکر کہا۔ "تو تم مجھے کیا کرنے کو کہتی ہو؟ دادا سے ہر مہینے روپے کے لیے لڑتا رہوں۔"

"ہاں میں یہی چاہتی ہوں۔ یہ غیروں کی غلامی چھوڑو اور گھر کا دھندا دیکھو۔"

"لیکن مجھے یہ لین دین، سود بیاج سے نفرت ہے۔"

سکھدا مسکرا کر بولی۔ "یہ تو تم نے اچھی دلیل پیش کی یعنی مریض کو چھوڑ دو، خود بخود اچھا ہوجائے گا۔ تم دُکان پر جتنی دیر بیٹھو گے۔ کم سے کم اتنی دیر تک تو یہ بے ہودگیاں نہ ہونے دوگے۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ تمھاری توجہ دیکھ کر لالہ جی سارا کاروبار تم ہی کو سونپ دیں۔ اس وقت تمھیں اختیار ہوگا کہ اسے اپنے اصولوں کے مطابق چلاؤ۔ اگر ابھی اتنا بار نہیں اُٹھانا چاہتے تو نہ اُٹھاؤ لیکن لالہ جی کے خیالات پر اتنا اثر تو ڈال سکتے ہو۔ وہ بھی وہی کر رہے ہیں جو اپنے ڈھنگ سے ساری دنیا کر رہی ہے۔ ان سے محترز ہوکر تم ان کے طرزِ عمل کو نہیں بدل سکتے۔ اور تم اپنا ہی راگ الاپو گے تو میں کہے دیتی

ہوں میں اپنے گھر چلی جاؤں گی زندگی کا جو معیار تمھارے سامنے ہے وہ میرے بس کا نہیں۔ تم بچپن ہی سے تکلیفیں سہنے کے عادی ہو۔ میرے لیے یہ نیا تجربہ ہے۔"

امرکانت ہار گیا۔ اس کے کئی دن بعد اسے کئی اچھے اچھے جواب سوجھے لیکن اس وقت اس کی زبان بند ہوگئی۔ نہیں سکھدا کی باتیں اسے قرینِ قیاس معلوم ہوئیں۔ ابھی تک اس کی آزادانہ روش کی بنیاد لالہ جی کا بخل تھا۔ سوتیلی ماں کی بے مہری نے اسی بنیاد پر ردّے چڑھا دیئے تھے۔ دلیل یا اصولوں پر اس کی بنیاد نہ تھی۔ اور وہ دن تو تھا ابھی دور، بہت دور۔ جب اس کے دل کی کیفیت ہی بدل جائے۔ اس نے دل میں فیصلہ کیا کہ خط و کتابت کا کام چھوڑ دوں گا۔ دکان پر بیٹھنے سے بھی اسے اتنا گریز نہ رہا۔ ہاں اپنی تعلیم کا خرچ باپ سے وصول کرنے پر وہ اپنے دل کو راضی نہ کرسکا۔ اس کے لیے اب کوئی دوسرا راستہ ڈھونڈنا پڑے گا۔ سکھدا سے کچھ دنوں کے لیے اس کی صلح سی ہوگئی۔

اسی درمیان میں ایک اور واقعہ ہوگیا جس نے اس کی آزادانہ روش کا خاتمہ کردیا۔

سکھدا ادھر سال بھر سے میکے نہ گئی تھی۔ بیوہ ماں بار بار بلاتی تھی۔ لالہ سمرکانت بھی چاہتے تھے کہ مہینے دو مہینے کے لیے سیر کر آئے۔ لیکن سکھدا جانے کا نام نہ لیتی تھی۔ امرکانت کی طرف سے اسے اطمینان نہ ہوتا تھا۔ وہ ایسے گھوڑے پر سوار تھے جس کا ہمیشہ پھرنا لازم تھا۔ دس پانچ دن بندھا رہا تو پٹھے پر ہاتھ بھی نہ رکھنے دے گا۔ اسی لیے وہ امرکانت کو چھوڑ کر نہ جانا چاہتی تھی۔ آخر سکھدا کی ماں نے خود دہلی آنے کا فیصلہ کیا۔ ایک مہینے تک امرکانت ان کے استقبال کی تیاریوں میں لگا رہا۔ جمنا کے کنارے بڑی مشکل سے پسند کا مکان ملا۔ اس کی صفائی اور سفیدی میں کئی دن لگے گئے۔ خانہ داری کی سینکڑوں چیزیں جمع کرنی تھیں۔ اس کی ساس نے اس کے نام ایک ہزار روپے کا بیمہ بھیج دیا تھا۔ امر نے کتربیونت کرکے اس کے آدھے ہی میں سارے مرحلے طے کرلیے۔ پائی پائی کا حساب لکھا تیار تھا۔ جب اس کی ساس پریاگ کا اشنان کرتی ہوئی ماگھ میں دہلی پہنچیں تو یہاں کا حسن انتظام دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔

امرکانت نے بچت کے پانچ سو روپے اس کے سامنے رکھ دیے۔ راما دیوی نے حیرت سے کہا۔"کیا پانچ سو ہی میں یہ ساری سجاوٹ ہوگئی؟ مجھے تو یقین نہیں آتا۔"

"جی ہاں، پانچ سو ہی خرچ ہوئے۔"

"یہ تو تم نے انعام کا کام کیا ہے۔ یہ بچت کے روپے تمھارے ہیں۔"

امر نے جھینپتے ہوئے کہا۔ "جب مجھے ضرورت ہوگی آپ سے مانگ لوں گا۔ ابھی تو ایسی کوئی ضرورت نہیں۔"

راما دیوی شکل اور عمر سے نہیں خیال اور عمل سے بوڑھی تھیں۔ دان اور برت میں انھیں اعتقاد نہ تھا۔ لیکن بدنامی سے ڈرتی تھیں۔ بیوہ کی زندگی ترک اور عبادت کی زندگی ہے۔ دنیا اس کے خلاف کچھ نہیں دیکھ سکتی۔ راما کو مجبور ہوکر دھرم کا سوانگ بھرنا پڑتا تھا۔ لیکن زندگی کے لیے کسی نہ کسی دلچسپی کا ہونا ضروری تھا۔ عیش و آرام، سیر تماشے سے روح کو اسی طرح اطمینان نہیں ہوتا جیسے کوئی چٹنی اچار کھاکر سیر نہیں ہوسکتا۔ زندگی کسی حقیقت پر ہی ٹک سکتی ہے۔ راما کی زندگی میں درحقیقت جانوروں اور چڑیوں کا شوق تھا۔ وہ اپنے ساتھ ایک خاصا چڑیا گھر لاتی تھی۔ طوطے، مینا، بندر، بلی، گائیں، ہرن، مور، کتے وغیرہ پال رکھے تھے اور انھیں کے سکھ دُکھ میں شریک ہوکر زندگی کی منشاء کا احساس کرتی تھی۔ دوسرے رئیسوں کی طرح اس کا یہ اُنس نمائش یا تفریح کے لیے نہ تھا۔ اپنے جانوروں اور چڑیوں میں اس کی جان بستی تھی۔ وہ ان کے بچّوں کو اسی مادرانہ شفقت سے کھلاتی تھی جیسے اپنے ہی ناتی پوتے ہوں۔ یہ بے زبان بھی اس کی باتیں اس کے اشاروں سے کچھ اس طرح سمجھ جاتے تھے کہ دیکھ کر تعجب ہوتا تھا۔

دوسرے دن ماں بیٹی میں باتیں ہونے لگیں۔ راما دیوی نے کہا۔ "تجھے سُسرال اتنی پیاری ہوگئی۔"

سکھدا شرمندہ ہوکر بولی۔ "کیا کروں امّاں ایسی اُلجھن میں پڑی ہوں، کچھ سوجھتا ہی نہیں۔ باپ بیٹے میں بالکل نہیں بنتی۔ دادا جی چاہتے ہیں کہ وہ کاروبار دیکھیں۔ وہ کہتے ہیں مجھے اس کاروبار سے نفرت ہے۔ میں چلی جاتی تو یہاں نہ جانے کیا حالت ہوتی۔ مجھے برابر یہی اندیشہ لگا رہتا ہے کہ کہیں وہ دیس بدیس کی راہ نہ لیں۔ تم نے مجھے کنویں میں ڈھکیل دیا اور کیا کہوں۔"

راما متفکرانہ انداز میں بولی۔ "میں نے تو اپنی نظر میں خوب دیکھ بھال کر کیا تھا۔ مگر تیری تقدیر کو کیا کرتی۔ لڑکے سے تیری پٹتی ہے یا اب بھی یہی حال ہے۔"

سکھدا پھر شرمندہ ہوگئی۔ اس کے دونوں رخسار سرخ ہوگئے۔ سر جھکا کر بولی "انھیں

اپنی کتابوں اور جلسوں ہی سے فرصت نہیں ملتی۔"

"تعجب ہے کہ تجھ جیسی حسین عورت ایک سیدھے سادے چھوکرے کو بھی قابو میں نہ لاسکی۔ چال چلن کیسا ہے؟"

سکھدا جانتی تھی امرکانت میں اس قسم کی کوئی بدوضعی نہیں ہے مگر اس وقت وہ اس امر کا قطعی طور پر اظہار نہ کرسکی۔ اس کی نسائیت پر دھبّہ آتا تھا۔ بولی۔ "میں کسی کے دل کا حال کیا جانوں اماں! اتنے دن ہوگئے مجھے ارمان ہی رہ گیا کہ کوئی سوغات لاکر دیتے۔ اپنے دل سے ہنسوں یا روؤں۔ ان سے کوئی مطلب نہیں۔"

راما نے مادرانہ فہمائش کے لہجے میں پوچھا۔ "تو اس کی کبھی خاطر کرتی ہے۔ کچھ بنا کر کھلاتی ہے؟ کبھی اس کے سر میں تیل ڈالتی ہے؟ کبھی اس کے پاؤں دباتی ہے؟"

سکھدا نے خوددارانہ انداز سے کہا "جب وہ میری بات نہیں پوچھتے تو مجھے کیا غرض پڑی ہے۔ وہ بولتے ہیں تو میں بھی بولتی ہوں۔ مجھ سے کسی کی غلامی نہیں ہوگی۔"

راما نے سمجھایا۔ "بیٹی بُرا نہ ماننا مجھے تو بہت کچھ تیری ہی خطا نظر آتی ہے شاید تجھے اپنے حسن کا غرور ہے۔ تو سمجھتی ہے وہ تیرے حسن پر فریفتہ ہوکر تیرے پیروں پر ناک رگڑے گا۔ ایسے مرد ہوتے ہیں، میں جانتی ہوں۔ مگر وہ محبت قائم نہیں رہتی۔ نہ جانے تو اس سے کیوں اتنی تنی رہتی ہے۔ مجھے وہ بڑا غریب اور بے زبان معلوم ہوتا ہے۔ سچ کہتی ہوں مجھے اس پر رحم آتا ہے بچپن میں تو بے چارے کی ماں مر گئی۔ دوسری ماں ملی وہ ڈائن۔ باپ ہوگیا دشمن۔ گھر کو اپنا گھر ہی نہ سمجھ سکا۔ جو دل بے مہریوں سے اتنا خشک ہو رہا ہو اُسے پہلے محبت اور خدمت سے سینچ کر ہی پیار کا بیج بویا جاسکتا ہے۔"

سکھدا چڑ کر بولی۔ "وہ چاہتے ہیں میں ان کے ساتھ پتونی بن کر رہوں۔ روکھا سوکھا کھاؤں۔ موٹا جھوٹا پہنوں اور وہ گھر سے الگ ہوکر مزدوروں کی سی زندگی بسر کریں۔ مجھ سے یہ نہ ہوگا۔ چاہے ہمیشہ کے لیے ان سے ناتا ٹوٹ جائے۔ وہ اپنے دل کے بادشاہ ہیں۔ میرے آرام و تکلیف کی انھیں بالکل پروا نہیں ہے۔ تو مجھے بھی ان کی پروا نہیں ہے۔"

راما نے تنبیہ آمیز نظروں سے دیکھا اور بولی۔ "اگر آج لالہ سمرکانت کا دیوالہ نکل جائے؟"

سکھدا نے اس امکان کا خیال بھی نہ کیا تھا۔ لاجواب ہوکر بولی۔ "دیوالہ کیوں نکلنے

لگا؟"

"ایسا ممکن تو ہے۔"

سکھدا نے ماں کی دولت کا سہارا نہ لیا۔ وہ یہ نہ کہہ سکی کہ تمھارے پاس جو کچھ ہے وہ بھی تو میرا ہی ہے۔ خودداری نے اس کی زبان بند کردی۔ ماں کی اس بے دردی پر جھنجھلا کر بولی۔ "جب موت آتی ہے تو آدمی مرجاتا ہے۔ قصداً آگ میں کوئی نہیں کودتا۔"

باتوں باتوں میں راما کو معلوم ہوا کہ اس کی جائداد کا وارث آنے والا ہے۔ سکھدا کے مستقبل کے بارے میں اسے بہت اندیشہ ہوگیا۔ اس خبر نے اسے مطمئن کردیا۔ اس نے باغ باغ ہوکر سکھدا کو گلے سے لگا لیا۔

(۵)

امرکانت نے اپنی زندگی میں ماں کی ماَمتا کے مزے نہ اُٹھائے تھے۔ قدرت نے اسے ایک نعمتِ عظمیٰ سے محروم کردیا تھا۔ جب اس کی ماں کی وفات ہوئی تو وہ چھوٹا تھا۔ اس ماضی بعید کی کچھ موہوم سی اور اسی لیے نہایت دل فریب اور پُرلطف یادیں باقی تھیں۔ اس کا نالۂ درد سُن کر گویا اس کی ماں نے راما دیوی کی صورت میں جنت سے آکر اسے گود میں اُٹھا لیا۔ لڑکا اپنا رونا دھونا بھول گیا۔ اور اس آغوشِ الفت میں منہ چُھپا کر بہشت کے مزے لوٹنے لگا۔ امرکانت نہیں نہیں کرتا رہتا۔ مگر راما اسے پکڑ کر اس کے سامنے میوے اور مٹھائیاں لاکر رکھ دیتی۔ اسے انکار کرنے کی جرأت نہ ہوتی۔ وہ دیکھتا یہ نئی ماں اس کے لیے کبھی کچھ پکا رہی ہے کبھی کچھ، اور مادرانہ اصرار سے اسے کھلاتی تو اس کے دل میں فرزندانہ احساس موج زن ہوجاتا۔ وہ کالج سے لوٹ کر سیدھا راما کے پاس جاتا۔ وہاں اس کے لیے ناشتہ تیار کرتی راما اس کی راہ دیکھتی رہتی۔ صبح کا ناشتہ بھی وہ وہیں کرتا۔ اس مادرانہ غمگساری اور پیار سے اس کا جی نہ بھرتا تھا۔ چھٹیوں کے دن وہ اکثر راما ہی کے یہاں گزارتا۔ اس کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی نینا بھی چلی جاتی۔ وہ خاص کر جانوروں اور چڑیوں کی خوش فعلیاں دیکھنے جاتی تھی۔

امرکانت کے کینہ دل میں محبت آئی تو اس کی تنگ ظرفی بھی رخصت ہوگئی۔ سکھدا اس کے قریب تر آنے لگی۔ اس کی امارت سے اب اسے اتنی شکایت نہ رہی۔ سکھدا

کو ساتھ لے کر سیر و تفریح کو بھی جانے لگا۔ راما وقتاً فوقتاً اسے دس بیس روپے دیتی۔ اس کے محبت آمیز اصرار کے سامنے امرکانت کی ایک نہ چلتی۔ اس کے لیے نئے نئے سوٹ بنے۔ نئے نئے جوتے آئے۔ موٹر سائیکل آئی۔ فاؤنٹین پن آئے۔ آرائش کے کتنے ہی سامان خریدے گئے۔ پانچ چھ ہی مہینے میں وہ تکلفات کا دشمن، سادہ زندگی کا قصیدہ گو، اچھا خاصا رئیس زادہ بن بیٹھا۔ رئیس زادوں کے جذبات اور چونچلوں سے پُر۔ اتنا ہی خودغرض اور کم اندیش۔ اس کی جیب میں ہمیشہ دس بیس روپے پڑے رہتے۔ خود کھاتا، دوستوں کو کھلاتا۔ اور ایک کی جگہ دو خرچ کرتا۔ وہ تعلیمی انہماک جاتا رہا۔ تاش اور چوسر میں اسے زیادہ لطف آتا۔ ہاں جلسوں سے اب اُسے اور زیادہ شغف ہوگیا۔ خوش بیان وہ تھا ہی۔ مشق سے اس کے بیان میں اور بھی روانی پیدا ہوگئی۔ روزناموں اور رسالوں سے بھی اسے کافی ذوق تھا۔ خصوصاً اس لیے کہ اس سے اس کے دعوتِ ہمہ گیر کو تقویت ہوتی تھی۔

روزناموں کے مطالعے سے امرکانت میں سیاسی بیداری پیدا ہونے لگی۔ اہلِ وطن کے ساتھ حکام کی زیادتیاں دیکھ کر اسے طیش آجاتا۔ جو ادارے اصلاح قوم کے مدعی تھے۔ان سے اسے ہمدردی ہوگئی۔ وہ اپنے شہر کی کانگریس کمیٹی کا ممبر بن گیا اور اس کے جلسے میں شریک ہونے لگا۔

ایک دن کالج کے کچھ طلباء دیہاتوں کی اقتصادی حالت کی جانچ کرنے نکلے۔ سلیم اور امر بھی چلے۔ پروفیسر ڈاکر شانتی کمار ان کے رہنما تھے۔ کئی گاؤں کے معائنے کے بعد یہ جماعت لوٹنے لگی تو امر نے کہا۔ ”مجھے کبھی اس کا خیال بھی نہ تھا کہ ہمارے کاشتکاروں کی حالت اتنی مایوس کن ہے۔“

سلیم بولا۔ ”تالاب کے کنارے وہ جو چار پانچ گھر ملاحوں کے تھے۔ ان میں تو دو ایک لوہے کے برتنوں کے سوا کچھ تھا ہی نہیں۔ میں سمجھتا تھا دیہاتیوں کے پاس اناج کی بکھاریں بھری ہوں گی۔ لیکن یہاں تو کسی کے گھر میں اناج کے مٹکے تک نہ تھے۔“

ڈاکٹر شانتی کمار نے اس خیال کی ترمیم کی ”سبھی کسان اتنے غریب نہیں ہوتے۔ بڑے کسان کے گھر میں بکھاریں بھی ہوتی ہیں۔ لیکن ایسے کسان گاؤں میں دو چار سے زیادہ نہیں ہوتے۔“

امرکانت نے اختلاف کیا۔ ”مجھے تو گاؤں میں ایک بھی ایسا کسان نہ ملا۔ مہاجن اور عملے انھیں غریبوں کا خون چوستے ہیں۔ میں کہتا ہوں ان لوگوں کو ان بیکسوں پر رحم نہیں آتا۔“

شانتی کمار نے مسکرا کر کہا۔ ”فرض اور رحم کا بہت دنوں امتحان ہوا اور وہ دونوں بے کار ثابت ہوئے۔ اب تو انصاف کا زور ہے۔ رحم اور فرض اختیاری چیزیں ہیں۔ انصاف کا انحصار محض اخلاقی قانون پر نہیں مجلسی قانون پر ہے۔ اس سے گریز ممکن نہیں۔“

شانتی کمار کی عمر پینتیس سال کے قریب تھی۔ گورے چٹے خوش رو آدمی تھے وضع قطع انگریزی تھی اور پہلی نظر میں انگریز ہی معلوم ہوتے تھے کیونکہ ان کی آنکھیں نیلی تھیں اور بال بھورے۔ آکسفورڈ سے ڈاکٹر ہوکر آئے تھے۔ شادی اور دیگر مجلسی قیود کے مخالف۔ آزاد محبت کے مداح۔ بہت ہی خوش مزاج، شگفتہ رو، بے لوث آدمی تھی۔ اپنی تجرّد کی زندگی کو ہنسی مذاق سے بہلاتے رہتے تھے۔ طلباء سے دوستانہ برتاؤ تھا۔ سیاسی تحریکوں میں شریک ہوتے تھے مگر خفیہ طور پر، کھلے میدان میں نہ آتے تھے۔

امرکانت نے دردناک لہجے میں کہا۔ ”مجھے تو اس آدمی کی صورت نہیں بھولتی جو چھ مہینے سے بیمار پڑا تھا اور ایک پیسے کی دوا بھی نہ خرید سکا تھا۔ اس پر طرہ یہ کہ زمیندار نے لگان کی ڈگری کرالی۔ جو کچھ اثاثہ تھا نیلام کرالیا۔ اس اندھیر نگری کا خالق کوئی دانا و بینا وجود ہے، مجھے تو اس میں شک ہے۔ غریب کے بدن پر چیتھڑے تک نہ تھے۔ اس کی ضعیف ماں کتنی پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی۔“

دیہات کی پگڈنڈیاں طے کرکے یہ لوگ پکّی سڑک پر آپہنچے تھے۔ دونوں طرف اونچے سایہ دار درختوں نے گویا راستے کو اپنی گود میں چھپا لیا تھا۔ سڑک کے داہنے بائیں اکھ اور ارہر کے کھیت تھے۔ راستہ قریب قریب بند ہو چلا تھا۔

دفعتاً ایک درخت کے نیچے دس بارہ آدمی خوف سے سمٹے ہوئے دُبکے نظر آئے۔ سب کے سب سامنے والے ارہر کے کھیت کی طرف پُرمعنی نگاہوں سے تاکتے، اور آپس میں سرگوشیاں کرتے تھے۔ ارہر کی کھیت کی مینڈ پر ہاتھ میں بیت لیے دو گورے اکڑے کھڑے تھے۔ لڑکوں کو کسی حادثے کا اندیشہ ہوا سب کے سب وہیں کھڑے ہوگئے۔ اور ان آدمیوں سے استفسارِ حال کیا۔ مگر کوئی بات سمجھ میں نہ آئی۔ سب ایک دوسرے کا منہ تکتے

تھے۔ مگر منہ سے کچھ نہ کہتے تھے۔

یکایک ارہر کے کھیت کی طرف سے کسی عورت کی چیخ سُنائی دی۔ معمّا حل ہوگیا۔ طلباء اپنے ڈنڈے سنبھال کر کھیت کی طرف لپکے۔

ایک گورے نے آنکھیں نکال کر چھڑی دکھاتے ہوئے کہا۔ "بھاگ جاؤ نہیں ہم ٹھوکر مارے گا۔"

اتنا اس کے منہ سے نکلنا تھا کہ ڈاکٹر شانتی نے جھپٹ کر اس کے منہ پر گھونسا مارا۔ تلملا اُٹھا۔ مگر تھا گھونسے بازی کے فن میں مشاق۔ گھونسے کا جواب دیا تو ڈاکٹر صاحب گر پڑے۔ اسی وقت سلیم نے اپنی ہاکی اسٹک اس کے سر پر جمائی۔ تیورا کر زمین پر گر پڑا۔ دوسرے سپاہی کو امر اور دو تین لڑکوں نے مل کر پیٹنا شروع کردیا۔ اتنے میں سلیم بھی آپہنچا۔ گورے صاحب نے جب دیکھا کہ اب جان نہیں بچتی تو بھاگا۔ مگر سلیم نے اتنے زور سے اسٹک دی کہ اوندھے منہ گر پڑا اور ایسا بے حس و حرکت ہوگیا کہ جیسے مر گیا ہو۔ اتنے میں ارہر کے پودوں کو چیرتا ہوا تیسرا گورا آپہنچا۔ شانتی کمار سنبھل کر اس پر لپکے ہی تھے کہ اس نے ریوالور نکال کر داغ دیا۔ ڈاکٹر صاحب زمین پر گر پڑے۔ معاملہ نازک تھا۔ لڑکے ڈاکٹر صاحب کو سنبھالنے لگے۔ یہ خوف بھی لگا ہوا تھا کہ گورا دوسری گولی نہ چلا دے۔ ڈاکٹر صاحب کی ران سے خون جاری تھا۔ درخت کے نیچے والے مزدور اب تک تو محض تماشا دیکھ رہے تھے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کو گرتے دیکھ کر ان کے خون میں بھی جوش آیا۔ خوف کی طرح جرأت بھی متعدی ہوتی ہے، سب کے سب اپنی لکڑیاں سنبھال کر گورے پر دوڑ پڑے، گورے نے ریوالور داغا۔ نشانہ خالی گیا۔ وہ تیسری گولی چلانا ہی چاہتا تھا کہ اس پر ڈنڈوں کی بارش ہونے لگی اور ایک لمحے میں وہ بھی بے جان سا زمین پر گر پڑا۔

خیریت یہ ہوئی کہ لڑکے فوری امداد سے واقف تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی رانوں میں پٹّی باندھ کر خون بہنا بند کردیا۔

اُسی وقت ایک نوجوان عورت کھیت سے نکلی اور منہ چھپائے لنگڑاتی کپڑے سنبھالتی ایک طرف چل پڑی، بیکسی اور شرم کے بوجھ سے اس کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا وہ ان آدمیوں کی صورت سے خائف ہے اور ان کی نظروں سے دور نکل کر

غائب ہو جانا چاہتی ہے۔ یا شاید کوئی سوراخ تلاش کر رہی ہے جس میں وہ اپنے روئے سیاہ کو چھپا لے۔ کسی کی ہمدردی اس کے کس کام کی، جو بیش بہا جنس اس کے ہاتھ سے نکل گئی اس کی بازیافت کیا ممکن ہے؟ ان بدمعاشوں کو مار ڈالا۔ اس سے تمھارے انصاف کے احساس کو تسکین ہوگئی لیکن اس کی تو جو چیز گئی وہ گئی۔ وہ اپنا دُکھ کیوں روئے، کیوں فریاد کرے۔ ساری دُنیا کی ہمدردی اس کے لیے بے کار ہے۔

سلیم ایک لمحے تک اس عورت کی طرف تکتا رہا۔ پھر سنبھل کر ان تینوں بدمعاشوں کو پیٹنے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دیوانہ ہوگیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے پکارا۔ ''کیا کرتے ہو سلیم، اس سے کیا فائدہ؟''

سلیم نے دم لے کر کہا۔ ''میں ایک شیطان کو بھی زندہ نہ چھوڑوں گا۔ مجھے پھانسی ہوجائے تو کوئی غم نہیں۔ انھیں ایسا سبق دوں گا کہ پھر کسی بدمعاش کو ایسی جرأت نہ ہو۔''

پھر مزدوروں کو مخاطب کرکے بولا۔ ''تم اتنے آدمی کھڑے دیکھتے رہے اور تم سے کچھ نہ ہوسکا۔ تم میں اتنی غیرت بھی نہیں۔ اپنی بہو بیٹیوں کی آبرو کی حفاظت بھی نہیں کرسکتے۔ سمجھتے ہو کہ کون یہ ہماری بہو بیٹی ہے۔ اس ملک میں جتنی بیٹیاں ہیں سب تمھاری بیٹیاں ہیں۔ جتنی بہوئیں ہیں سب تمھاری بہوئیں ہیں۔ جتنی مائیں ہیں سب تمھاری مائیں ہیں۔ تمھاری آنکھوں کے سامنے ایک غریب عورت کی آبروریزی ہوئی اور تمھارے خون میں ذرا بھی جوش نہ آیا۔ سب کے سب جاکر مر کیوں نہ گئے۔''

پھر اس بات کا خیال آگیا کہ میں اشتعال میں آکر انصاف کے دائرے سے باہر نکلا جارہا ہوں۔ صدیوں سے زنجیر میں بندھا ہوا انسان اگر اپنی انسانیت سے محروم ہوجائے تو اس کی کیا خطا ہے۔ وہ تو محض ایک قانونِ قدرت کا شکار ہے۔ وہ خاموش ہوگیا اور شرمندہ بھی ہوا۔

قریب کے گاؤں سے بیل گاڑی منگوائی گئی۔ شانتی کمار کو لوگوں نے اُٹھا کر اس پر لٹا دیا۔ ابھی گاڑی چلنے کو تھی کہ یکایک ڈاکٹر صاحب نے پوچھا۔ ''اور اِن تینوں آدمیوں کو کیا یہیں چھوڑ جاؤگے؟''

سلیم نے پیشانی پر بل ڈال کر کہا۔ ''ہم ان کے ذمّے دار نہیں ہیں۔ میرا تو جی چاہتا

ہے انھیں کھود کر دفن کردوں۔"

سلیم اس وقت تک راضی نہ ہوا جب تک ڈاکٹر صاحب نے اُسے قائل نہ کردیا۔ اس گاڑی پر بورے تو پچاس لد سکتے تھے۔ مگر چار آدمیوں کے لیے بڑی مشکل سے جگہ نکلی۔ گاڑی چلی، دیہات کے مزدور خطاواروں کی طرح سر جھکائے بہت دور تک گاڑی کے پیچھے پیچھے چلے۔ ڈاکٹر صاحب نے انھیں شکریہ کے ساتھ واپس کیا۔

نو بجتے بجتے قریب کا ریلوے اسٹیشن ملا۔ اتنی دیر میں گوروں کے ہوش بجا ہوگئے تھے اور صورت حال ان کی سمجھ میں آگئی تھی۔ ڈر رہے تھے کہ معاملہ افسروں تک پہنچا تو تحقیقات لازمی ہوجائے گی۔ اور سب افسروں کا اغماض بھی انھیں آفت سے نہ بچاسکے گا۔ اس لیے تینوں بھیگی بلّی بنے ہوئے تھے۔ اور باوجودیکہ ہاکی کے ڈنڈوں نے ان کی ہڈیوں کو مضروب اور اعضا کو داغ دار بنا دیا تھا۔ سب کے سب ان لوگوں کے تلوے سہلا رہے تھے۔ اور اپنے فعل پر حد درجہ ندامت کا اظہار کر رہے تھے۔ ساری ہیکڑی غائب ہوگئی تھی۔ اسٹیشن پر کوئی خاص بات نہ ہوئی۔ تینوں بہ مشکل گاڑی سے اُترے اور پلیٹ فارم پر لیٹ گئے۔ ادھر لڑکے دون کی لے رہے تھے۔ جب تک گاڑی نہ آئی تھی۔ اسٹیشن کے ملازموں سے داد لی۔ گاڑی میں بیٹھ کر مسافروں سے خراجِ تحسین لینے لگے۔ سلیم تو اپنی شجاعت اور بسالت پر اتنا نازاں تھا گویا منزلِ ہفت خواں طے کر آیا ہے، خلقت کو چاہیے کہ اس پر پھولوں کی بارش کرے۔ اس کی گاڑی کھینچے۔ اس کا جلوس نکالے۔ مگر امرکانت خیالات میں ڈوبا ہوا ڈاکٹرصاحب کے پاس بیٹھا تھا کہ آج کے سانحے نے اس کے دل پر ایسی چوٹ لگائی تھی جو زہر کی طرح اس کے خون میں گردش کر رہی تھی۔ اس واقعے کی کتنی ہی تصویریں اس کے ذہن میں آرہی تھیں۔ سپاہی انگلینڈ کے سب سے نیچے طبقے سے بھرتی کیے جاتے ہیں۔ پھر انھیں اتنی جرأت کیوں کر ہوئی۔ نہیں ایسے جاہل اور ذلیل ہی ایسی شیطنت کرسکتے ہیں اور جب جہل کے ساتھ قومی افتخار بھی شامل ہوجائے تو پھر انسانیت کے لیے کہیں جگہ ہی نہ رہتی۔ یہ جہلا بھی جانتے ہیں کہ ہندوستانیوں پر ان کا رعب چھایا ہوا ہے، وہ جتنے ظلم چاہیں ڈھائیں کوئی چوں نہیں کرسکتا۔

غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کے لیے وہ طرح طرح کے منصوبے باندھنے لگا۔ جن میں شباب کی اُمنگ تھی۔ لڑکپن کے خیالی پلاؤ، اور ایک شاعر کا تخیل۔

(۶)

ڈاکٹر شانتی کمار ایک مہینے تک اسپتال میں رہ کر اچھے ہوگئے، اور پہلا کام جو انھوں نے کیا وہ ان سپاہیوں کا دریافت حال تھا۔ معلوم ہوا وہ تینوں بھی کئی دن تک اسپتال میں رہے اور اچھے ہونے پر تبدیل کردیے گئے۔ رجمنٹ کے کپتان نے ڈاکٹر صاحب سے اپنے سپاہیوں کے جرم کی معذرت کی اور یقین دلایا کہ آئندہ ان کی نگرانی سختی سے کی جائے گی۔

ادھر سے فرصت پاتے ہی امرکانت کو قومی تحریکوں سے بہت زیادہ دل چسپی ہوگئی۔ ایک بار ایک عام جلسے میں وہ اتنے جوش و خروش سے بولا کہ سپرنٹنڈنٹ پولیس نے لالہ سمرکانت کو بلا کر لڑکے کو قابو میں رکھنے کی تاکید کی۔ لالہ جی نے وہاں سے لوٹ کر خود تو امر سے کچھ نہ کہا۔ سکھدا اور راما دونوں سے جڑ دیا۔ امرکانت پر اب کون حاوی ہے، وہ خوب سمجھتے تھے۔ ان دنوں بیٹے سے انھیں انس ہوگیا تھا۔ جب ماہواری فیس دینی پڑتی تھی تب امرکانت کا اسکول جانا انھیں زہر لگتا تھا۔ اب ان کے اوپر یہ بار نہ تھا اس لیے کچھ نہ بولتے تھے۔ بلکہ کبھی کبھی صندوقچی کی کنجی نہ ملنے پر یا اُٹھ کر صندوق کھولنے کی تکلیف سے بچنے کے لیے بیٹے سے روپے قرض لے لیا کرتے۔ نہ امرکانت مانگتا نہ وہ دیتے۔

سکھدا کے ماں بننے کا زمانہ قریب آتا جاتا تھا۔ اس کا چہرہ بے رونق ہوگیا تھا۔ برائے نام کھاتی اور بہت کم سیر کرنے جاتی۔ طرح طرح کے اندیشے اور دہشت انگیز خیالات اسے پریشان کرتے رہتے تھے۔ نہ جانے کیا ہوگا۔ اس کے جسم میں ذہن اور عقل، حوصلے اور ارمان سے بھرے ہوئے انسان کی تخلیق ہو رہی ہے۔ وہی رینگنے کی سی جِس ایک دن زندگی کے بڑے بڑے مسئلے حل کرے گی۔ قانون بنائے گی۔ آدمیوں پر حکومت کرے گی۔ اس حیرت انگیز، فطری معجزے کی طرف اس کی نگاہ نہ تھی۔ راما نے بچّوں کی پیدائش اور پرورش کے متعلق کئی کتابیں منگوا دی تھیں۔ انھیں پڑھ کر وہ اور بھی فکرمند ہوجاتی تھی۔

اس دن شام کے وقت امرکانت اس کے پاس آیا تو وہ جلی بیٹھی تھی۔ بولی۔"تم مجھے تھوڑا سا سنکھیا کیوں نہیں دے دیتے۔ تمھارا گلا بھی چھوٹ جائے اور میں بھی جنجال سے نکل جاؤں۔"

امرکانت ان دنوں سکھدا کی دل جوئی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرتا۔ حسن کی ضیا سے چمکتی ہوئی سکھدا آنکھوں کو فریفتہ کرتی تھی۔ لیکن یہ زرد رو حاملہ اس کے دل کو نور سے منور کردیتی تھی۔ وہ اس کے پاس بیٹھا ہوا اس کی روکھی زلفوں اور سوکھے ہوئے ہاتھوں سے کھیلا کرتا۔ اس کی اس خستہ حالی کا ذمہ دار وہ ہے۔ اس لیے وہ اس کی دل جوئی کرنے کا موقعہ ڈھونڈھتا رہتا تھا۔ ان دنوں اس کی سب سے بڑی تمنا یہ تھی کہ سکھدا اس سے کسی چیز کی فرمائش کرے۔ وہ ایک بار آسمان کے تارے توڑ لانے پر آمادہ ہوجاتا۔ ہمیشہ اسے اچھی اچھی کتابیں سنا کر خوش کرنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ ولادت کے خیال سے اسے جتنی مسرت ہوتی تھی۔ اس سے کہیں زیادہ فکر سکھدا کی حالت دیکھ کر ہوتی تھی۔ گھبرا کر بولا۔ "یہ کیوں کہتی ہو۔ مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہو تو۔ بتلا دو۔"

سکھدا لیٹی ہوئی تھی تکیے کے سہارے ٹیک لگا کر بولی۔ "تم عام جلسوں میں پُرجوش تقریریں کرتے پھرتے ہو۔ اس کے سوا اور کیا نتیجہ ہے کہ تم گرفتار ہوجاؤ اور اپنے ساتھ گھر کو بھی لے ڈوبو۔ دادا سے پولیس کے کسی بڑے افسر نے شکایت کی ہے۔ تم ان کی کچھ مدد تو کرتے نہیں، اُلٹے اور ان کے کیے کرائے کو خاک میں ملانے پر تُلے بیٹھے ہو۔ میں تو آپ ہی اپنی جان سے مر رہی ہوں۔ اس پر تمھاری یہ حرکتیں اور بھی مارے ڈالتی ہیں۔ مہینہ بھر ڈاکٹر کے پیچھے ہلکان ہوئے۔ ادھر سے فرصت ملی تو یہ مصیبت لے بیٹھے، تم سے اطمینان کے ساتھ کیوں بیٹھا نہیں جاتا؟ تم اپنے مالک نہیں ہوکہ جس راستے پر چاہو جاؤ۔ تمھارے پاؤں میں بیڑیاں ہیں۔ کیا اب بھی تمھاری آنکھیں نہیں کھلتیں؟" امرکانت نے اپنی صفائی میں کہا۔ "میں نے تو کوئی ایسی قابلِ اعتراض تقریر نہیں کی۔"

"تو دادا جھوٹ کہتے تھے؟"

"اس کا تو یہ مطلب ہے کہ میں اپنی زبان بند کرلوں۔"

"ہاں تمھیں اپنی زبان بند کرنی پڑے گی۔"

دونوں ایک لمحہ تک خاموش رہے۔ تب امرکانت نے مجبورانہ انداز سے کہا۔ "اچھی بات ہے آج سے زبان بند کرلوں گا۔ پھر تمھارے سامنے ایسی شکایت آئے تو میرا کان پکڑ لینا۔"

سکھدا نرم ہوکر بولی۔"تم ناراض ہوکر تو یہ وعدہ نہیں کر رہے ہو؟ میں تمھاری

ناراضی سے بہت ڈرتی ہوں۔ میں بھی جانتی ہوں کہ ہم لوگ بے دست و پا ہیں۔ یہ بے بسی مجھے بھی اتنی ہی ناگوار گزرتی ہے جتنی تمھیں۔ میرے پاؤں میں دوہری بیڑیاں ہیں۔ جنس کی الگ سرکار کی الگ۔ لیکن آگے پیچھے بھی تو دیکھنا ہوتا ہے۔ ملک کے ساتھ ہمارا جو فرض ہے۔ اس سے زیادہ دادا جی کے ساتھ ہے۔ اور اس سے زیادہ اپنی اولاد کے ساتھ۔ باپ کو آزردہ خاطر اور معصوم بچّے کو بے سہارے چھوڑ کر قوم کی خدمت کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی اپنے گھر میں آگ لگا کر آسمان کے نیچے رہے۔ جس جان کو میں اپنا خونِ دل پلا پلا کر پال رہی ہوں۔ میں چاہتی ہوں تم بھی اسے اپنا لختِ جگر سمجھو۔ تمھاری ساری شفقت، ایثار اور حمیت کا حق دار وہی رہے۔"

امرکانت سر جھکائے یہ وعظ سنتا رہا۔ وہ نادم تھا اور اس کا ضمیر اسے نفریں کر رہا تھا۔ اس نے سکھدا کے ساتھ بے انصافی کی ہے اور آنے والے بچّے کے ساتھ بے رحمی۔ اس بچّے کی خیالی تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔ وہ مکّھن سا ملائم اور نورِ سحر کی طرح شگفتہ اس کی گود میں کھیل رہا تھا۔ وہ اس خیالی نظارے میں ہمہ تن محو ہوگیا۔ دیوار پر نونہال کرشن کی خوب صورت تصویر لٹک رہی تھی۔ اس تصویر میں آج اسے جتنی روحانی مسرّت حاصل ہوئی اتنی اور کبھی نہ ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں آب گوں ہو گئیں۔

سکھدا نے اسے ایک پان کا بیڑا دیتے ہوئے کہا۔ "اماں کہتی تھیں میں بچّے کو لے کر لکھنؤ چلی جاؤں گی۔" میں نے کہا۔ "اماں تمھیں بُرا لگے یا بھلا میں تو اپنا لعل نہ دوں گی۔"

امرکانت نے اشتیاق کے ساتھ پوچھا۔"تو بگڑی ہوں گی۔"

"نہیں جی بگڑنے کی کیا بات تھی، ہاں انھیں کچھ بُرا ضرور معلوم ہوا ہوگا۔ لیکن میں مذاق میں بھی اپنی زندگی کی کائنات کو نہیں چھوڑسکتی۔"

"دادا نے پولیس والوں کی شکایت کا ذکر اماں سے بھی کیا ہوگا؟"

"ہاں ضرور کیا ہے، جاؤ آج اماں تمھاری کیسی خبر لیتی ہیں۔"

"میں آج جاؤں گا ہی نہیں۔"

"اچھا چلو میں تمھاری وکالت کردوں گی۔"

"معاف کرو، وہاں مجھے اور ذلیل کروگی۔"

"نہیں سچ کہتی ہوں، اچھا بتاؤ بچّہ کس پر ہوگا؟ مجھ پر یا تم پر؟ میں کہتی ہوں تم پر

ہو۔"

"میں چاہتا ہوں تم پر ہو۔"

"یہ کیوں؟ میں تو چاہتی ہوں تم پر ہو۔"

"تم پر ہوگا تو میں اسے اور زیادہ چاہوں گا۔"

"اچھا اس عورت کی کچھ خبر ملی جسے گوروں نے خراب کیا تھا؟"

"نہیں، پھر تو کوئی خبر نہیں ملی۔"

"ایک دن جاکر اس کا پتہ کیوں نہیں لگاتے یا زبانی ہمدردی دکھا کر ہی اپنے فرض سے سبک دوش ہوگئے۔"

امرکانت نے نادم ہوکر کہا۔"کل جاؤں گا۔"

"ایسی ہوشیاری سے پتہ لگاؤ کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ اگر گھر والوں نے اسے نکال دیا ہو تو اپنے ساتھ لے آؤ، اماں کو اسے اپنے ساتھ رکھنے میں کوئی عذر نہ ہوگا اور ہوگا تو میں اسے اپنے ساتھ رکھوں گی۔"

امرکانت نے پُرغرور نظروں سے سکھدا کو دیکھا۔ کتنی رحم دل، کتنی بے باک۔ کتنی روشن خیال عورت ہے، اس نے پوچھا۔"تمھیں اس سے ذرا بھی احتراز نہ ہوگا؟"

سکھدا نے پس و پیش کے ساتھ کہا۔ "اگر میں یہ کہوں کہ نہ ہوگا تو یہ غلط ہے، ہوگا ضرور ۔ لیکن اپنے دل پر جبر کرنا پڑے گا۔ اس نے کوئی خطا نہیں کی۔ پھر سزا کیوں دی جائے۔"

امرکانت نے دیکھا سکھدا انسانیت کی پاکیزہ شعاعوں میں نہا رہی ہے۔ اس کی پاک نفسی منعکس ہوکر جلال بن گئی ہے۔

(۷)

امرکانت نے جلسوں میں بولنا تو درکنار شریک ہونا بھی چھوڑ دیا۔ لیکن اس کا ضمیر ان بندشوں سے آزاد ہوجانے کے لیے تڑپتا رہتا تھا۔ وہ کبھی کبھی اخباروں اور رسالوں میں اپنے جذبات کا اظہار کرکے اپنے دل کو تسکین دے لیتا تھا۔ اب وہ کبھی کبھی دکان پر بھی آبیٹھتا۔ خاص کر چھٹیوں کے دن تو وہ دکان پر ہی رہتا۔ اسے تجربہ ہو رہا تھا کہ دکان پر بیٹھ کر بھی انسانی فطرت کا بہت کچھ علم حاصل کیا جاسکتا ہے۔ سکھدا اور راما دونوں کی

محبت اور شفقت نے اسے جکڑ لیا تھا۔ وہ دل کی جلن جو گھر والوں سے مخالفت کرنے میں صورت پذیر ہوتی تھی اب رفع ہو گئی تھی۔ روتا ہوا بچہ مٹھائی پاکر رونا بھول گیا تھا۔

ایک دن امرکانت دکان پر بیٹھا تھا کہ ایک آسامی نے آکر پوچھا۔ "لالہ جی کہاں ہیں بابو جی! بڑا ضروری کام ہے۔"

امرکانت نے دیکھا، ادھیڑ، سیہ فام، توانا، کریہہ المنظر آدمی ہے نام ہے کالے خاں، لاپرواہی سے بولا۔ "کہیں گئے ہیں۔ کیا کام ہے؟"

"کچھ کہہ نہیں گئے کب تک آئیں گے؟"

امر کو شراب کی ایسی بدبو آئی کہ اس نے ناک بند کرلی اور منہ پھیر کر بولا۔ "کیا تم شراب پیتے ہو؟"

کالے خاں نے ہنس کر کہا۔ "شراب کسے میسّر ہے لالہ۔ روکھی روٹیاں تو ملتی نہیں۔ آج ایک ناتے داری میں گیا تھا۔ لوگوں نے پلا دی۔"

وہ اب قریب آگیا اور امر کے کان کے پاس منہ لاکر بولا۔ "ایک رقم دکھانے لایا تھا۔ کوئی دس تولے کی ہوگی۔ بازار میں ڈھائی سے کم کی نہیں ہے۔ لیکن میں تمھارا پُرانا آسامی ہوں۔ جو کچھ دے دوگے لے لوں گا۔"

اس نے کمر سے طلائی کڑوں کا ایک جوڑا نکالا اور امر کے سامنے رکھ دیا۔ امر نے کڑوں کو بغیر اُٹھائے ہوئے پوچھا۔ "یہ کڑے تم نے کہاں پائے؟"

کالے خاں نے بے حیائی سے مسکرا کر کہا۔ "یہ نہ پوچھو راجا، اللہ دینے والا ہے۔"

امر نے نفرت آمیز لہجے میں کہا۔ "کہیں سے چُرا کر لائے ہو گے؟"

کالے خاں پھر ہنسا۔ "چوری کسے کہتے ہیں؟ یہ تو اپنی کھیتی ہے۔ اللہ نے سب کے پیچھے حیلہ لگا دیا ہے۔ کوئی نوکری کرکے لاتا ہے کوئی مجوری کرتا ہے، کوئی روج گار کرتا ہے۔ دیتا سب کو وہی اللہ ہے۔ تو پھر نکالو روپے مجھے دیر ہو رہی ہے۔ ان لال پگڑی والوں کی بڑی پوجا کرنی پڑتی ہے، نہیں تو کچھ کام بھی نہ چلے۔"

امرکانت کو یہ معاملہ اتنا مکروہ معلوم ہوا کہ جی میں آیا کالے خاں کو دھتکار دے۔ اس کے پدر بزرگوار ایسے ذات شریفوں کو بھی منہ لگاتے ہیں۔ بے اعتنائی سے بولا۔ "مجھے اس چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ اسے لے جاؤ ورنہ پولیس میں اطلاع کردوں گا۔ پھر اس

دُکان پر نہ آنا کہے دیتا ہوں۔"

کالے خاں حیرت سے اس کا منہ تکنے لگا۔ ایسی بے رُخی کا برتاؤ اس کے ساتھ کبھی کسی نے نہیں کیا تھا۔ جس دُکان پر جاتا لوگ اس کی آؤ بھگت کرتے۔ اسے سونے کی چڑیا سمجھتے تھے۔ مگر اس کے سکون میں ذرا بھی فرق نہ آیا۔ مطمئن انداز سے بولا۔ "یہ تو تم بالکل نئی بات کہہ رہے ہو بھیّا۔ لالہ کا یہ برتاؤ ہوتا تو آج لکھ پتی نہ بنے بیٹھے ہوتے۔ ہزاروں روپے کی چیزیں تو میں ہی دے گیا ہوں۔ شنکر مہاراج، بھکاری، ہینگن سبھی سے تو لالہ کا بیوپار ہے کوئی چیز ہاتھ لگی اور آنکھ بند کرکے یہاں چلے آئے۔ دام لیے اور گھر کی راہ لی۔ اس دُکان سے بال بچّوں کو روزی چلتی ہے۔ کانٹا نکال کر تول لو۔ دس تولے سے کچھ اوپر ہی نکلیں گے۔ لینے والے تو بیس ہیں مگر اس دُکان کو چھوڑ کر کہیں جانے کو جی نہیں چاہتا۔ لاؤ ڈیڑھ سو ہی دے دو کہاں دوڑتے پھریں۔

امرکانت نے ڈانٹ کر کہا۔ "میں نے کہہ دیا مجھے اس کی ضرورت نہیں۔"

"پچھتاؤ گے لالہ! کھڑے کھڑے ڈھائی سو میں بیچ لوگے۔"

"کیوں مغز چاٹ رہے ہو، میں اسے نہیں لوں گا۔"

"اچھا لاؤ، سو ہی روپے دے دو۔ ایک بار گھاٹا ہی سہی۔"

"تم مجھے ناحق دق کر رہے ہو۔ میں چوری کا مال نہ لوں گا۔ چاہے لاکھ کی چیز دھیلے میں ملے۔ تمھیں چوری کرتے شرم نہیں آتی۔ ایشور نے ہاتھ پاؤں دیے ہیں۔ خاصے موٹے تازے آدمی ہو۔ مزدوری کیوں نہیں کرتے۔ دوسروں کا مال اُڑا کر اپنی دنیا اور عاقبت دونوں خراب کر رہے ہو۔"

کالے خاں نے ایسا منہ بنایا گویا ایسی بکواس سُن چکا ہے۔ بولا۔ "تو تمھیں نہیں لینا ہے۔"

"نہیں۔"

"پچاس دیتے ہو؟"

"ایک کوڑی نہیں۔"

کالے خاں نے کڑے اُٹھا کر کمر میں رکھ لیے اور دُکان کے نیچے اُتر گیا۔ لیکن ایک ہی لمحے میں پھر لوٹ کر بولا۔ "اچھا تیس ہی دے دو۔ اللہ جانتا ہے اس میں آدھا مال

پگڑی والوں کا ہے۔"

امرکانت نے اسے دھکا دے کر کہا۔ "نکل جا یہاں سے مردود۔ مجھے کیوں حیران کر رہا ہے۔"

کالے خاں چلا گیا تو امر نے اس جگہ کو جھاڑو سے صاف کرایا اور اگربتی جلا کر رکھ دی۔ شراب کی بدبو ابھی تک اس کی ناک میں بھری ہوئی تھی۔ آج اسے اپنے باپ سے جتنی نفرت ہوئی تھی۔ اتنی کبھی نہیں ہوئی تھی۔ اس گھر کی ہوا تک اسے مسموم معلوم ہونے لگی۔ لالہ جی کے ہتھکنڈوں سے وہ کچھ کچھ تو واقف تھا لیکن وہ اس درجہ گر گئے ہیں اس کا ثبوت آج ہی ملا، اس نے اپنے دل میں عہد کیا آج دادا سے اس مسئلے پر خوب بحث کروں گا۔ اس نے کھڑے ہوکر منتظر آنکھوں سے سڑک کی طرف دیکھا۔ لالہ جی کہیں نہ دکھائی دیے۔ اس کے جی میں آیا دُکان بند کرکے چلا جائے۔ اور جب لالہ جی آجائیں ان سے صاف صاف کہہ دے مجھ سے یہ بیوپار نہ ہوگا۔ وہ دُکان بند کرنا چاہتا ہی تھا کہ ایک بُڑھیا لاٹھی ٹیکتی سامنے کھڑی ہوگئی اور پوچھا "لالہ نہیں ہیں کیا بیٹا!"

بڑھیا کے بال سن ہوگئے تھے۔ جسم کی ہڈیاں تک خشک ہوگئی تھیں۔ حیات کی اس دوردراز منزل پر پہنچ گئی تھی جہاں سے محض اس کا عکس نظر آتا تھا۔ گویا دو ایک لمحے میں اُفق میں ڈوب جائے گی۔

امرکانت کے جی میں پہلے تو آیا کہ کہہ دے لالہ نہیں ہیں۔ لیکن بُڑھیا کے پچکے ہوئے چہرے پر ایسی دردناک بے کسی چھائی ہوئی تھی کہ اسے رحم آگیا، بولا۔ "لالہ جی سے کیا کام ہے؟ وہ تو کہیں گئے ہوئے ہیں۔"

بُڑھیا نے مایوس ہوکر کہا۔ "کوئی ہرج نہیں بیٹا! پھر آجاؤں گی۔"

امر کی بے التفاتی رخصت ہوگئی، ہمدردی سے بولا۔ "اب آتے ہی ہوں گے، اوپر چلی آؤ۔"

دُکان کی کرسی اونچی تھی۔ تین سیڑھیاں چڑھنی پڑتی تھیں، بڑھیا نے پہلی سیڑھی پر پاؤں رکھا لیکن دوسرا پاؤں اوپر نہ اُٹھا سکی، پیروں میں اتنی طاقت نہ تھی۔ امر نے نیچے آکر اس کا ہاتھ پکڑ لیا، اور اسے سہارا دے کر دُکان پر چڑھا دیا۔ بڑھیا نے دعائیں دیتے ہوئے کہا۔ "تمھاری عمر دراز ہو بیٹا! میں ڈرتی ہوں کہیں لالہ دیر میں آئے اور اندھیرا ہوگیا تو

میں گھر کیسے پہنچوں گی۔ رات کو کچھ نہیں سوجھتا بیٹا۔"

"تمھارا گھر کہاں ہے بڑی بی؟"

بڑھیا نے بے نور آنکھوں سے اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر کہا۔ "گوبردھن سرائے میں رہتی ہوں۔"

"تمھارے بال بچے نہیں ہیں؟"

"کوئی نہیں رہا بیٹا! ایک زمانے میں پورا خاندان تھا۔ پر اللہ نے سب کو بلا لیا۔ بس ایک پوتی رہ گئی ہے اسی کا منہ دیکھ کر جیتی ہوں اور اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں۔ اس کی مرضی میں کسی کو کیا دخل۔ اسی کے کرم سے تو ایک دن سب کچھ تھا۔ اس نے چھین لیا تو کیوں گلہ کروں۔

"میں کسی کے بھروسے نہیں ہوں بیٹا! جیتے رہیں میرے لالہ سمرکانت، وہی میری پرورش کرتے ہیں۔ تب تو تم بہت چھوٹے تھے جب میرا سردار لالہ جی کا چپراسی تھا۔ اس کی کمائی میں خدا نے کچھ ایسی برکت دی کہ گھربار بنا، بال بچّوں کے شادی بیاہ ہوئے۔ چار پیسے ہاتھ میں آئے تھے تو پانچ روپے کے پیادے پر کسی سے دبے نہیں۔ کسی کے سامنے گردن نہیں جھکائی۔ جہاں لالہ کا پسینہ گرے وہاں اپنا خون گرانے کو تیار رہتے تھے۔ آدھی رات، پچھلی رات جب بلایا حاضر ہوگئے۔ تھے تو ادنیٰ نوکر لیکن لالہ نے کبھی "تم" کہہ کر نہیں پکارا۔ برابر خاں صاحب کہتے تھے۔ بڑے بڑے سیٹھ کہتے خاں صاحب! ہمارے پاس آجاؤ مگر سب کو یہی جواب دیتے جس کے ہوگئے اس کے ہوگئے۔ لالہ نے بھی ایسا نبھایا کہ کیا کوئی نبھائے گا۔ انھیں مرے آج بیسواں سال ہے اسی طرح دیئے جاتے ہیں کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی نوبت نہیں آئی۔"

امرکانت نے اپنے والد کو خودغرض، بے درد اور حریص سمجھ رکھا تھا۔ آج اُسے معلوم ہوا کہ ان میں رحم اور غربا پروری بھی ہے۔ اسے اپنے اندر ایک پُرغرور مسرّت کا احساس ہوا اور پوچھا "تو تمھیں پانچ روپے ملتے ہیں؟"

"ہاں بیٹا! پانچ روپے مہینہ دیے جاتے ہیں۔"

"تو میں تمھیں روپے دیے دیتا ہوں۔ لیتی جاؤ۔ لالہ شاید دیر میں آئیں۔"

بڑھیا نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "نہیں بیٹا! انھیں آجانے دو لٹھیا ٹیکتی چلی

جاؤں گی۔ اب تو یہی آنکھ رہ گئی ہے۔"

"اس میں ہرج کیا ہے۔ میں ان سے کہہ دوں گا۔ پٹھانی روپے لے گئی۔ اندھیرے میں کہیں گر پڑو گی۔"

"نہیں بیٹا! ایسا کام نہیں کرتی جس میں بعد میں کوئی بات پیدا ہو۔ پھر آجاؤں گی۔"

"نہیں میں بغیر روپے دیے نہ جانے دوں گا۔"

بڑھیا نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "تو دے دو بیٹا! میرا نام ٹانک لینا۔"

امرکانت نے روپے دے دیے۔ بڑھیا نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے روپے لے کر گرہ میں باندھے اور دعائیں دیتی ہوئی آہستہ آہستہ چلی گئی۔ مگر پچاس قدم بھی نہ گئی ہوگی کہ پیچھے سے امرکانت ایک یکہ لیے ہوئے آکر بولا۔ "بڑی بی آکر اس یکہ میں بیٹھ جاؤ، میں تمھیں پہنچادوں۔"

بڑھیا نے تعجب کی نگاہوں سے اسے دیکھ کر کہا۔ "ارے نہیں بھیا تم مجھے پہنچانے کہاں جاؤ گے میں لکڑی ٹیکتی ہوئی چلی جاؤں گی۔ اللہ تمھیں سلامت رکھے۔"

امرکانت نے بڑھیا کو گود میں اُٹھا کر یکے پر بٹھایا اور پوچھا۔ "کہاں چلوں؟"

بڑھیا نے یکے کے ڈنڈے کو مضبوط پکڑ کر کہا۔ "گوبردھن کی سرائے چلو بھیا! اللہ تمہاری عمر دراز کرے۔ میرا بچہ اس بڑھیا کے لیے اتنا حیران ہو رہا ہے۔ اتنی دور سے دوڑا آیا۔"

پندرہ بیس منٹ میں یکہ بلیماران کے کوچے میں آپہنچا۔ سڑک کے داہنے ہاتھ ایک گلی تھی۔ وہیں بڑھیا نے رکوایا اور اُتر پڑی۔ یکہ آگے نہ جاسکتا تھا۔ اندھیرا اتنا زیادہ تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ تاریکی نے منہ پر تارکول پوت لیا ہے۔

امرکانت نے یکہ لوٹانے کو کہا تو بڑھیا بولی۔ "نہیں میرے لال! اتنی دور آئے ہو تو پل بھر میرے گھر بھی بیٹھ لو۔ تم نے میرا کلیجہ ٹھنڈا کردیا۔"

گلی میں سخت بدبو تھی۔ گندے پانی کے نالے دونوں طرف بہہ رہے تھے۔ غریبوں کا محلّہ تھا۔ اکثر مکان کچے تھے۔ شہر کے بازاروں اور گلیوں میں کتنا فرق ہے۔ ایک پھول ہے خوب صورت، پاکیزہ اور خوشبودار۔ دوسری جڑ ہے کیچڑ اور بدبو سے لپٹی ہوئی۔ ٹیڑھی میڑھی۔ لیکن کیا پھول کو معلوم ہے اس کی ہنسی اس کی جڑ سے ہے؟

بڑھیا نے ایک مکان کے سامنے کھڑے ہوکر آہستہ سے پکارا "سکینہ۔"
اندر سے آواز آئی۔ "آتی ہوں اماں! اتنی دیر کہاں لگائی؟"

ایک لمحے میں سامنے کا دروازہ کھلا اور دوشیزہ ہاتھ میں مٹّی کے تیل کی ڈبیہ لیے دروازے پر آکر کھڑی ہوگئی۔ امر کانت بڑھیا کے پیچھے کھڑا تھا اس پر اس کی نگاہ نہ پڑی۔ لیکن بڑھیا آگے بڑھی تو سکینہ نے امر کو دیکھا۔ فوراً اوڑھنی سے منہ چھپاتی ہوئی پیچھے ہٹ گئی اور آہستہ سے پوچھا۔ "یہ کون ہیں اماں؟"

بڑھیا نے ایک کونے میں اپنی لکڑی رکھ دی اور بولی۔ "لالہ کا لڑکا ہے مجھے پہنچانے آیا ہے۔ ایسا سعادت مند لڑکا تو میں نے دیکھا ہی نہیں۔"

اس نے اب تک کا سارا واقعہ دعاؤں اور پیار کے جملوں سے بھری ہوئی زبان میں کہہ سنایا اور بولی۔ "آنگن میں کھٹولا ڈال دے۔ بلا لوں۔ تھک گیا ہوگا۔"

سکینہ نے ایک ٹوٹا سا کھٹولا آنگن میں ڈال دیا اور اس پر ایک سڑی سی چادر بچھاتی ہوئی بولی۔ "اس کھٹولے پر کیا بٹھاؤ گی اماں، مجھے تو شرم آتی ہے۔"

بڑھیا خفا ہوکر بولی۔ "اس میں شرم کی کیا بات ہے۔ ہمارا حال کیا ان سے چھپا ہوا ہے۔"

بڑھیا نے باہر جاکر امر کانت کو بلایا۔ دروازہ ایک پردے کی دیوار میں تھا۔ اس پر ٹاٹ کا ایک پھٹا پُرانا پردہ پڑا ہوا تھا۔ دروازے کے اندر قدم رکھتے ہی ایک آنگن تھا جس میں مشکل سے دو کھٹولے بچھ سکتے تھے۔ سامنے کھپریل کا ایک نیچا سائبان تھا اور سائبان کے پیچھے ایک کوٹھری تھی جو اس وقت اندھیری پڑی تھی۔ سائبان میں ایک کنارے ایک چولھا بنا ہوا تھا، ٹین اور مٹی کے دو چار برتن، ایک گھڑا اور ایک مٹکا رکھا ہوا تھا۔ چولھے میں آگ جل رہی تی۔ اور توا رکھا ہوا تھا۔

امر نے کھٹولے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "یہ گھر تو بہت چھوٹا ہے۔ اس میں تمھاری گزر کیسے ہوتی ہے؟"

بڑھیا کھٹولے کے پاس زمین پر بیٹھ گئی اور بولی۔ "بیٹا اب تو دو ہی آدمی ہیں۔ یہیں اس گھر میں پورا کنبہ رہتا تھا۔ میرے دو بیٹے، دو بہوئیں، ان کے بچے سب اسی گھر میں رہتے تھے۔ اسی میں سبھوں کے شادی بیاہ ہوئے اور اسی میں سب مر گئے۔ اُس وقت یہ گھر

کیسا گلزار لگتا تھا کہ میں تم سے کیا کہوں۔ اب میں ہوں اور یہی میری پوتی ہے اور سب کو اللہ نے بلا لیا۔ تمھارے پٹھان کے مرتے ہی گھر میں جیسے جھاڑو پھر گئی اب تو خدا سے یہی دعا ہے کہ میرے جیتے جی کسی بھلے آدمی سے اس کا نکاح ہو جائے۔ تمھارے یار دوست تو بہت ہوں گے بیٹا! اگر شرم کی بات نہ سمجھو تو کسی سے ذکر کرنا۔ کون جانے تمھارے ہی حیلے سے کہیں بات چیت ٹھیک ہو جائے۔"

سکینہ کُرتا پاجامہ پہنے، اوڑھنی سے پیشانی چُھپائے سائبان میں کھڑی تھی۔ بڑھیا نے جوں ہی اس کی شادی کا ذکر چھیڑا۔ وہ چولھے کے پاس جا بیٹھی اور آٹے کو انگلیوں سے گودنے لگی۔ وہ دل میں جھنجلا رہی تھی کہ اماں کیوں ان سے میرا دُکھڑا لے بیٹھیں۔ کس سے کیا بات کہنی چاہیے کیا نہیں اس کا انھیں ذرا بھی لحاظ نہیں۔ جو ایرا غیرا آبیٹھا اسی سے شادی کا دُکھڑا لے بیٹھیں۔ اور ساری باتیں گئیں ایک شادی رہ گئی۔

امرکانت نے دل میں اپنے مسلمان دوستوں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا "میرے مسلمان دوست زیادہ تو نہیں۔ لیکن دو چار ہیں ان سے ذکر کروں گا۔"

پٹھانی نے یہ مسئلہ چھیڑ تو دیا۔ لیکن اسے معاً خیال آیا کہ امرکانت کے دوست مالدار ہوں گے اور مالدار کسی غریب کے گھر کیوں شادی کرنے لگا اس لیے امرکانت کو یہ سمجھا دینا ضروری تھا کہ اس کی حیثیت کا لحاظ کرکے کسی سے تذکرہ کیا جائے۔ بولی۔ "مجھے تو صرف ایسا لڑکا چاہیے کہ جو شریف خاندان ہو اور شریف مزاج ہو۔ میں دولت کی قائل نہیں ہوں۔ حالاں کہ ہمارے رسول پاکؐ کا حکم ہے کہ نکاح میں امیر و غریب کا امتیاز مٹا دیا جائے لیکن ان کا حکم اب کون مانتا ہے۔ نام کے مسلمان اور نام کے ہندو رہ گئے ہیں۔ نہ کہیں سچّا مسلمان نظر آتا ہے۔ نہ سچّا ہندو۔ میرے گھر کا تو تم پانی بھی نہ پیو گے بیٹا! تمھاری کیا خاطر کروں؟" یہ کہہ کر اس نے سکینہ سے وہ رومال لانے کو کہا جس پر ابھی اس نے کشیدہ کاڑھا تھا۔ شاید بھیّا کو وہ رومال پسند آجائے وہ غریب اور کس لائق ہے۔"

سکینہ سر جھکائے جھجکتی ہوئی بڑھیا کے پاس آئی۔ اس کے ہاتھ میں رومال رکھا اور تیزی سے غائب ہو گئی۔

امرکانت آنکھیں جھکائے ہوئے تھا۔ مگر سکینہ کو دیکھ کر وہ آنکھیں نیچی نہ رکھ سکا۔ ایک نازنین سامنے کھڑی ہو تو اس کی طرف سے منہ پھیر لینا اس کی انگریزی تہذیب میں

پرلے درجے کی بدتہذیبی تھی۔ لڑکی کا رنگ سانولا تھا اور خدوخال کے اعتبار سے اس پر حسین کا اطلاق نہ ہوسکتا تھا۔ مگر خدوخال، شرم و حیا سادگی اور نزاکت، ان سب نے مل جُل کر اس میں حسن کی کشش پیدا کردی تھی۔ وہ بڑی بڑی پلکوں سے آنکھیں چُھپائے، بدن چُرائے ایک نورسا بکھیرتی ہوئی اس طرح نکل گئی جیسے موسیقی کی تان کان میں آکر غائب ہوجائے۔

امرکانت نے رومال اُٹھایا اور چراغ کی روشنی میں اسے دیکھنے لگا۔ کتنی صفائی سے بیل بوٹے بنائے گئے تھے۔ امر کو ان بیل بوٹوں میں سکینہ کی نازک اُنگلیاں نظر آئیں۔ اس جھونپڑی میں اتنا پاکیزہ مذاق۔

حیرت میں آکر بولا۔ ''یہ تو بڑا خوب صورت رومال ہے بڑی بی! سکینہ سوزن کاری میں بڑی ہوشیار معلوم ہوتی ہیں۔''

بڑھیا نے فخر کے ساتھ کہا۔ ''سب ہی کام جانتی ہے بیٹا! نہ جانے کیسے سیکھ گئی۔ محلے کی دو چار لڑکیاں مدرسے پڑھنے جاتی ہیں۔ انھیں کو کاڑھتے دیکھ کر اس نے سب کچھ سیکھ لیا۔ مگر اس غریبوں کے محلے میں ان کاموں کی کون قدر کرسکتا ہے۔ ایک بیکس بیوہ کا تحفہ سمجھ کر اسے قبول کرو۔''

امر نے رومال کو لے کر رکھا تو اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس کا بس ہوتا تو اسی وقت سو دو سو رومالوں کی فرمائش کردیتا۔ غربتِ لطیف کا یہ نظارہ دیکھ کر وہ سوچ رہا تھا کہ کاش وہ اس قابل ہوتا تو دو چار اشرفیاں انعام کے طور پر سکینہ کی نظر کرتا۔ کھڑا ہو کر بولا۔ ''میں اس رومال کو ہمیشہ آپ کی دعا سمجھوں گا۔ اگر میرے دوستوں کو ایسے اور رومالوں کی ضرورت ہو تو آسانی سے بن سکیں گے؟''

یہ پوچھنے کی ضرورت نہ تھی۔ امرکانت کو قیافے سے سمجھ لینا چاہیے تھا۔ پٹھانی نے اس کی بلائیں لیں۔ اس طرح کا جتنا کام وہ اسے دے سکے اتنا ہی اس کا احسان ہوگا۔

امرکانت نے پہلے پٹھانی کے لیے ''تم'' کا استعمال کیا تھا۔ رخصت ہوتے وقت وہ ''تم'' آپ میں تبدیل ہوگیا تھا۔ سلیقہ، نفاست، وضع داری اور شرافت کا ایسا دل آویز اجتماع امرکانت کے محدود تجربے میں نہ نظر آیا تھا۔ ہاں ان خوبیوں پر عسرت اور افلاس کا پردہ پڑا ہوا تھا۔

امر کانت رخصت ہوا اور بڑھیا آنچل اُٹھا کر اسے دعائیں دیتی رہی۔

(۸)

امر کانت نو بجتے بجتے لوٹا تو لالہ سمر کانت نے پوچھا۔ "تم دُکان بند کر کے کہاں چلے گئے تھے؟ اس طرح دُکان داری ہوتی ہے؟"

امر نے صفائی پیش کی۔ "وہ بڑھیا پٹھانی روپے لینے آئی تھی۔ بہت اندھیرا ہو گیا تھا۔ میں نے سمجھا کہیں راستے میں گر نہ پڑے اس لیے اس کے گھر تک پہنچانے چلا گیا تھا۔ بڑی مشکل سے اس نے روپے لیے۔"

"کتنے روپے دیے؟"

"پانچ"

لالہ کو کچھ تشفی ہوئی، پھر پوچھا۔"اور بھی کوئی آسامی آیا تھا؟ کسی سے کچھ روپے وصول ہوئے؟"

"جی نہیں"

"تعجب ہے۔"

"اور تو کوئی نہیں آیا، وہی بدمعاش کالے خاں سونے کی ایک چیز بیچنے لایا تھا۔ میں نے لوٹا دیا۔"

سمر کانت کے چہرے پر ناراضگی کے آثار نمایاں ہوئے "کیا چیز تھی؟"

"سونے کے کڑے تھے۔ دس تولے کے بتاتا تھا۔"

"تم نے تولا نہیں؟"

"میں نے ہاتھ سے چھوا تک نہیں۔"

لالہ جی کی ناراضی غصّے میں تبدیل ہو گئی۔ بولے۔ "ہاں کیوں چھوتے اس میں شاید گناہ لپٹا ہوا ہوگا۔ کتنا مانگتا تھا؟"

"دو سو۔"

"جھوٹ بولتے ہو۔"

"شروع دو سو سے کیے تھے ہاں اُتر کر تیس تک آ گیا تھا۔"

"لالہ جی نے غضب ناک ہو کر کہا۔ "پھر تم نے لوٹا دیے؟"

"اور کیا کرتا؟ میں تو اُسے مفت بھی نہ لیتا۔ ایسے روزگار پر میں لعنت بھیجتا ہوں۔"

سمرکانت آپے سے باہر ہوکر بولے۔"چپ بھی رہو، شرماتے نہیں۔ اوپر سے باتیں بناتے ہو۔ ڈیڑھ سو روپے مفت میں بیٹھے بٹھائے تھے۔ وہ تم نے اپنے اصول پروری کے زعم میں کھو دیے۔ اس پر بھی اکڑتے ہو۔ جانتے بھی ہو دولت کیا چیز ہے؟ سال میں ایک بار بھی گنگا اشنان کرتے ہو؟ ایک بار بھی دیوتاؤں کو جل چڑھاتے ہو؟ کبھی رام کا نام لیا ہے زندگی میں۔ کبھی ایکادشی یا کوئی دوسرا برت رکھا ہے؟ کبھی کتھا پُران پڑھتے یا سنتے ہو۔ تم کیا جانو دھرم کسے کہتے ہیں۔ دھرم دوسری شے ہے، روزگار دوسری شے ہے۔ چھی، صاف ڈیڑھ سو پانی میں ڈال دیے۔"

امرکانت دھرم کی اس تشریح پر دل میں ہنس کر بولا۔"آپ گنگا اشنان، پوجا پاٹ کو حقیقی دھرم سمجھتے ہیں۔ میں سچائی، خدمت اور اصول کو حقیقی دھرم سمجھتا ہوں۔ اشنان، دھیان، پوجا، برت دھرم کے معاون اسباب ہیں۔ دھرم نہیں۔"

سمرکانت نے منہ چڑا کر کہا۔ "ٹھیک کہتے ہو، بالکل ٹھیک۔ اب دنیا تم کو اپنا مرشد سمجھے گی۔ اگر تمھارے دھرم کے راستے پر چلتا تو آج میں بھی لنگوٹی لگائے گھومتا ہوتا۔ تم بھی یوں محل میں نہ بیٹھے ہوتے۔ چار حرف انگریزی پڑھ لی نہ، یہ اسی کی برکت ہے۔ لیکن میں ایسے لوگوں کو بھی جانتا ہوں جو انگریزی کے عالم ہوکر بھی دھرم کو نبھائے جاتے ہیں، صاف ڈیڑھ سو پھینک دیے۔"

امر نے جھنجلا کر کہا۔"آپ بار بار اس کا ذکر کیوں کرتے ہیں؟ میں چوری اور ڈاکے کے مال کی خرید و فروخت نہیں کرسکتا۔ کسی حالت میں بھی نہیں، مجھے ایسے روزگار سے نفرت ہے۔"

"تو میرے کاروبار میں ایسے اصولوں کی گنجائش نہیں۔ میں تو ایسا آدمی چاہتا ہوں جو موقع محل دیکھ کر، نفع نقصان کا لحاظ کرکے کام کرے۔"

"دھرم کو میں نفع نقصان کی ترازو میں نہیں تولتا۔"

اس احمقانہ دلیل اور کٹھ حجتی کا جواب ہی کیا ہوسکتا تھا۔ لالہ جی خون کا سا گھونٹ پی کر رہ گئے۔ اگر امر کی شادی نہ ہوگئی ہوتی تو اُسے آج دھرم کی توہین کرنے کا مزہ مل جاتا۔ بولے۔"بس تمھیں تو دنیا میں ایک دھرم کے ٹھیکدار رہ گئے ہو اور جتنے ہیں سب

بے دین ہیں۔ وہی مال جو تم نے اپنی حماقت سے اُوٹا دیا تمھارے کسی دوسرے بھائی نے دو چار روپے کم و بیش دے کر لے لیا ہوگا۔ اس نے تو روپے کمائے تم نیبو نون چاٹ کر رہ گئے۔ ڈیڑھ سو روپے اس وقت ہاتھ آتے ہیں جب ڈیڑھ سو تھان کپڑا یا ڈیڑھ سو بورے چینی کے بک جائیں۔ منہ کا لقمہ نہیں ہے۔"

امر اب بھی قائل نہ ہوا۔ یہ بھی نہ ہوتا تھا کہ خاموش ہی ہوجائے۔ خواہ مخواہ بات بڑھائے جاتا تھا۔ بولا۔ "دوسرے اگر اپنا ایمان بیچ کر روپیہ کما سکتے ہیں تو میں اُن پر رشک نہیں کرسکتا۔"

لالہ جی کو لڑکے کی جہالت پر غصّے کی جگہ رحم آگیا۔ جو بالکل نادان ہو اس پر غصہ کیا، بولے۔ "تو پھر کون سا روزگار کروگے؟ دنیا میں کون سا روزگار ہے جس میں تمھارے اصولوں کا خون نہ ہوتا ہو؟ لین دین، سود بٹہ، غلّہ، کپڑا، تیل، گھی سبھی روزگاروں میں داؤ پیچ ہیں۔ جو داؤ گھات سمجھتا ہے وہ نفع اُٹھاتا ہے جو نہیں سمجھتا اس کا دیوالہ پٹ جاتا ہے۔ مجھے کوئی ایسا روزگار بتا دے جس میں جھوٹ نہ بولنا پڑے۔ بے ایمانی نہ کرنی پڑے۔ اتنے بڑے بڑے حکام ہیں کون رشوت نہیں لیتا۔ ایک سیدھی سی نقل لینے جاؤ تو ایک روپیہ لگ جاتا ہے۔ بغیر روپیہ لیے تھانیدار رپٹ نہیں لکھتا۔ کون وکیل ہے جو جھوٹے گواہ نہیں بناتا؟ لیڈروں ہی میں کون ہے جو چندے کے روپے میں نوچ کھسوٹ نہ کرتا ہو، کون ہے جو دولت سے بے نیاز ہے؟"

امرکانت نے مایوسانہ انداز سے سر ہلا کر کہا۔ "اگر روزگار کا یہ حال ہے تو میں وہ نہیں کرنا چاہتا۔"

"تو پھر گرہستی کیسے چلے گی۔ کنوئیں میں پانی کی آمد نہ ہو تو لوگ پیاسے مرجائیں۔"

امرکانت نے اس بحث کو ختم کرنے کے ارادے سے کہا۔ "میں بھوکوں مرجاؤں گا لیکن اپنے ضمیر کا گلا نہ گھوٹوں گا۔"

"تو کیا مزدوری کروگے؟"

"مزدوری کرنا شرم کی بات نہیں۔"

سمرکانت نے ہتوڑے سے کام نہ چلتے دیکھ کر گھن چلایا۔ "شرم چاہے نہ ہو مگر تم

مزدوری کر نہیں سکتے۔ کہو لکھ دوں۔ منہ سے بک دینا آسان ہے کر دکھانا مشکل۔ چوٹی کا پسینہ ایڑی تک آتا ہے تب چار گنڈے پیسے ملتے ہیں۔ آپ مزدوری کریں گے ایک گھڑا پانی تو اپنے ہاتھوں کھینچا نہیں جاتا۔ چار پیسے کی بھاجی لینی ہوتی ہے تو نوکر لے کر چلتے ہیں۔ یہ مزدوری کریں گے۔ اپنی تقدیر کو سراہو کہ میں نے کما کر رکھ دیا۔ تمھارا کیا کچھ نہ ہوگا۔ تمھاری ان باتوں سے ایسا جی جلتا ہے کہ اپنا سارا اثاثہ کسی مندر کے لیے وقف کردوں، پھر دیکھوں تمھارا ضمیر کدھر جاتا ہے۔"

امرکانت پر اس چوٹ کا بھی کوئی اثر نہ ہوا۔ "آپ شوق سے اپنی جائداد وقف کردیں۔ میرا مطلق فکر نہ کریں۔ جس دن آپ کا یہ مقدّس ارادہ پورا ہوگا وہ میری زندگی کا سب سے مبارک دن ہوگا۔ میں ہوس کی قید سے آزاد ہوجاؤں گا۔ جب تک میں اس قید میں پڑا رہوں گا۔ میری روح کی نجات نہ ہوگی۔"

سمرکانت کے پاس اب کوئی آلہ نہ تھا۔ ایک لمحے کے لیے غصّے نے ان کی عقل سلیم کو سلب کردیا بولے۔ "کیوں اس قید میں پڑے ہو، کیوں اپنی روح کو آزاد نہیں کرتے۔ مہاتما ہی ہوجاؤ۔ کچھ کر کے دکھاؤ تو جس چیز کی تم قدر نہیں کرسکتے اسے میں تمھارے گلے نہیں منڈھنا چاہتا۔"

یہ کہتے ہوئے وہ ٹھاکر دوارے میں چلے گئے۔ جہاں اس وقت آرتی کا گھنٹہ بج رہا تھا۔ امر اس للکار کا جواب نہ دے سکا۔ منہ سے الفاظ ہی باہر نہ نکل سکے۔ اس کے دل میں پھوڑے کی طرح ٹیس ہونے لگی۔ آپ مجھ پر اپنی ثروت کی دھونس جمانے چلے ہیں۔ سرقے کا مال بیچ کر، جواریوں کو چار آنے سود پر روپے دے کر، غریب مزدور اور کسانوں کو فریب کا شکار بناکر تو روپے جمع کیے ہیں اس پر آپ کو اتنا غرور ہے۔ خدا نہ کرے کہ میں اس دولت کا شکار بنوں۔ وہ انھیں اشتعال انگیز خیالات میں ڈوبا بیٹھا تھا کہ نینا نے آکر کہا۔ "دادا بگڑ رہے تھے کیا؟"

امرکانت کی سنسان زندگی میں نینا ہی محبت اور تشفی کی صدائے شیریں تھی۔ اپنا درد و غم، اپنی ہار جیت، اپنی آرزوئیں اور تمنائیں وہ اسی سے بیان کرتا تھا۔ اگرچہ اب سکھدا سے اتنی بے گانگی نہ تھی۔ نہیں، اسے اب اس سے کچھ محبت بھی ہوگئی تھی۔ مگر نینا اس سے اب بھی قریب تر تھی۔ سکھدا اور نینا دونوں اس کے دل کے دو ساحل تھے۔ سکھدا

اونچی، ناہموار اور قریب۔ ہوا کے ہلکے جھونکے پا کر بھی موجیں اس کی تہہ تک پہنچ جاتی تھیں۔

امر اپنے دردِ دل کو تبسم کی آڑ میں چھپاتا ہوا بولا۔ ''کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہی پُرانا قصہ تھا۔ دادا نے تو آج مجھ سے صاف صاف کہہ دیا، تم اپنے لیے کوئی راہ نکال لو۔ اور میں بھی سوچتا ہوں کہ اب مجھے کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔ یہ روز روز کا فضیحتا نہیں سہا جاتا۔ میں کوئی حرکت کروں تو انھیں مجھے تنبیہہ کرنے کا اختیار ہے۔ لیکن اصول کے معاملے میں بے جا دباؤ نہیں مان سکتا۔''

نینا نے اس وقت میٹھی پکوڑیاں اور کھٹی پکوڑیاں اور خدا جانے کیا کیا چیزیں پکا رکھی تھیں۔ اس کی طبیعت ان چیزوں کو کھلانے اور کھانے کی مسرّت کا مزہ لے رہی تھی۔ امر و نہی کے جھگڑے اسے فضول سے معلوم ہوئے۔ بولی۔ ''پہلے چل کر پکوڑیاں تو کھا لو۔ پھر اس مسئلے پر صلاح و مشورہ ہوگا۔''

امر نے بے دلی سے کہا۔ ''مجھے تو اس وقت بالکل بھوک نہیں ہے۔ لات ماری ہوئی روٹیاں حلق کے نیچے نہ اُتریں گی۔ دادا نے آج فیصلہ کردیا ہے۔''

''اب تمھاری یہی بات مجھے اچھی نہیں لگتی .... آج کی سی مزے دار پکوڑیاں تم نے کبھی نہ کھائی ہوں گی۔ تم نہ کھاؤ گے تو میں بھی نہ کھاؤں گی۔''

نینا کی اس دھمکی نے امر کے انکار کو کئی قدم پیچھے ڈھکیل دیا۔ ''تو مجھے بہت تکلیف دیتی ہے نینا، سچ کہتا ہوں مجھے بالکل بھوک نہیں ہے۔''

''چل کر تھال پر بیٹھو تو پکوڑیاں دیکھتے ہی ٹوٹ نہ پڑو تو کہنا۔''

''تو جا کر کھا کیوں نہیں لیتی۔ میں ایک دن نہ کھانے سے مر تو نہ جاؤں گا۔''

''تو کیا ایک دن نہ کھانے سے میں مر جاؤں گی۔ میں تو نرجل شیوراتری برت رکھتی ہوں۔ تم نے تو کبھی برت بھی نہیں رکھا۔''

امر میں نینا کی محبت آمیز اصرار کو رد کرنے کی طاقت نہ تھی۔

لالہ سمرکانت رات کا کھانا نہیں کھاتے تھے۔ اس لیے بھائی، بھاوج، بہن ساتھ ہی کھا لیا کرتے تھے۔ امر آنگن میں پہنچا تو نینا نے بھابی کو بلایا۔ سکھدا نے اوپر ہی سے کہا۔ ''مجھے بھوک نہیں ہے۔''

منانے کا بار امرکانت کے سر پڑا۔ دبے پاؤں اوپر گیا۔ جی میں ڈر رہا تھا کہ آج معاملہ طول کھینچے گا۔ مگر اس کے ساتھ ہی اس کا ارادہ مستقل تھا کہ اس مسئلے پر وہ کبھی نہ دبے گا۔ یہ ایسا اہم معاملہ تھا جس پر کسی طرح کا سمجھوتا غیر ممکن تھا۔

امرکانت کی آہٹ پاتے ہی سکھدا سنبھل بیٹھی۔ اس کے زرد چہرے پر ایسی دردناک التجا جھلک رہی تھی کہ ایک لمحے کے لیے امرکانت کا دل کمزور ہوگیا۔

اس نے سکھدا کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "چلو کھانا کھالو۔ آج تو بہت دیر ہوگئی۔"

"کھانا پیچھے کھاؤں گی پہلے تم سے ایک بات کا فیصلہ کرنا ہے۔ تم آج پھر دادا جی سے اُلجھ پڑے؟"

"میں اُلجھ پڑا، یا انھوں نے مجھے سخت سُست کہنا شروع کردیا۔"

"تو انھیں اس کا موقع کیوں دیتے ہو۔ میں مانتی ہوں کہ ان کا طرزِ عمل تمھیں پسند نہیں۔ میں بھی اس کی تائید نہیں کرتی۔ لیکن اب اس عمر میں تم انھیں کسی نئے راستے پر نہیں ڈال سکتے۔ آخر ان کا بھی تو وہی راستہ ہے جس پر ساری دنیا چل رہی ہے۔ تمھارا فرض ہے تا حدِ امکان ان کی مدد کرنا۔ جب وہ نہ رہیں گے اس وقت اپنے معیاروں یا اصولوں کی پابندی کرنا، تب کوئی تمھارا ہاتھ نہ پکڑے گا۔ اس وقت تمھیں اپنے اصولوں کے خلاف بھی عمل کرنا پڑے تو بُرا نہ ماننا چاہیے۔ انھیں کم سے کم اتنا اطمینان تو دلا دو کہ ان کے بعد تم ان کی کمائی کو برباد نہ کروگے۔ میں آج تم دونوں آدمیوں کی باتیں سُن رہی تھی۔ مجھے تو تمھاری زیادتی معلوم ہوتی تھی۔"

امرکانت اِن دنوں کوئی ایسا کام نہ کرنا چاہتا تھا جو سکھدا کے لیے تشویش کا باعث ہو۔ لیکن معاملہ ایسا آپڑا تھا کہ اسے اپنی صفائی پیش کرنے کی ضرورت تھی۔ بولا۔ "انھوں نے آج مجھ سے صاف صاف کہہ دیا تم اپنی فکر کرو۔ انھیں اپنی دولت مجھ سے زیادہ پیاری ہے۔"

یہی کانٹا تھا جو امر کے دل میں چبھ رہا تھا۔

سکھدا کے پاس جواب تیار تھا۔ "تمھیں بھی اپنا اصول اپنے باپ سے زیادہ پیارا ہے۔ انھیں تو میں کچھ نہیں کہتی۔ اب ساٹھ برس کی عمر میں ان کی اصلاح نہیں کی جاسکتی۔ کم سے کم تم کو یہ حق نہیں ہے۔ تم کو روپے کاٹتے ہیں۔ لیکن اولوالعزم اور جوان ہمت

آدمیوں نے ہمیشہ لکشمی کی پوجا کی ہے۔ دنیا کا اہلِ ہمّت نے ہی لطف اٹھایا ہے اور ہمیشہ اٹھائیں گے۔ ترک خانہ داروں کے لیے نہیں۔ بلکہ گوشہ نشینوں کے لیے ہے۔ اگر تمھیں ترک و قناعت کی زندگی پسند تھی تو شادی کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ سر منڈا کر کسی سادھو سنت کے چیلے بن جاتے تب میں تم سے کچھ نہ کہنے آتی۔ اب اوکھلی میں سر ڈال کر موسلوں سے نہیں بچ سکتے۔ خانہ داری کے چرخے میں پڑ کر بڑے بڑوں کو اپنے اصولوں کا خون کرنا پڑتا ہے۔ تم کس شمار میں ہو۔"

امر نے اس تلقین کا جواب دینے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ ایسی دلیلوں پر سنجیدگی سے غور ہی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ بولا۔ "تو تمھاری صلاح ہے کہ سنیاسی ہوجاؤں۔"

سکھدا چڑ گئی۔ اپنی دلیلوں کی یہ تحقیر برداشت نہ کرسکی۔ بولی۔ "بے غیرتوں کو اس کے سوا سوجھ ہی کیا سکتا ہے۔ دولت پیدا کرنا آسان نہیں ہے۔ روزگاریوں کی سی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑے تو سارا سنیاس بھول جائے۔ کسی بھلے آدمی کے دروازے پر جاکر بھیک مانگنے کے لیے علم، عقل، ہمّت، تجربہ کسی چیزی کی ضرورت نہیں۔ دولت پیدا کرنے کے لیے خون جلانا پڑتا ہے، گوشت گھلانا پڑتا ہے۔ دماغ لڑانا پڑتا ہے۔ آسان کام نہیں ہے۔ دولت کہیں پڑی نہیں ہے کہ جو چاہے بٹور لائے۔"

امرکانت نے اسی ظریفانہ انداز سے کہا۔ "میں تو دادا کو گدی پر بیٹھے رہنے کے سوا اور کچھ کرتے نہیں دیکھتا۔ اور بھی جو بڑے بڑے سیٹھ ساہوکار ہیں انھیں بھی پھول کر کپّا ہوتے ہی دیکھا ہے۔ اس سے تو یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہاں خون جلانا پڑتا ہے۔ خون اور گوشت تو مزدور جلاتے ہیں۔"

سکھدا نے کچھ جواب نہ دیا۔ ایسی موٹی عقل کے آدمی سے بکواس کرنا بے سود تھا۔

نینا نے پکارا۔ "تم کیا کرنے لگے بھیا! آتے کیوں نہیں پکوڑیاں ٹھنڈی ہوئی جاتی ہیں۔"

سکھدا نے کہا۔ "تم جاکر کھا کیوں نہیں لیتے۔ بے چاری دن بھر پریشان ہوئی ہے۔"

"میں تو جب ہی کھاؤں گا جب تم بھی چلو۔"

"وعدہ کرو کہ پھر دادا سے لڑائی نہ کروگے۔"

امر نے متین لہجے میں کہا۔ "سکھدا میں تم سے سچ کہتا ہوں۔ میں نے اس لڑائی سے

بچنے کے لیے کوئی بات اُٹھا نہیں رکھی۔ ان دو برسوں میں کتنا بڑا انقلاب ہو گیا ہے اس پر مجھے خود حیرت ہوتی ہے۔ مجھے جن جن باتوں سے نفرت تھی وہ سب میں نے قبول کرلیں۔ اب اس حد پر پہنچ گیا ہوں کہ جو بھر بھی آگے بڑھا تو میں اس غار میں جا گروں گا جس کی کوئی تھاہ نہیں ہے۔ اس جہنم کی طرف مجھے مت ڈھکیلو۔"

اس گفتگو میں سکھدا ہی پر الزام آتا تھا اسے وہ کیسے برداشت کرتی بولی۔ "اس کا تو یہ منشاء ہے کہ میں تمھاری بدخواہ ہوں۔ اگر تمھارے خیال میں اتنی تنگ نظر ہوں تو تمھیں اس سے بہت پہلے مجھے زہر دے دینا چاہئے تھا۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ میں آرام و آسائش کی لونڈی ہوں اور محض اپنی غرض کے لیے تمھیں سمجھا رہی ہوں تو میرے ساتھ بڑی بے انصافی کر رہے ہو۔ میں تم کو بتا دینا چاہتی ہوں کہ عیش پسند سکھدا موقع پڑنے پر جتنی تکلیفیں جھیلنے کی صلاحیت رکھتی ہے ان کا تم اندازہ نہیں کرسکتے۔ ایشور وہ دن نہ لائے کہ میں تمھاری تباہی کا باعث بنوں لیکن جلنے کے لیے خود اپنی چتا بنانا مجھے منظور نہیں۔ میں جانتی ہوں کہ تھوڑی سی عقل سے کام لے کر تم اپنے اصولوں کی تعمیل اور فرض کی پابندی بھی کرسکتے ہو۔ دادا پڑھے لکھے آدمی ہیں، دنیا دیکھ چکے ہیں۔ اگر تمھاری زندگی میں کچھ صداقت ہے تو اس کا ان پر یقیناً اثر پڑے گا۔ آئے دن کی ان نصیحتوں سے تم انھیں اور بھی سخت بنائے دیتے ہو۔ بچے بھی تو مار سے ضدی ہو جاتے ہیں۔ بوڑھوں کی طبیعت بھی کچھ بچوں کی ہی سی ہوتی ہے۔ بچوں کی طرح بوڑھوں کی بھی تم اپنی خدمت اور اطاعت سے اپنا بنا سکتے ہو۔"

امر نے پوچھا۔ "چوری کا مال خریدا کروں؟"

"کبھی نہیں۔"

"لڑائی تو اسی بات پر ہوئی۔"

"تم اس آدمی سے کہہ سکتے تھے کہ دادا آجائیں تب لانا۔"

"نینا پکار رہی ہے۔"

"میں تو جب ہی چلوں گی جب تم وعدہ کروگے۔"

امر نے شش و پنج میں پڑکر کہا۔ "تمھاری خاطر سے کہو وعدہ کرلوں لیکن میں اسے پورا نہیں کرسکتا۔ یہی ہو سکتا ہے کہ میں گھر کی کسی بات سے سروکار نہ رکھوں۔"

سکھدا بولی۔ "یہ اس سے کہیں اچھا ہے کہ روز گھر میں جنگ چھڑی رہے جب تک اس گھر میں ہو تمھیں اس گھر کے نفع نقصان کا لحاظ کرنا پڑے گا۔"

امر نے خودداری کی شان سے کہا۔ "میں آج اس گھر کو چھوڑ سکتا ہوں۔"

سکھدا نے بم سا پھینکا۔ "اور میں!"

امر سکتے میں آکر سکھدا کا منہ تکنے لگا۔

سکھدا نے اسی انداز سے کہا۔ "میرا اس گھر سے تعلق تمھارے رشتے سے ہے جب تم اس گھر میں نہ رہو گے تو میرے لیے اس گھر میں کیا رکھا ہے۔ جہاں تم رہو گے وہیں میں بھی رہوں گی۔"

امر نے پس و پیش کے ساتھ کہا۔ "تم اپنی ماں کے ساتھ رہ سکتی ہو۔"

"ماں کے ساتھ کیسے رہوں۔ میں کسی کی دست نگر بن کر نہیں رہ سکتی۔ میرا دکھ سکھ تمھارے ساتھ ہے۔ جس طرح رکھو گے، اسی طرح رہوں گی۔ میں دیکھوں گی تم اپنے اصولوں کے کتنے پکے ہو۔ میں عہد کرتی ہوں کہ تم سے کچھ نہ مانگوں گی۔ تمھیں میرے باعث کچھ تکلیف نہ اٹھانی پڑے گی۔ میں خود بھی کچھ کما سکتی ہوں۔ تھوڑے میں گزر کرلیں گے۔ بہت ملے گا تو پوچھنا ہی کیا۔ جب ایک دن ہمیں اپنی جھونپڑی بنانی ہے تو کیوں نہ ابھی سے ہاتھ لگا دیں۔ تم کنویں سے پانی لانا میں چوکا برتن کرلوں گی۔ کوئی دھونس تو نہ جمائے گا۔"

امرکانت لاجواب ہوگیا۔ اسے اپنے متعلق تو کوئی اندیشہ نہ تھا لیکن سکھدا پر وہ یہ ستم کیسے کرتا۔ خفیف ہوکر بولا۔ "وہ وقت ابھی نہیں آیا ہے۔ سکھدا۔"

سکھدا نے زخم پر نمک چھڑکا۔ "ڈرتے ہو گے کہ اپنے نصیبوں کو روئے گی۔ کیوں؟"

امرکانت نے زچ ہوکر کہا۔ "اس کا تو مجھے گمان بھی نہ تھا۔"

"کیوں جھوٹ بولتے ہو، تمھارے دل میں یہی شبہ ہے اور تم اس سے بڑی بے انصافی میرے ساتھ نہیں کرسکتے۔ قربانی یا اصولوں کی حمایت کے لیے عورتیں کبھی مردوں سے پیچھے نہیں رہیں۔ تم مجھے مجبور کررہے ہو کہ اور کچھ نہ ہو تو اس الزام سے بچنے ہی کے لیے میں دادا سے الگ رہنے کی اجازت مانگوں۔"

امر شرمندہ ہوکر بولا۔ "مجھے معاف کرو سکھدا! میں وعدہ کرتا ہوں کہ دادا کو کبھی شکایت کا موقع نہ دوں گا۔"

اس لیے کہ تمھیں میرے متعلق اندیشہ ہے۔"

"نہیں، محض اس لیے کہ مجھ میں ابھی اتنی قوت نہیں۔"

اسی وقت نینا آکر دونوں کو پکوڑیاں کھلانے کے لیے گھسیٹ لے گئی۔ سکھدا خوش تھی اس نے آج معرکے کی فتح پائی تھی۔ امرکانت شرمندہ تھا۔ اس کے فرض اور اصول کی آج آزمائش ہوگئی تھی اور اسے اپنی کمزوری کا علم ہوگیا تھا۔ اونٹ پہاڑ کے نیچے آکر اپنی اونچائی دیکھ چکا تھا۔

(۹)

امرکانت کو زندگی کی حقیقتوں کا تجربہ ہو رہا تھا۔ وہ ایک لفظ بھی ایسا منہ سے نہ نکالتا۔ جس سے سکھدا کو صدمہ پہنچے کیوں کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ اس کی مرضی کے خلاف وہ چھوٹی سے چھوٹی بات بھی نہیں کہنا چاہتا۔ اسے اچھی اچھی کتابیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں۔ رامائن، مہابھارت اور گیتا سے اب امر کو خاص عقیدت ہوگئی ہے۔ کیونکہ سکھدا ماں بننے والی ہے۔ بچے میں -تو وہ صفات کیسے پیدا ہوں۔ اس کا ہمیشہ دھیان رہتا ہے۔ سکھدا کو خوش رکھنے کے لیے کوئی بات اُٹھا نہیں رکھی جاتی۔ اسے تھیٹر، سینما اور تماشے دکھانے میں اب امر کو تامل نہیں ہوتا کبھی پھولوں کے گجرے آتے ہیں۔ کبھی تفریح کے دوسرے سامان۔ وہ صبح و شام دُکان پر بھی آبیٹھتا ہے۔ عام جلسوں سے اسے اب اتنی رغبت نہیں ہے۔ وہ بیٹے کا باپ بننے والا ہے۔ اس تخیّل سے اسے کبھی کبھی ایسا سرور ہوتا ہے۔ دل میں ایک ایسا ولولہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ تنہائی میں کرشن کی تصویر کے سامنے فرق نیاز خم کرلیتا ہے۔ سکھدا تپ کر رہی ہے اور امر اپنے کو نئی ذمےّداریوں کے لیے تیار کر رہا ہے۔ اب تک وہ ہموار زمین پر تھا۔ بہت سنبھل کر چلنے کی اتنی ضرورت نہ تھی۔ اب وہ بامِ رفعت پر جا پہنچا ہے وہاں بہت سنبھل کر پاؤں رکھنا پڑے گا۔

لالہ سمرکانت بھی آج کل بہت خوش نظر آتے ہیں۔ بیسوں مرتبہ اندر جاکر سکھدا کی مزاج پُرسی کر آتے ہیں۔ امر پر بھی ان کی نظرِ کرم ہے۔ اس کی معیار پروری کو وہ اتنا قابلِ اعتراض نہیں سمجھتے۔ ایک دن کالے خاں کو انھوں نے دُکان سے کھڑے کھڑے نکال

دیا۔ آسامیوں پر اب وہ زیادہ سختی نہیں کرتے۔ زیادہ استغاثے نہیں دائر کرتے۔ ان کا مستقبل اب روشن ہو گیا ہے۔ ایک دن راما سے انھوں نے امرکانت کی سعادت مندی اور حق پسندی کی دل کھول کر تعریف کی۔

راما اتنی خوش نہ تھی۔ وضع حمل کی تکلیفوں کا خیال کر کے وہ گھبرا اُٹھتی تھیں۔ بولی۔ ''لالہ جی میں ایشور سے یہی مناتی ہوں کہ جب یہ دن دکھایا ہے تو بیچ میں رُلا مت دینا۔ پہلونٹی میں بڑا خدشہ رہتا ہے۔ یوں کہیے کہ عورت کا دوسرا جنم ہوتا ہے۔''

سمرکانت کو ایسا کوئی اندیشہ نہ تھا بولے۔ ''میں نے تو بچے کا نام طے کر لیا ہے۔ ''راما کانت'' راما سہم کر بولی۔''ابھی نام وام نہ رکھیے لالہ جی۔ اس مصیبت سے نجات ہو جائے تو نام طے ہو جائے گا۔ میں تو سوچتی ہوں کہ دُرگا پاٹ بٹھا دیجیے۔ اس محلے میں ایک دائی رہتی ہے۔ اُسے ابھی سے رکھ لیا جائے تو اچھا ہو۔ سکھدا ابھی نادان ہے۔ کچھ سمجھتی ہی نہیں۔ دائی اسے سنبھالتی رہے گی۔''

لالہ جی نے اس تجویز کو خوشی سے منظور کر لیا۔ یہاں سے جب لوٹے تو دیکھا دُکان پر دو گورے اور ایک میم بیٹھے ہوئے ہیں اور امرکانت ان سے باتیں کر رہا ہے۔ کبھی کبھی ادنیٰ درجے کے گورے یہاں اپنی چیزیں بیچنے یا گرو رکھنے کے لیے آجاتے تھے۔ سمرکانت انھیں اُسترے سے مونڈتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ یہ لوگ بدنامی کے خوف سے کسی دوسری دُکان پر نہ جائیں گے۔ انھوں نے جاتے ہی جاتے امرکانت کو ہٹا دیا۔ اور خود سودا پٹانے لگے۔ امرکانت صاف گو تھا اور یہ صاف گوئی کا موقع نہ تھا۔ میم صاحب کو سلام کر کے پوچھا۔ ''کہیے، کیا حکم ہے؟''

تینوں شراب کے نشے میں چور تھے۔ میم نے سونے کی ایک زنجیر نکال کر کہا۔ ''سیٹھ جی ہم اس کو بیچنا چاہتا ہے، بابا بہت بیمار ہے۔ اس کی دوائی میں بہت خرچ ہو گیا۔''

سمرکانت نے ہاتھ میں زنجیر لے کر دیکھا اور تولتے ہوئے بولے۔ ''اس کا سونا اچھا نہیں ہے۔ میم صاحب آپ نے کہاں بنوایا تھا؟''

میم ہنس کر بولی۔''اوتم برابر یہی بات کہتا ہے۔ سونا بہت اچھا ہے۔ انگریزی دُکان کا بنا ہوا ہے۔''

سمرکانت نے بے اعتنائی کے انداز سے کہا۔ ''بڑی بڑی دُکانیں ہی تو گاہکوں کو لوٹتی

ہیں۔ جو کپڑا یہاں چھ آنے گز ملے گا وہی انگریزی دُکان پر بارہ آنے گز سے کم نہ ملے گا۔ میں تو اس کے دام دس روپے تولے سے زیادہ نہیں دے سکتا۔"

"اور کچھ نہیں دے گا؟"

"اور کچھ نہیں، یہ بھی آپ کے خاطر ہے۔"

یہ گورے اس طبقے کے تھے جو اپنے ضمیر کو شراب اور جوئے کے ہاتھوں بیچ دیتے ہیں۔ بے ٹکٹ فسٹ کلاس میں سفر کرتے ہیں۔ ہوٹل والوں کو چرکا دے کر اُڑ جاتے ہیں۔ جب کچھ بس نہیں چلتا تو بگڑے ہوئے شریف بن کر بھیک مانگتے ہیں۔ تینوں نے آپس میں صلاح کی اور زنجیر بیچ ڈالی۔ روپے لے کر دُکان سے اُترے اور تانگے پر بیٹھے ہی تھے کہ ایک بھکارن تانگے کے پاس آکر کھڑی ہوگئی۔ تینوں گورے روپے پانے کی خوشی میں پھولے ہوئے تھے اسی وقت بھکارن نے چُھری نکال کر ایک گورے پر وار کیا۔ چھری اس کے منہ پر آ رہی تھی۔ اس نے گھبرا کر منہ پیچھے ہٹایا تو چھاتی میں چُبھ گئی۔ وہ تانگے پر ہی ہائے ہائے کرنے لگا۔ باقی دونوں گورے تانگے پر سے اُتر پڑے۔ عورت تو دُکان پر چڑھ گئی۔ مرد نے بھکارن کے ہاتھ سے چھری چھین لینے کی کوشش کی۔ بھکارن نے چھری اس کی پسلی میں چبھا دی، وہ زمین پر گر پڑا۔ تب بھکارن لپک کر دُکان پر چڑھ گئی۔ اور میم پر جھپٹی کہ امرکانت ہاں ہاں کر کے اس کی چھری چھین لینے کو دوڑا۔ بھکارن نے اسے دیکھ کر چھری پھینک دی اور دُکان کے نیچے کود کر کھڑی ہوگئی۔ سارے بازار میں ہل چل پڑ گئی۔ خبر اُڑی کہ ایک گورے نے کئی آدمیوں کو مار ڈالا۔ لالہ سمرکانت مار ڈالے گئے۔ امرکانت کو بھی چوٹ آئی ہے۔ ایسی حالت میں کسے اپنی جان بھاری تھی جو وہاں آتا۔ فوجی گورے بدمعاش ہوتے ہی ہیں۔ ان کا کیا اعتبار۔ لوگ دُکانیں بند کر کے بھاگنے لگے۔

دونوں گورے زمین پر پڑے تڑپ رہے تھے۔ اوپر میم کھڑی تھی، اور لالہ سمرکانت بیٹے کا ہاتھ پکڑ کر اندر گھسیٹ لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ بھکارن بھی سر جھکائے بت بنی کھڑی تھی۔ ایسی بھولی بھالی جیسے کچھ کیا ہی نہیں ہے۔

وہ بھاگ سکتی تھی۔ کوئی اس کا پیچھا نہ کر سکتا تھا۔ مگر وہ بھاگی نہیں۔ وہ خودکشی کر سکتی تھی۔ اس کی چھری اب بھی زمین پر پڑی ہوئی تھی مگر اس نے خودکشی بھی نہ کی۔ وہ تو کچھ اِس انداز سے کھڑی تھی گویا نگاہِ حیرت سے یہ کیفیت دیکھ رہی ہو۔

آس پاس کے کئی دُکان دار جمع ہوگئے۔ پولیس کے دو جوان بھی آپہنچے۔ ایک مجمع جمع ہوگیا۔ چاروں طرف سے آوازیں آنے لگیں "یہی عورت ہے" پولیس والوں نے اسے گرفتار کرلیا۔

ایک دس منٹ میں سارا شہر اور سارے حکام موقع واردات پر جمع ہوگئے۔ سرخ پگڑیوں کا ایک دریا اُمڈا ہوا تھا۔ سول سرجن نے آکر زخمیوں کو اُٹھایا اور اسپتال لے چلے۔ ادھر تحقیقات ہونے لگی۔ بھکارن نے اپنے جرم کا اقبال کرلیا۔

پولیس سپرنٹنڈنٹ نے پوچھا۔ "ان آدمیوں سے تیری کیا عداوت تھی۔" بھکارن نے کوئی جواب نہ دیا۔ سینکڑوں آوازیں آئیں۔ "بولتی کیوں نہیں ہتیارنی؟"

بھکارن نے خودداری کی شان سے کہا۔ "میں ہتیارنی نہیں ہوں۔"

"ان صاحبوں کو تم نے نہیں مارا؟"

"ہاں میں نے مارا مگر ہتیارنی نہیں ہوں۔ چھ مہینے ہوئے ایسے تین آدمیوں نے میری آبرو برباد کردی تھی۔ تب سے میں اپنے گھر نہیں گئی۔ کسی کو اپنی صورت تک نہیں دکھائی۔ مجھے ہوش نہیں کہ میں کہاں کہاں رہی۔ کیا کیا جھیلا اور کیا کیا کیا۔ اس وقت بھی مجھے تب ہوش آیا جب میں ان دونوں گوروں کو گھائل کرچکی۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ میں نے کیا کرڈالا۔ میں بہت غریب ہوں۔ میں یہ نہیں کہہ سکتی کہ مجھے چُھری کس نے دی اور مجھ میں اتنی ہمّت کہاں سے آئی۔ یہ میں اس لیے نہیں کہہ رہی ہوں کہ پھانسی سے ڈرتی ہوں۔ میں تو بھگوان سے مناتی ہوں کہ جتنی جلدی ہوسکے مجھے اس سنسار سے اُٹھا لے۔ جب آبرو لُٹ گئی تو جینا کس کام کا ہے۔"

اس تقریر نے مجمع کا رنگ بدل دیا۔ پولیس نے جن جن شہادتوں کے بیان لیے سب نے یہی کہا۔ "یہ پگلی ہے۔ ادھر اُدھر ماری ماری پھرتی تھی۔ کچھ کھانے کو دیا جاتا تھا تو کُتّوں کے آگے ڈال دیتی تھی۔ پیسے دیے جاتے تو پھینک دیتی تھی۔"

ایک تانگے والے نے بیان دیا۔ "یہ بیچ سڑک پر بیٹھی ہوئی تھی۔ کتنی ہی گھنٹی بجائی مگر راستے سے ہٹی نہیں۔ میں مجبور ہوکر پٹری سے تانگا نکال لے گیا۔"

ایک پان والے نے کہا۔ "ایک دن میری دُکان پر آکر کھڑی ہوگئی۔ میں نے ایک بیڑا دیا۔ اسے زمین پر ڈال کر پیروں سے کچلنے لگی۔ پھر گاتی ہوئی چلی گئی۔"

امرکانت کا بیان بھی ہوا۔ لالہ جی تو چاہتے تھے کہ وہ اس قضیے میں نہ پڑے۔ لیکن امرکانت اتنا غضب ناک ہو رہا تھا کہ انھیں دوبارہ کچھ کہنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ امر نے سارا واقعہ کہہ سُنایا۔ رنگ کو اور شوخ کرنے کے لیے کچھ اپنی طرف سے آمیزش کردی۔

پولیس کے افسر نے پوچھا۔ "تم کہہ سکتے ہو کہ یہ عورت پاگل ہے۔"

امرکانت بولا۔ "جی ہاں بالکل پاگل! بیسیوں بار اُسے آپ ہی آپ روتے اور ہنستے دیکھا ہے۔ کوئی پوچھتا تھا تو بھاگ جاتی تھی۔"

یہ سب جھوٹ تھا۔ اس دن کے بعد آج یہ عورت پہلی بار نظر آئی تھی۔

جب پولیس پگلی کو لے کر چلی تو دو ہزار آدمی تھانے تک اس کے ساتھ گئے۔ اب وہ عوام کی نظروں میں معمولی عورت نہ تھی۔ شہادت کے درجے تک پہنچ گئی تھی۔ کسی غیبی طاقت کے بغیر اس میں اتنی ہمّت کہاں سے آجاتی۔ رات بھر شہر کے مختلف حصّوں سے آآکر لوگ اس موقع کا معائنہ کرتے رہے۔ دو چار آدمی اس سانحہ کی تشریح کرنے میں خاص دلچسپی کا اظہار کر رہے تھے۔ یوں تانگے کے پاس آکر کھڑی ہوگئی۔ یوں چُھری نکالی۔ یوں جھپٹی، بھیّا امرکانت نہ آجائیں تو میم کا بھی خاتمہ کردے۔ اس وقت اس کی آنکھوں سے سرخ انگارے نکل رہے تھے۔ چہرہ شعلے کی طرح دہک رہا تھا۔

امرکانت اندر گیا تو دیکھا نینا بھاوج کا ہاتھ پکڑے سہمی کھڑی ہے اور سکھدا آنکھوں میں آنسو بھرے رقّت کے عالم میں منتظر آنکھوں سے دروازے کی طرف تاک رہی تھی۔ امر کو دیکھتے ہی اس نے پوچھا۔ "یہ وہی عورت تھی نہ؟"

"ہاں وہی تو معلوم ہوتی ہے۔"

"تو اب اسے پھانسی ہوجائے گی؟"

"شاید بچ جائے لیکن امید کم ہے۔"

"اگر اسے پھانسی ہوگئی تو میں سمجھوں گی، دنیا سے انصاف اُٹھ گیا۔ اس نے کوئی جرم نہیں کیا۔ جن بدذاتوں نے اس پر اتنا بڑا ستم کیا۔ انھیں یہی سزا ملنی چاہیے تھی۔ میں اگر عدالت کی کرسی پر ہوتی تو اسے بے داغ چھوڑ دیتی۔ ایسی دیبی کی تو پوجا کرنی چاہیے۔ اس نے اپنی ساری بہنوں کا سر اونچا کردیا۔"

امرکانت نے کہا۔ "لیکن یہ تو کوئی انصاف نہیں ہے کہ کام کوئی کرے اور سزا کوئی

پائے۔ یہ وہ گورے نہیں ہیں۔"

سکھدا نے جوش میں آکر کہا۔ "وہ سب ایک ہیں۔ جس قوم میں ایسے شیطان ہوں اس کا ستارہ ڈوبا سمجھو۔ قوم میں ایک آدمی کوئی برائی کرتا ہے تو ساری قوم بدنام ہوجاتی ہے اس کی سزا بھی تو ساری قوم کو ملنی چاہیے۔ ایک گوری عورت کو سرحد کا کوئی پٹھان لے گیا تھا۔ سرکار نے اس کا بدلہ لینے کے لیے سرحد پر حملے کی تیاری کردی تھی۔ مجرم کون ہے کسی نے پوچھا تک نہیں۔ سرکار کی نظر میں سارے صوبے پر الزام عائد ہوتا تھا۔ اس بھکارن کا کوئی محافظ نہ تھا۔ اس لیے خود اسے اپنی آبرو کا بدلہ لینا پڑا۔ تم جاکر وکیلوں سے مشورہ لو۔ پھانسی نہ ہونے پائے۔ چاہے کتنے ہی روپے خرچ ہوں۔ میں تو کہتی ہوں وکیلوں کو اس مقدمے کی پیروی مفت کرنی چاہیے۔ ایسے معاملے میں بھی اگر کوئی وکیل محنتانہ مانگے تو میں سمجھوں گی وہ انسان نہیں ہے۔ تم اپنی سبھا میں آج جلسہ کرکے چندہ جمع کرنا شروع کردو۔ میں اس حالت میں بھی اسی شہر سے ہزاروں روپے جمع کرسکتی ہوں۔ ایسی کون عورت ہے جو اس کے لیے نہیں کردے۔"

امرکانت نے اس کا غصہ فرو کرنے کے ارادے سے کہا۔ "جو کچھ تم چاہتی ہو وہ سب ہوجائے گا۔ نتیجہ کچھ بھی ہو مگر ہم اپنی طرف سے کوئی بات اُٹھا نہ رکھیں گے۔ میں ذرا پروفیسر شانتی کمار کے پاس جاتا ہوں۔ تم جاکر آرام سے لیٹو۔"

"میں بھی اماں کے پاس جاؤں گی۔ تم مجھے ادھر چھوڑ کے چلے جانا۔"

امرکانت نے التجا کی۔"تم جاکر آرام سے لیٹو۔ میں اماں سے ملتا آؤں گا۔"

سکھدا نے چڑ کر کہا۔ "یہ کیفیت آنکھوں سے دیکھ کر جو لیٹے اسے میں بے جان کہتی ہوں۔ اس دیوی کے لیے تو اگر مجھے جان بھی دینی پڑے تو دریغ نہ کروں۔ اماں سے جو میں کہوں گی وہ تم نہیں کہہ سکتے۔ عورت کے لیے عورت میں جو تڑپ ہوگی وہ مردوں کے دل میں نہیں ہوسکتی۔ میں اماں سے اس مقدمے کے لیے پانچ ہزار سے کم نہ لوں گی۔"

امرکانت کو آج معلوم ہوا کہ اس نازنین کے دل میں کتنا درد، کتنی جنسی ہمدردی، کتنا ایثار ہے۔

تانگہ آیا اور دونوں راما دیوی سے ملنے چلے۔

(۱۰)

تین مہینے تک سارے شہر میں تلاطم برپا رہا۔ روز ہزاروں آدمی سب کام دھندے چھوڑ کر کچہری کا چکر لگاتے۔ بھکارن کو ایک نظر دیکھ لینے کا اشتیاق ہر ایک کے دل میں تھا۔ عورتوں کی بھی خاصی تعداد جمع ہوجاتی تھی۔ بھکارن جونہی لاری سے اُترتی۔ جے جے کے فلک بوس نعرے بلند ہوجاتے اور پھولوں کی بارش ہونے لگتی۔ راما اور سکھدا تو کچہری کے برخاست ہونے تک وہیں رہتیں۔

حاکم ضلع نے مقدمے کو سشن سپرد کردیا۔ روز پیشیاں ہونے لگیں جیوری مقرر ہوئی۔ ادھر صفائی کے لیے ایک فوج تیار کی گئی۔ مقدمے کو ثبوت کی ضرورت نہ تھی۔ ملزم نے اپنا جرم تسلیم کرلیا تھا۔ پس یہی فیصلہ کرنا تھا کہ جس وقت اس نے جُرم کا ارتکاب کیا وہ اپنے ہوش میں تھی یا نہیں۔ شہادتوں کا بیان تھا کہ وہ اپنے ہوش میں نہ تھی۔ ڈاکٹر کہتا تھا فتورِ عقل کی کوئی علامت نظر نہیں آتی۔ ڈاکٹر صاحب بنگالی تھے۔ جس دن وہ بیان دے کر نکلے ان پر لعنتوں کی اتنی بوچھار پڑی کہ بے چارے کو گھر پہنچنا مشکل ہوگیا۔ ایسے موقعوں پر عام رائے سے اختلاف کرنا تیر ملامت کا نشانہ بنتا ہے۔ خلقت کسی کو اپنی رائے کے آزادانہ اظہار کا موقع نہیں دیتی۔

راما شہر کی رانی بنی ہوئی تھی۔ مقدمے کی پیروی کی ساری ذمّے داری اسی کے سر تھی۔ ڈاکٹر شانتی کمار اور امرکانت اس کے داہنے اور بائیں بازو تھے۔ لوگ آکر خود چندے دے جاتے۔ یہاں تک کہ لالہ سمرکانت بھی خفیہ طور پر مدد کر رہے تھے۔

ایک دن امرکانت نے پٹھانی کو کچہری میں دیکھا۔ سکینہ بھی چادر اوڑھے اس کے ساتھ تھی۔ امرکانت نے پوچھا۔ ’’بیٹھنے کو کچھ لاؤں اماں! آج آپ سے بھی نہ رہا گیا؟‘‘

پٹھانی نے شکوہ آمیز لہجے میں کہا۔ ’’میں تو روز آتی ہوں بیٹا! تم نے مجھے نہ دیکھا ہوگا۔ یہ لڑکی مانتی ہی نہیں۔‘‘

امرکانت کو رومال کی یاد آگئی۔ اور وہ تجویز بھی یاد آئی جو بُڑھیا نے اس سے کی تھی۔ مگر شورش میں وہ کالج تک تو جا نہ پاتا تھا۔ اس معاملے کی طرف متوجہ ہونے کا موقعہ ہی کہاں تھا۔

پٹھانی نے پوچھا۔ ’’مقدمے میں کیا ہوگا بیٹا! پگلی چھوٹے گی یا سزا پاجائے گی؟‘‘

امر نے کہا۔ ''کچھ کہہ نہیں سکتا اماں! چھوٹنے کی کوئی امید نہیں معلوم ہوتی۔ مگر ہم نے پریوی کونسل تک جانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔''

پٹھانی بولی۔ ''ایسے معاملے میں بھی حاکم سزا دے تو اندھیر ہے۔''

امرکانت نے جوش کے ساتھ کہا۔ ''اسے سزا ملے یا رہا ہو مگر اس نے دکھا دیا کہ ہندوستان کی غریب عورتیں بھی اپنی آبرو کی کتنی دلیری سے حفاظت کرسکتی ہیں۔''

سکینہ نے پوچھا تو امر سے لیکن منہ دادی کی طرف کرکے ''اور ہم اس سے مل نہ سکیں گے اماں؟''

امر نے معاً کہا۔ ''ہاں ملنے میں کیا ہے، چلو اماں میں تمھیں اپنے گھر کی عورتوں کے ساتھ بٹھا دوں۔ وہاں تم ان لوگوں سے باتیں بھی کرسکو گی۔''

پٹھانی نے احسان مندانہ لہجے میں کہا۔ ''ہاں بیٹا! پہلے ہی دن سے یہ لڑکی میری جان کھا رہی ہے۔ تم سے ملاقات ہی نہ ہوتی تھی کہ پوچھوں۔ اس نے کچھ رومال بنائے تھے، اس کے دو روپے ملے۔ وہ دونوں روپے تب ہی سے امانت کی طرح رکھے ہوئے ہیں، چندہ دے گی۔ نہ ہو تو تمھیں لے لو بیٹا! ان بی بیوں کو دو روپے دیتے مجھے شرم آئے گی۔''

امرکانت اِن غریبوں کا ایثار دیکھ کر دل میں بہت شرمندہ ہوا۔ وہ اپنے کو کچھ سمجھنے لگا تھا۔ جدھر نکل جاتا لوگ اس کا احترام کرتے۔ لیکن ان فاقہ مستوں کی یہ حمیت دیکھ کر اس کی آنکھیں کُھل گئیں۔ بولا۔ ''چندے کی اب کوئی ضرورت نہیں اماں! روپے کی کمی نہیں ہے۔ اسے اپنے پاس رہنے دو۔ ہاں چلو ان لوگوں سے تمھاری ملاقات کرادوں۔''

سکینہ کا حوصلہ پست ہوگیا۔ سر جھکا کر بولی۔ ''جہاں غریبوں کے روپے نہیں پوچھے جاتے وہاں غریبوں کو کون پوچھے گا۔ ان امیرزادیوں کے پاس جاکر کیا کروگی اماں!''

امرکانت جھینپتا ہوا بولا۔ ''نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے اماں! وہاں تو ایک پیسہ بھی شکریہ کے ساتھ قبول کیا جاتا ہے۔ غریب امیر کی کوئی بات نہیں ہے۔ میں خود غریب ہوں۔ میں نے تو صرف اس خیال سے کہا تھا کہ تمھیں زیرباری ہوگی۔''

دونوں امرکانت کے ساتھ چلیں تو راستے میں پٹھانی نے آہستہ سے کہا۔ ''میں نے اس دن تم سے ایک بات کہی تھی بھیّا! شاید تم بھول گئے؟''

امرکانت نادم ہوکر بولا۔ ''نہیں نہیں، مجھے یاد ہے، خوب یاد ہے۔ ذرا آج کل

انھیں پریشانیوں میں مبتلا رہا۔ جوں ہی ادھر سے فرصت ہوئی میں اپنے دوستوں سے اس کا ذکر کروں گا۔'' امرکانت دونوں عورتوں کا راما دیوی سے تعارف کرا کے باہر نکلا تو پروفیسر شانتی کمار سے مڈبھیڑ ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے پوچھا۔ ''تم کہاں مٹرگشت کر رہے ہو جی؟ سارے وکیل نہ جانے کس بل میں سما گئے۔ مقدمہ پیش ہونے والا ہے۔ آج ملزمہ کا بیان ہوگا اور کوئی وکیل نہیں۔ ان سے خدا سمجھے۔ ذرا سا اجلاس پر کھڑے کیا ہوجاتے ہیں گویا حاتم کی قبر پر لات مارتے ہیں۔ اس سے کہیں اچھا تھا کہ ایک وکیل کو مختانے پر رکھ لیا جاتا۔ مفت کا کام بے گار سمجھا جاتا ہے۔ اتنی بے دلی سے پیروی کی جارہی ہے کہ میرے جسم کا خون کھولنے لگتا ہے۔ نام سب چاہتے ہیں۔ مگر کام کرنا کسی کو منظور نہیں۔ اچھی جرح ہوتی تو پولیس کے سارے گواہ اُکھڑجاتے۔ مگر یہ کون کرتا۔ جانتے ہیں کہ آج ملزمہ کا بیان ہوگا۔ پھر بھی کسی کو فکر نہیں۔''

امرکانت نے کہا۔ ''میں ایک ایک کو اطلاع دے چکا ہوں۔ کوئی نہ آئے تو میں کیا کروں۔''

شانتی کمار گرم ہوکر بولے۔ ''مقدمہ ختم ہوجائے تو ایک ایک کی خبر لوں گا۔''

وہ لاری آرہی ہے۔ امرکانت وکیلوں کی تلاش میں دوڑا۔ تماشائی چاروں طرف سے دوڑ دوڑ کر اجلاس کے کمرے میں آگئے۔ بھکارن لاری سے اُتری اور اجلاس کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ ہزاروں آنکھیں اس کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ ان بے شمار آنکھوں میں ایک بھی ایسی نہ تھی کہ جو آنسوؤں سے نم نہ ہو۔ بھکارن کے زرد، مرجھائے ہوئے چہرے پر خودداری کا ایسا جلال تھا جو ہوسناک نظروں کو بھی اُٹھنے سے پہلے مغلوب اور متاثر کرکے ان میں عقیدت اور احترام کا نور بھر دیتا تھا۔

جج صاحب سانولے رنگ کے پستہ قد، فربہ اندام آدمی تھے۔ ان کی لمبی ناک اور چھوٹی چھوٹی آنکھیں خواہ مخواہ مسکراتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ پہلے یہ حضرت قوم کے سرگرم خادم تھے اور کانگریس کے کسی اجلاس کے صدر ہوچکے تھے۔ لیکن ادھر تین سال سے وہ اس عہدے پر پہنچ گئے تھے۔ اس لیے اب قومی تحریکوں سے الگ تھلگ رہتے تھے۔ لیکن جاننے والے جانتے تھے کہ وہ اب بھی اخباروں میں ایک فرضی نام سے اپنے قومی جذبات کا اظہار کیا کرتے تھے۔ ان کے بارے میں کوئی دشمن بھی یہ کہنے کی جرأت نہ

کرسکتا تھا کہ وہ کسی طرح کے دباؤ یا ایمان سے حق سے جو بھر بھی ٹل سکتے ہیں۔ ان کی یہی انصاف پروری بھکارن کی رہائی میں مُخل ہو رہی تھی۔

جج صاحب نے ملزمہ سے پوچھا۔ ''تمھارا نام؟''

''بھکارن۔''

''تمھارے باپ کا نام؟''

''باپ کا نام بتا کر میں انھیں بدنام نہیں کرنا چاہتی۔''

''سکونت؟''

بھکارن نے پُردرد لہجے میں کہا۔ ''پوچھ کر کیا کیجیے گا۔ آپ کو اس سے کیا غرض ہے؟''

''تمھارے اوپر یہ الزام ہے کہ تم نے تیسری تاریخ کو دو گوروں کو چُھری سے ایسا زخمی کیا کہ دونوں اسی دن اسپتال میں جاکر مرگئے۔ تم اس جُرم کا اقبال کرتی ہو؟''

بھکارن نے بے خوف ہوکر کہا۔ ''آپ اسے جُرم سمجھتے ہیں میں نہیں سمجھتی۔''

''تم یہ تسلیم کرتی ہو کہ تم نے دونوں آدمیوں پر چُھری چلائی؟''

بھکارن نے پُردرد لہجے میں کہا۔ ''جی ہاں چلائی۔ لیکن میں اپنی جان بچانے کے لیے کوئی صفائی نہیں پیش کرنا چاہتی۔ میں تو اس خیال سے خوش ہوں کہ جلد زندگی کا خاتمہ ہوجائے گا۔ میں بیکس اور مصیبت زدہ عورت ہوں مجھے اتنا ہی یاد ہے کہ کئی مہینے پہلے میری سب سے عزیز چیز ظالموں کے ہاتھ لُٹ گئی اور اب میرا جینا بے کار ہے۔ میں تو اسی دن مرچکی۔ میں آپ کے سامنے کھڑی بول رہی ہوں۔ لیکن اس جسم میں جان نہیں ہے۔ اسے میں زندہ نہیں کہتی جو کسی کو اپنا مُنہ نہ دکھا سکے۔ میرے اتنے بھائی بہنیں میری رہائی کے لیے بے کار اتنی دوڑ دھوپ کر رہے ہیں۔ روسیاہ ہوکر جینے سے مرجانا کہیں بہتر ہے۔ میں انصاف نہیں مانگتی۔ رحم نہیں مانگتی۔ میں صرف سزا مانگتی ہوں۔ ہاں اپنے بھائی بہنوں سے میں اتنی التجا ضرور کروں گی کہ میرے مرنے کے بعد میرے جسم کی توہین نہ کرنا۔ اسے اچھوت مت سمجھنا۔ بھول جانا کہ یہ کسی بدنصیب عورت کی لاش ہے۔ جیتے جی جو چیز مجھے نہیں مل سکی وہ مجھے مرنے کے بعد دے دینا۔ میں صاف کہتی ہوں کہ مجھے اپنے فعل کا افسوس نہیں ہے۔ رنج نہیں ہے۔ شرم نہیں ہے۔ ایشور نہ کرے کہ میری

کسی بہن پر یہ آفت آئے۔ لیکن اگر آہی جائے تو اس کے لیے اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ آپ سوچتے ہوں گے کہ جب یہ مرنے کے لیے اتنی بے قرار ہے تو اب تک زندہ کیوں رہی۔ اس کا سبب میں آپ کو کیا بتاؤں؟ جب مجھے ہوش آیا اور میں نے اپنے سامنے دو آدمیوں کو زمین پر تڑپتے دیکھا تو ڈر گئی۔ مجھے کچھ سوجھ ہی نہ پڑا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ اس کے بعد بھائیوں بہنوں کی شرافت اور محبت نے مجھے گرویدہ کرلیا۔ اور اب تک میں اپنے کو اس دھوکے میں ڈالے ہوئے ہوں کہ شاید میرے مُنہ کی کالکھ چھوٹ گئی اور مجھے اپنی دوسری بہنوں کی طرح عزت اور نیک نامی ملے گی۔ لیکن من کی مٹھائی سے کسی کا پیٹ بھرا ہے۔ آج اگر سرکار مجھے چھوڑ بھی دے، یہ سب بھائی بہن میرے گلے میں پھولوں کی مالا بھی ڈال دیں۔ مجھ پر اشرفیوں کا برکھا بھی کیا جائے تو کیا یہاں سے میں اپنے گھر جاؤں گی؟ میں بال بچوں والی عورت ہوں۔ میرا ایک چھوٹا سا بچّہ ہے۔ کیا میں اس بچّے کو اپنا کہہ سکتی ہوں۔ کیا اپنے شوہر کو مُنہ دکھا سکتی ہوں؟ ہرگز نہیں۔ بچّہ مجھے دیکھ کر میری گود کے لیے ہاتھ پھیلائے گا۔ لیکن میں اس کے ہاتھوں کو ہٹا دوں گی اور آنکھوں میں آنسو بھرے مُنہ پھیر کر چلی جاؤں گی۔ میرا شوہر مجھے معاف بھی کردے، میں نے اس کے ساتھ کوئی فریب نہیں کیا ہے۔ میں اب بھی اس کے قدموں سے لپٹ کر رونا چاہتی ہوں لیکن میں اس کے سامنے آنکھیں نہیں اُٹھاسکتی۔ وہ مجھے زبردستی بھی کھینچ لے جائے تب بھی میں اس گھر میں قدم نہ رکھوں گی۔ اس خیال سے میرے دل کو تشفی نہیں ہوتی کہ میرے دل میں گناہ نہ تھا اس طرح اپنے من کو وہ سمجھائے جسے جینے کی آرزو ہو میرے دل سے تو یہ خیال کسی طرح دور نہیں ہوسکتا کہ میں اچھوت ہوں، ناپاک ہوں کوئی کچھ کہے، کوئی کچھ سنے مجھے پروا نہیں۔ آدمی کو جان کیوں پیاری ہے؟ اس لیے نہیں کہ وہ سکھ بھوگتا ہے۔ جو ہمیشہ دُکھ بھوگا کرتے ہیں اور روٹیوں کو ترستے ہیں انھیں بھی جان کچھ کم پیاری نہیں ہوتی۔ ہمیں جان اس لیے پیاری ہوئی ہے کہ ہمیں اپنوں سے محبت اور غیروں سے عزّت ملتی ہے۔ جب مجھے ان دو میں سے ایک کی بھی ملنے کی اُمید نہیں تو جینے کی ہوس کیوں کروں۔ اپنے چاہے اب بھی مجھ سے محبت دکھائیں لیکن وہ رحم ہوگا محبت نہیں۔ دوسرے اب میری عزت کریں لیکن وہ بھی رحم ہوگا عزّت نہیں۔ وہ عزّت اور محبت اب مجھے موت کے بعد ہی مل سکتی ہے۔ زندگی میں تو میرے لیے رُسوائی اور

بدی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یہاں میری جتنی بہنیں اور بھائی ہیں ان سب سے میں یہی بھیک مانگتی ہوں کہ میری مکتی کے لیے ایشور سے دعا کریں۔"

بھکارن کا بیان ختم ہو گیا۔ عدالت کے اس وسیع کمرے میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ صرف دو چار عورتوں کی سسکیاں سُنائی دیتی تھیں۔ عورتوں کے چہرے غرور سے منوّر ہو رہے تھے۔ مردوں کے چہرے شرم سے جُھکے ہوئے تھے۔ امرکانت سوچ رہا تھا، گوروں کی یہ شرارت تو اسی لیے سوجھی کہ وہ اپنے کو اس مُلک کا حاکم سمجھتے تھے۔ شانتی کمار نے دل میں ایک تقریر کر ڈالی تھی۔ جس کا مضمون تھا عورتوں پر مردوں کی زیادتیاں۔ سکھدا سوچ رہی تھی کہ اگر یہ عورت چھوٹ جاتی تو میں اسے اپنے گھر میں رکھتی اور اس کی خدمت کرتی۔ راما اس کے نام پر ایک دواخانہ کھولنے کی تجویز کر رہی تھی۔ سکھدا کے قریب ہی جج کی بیوی بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ بڑی دیر سے اس مقدمے کے متعلق گفتگو کرنے کے لیے بے قرار ہو رہی تھی۔ لیکن اپنے قریب بیٹھی ہوئی عورتوں کا نا ہمدردانہ انداز دیکھ کر اسے مُنہ کھولنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ آخر اس سے نہ رہا گیا سکھدا سے بولی۔

"یہ عورت بالکل بے قصور ہے۔"

سکھدا نے چٹکی لی۔ "جب جج صاحب بھی ایسا سمجھیں۔"

"میں تو آج ان سے صاف صاف کہہ دوں گی کہ اگر تم نے اس عورت کو سزا دی تو میں سمجھوں گی کہ تم نے اپنے آقاؤں کا منہ کیا۔"

جج صاحب نے کھڑے ہو کر جیوری کو تھوڑے سے لفظوں میں اس مقدمے میں اپنی رائے دینے کی درخواست کی اور خود کچھ کاغذات دیکھنے لگے۔ جیوری نے اپنی رائے دے دی۔ ان کے خیال میں ملزمہ بے قصور تھی۔ جج صاحب کے لبوں پر ایک ہلکا سا تبسم نظر آیا۔ اور کل فیصلہ سُنانے کا وعدہ کر کے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

(۱۱)

سارے شہر میں کل کے لیے دونوں طرح کی تیاریاں ہونے لگیں۔ ہائے ہائے کی بھی اور واہ واہ کی بھی۔ سیاہ جھنڈیاں بھی بنیں اور پھولوں کی ڈالیاں بھی جمع کی گئیں۔ مگر من چلے کم تھے، بے حیا زیادہ۔ گوروں کا خون ہوا ہے۔ جج ایسے معاملے میں بھلا کیا انصاف کرے گا۔ شانتی کمار اور سلیم تو علانیہ کہتے پھرتے تھے کہ جج نے ملزمہ کو پھانسی کی سزا

دے دی۔ کوئی خبر لاتا تھا فوج کی ایک پوری رجمنٹ کل عدالت میں طلب کی گئی ہے۔ کوئی فوج تک نہ جاکر مسلح پولیس تک رہ جاتا تھا۔ اور امرکانت کو فوج بُلائے جانے کا کامل یقین تھا۔

دس بجے رات کو امرکانت سلیم کے گھر پہنچا۔ ابھی یہاں سے گھنٹے بھر ہی پہلے گیا تھا۔ سلیم نے متفکر ہوکر پوچھا۔ ''کیسے لوٹ پڑے بھئی! کیا کوئی نئی بات ہوگئی۔''

امر نے کہا۔ ''پھانسی کی سزا پر خاموش رہ جانا تو بے غیرتی ہے۔ کچلو صاحب کو سبق دینے کی ضرورت ہوگی۔ تاکہ انھیں بھی معلوم ہوجائے کہ نوجوانانِ ہند انصاف کا خون دیکھ خاموش نہیں رہ سکتے۔ سوشل بائیکاٹ کردیا جائے۔ بچّا کو پانی بھی نہ ملے، جدھر سے نکلیں اُدھر تالیاں پٹیں۔''

سلیم نے مسکرا کر کہا۔ ''سوچتے سوچے بھی تو وہی لین دین کی بات۔''

''مگر اور کرہی کیا سکتے ہو؟''

''چار دن پریشان تو ہوں گے حضرت۔''

''بالکل فضول سی بات ہے۔ اگر سبق ہی دینا ہے تو ایسا سبق دو جو کچھ دن حضرت کو یاد رہے۔ ایک آدمی ٹھیک کرلیا جائے۔ جو عین وقت جب حضرت فیصلہ سُنا کر بیٹھنے لگیں ایک جوتا ایسا نشانہ لے کر دے کہ منہ پر پڑے۔''

امرکانت نے قہقہہ مار کر کہا۔ ''بڑے مسخرے ہو یار!!''

''اس میں مسخرے پن کی کیا بات ہے؟''

''تو کیا سچ مچ جوتا لگوانا چاہتے ہو؟''

''جی ہاں۔ اور کیا مذاق کر رہا ہوں؟''

امرکانت نے سوچا بے ہودگی تو ہے ہی مگر بُرائی کیا ہے۔ لاتوں کے بھوت کبھی باتوں سے مانتے ہیں۔ بولا۔ ''اچھی بات ہے، دیکھی جائے گی۔ مگر ایسا آدمی کہاں ملے گا؟''

سلیم نے اس کی سادگی پر مسکرا کر کہا۔ ''آدمی تو ایسے مل سکتے ہیں جو سر عام گردن کاٹ لیں، پاپوش بازی کون سی بڑی بات ہے۔ کسی بدمعاش کو راضی کرلو، کالے خاں کیسا رہے گا؟''

''اچھا وہ اسے تو میں ایک بار اپنی دُکان پر پھٹکار چکا ہوں۔''

"تمھاری حماقت تھی۔ ایسے دو چار آدمیوں کو ملائے رکھنا چاہیے۔ وقت پر ان سے بڑے کام نکلتے ہیں۔ میں اور سب باتیں طے کرلوں گا۔ مگر روپے کی فکر تم کرنا۔ میں تو اپنا بجٹ پورا کرچکا۔"

"ابھی تو مہینہ شروع ہوا ہے بھائی!"

"جی ہاں۔ یہاں شروع میں ہی ختم ہوجاتے ہیں۔ پھر نوچ کھسوٹ چلتی ہے۔ کہیں اماں سے دس روپے اُڑا لیے۔ کہیں ابا جان سے کتاب کے بہانے دس پانچ اینٹھ لیے۔ مگر دوسو کی تھیلی ذرا بڑی مشکل سے ملے گی۔ ہاں تم انکار کردوگے تو مجبور ہوکر اماں کا گلا دباؤں گا۔"

امر نے کہا۔"روپے کا غم نہیں، میں جاکر لے آتا ہوں۔"

سلیم نے اتنی رات گئے روپے منگوانا مناسب نہ سمجھا۔ مسئلہ کل کے لیے ملتوی ہوگیا، علی الصباح امر روپے لائے گا اور کالے خاں سے پکا وعدہ کرلیا جائے گا۔

امر گھر پہنچا تو ساڑھے دس بج رہے تھے۔ دروازے پر بجلی جل رہی تھی۔ لالہ جی دیوان خانے میں دو تین پنڈتوں کے ساتھ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ امرکانت کو خوف ہوا کہ اتنی رات گئے یہ جاگ کس لیے ہے کوئی نیا شگوفہ تو نہیں کھلا۔

لالہ جی نے اسے دیکھتے ہی ڈانٹ کر کہا۔ "تم کہاں گھوم رہے ہو جی! دس بجے کے نکلے نکلے آدھی رات کو لوٹے ہو۔ ذرا جلدی جاکر لیڈی ڈاکٹر کو بلا لاؤ۔ وہی جو بڑے اسپتال میں رہتی ہے۔ ساتھ ہی لیتے آنا۔"

امرکانت نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔"کیا کسی کی طبیعت ...."

سمرکانت نے قطع کلام کرکے تند لہجے میں کہا۔ "کیا فضول بکتے ہو۔ میں جو کہتا ہوں وہ کرو۔ تم لوگوں نے ناحق دنیا میں جنم لیا۔ یہ مقدمہ کیا ہوا سارے گھر پر بھوت سوار ہوگیا، فوراً جاؤ۔"

امر کو پھر کچھ پوچھنے کا یارا نہ ہوا۔ گھر میں بھی نہ جاسکا۔ آہستہ سے سڑک پر آیا اور سائیکل پر بیٹھ ہی رہا تھا کہ اندر سے سلّو نکل آئی۔ امر کو دیکھتے ہی بولی۔ "ارے بھیا سنو، کہاں جاتے ہو؟ بہو جی بہت بے حال ہیں۔ کب سے تمھیں بلا رہی ہیں۔ سارا بدن پسینے سے تر ہو رہا ہے۔ دیکھو بھیا، میں سونے کی کنٹھی لوں گی۔ پیچھے سے حیلے حوالے نہ

کرنے لگنا۔"

امرکانت اس معمّے کو سمجھ گیا۔ بائیسکل سے اُتر پڑا اور برقی رفتار سے اندر جا پہنچا۔ وہاں ایک دائی، پڑوس کی ایک برہمنی اور نینا بیٹھی ہوئی تھیں۔ بیچ میں ایک ڈھول رکھا ہوا تھا۔ کمرے میں سکھدا دروازے سے ہائے ہائے کر رہی تھی۔

نینا نے دوڑ کر امرکانت کا ہاتھ پکڑ لیا اور روتی ہوئی بولی۔ "تم کہاں تھے بھیّا! بھابی بڑی دیر سے بے چین ہیں۔" امر کے دل میں آنسوؤں کی ایسی لہر اُٹھی کہ آنکھیں لبریز ہو گئیں۔ کمرے کے دروازے پر جاکر کھڑا ہوگیا۔ مگر اندر قدم نہ رکھ سکا۔ اس کا دل پھٹا جارہا تھا۔

سکھدا نے بیکسانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ "اب نہیں بچوں گی۔ ہائے پیٹ میں جیسے کوئی برچھی چبھو رہا ہے۔ میرا کہا سُنا معاف کرنا۔"

راما نے دوڑ کر امرکانت سے کہا۔ "بیٹا تم یہاں سے جاؤ۔ تمھیں دیکھ کر وہ اور بھی گھبرائے گی۔ کسی کو بھیج دو کہ وہ لیڈی ڈاکٹر بلا لائے۔ جی کڑا کرو۔ سمجھ دار ہوکر روتے ہو۔"

سکھدا بولی۔ "نہیں امّاں ان سے کہہ دو ذرا یہاں بیٹھ جائیں۔ اب نہ بچوں گی، ہائے ایشور۔"

راما نے امر کو ڈانٹ کر کہا۔ "میں تم سے کہتی ہوں یہاں سے چلے جاؤ اور تم کھڑے رو رہے ہو۔ جاکر لیڈی ڈاکٹر کو بلا لاؤ۔"

امرکانت روتا ہوا باہر نکلا اور زنانے اسپتال کی طرف چلا۔ لیکن راستے بھر رہ رہ کر اس کے کلیجے میں ہوک اُٹھتی رہی۔ شدّتِ درد سے تڑپتی ہوئی سکھدا کی تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے ناچتی رہی۔ ایسا کرب تو اس نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ اپنے کو نفرین کر رہا تھا۔ گویا سکھدا کی اس حالت کا خطاوار وہ خود ہے۔

لیڈی ڈاکٹر مس ہوپر کو اکثر ناوقت بلاوے آتے رہتے۔ رات کو اس کی فیس دوگنی ہوگئی تھی۔ امرکانت ڈر رہا تھا کہ کہیں ناراض نہ ہوکر اتنی رات کو کیوں آئے۔ لیکن مس ہوپر نے خندہ پیشانی سے اس کا خیرمقدم کیا اور موٹر لانے کا حکم دے کر اس سے باتیں کرنے لگی۔

"یہ پہلا ہی بچّہ ہے؟"

امرکانت نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "جی ہاں۔"

"آپ روئیں نہیں، گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ پہلی بار عام طور پر زیادہ تکلیف ہوتی ہے۔ بہت دُبلی تو نہیں ہیں؟"

"آج کل تو بہت دُبلی ہوگئی ہیں۔"

"آپ کو اور پہلے آنا چاہیے تھا۔"

امر کی جان سوکھ گئی۔ وہ کیا جانتا تھا آج یہ آفت آنے والی ہے۔ "میں تو کچہری سے سیدھا گھر آسما۔"

مس ہوپر نے پھر کہا۔ "آپ لوگ اپنی لیڈیوں کو کوئی ورزش نہیں کراتے اسی لیے درد زیادہ ہوتا ہے۔ اندر کی رگیں بندھی رہ جاتی ہیں۔"

امرکانت نے سسک کر کہا۔ "میڈم اب تو آپ ہی کا بھروسہ ہے۔"

"میں تو چلتی ہوں لیکن شاید سول سرجن کو بلانا پڑے۔"

امر نے مضطرب ہوکر کہا۔ "کہیے تو اُن کو بھی لیتا چلوں؟"

مس ہوپر نے اس کی طرف نگاہِ ترحم سے دیکھا۔ "نہیں ابھی نہیں۔ پہلے مجھے چل کر دیکھ لینے دو۔"

امرکانت کو کچھ تشفی ہوئی، تشویشناک لہجے میں بولا۔ "میڈم اگر اسے کچھ ہوگیا تو میں بھی مرجاؤں گا۔"

میم نے فکرمند ہوکر پوچھا۔ "تو کیا حالت اچھی نہیں ہے؟"

"بڑی شدّت کا درد ہے۔"

"حالت تو اچھی ہے؟"

"چہرہ زرد پڑگیا ہے۔"

"ہم پوچھتے ہیں حالت کیسی ہے؟ اس کا جی تو نہیں ڈوب رہا ہے؟ دل تو نہیں بیٹھ رہا ہے؟ ہاتھ پاؤں تو نہیں ٹھنڈے ہوگئے ہیں؟"

امر نے معذرت کے انداز سے کہا۔ "یہ تو میں نہیں دریافت کرسکا۔"

موٹر تیار ہوگئی۔ میم صاحب نے امر کو بھی موٹر میں بٹھا لیا اور سائیکل اُٹھوا کر

برآمدے میں رکھوا دی۔ موٹر چلی۔

امر نے بڑے انکسار کے ساتھ کہا۔ "کہیے تو سول سرجن کے پاس ہوتا آؤں نئے بازار میں لالہ سمرکانت کا مکان سڑک پر ہے۔"

"میں جانتی ہوں۔"

میم صاحب تو ادھر چلیں، امرکانت سول سرجن کو بلانے چلا گیا۔ گیارہ بج گئے تھے۔ آمد و رفت بند ہوگئی تھی۔ اور پورے تین میل کی منزل تھی۔ سول سرجن نئی دہلی میں رہتا تھا۔ راستے میں کوئی سواری بھی نہ ملی۔ وہاں پہنچتے پہنچتے بارہ بج گئے۔ صدر پھاٹک کھلوانے، پھر صاحب کو اطلاع کرانے میں ایک گھنٹے سے زیادہ لگا۔ صاحب اُٹھے تو جامے سے باہر، گرجتے ہوئے بولے۔"ہم اس وقت نہیں جاسکتے۔"

امر نے بے خوف ہوکر کہا۔ "آپ اپنی فیس ہی تو لیں گے؟"

"ہماری رات کی فیس سو روپیہ ہے۔"

"کوئی ہرج نہیں۔"

"تم فیس لایا ہے؟"

امرکانت نے ڈانٹ بتائی۔ "کیا آپ ہر ایک سے پیشگی فیس لیتے ہیں؟ لالہ سمرکانت ان آدمیوں میں نہیں ہیں جن پر سو روپے کا بھی اعتبار نہ کیا جاسکے۔ وہ اس شہر کے سب سے بڑے ساہوکار ہیں۔ میں ان کا لڑکا ہوں۔"

صاحب کچھ نرم پڑے۔ امر نے انھیں ساری کیفیت سنائی تو چلنے کو تیار ہوگئے۔ موٹر آگئی۔ امر صاحب کے ساتھ موٹر میں جا بیٹھا۔ پندرہ منٹ میں موٹر گھر پر آ پہنچی۔ امر کو دور ہی سے کچھ شہنائی کی آواز سنائی دی۔ کچھ بندوقیں چھوٹنے کی آواز آئی۔ اس کا دل مسرت سے شگفتہ ہوگیا۔ دروازے پر موٹر رکی، تو لالہ سمرکانت نکلے۔ ڈاکٹر کو سلام کیا اور بولے۔ "حضور کے اقبال سے خیریت ہے۔ بھگوان نے پوتا دیا ہے۔"

ڈاکٹر اور مس ہوپر میں کچھ باتیں ہوئیں۔ ڈاکٹر صاحب نے فیس لی اور چل دیے۔ ان کے جانے کے بعد لالہ جی نے امرکانت کو آڑے ہاتھوں لیا۔ "مفت میں سو روپے کی چپت پڑی۔" [illegible]

امرکانت نے جھلا کر کہا۔ "آپ مجھ سے روپے لے لیجیے گا۔ ایسے موقع پر روپے کا

منہ نہیں کیا جاتا۔"

کسی دوسرے موقع امرکانت یہ جھڑکیاں سن کر گھنٹوں بسورتا۔ مگر اس وقت اس کا دل شکر و احسان کے جذبے سے پُر تھا۔ ایک ایک عضو مسرت سے کھلا ہوا تھا۔ بھری ہوئی گیند پر ٹھوکر کا کیا اثر۔ اس کے جی میں تو آرہا تھا۔ اس وقت کیا لُٹا دوں۔ اب وہ ایک لڑکے کا باپ ہے۔ اب کون اس سے ہیکڑی جتا سکتا ہے۔ وہ طفلِ نو زائیدہ گویا جنت سے اس کے لیے امید اور بقا کی دعائیں لے کر آیا ہے۔ اسے دیکھ کر اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرنے کے لیے وہ بے قرار ہو رہا تھا۔ اوہو انھیں آنکھوں سے وہ نئے دیوتا کے درشن کرے گا۔

مس ہوپر نے اسے منتظر آنکھوں سے تکتے دیکھ کر کہا۔ "آپ یوں بچّے کو نہیں دیکھ سکیں گے آپ کو کوئی بڑا انعام دینا پڑے گا۔"

امرکانت نے امیرانہ انکسار کے ساتھ کہا۔ "بچّہ تو آپ کا ہے میم صاحب میں تو محض آپ کا خادم ہوں۔ زچہ کی طبیعت اب کیسی ہے؟"

"بہت اچھی، ابھی سوگئی ہیں۔"

"بچّہ خوب تندرست ہے؟"

"ہاں اچھا ہے۔ بہت خوب صورت، گلاب کا پتلا سا۔"

یہ کہہ کر وہ زچہ خانے میں چلی گئی۔ عورتیں تو گانے بجانے میں مگن تھیں۔ محلے کی پچاسوں عورتیں جمع ہوگئی تھیں۔ اور ان کی ملی ہوئی آوازیں گویا ایک رسی کی طرح دبیز ہوکر امر کے گلے کو باندھے لیتی تھیں۔ اسی وقت مس ہوپر نے بچّے کو گود میں لے کر اسے زچہ خانے کی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ امر اُمنگ سے بھرا ہوا چلا۔ لیکن یکایک اس پر ایک نامعلوم دہشت غالب آگئی۔ وہ آگے نہ بڑھ سکا۔ وہ گناہوں سے بھرا ہوا دل لیے اس نعمتِ عظمیٰ کو کیسے اپنے دامن میں لے سکے گا، وہ اس نظر کرم کے قابل ہے ہی کب۔ اس نے اس کے لیے کون سا ریاض کیا ہے۔ یہ ایشور کا فیضِ بیکراں ہے جس نے یہ نعمت اسے عطا کی۔ یہ اس کی کریمی کا صدقہ ہے تم کیسے رحیم ہو ایشور!

نیلگوں اُفق کے پردے سے نکلنے والی سُنہری شعاعوں کی طرح امر کانت کو اپنے دل کی ساری کثافتوں، ساری خباثتوں کے اندر سے ایک بجلی سی نکلتی ہوئی معلوم ہوئی۔ جس نے اس کی زندگی کو روشن کردیا۔ چراغوں کی روشنی میں، گیتوں کی آوازوں میں، آسمان کے

ستاروں میں اسی بچّے کی دل فریبی تھی۔ اسی کا جادو تھا اس کی معصومیت تھی۔

سلّو آکر رونے لگی امر نے پوچھا۔ ''تجھے کیا ہوا ہے تو کیوں روتی ہے؟''

سلّو بولی۔ ''میم نے مجھے بھیّا کو نہیں دیکھنے دیا۔ کیا میں بچّے کو نجر لگا دیتی۔ میرے بھی بچّے تھے۔ میں نے بھی بچّے پالے ہیں۔ میں جرا دیکھ لیتی تو کیا ہوتا؟''

امر نے ہنس کر کہا۔ ''تو کیسی پگلی ہے، سلّو! اس نے تجھے اس لیے نہ دکھایا ہوگا کہ کہیں بچّے کو ہوا نہ لگ جائے۔ لیڈی ڈاکٹروں کے نخرے کچھ نرالے ہوتے ہیں۔ لیکن ان کا راج تو آج ہی کے دن ہے نہ۔ پھر تو اکیلی دائی رہ جائے گی۔ تو ہی تو بچّے کو پالے گی، دوسرا کون بیٹھا ہوا ہے!''

سلّو کی آنسو بھری آنکھیں مسکرا پڑیں۔ بولی۔ ''میں نے دور ہی سے دیکھ لیا بالکل تم کو پڑا ہے۔ ہاں رنگ بہو جی کا ہے۔ میں کنٹھی لے لوں گی کہے دیتی ہوں۔''

اب دو بج رہے تھے، اسی وقت لالہ سمرکانت نے امر کو بلاکر کہا۔ ''نیند تو اب کیا آئے گی۔ بیٹھ کر کل کے جشن کا ایک تخمینہ بنا لو۔ تمھاری دفعہ ہاتھ تنگ تھا۔ نینا لڑکی تھی پچیس سال کے بعد بھگوان نے یہ دن دکھایا۔ کچھ لوگ ناچ مجرے کو معیوب سمجھتے ہیں۔ مجھے تو اس میں کوئی بُرائی نہیں نظر آتی۔ خوشی کے یہی موقعے ہیں۔ چار بھائی بندہ یار دوست آتے ہیں، گانا بجانا سنتے ہیں اور دعوت میں شریک ہوتے ہیں یہی زندگی کی راحت ہے اور اس دنیا میں کیا رکھا ہے۔''

امر نے اعتراض کیا۔ ''لیکن رنڈیوں کا ناچ تو ایسے سعید موقع پر کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا۔'' لالہ جی نے اس کی تردید کی۔ ''تم اپنے اصولوں کو یہاں نہ گھسیڑوں میں تم سے صلاح نہیں پوچھ رہا ہوں۔ ہمارے جتنے رسوم ہیں ان کی کوئی نہ کوئی بنیاد بھی ہے۔ سری رام چندر جی کے جشنِ ولادت میں اپسراؤں کا ناچ ہوا تھا۔ ہمارے سماج میں ناچ کو شگون سمجھتے ہیں۔''

امرکانت نے پھر عذر کیا۔ ''انگریزوں کے یہاں تو یہ رواج نہیں ہے۔''

سمرکانت کو وار کرنے کا موقع ملا۔ ''انگریزوں کے یہاں رنڈیاں نہیں ہیں، گھر کی بہو بیٹیاں ناچتی ہیں۔ جیسا ہمارے یہاں چماروں میں ہوتا ہے۔ بہو بیٹیوں کو نچانے سے تو یہ کہیں اچھا ہے کہ یہ رنڈیاں ناچیں۔ کم از کم میں اور میری طرح کے اور بڈھے اپنی بیٹیوں

کو نچانا کبھی پسند نہ کریں گے۔"

امرکانت کو کوئی جواب نہ سوجھا۔ اس ولادت کی خوشی نے ناچ کو اس کی نظر میں کچھ کم مکروہ بنا دیا تھا۔ حکیم اور دوسرے احباب جمع ہوں گے۔ خاصی چہل پہل رہے گی۔ اس نے ضد بھی کی؟ تو کیا نتیجہ۔ لالہ جی ماننے کو نہیں۔ پھر وہ اکیلا کر ہی کیا سکتا ہے۔

وہ لیٹ کر تخمینے لکھنے لگا۔

(۱۲)

سلیم نے معمول سے کچھ قبل اٹھ کر کالے خاں کو بلایا اور رات کی تجویز اس کے سامنے پیش کی۔ دو سو کی رقم حقیر نہ تھی۔ کالے خاں چھاتی ٹھونک کر کہا۔ بھیا ایک دو جوتے کی کیا بات ہے۔ کہو تو اجلاس پر پچاس گن کر لگاؤں۔ چھ مہینے سے تو پیشی ہوتی نہیں۔ دو سو بال بچوں کے کھانے کے لیے بہت ہے۔" سلیم نے سوچا امرکانت روپے لیے آتا ہوگا۔ مگر آٹھ بجے، نو کا عمل ہوا، امر کا کہیں پتہ نہیں۔ آیا کیوں نہیں، کہیں بیمار تو نہیں پڑ گیا، روپے کا انتظام کر رہا ہوگا۔ لالہ سمرکانت تو ایک کوڑی نہ دیں گے۔ ساس کی خوشامد کرے گا تب جا کر ملیں گے۔ آخر دس بج گئے تو امرکانت کے پاس چلنے کو تیار ہوا کہ پروفیسر شانتی کمار آ پہنچے۔ سلیم نے دروازے تک جا کر ان کی تعظیم کی۔ ڈاکٹر صاحب نے کرسی پر لیٹتے ہوئے پنکھا چلانے کا اشارہ کر کے کہا۔ "تم نے کچھ سنا، امر کے گھر میں بچہ ہوا ہے۔ وہ آج کچہری نہ جا سکے گا۔ اس کی ساس بھی تو ہیں۔" "سمجھ لیں نہیں! آج کا انتظام کیسے ہوگا۔ امر کے بغیر تو ہم کسی طرح کا مظاہرہ نہ کر سکیں گے۔ رانا دیوی آ جاتیں تو غنیمت تھی۔ مگر انھیں ابھی آج فرصت نہیں ہے۔"

سلیم نے کالے خاں کی طرف دیکھ کر کہا "یہ تو آپ نے بری خبر سنائی۔ اس بھلے آدمی کے گھر میں آج ہی لڑکا بھی ہونا تھا۔ بولو کالے خاں اب؟"

کالے خاں نے دلیرانہ لہجے میں کہا۔ "تو کوئی ہرج نہیں ہے، بھیا! تمھارا کام میں کردوں گا، روپے کہیں بھاگے جاتے ہیں۔ میں ادھر ہی سے کچہری چلا جاؤں گا۔ جوں ہی تم اشارہ کرو گے....."

وہ چلا گیا تو ڈاکٹر صاحب نے مشتبہ آمیز لہجے میں پوچھا۔ "متانت سے غور کرنے کی ضرورت تو نہیں ہے۔" کچھ نہیں ذرا کالے خاں کی جواں مردی کا تماشا دیکھنا ہے۔ امرکانت کی

یہ صلاح ہے کہ جج صاحب بہادر آج فیصلہ سُنا چکیں تو ان کی مدارت کردی جائے۔"

ڈاکٹر صاحب نے تیز نظروں سے دیکھ کر کہا۔ "تو یہ کہو تم لوگ بدمعاشی پر اُتر آئے۔ زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ امرکانت کی صلاح ہے۔ وہ تو یہاں ہے نہیں مگر تم اس اصلاح میں شریک ہو اور تمھارے اوپر بھی اس کی اتنی ہی ذمے داری ہے۔ میں ایسے فعل کو کمینہ پن سمجھتا ہوں۔ تمھیں یہ خیال کر لینے کا کوئی حق نہیں ہے کہ جج صاحب اپنے افسروں کو خوش کرنے کے لیے انصاف کا خون کردیں گے۔ جو آدمی علم میں، عقل میں، تجربے میں، عزّت میں تم سے کوسوں آگے ہے اس میں انصاف کا احساس تم سے کم نہیں ہوسکتا۔ مجھے اس لیے اور بھی زیادہ رنج ہے کہ میں تم دونوں کو شریف اور بے لوث سمجھتا ہوں۔"

سلیم کا منہ ذرا سا نکل آیا۔ ایسی لتاڑ اس نے اپنی عمر میں کبھی نہ سُنی تھی۔ اس کے پاس اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے ایک بھی دلیل، ایک بھی لفظ نہ تھا۔ اس کی ذمّے داری امرکانت کے سر ڈالنے کی نیت سے بولا۔"میں نے تو امرکانت کو منع کیا تھا مگر جب وہ نہ مانے تو کیا کرتا۔"

ڈاکٹر صاحب کو اعتبار نہ آیا بولے۔"تم جھوٹ بولتے ہو۔ یہ سب تمھاری شرارت ہے۔"

"آپ کو میرا یقین ہی نہ آئے تو اس کا کیا علاج۔"

"امرکانت کے دل میں ایسا خیال پیدا ہی نہیں ہوسکتا۔"

سلیم چپ ہوگیا۔ کیونکہ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب کا یہ جواب ہوتا کہ اگر امر نے یہ تجویز کی تو تم نے اسے مان کیوں لیا۔ اس کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

ایک لمحے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ "آج اس لونڈے پر ایسا غصہ آرہا ہے کہ گن کر پچاس ہنٹر جماؤں۔ اتنے دنوں تک اس مقدمے کے پیچھے سر پٹکتا پھرا اور آج جب فیصلے کا دن آیا تو ولادت کا جشن منانے بیٹھ گیا۔ نہ جانے کب ہم لوگوں کو اپنی ذمّے داری کا احساس پیدا ہوگا۔ اس جشن میں کیا تھا دلیروں کا کام ہے میدانِ عمل میں جمے رہنا۔ خوشیاں منانا تو تنگ ظرفوں کا کام ہے۔ میں نے پھٹکار سُنائی تو ہنسنے لگا۔ آدمی وہ ہے جو زندگی میں اصول بنائے اور زندگی بھر اس پر قائم رہے۔ کبھی فرض سے منہ نہ

موڑے۔ یہ کیا کہ کٹے ہوئے پتنگ کی طرح جدھر ہوا اُڑا لے گئی ادھر اُڑ گئے۔ تم تو چلنے کو تیار ہو۔ ہمیں اور کچھ نہیں کرنا ہے۔ اگر فیصلہ موافق ہے تو بھکارن کو جلوس کے ساتھ جمنا کنارے تک لانا ہوگا۔ وہاں سب لوگ اشنان کریں گے اور اپنے گھر کی راہ لیں گے۔ سزا ہوگئی تو اسے مبارک باد کے ساتھ رخصت کرنا ہوگا۔ آج ہی شام کو اصلاحِ تعلیم پر میری تقریر ہوگی۔ اس کی بھی فکر کرنا ہے۔ تم بھی کچھ بولوگے؟"

سلیم نے مسکرا کر کہا۔ "میں ایسے مسئلے پر کیا بول سکتا ہوں؟"

"کیوں؟ میرے خیالات تمھیں معلوم ہیں۔ یہ کرائے کی تعلیم ہمارے کیرکٹر کو تباہ کیے ڈالتی ہے۔ ہم نے تعلیم کو ایک روزگار بنا لیا ہے۔ اور اسی اعتبار سے اس کے عیب و ہُنر کی جانچ کرتے ہیں۔ زیادہ سرمایہ خرچ کرو، زیادہ نفع ہوگا۔ میں چاہتا ہوں کہ بہترین تعلیم سب کے لیے معاف ہو۔ تاکہ غریب سے غریب آدمی بھی اونچی لیاقت حاصل کرسکے اور اونچے سے اونچا کام کرسکے۔ میں یونیورسٹی کے دروازے ہر شخص کے لیے کھلے رکھنا چاہتا ہوں۔ سارا خرچ گورنمنٹ کے ذمے ہونا چاہیے۔ ملک کو تعلیم کی اس سے کہیں زیادہ ضرورت ہے جتنی فوج کی۔"

سلیم نے اعتراض کیا۔"اگر فوج نہ ہو تو ملک کی حفاظت کون کرے؟"

ڈاکٹر صاحب نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "ملک کی حفاظت کریں گے ہم اور تم اور ملک کے دس کروڑ جوان جو اب بھی دلیری اور ہمت میں دنیا کی کسی قوم سے پیچھے نہیں ہیں۔ اسی طرح جیسے ہم اور تم رات کو چوروں کے آجانے پر پولیس کو نہیں پکارتے بلکہ اپنی اپنی لکڑیاں لے کر گھروں سے نکل پڑتے ہیں۔"

سلیم نے پیچھا چھڑانے کے لیے کہا۔"میں بول تو نہ سکوں گا، مگر آؤں گا ضرور۔"

سلیم نے موٹر منگوائی اور دونوں آدمی کچہری چلے۔ آج وہاں غیر معمولی ہجوم تھا۔ لیکن جیسے بن دولھا کے برات ہو۔ کہیں کوئی ترتیب نہ تھی۔ سوسو پچاس پچاس کی ٹولیاں جا بجا بیٹھی یا کھڑی گپ شپ کر رہی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب کو دیکھتے ہی ہزاروں آدمی ان کی طرف دوڑے۔ ڈاکٹر صاحب خاص خاص کارپردازوں کو ضروری ہدایتیں دے کر وکالت خانے میں پہنچے تو دیکھا کہ لالہ سمرکانت سب کو نوید تقسیم کررہے ہیں۔ اس وقت وہ جشن کی دلچسپیوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ لوگ بڑے اشتیاق سے پوچھ رہے تھے کون کون سے طائفے

بلائے گئے ہیں؟ بھانڈ بھی ہیں یا نہیں؟ گوشت خوروں کے لیے بھی کچھ انتظام ہے؟ ایک جگہ دس بارہ آدمی ناچ پر بحث کر رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کو دیکھتے ہی ایک صاحب نے پوچھا۔ ''آپ تو جشن میں آئیں گے ضرور کہ آپ کو اعتراض ہے؟''

ڈاکٹر صاحب نے بے اعتنائی سے کہا۔''میرے پاس اس سے زیادہ ضروری کام ہے۔''

ایک صاحب نے پوچھا۔ ''آخر آپ کو ناچ پر کیوں اعتراض ہے؟''

ڈاکٹر صاحب نے دل آزارانہ انداز سے کہا۔ ''اس لیے کہ ہم اور آپ ناچنا عیب سمجھتے ہیں۔ ناچنا نفس پروری کی چیز نہیں۔ روحانیت اور تہذیب کی چیز ہے۔ مگر ہم نے اسے شرمناک بنا رکھا ہے۔ مستورات کو عیش اور حظ کی چیز بنانا اپنی ماں اور بہنوں کی توہین کرنا ہے۔ ہم حقیقت سے اتنی دور پہنچ گئے ہیں کہ ہمیں اس کی اصلی صورت بھی نظر نہیں آتی۔''

دفعتاً ایک نوجوان نے قریب آکر ڈاکٹر صاحب کو سلام کیا، ایک لمبا سا دُبلا پتلا آدمی تھا۔ چہرہ خشک اور مغموم۔ کپڑے میلے اور بوسیدہ۔ بالوں پر گرد پڑی ہوئی۔ آنکھوں میں ایک دردناک بیکسی، اس کی گود میں ایک سال بھر کا بچّہ تھا۔ بڑا شوخ لیکن کچھ ڈرا ہوا۔

ڈاکٹر صاحب نے پوچھا۔ ''تم کون ہو؟ مجھ سے کچھ کام ہے؟''

جوان نے اِدھر اُدھر مشتبہ انداز سے دیکھا۔ گویا ان آدمیوں کے روبرو وہ اپنے متعلق کچھ کہنا نہیں چاہتا اور بولا۔''میں تو ٹھاکر ہوں، یہاں سے چھ سات کوس پر ایک گاؤں ہے وہیں رہتا ہوں۔''

ڈاکٹر صاحب نے قیافے سے اسے پہچان لیا اور بولے۔''اچھا وہی گاؤں جو سڑک کے پچھّم طرف ہے، آؤ میرے ساتھ۔''

ڈاکٹر صاحب اسے لیے ہوئے قریب کے باغیچے میں چلے گئے اور بنچ پر بیٹھ کر اس کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا کہ اب وہ اس کی داستان سننے کے لیے تیار ہیں۔

جوان نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ''اس مقدمے میں جو عورت ہے، وہ اس بچّے کی ماں ہے۔ گھر میں ہم دو آدمیوں کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ میں کھیتی باڑی کرتا ہوں وہ بازار سے کبھی کبھی سودا سلف لانے چلی جاتی تھی۔ اس دن وہ بازار سے لوٹ رہی تھی جب یہ واردات ہوئی۔ بس اس دن سے وہ گھر نہیں گئی ورنہ ہم دونوں میں سے ایک یا دونوں کی

جان جاتی۔ اس بچّے کے لیے مجھے زیادہ فکر تھی۔ باربار ماں ماں پکارتا تھا۔ لیکن میں اسے بہلاتا رہتا تھا۔ پہلے تو معلوم ہوتا تھا کہ بچے گا ہی نہیں۔ ایشور کی مرضی تھی۔ رفتہ رفتہ ماں کو بھول گیا۔ پہلے میں اس کا باپ تھا اور اب تو ماں باپ دونوں میں ہی ہوں۔ باپ کم ماں زیادہ۔ میں نے دل میں سمجھ لیا تھا کہ وہ کہیں ڈوب مری ہوگی۔

جس دن مجھے خبر ملی کہ لالہ سمرکانت کی دُکان پر ایک عورت نے دو گوروں کو مار ڈالا تو میں تاڑ گیا کہ یہ وہی ہے۔ اس دن سے ہر پیشی پر آتا ہوں اور سب سے پیچھے کھڑا رہتا ہوں۔ کسی سے کچھ کہنے کی ہمّت نہیں پڑتی۔ آج میں نے سمجھا اس سے سدا کے لیے ناتا ٹوٹ رہا ہے۔ اس لیے بچّے کو لیتا آیا کہ اسے دیکھنے کی اسے آرزو نہ رہ جائے۔ آپ لوگوں نے تو کوئی بات اُٹھا نہیں رکھی۔ لیکن بھاگ میں جو کچھ لکھا تھا وہ کیسے ٹلتا۔ آپ سے بس اتنی ہی عرض ہے کہ جج صاحب جب فیصلہ سُنا چکیں تو اس سے ایک چھن کے لیے میری ملاقات کرا دیجیے گا۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں بابو جی! کہ اگر وہ بَری ہوجائے تو میں اس کے چرن دھو دھو کر پیوں اور اسے اپنے گھر کی دیوی سمجھوں۔ بھائی بند اب بھی ناک سکوڑیں گے مگر جب آپ ایسے بڑے بڑے آدمی میرے ساتھ ہیں تو مجھے برادری کی پروا نہیں۔"

شانتی کمار نے پوچھا۔ "جس دن اس کا بیان ہوا۔ تم وہاں تھے؟"

نوجوان نے پُرنم آنکھوں سے جواب دیا۔ "ہاں بابو جی تھا۔ سب کے پیچھے دروازے پر کھڑا رو رہا تھا۔ یہی جی میں آتا تھا کہ دوڑ کر اس کے قدموں سے لپٹ جاؤں اور کہوں منّی میں تیرا خادم ہوں۔ تو اب تک میری عورت تھی۔ آج سے میری دیوی ہے۔ منّی نے میرے بزرگوں کا نام روشن کردیا بابو جی اور کیا کہوں۔"

شانتی کمار نے پھر پوچھا۔ "مان لو آج وہ چھوٹ جائے تو تم اسے گھر لے جاؤ گے؟"

نوجوان نے دردناک لہجے میں کہا۔ "یہ تو پوچھنے کی بات نہیں ہے۔ میں اسے آنکھوں پر بٹھا کر لے جاؤں گا۔ اور جب تک زندہ رہوں گا اس کا غلام بنا رہوں گا۔"

ایک لمحے کے بعد اس نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔ "کیا چھوٹنے کی کچھ آشا ہے، بابو جی؟"

شانتی کمار نے کہا۔ "اوروں کو تو نہیں ہے پر مجھے ہے۔"

نوجوان ڈاکٹر صاحب کے پیروں پر گر کر رونے لگا۔ چاروں طرف مایوسیوں کا شکار ہونے کے بعد آج اسے اُمید کی صورت نظر آئی اور اس کے دل کی ساری کیفیتیں گویا مسرّت کے نغمے گانے لگیں اور مسرّت جب دل میں نہیں سماتی تو کیا آنکھوں میں آنسو بن کر نہیں نکل آتی؟

موٹر کا ہارن سُنتے ہی دونوں نے کچہری کی طرف دیکھا جج صاحب آگئے خلقت کا وہ سمندر چاروں طرف سے اُمنڈ کر اجلاس کے سامنے جا پہنچا پھر بھکارن عدالت میں لائی گئی۔ خوشی کے نعرے بلند ہوئے۔ وکیل، بیرسٹر، پولیس، عمال، حکام سبھی آکر اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔

جج صاحب نے ایک اُڑتی نگاہ سے مجمع کو دیکھا۔ چاروں طرف خاموشی طاری ہوگئی۔ اَن گنت آنکھیں جج صاحب کی طرف تاکنے لگیں۔ گویا کہہ رہی تھیں آپ ہی ہماری قسمت کے مالک ہیں۔

جج صاحب نے صندوق سے ٹائپ کیا ہوا فیصلہ نکالا اور پڑھنے لگے۔ مجمع اور قریب آگیا۔ بیشتر لوگ فیصلے کا ایک حرف بھی نہ سمجھتے تھے۔ مگر کان سب ہی لگائے ہوئے تھے اور سب کے دل دھک دھک کر رہے تھے کہ دیکھو جج صاحب اس کی قسمت کا کیا فیصلہ کرتے ہیں۔

کوئی پندرہ منٹ تک جج صاحب فیصلہ پڑھتے رہے اور مجمع ہمہ تن گوش بنا سُنتا رہا۔

آخر میں جج کے منہ سے نکلا۔ "یہ ثابت ہے کہ منّی نے ارتکاب جرم کیا۔"

کتنوں ہی کے دل بیٹھ گئے۔ ایک دوسرے کی طرف خطاوار نظروں سے دیکھنے لگے۔

جج نے جُملے کو پورا کیا۔ "لیکن یہ بھی ثابت ہے کہ اس نے یہ خون فتورِ عقل کی حالت میں کیا۔ اس لیے میں اسے رہا کرتا ہوں۔"

فیصلے کا آخری لفظ مسرّت کے طوفانی ولولے میں ڈوب گیا۔ خوشی مہینوں قیدِ فکر میں پڑے رہنے کے بعد آج جو چھوٹی تو چھوٹے ہوئے بچھڑے کی طرح قلانچیں مارنے لگی۔ لوگ متوالے ہو ہو کر ایک دوسرے کے گلے ملنے لگے۔ احباب میں دھول دھپّا ہونے لگا۔ کتنوں ہی نے اپنی اپنی ٹوپیاں ہوا میں اُچھال دیں جو مسخرے تھے انھیں جوتے اُچھالنے کی سوجھی۔ دفعتاً منّی ڈاکٹر شانتی کمار کے ساتھ متانت آمیز تبسّم سے جگمگاتی ہوئی باہر نکلی۔

گویا کوئی رانی اپنے وزیر کے ساتھ آرہی ہو۔ مجمع کی وہ ساری مدہوشی اور وحشت غائب ہوگئی۔ رانی کے سامنے کون بے ادبی کرسکتا ہے۔

جشن کا نقشہ پہلے ہی سے تیار تھا۔ گل باری کے بعد منّی کے گلے میں پھولوں کا ہار ڈالنا تھا۔ یہ فخر جج صاحب کی بیوی کو حاصل ہوا۔ جو اس فیصلے کے بعد مسجودِ عوام بن چکی تھیں۔ پھر بینڈ بجنے لگا۔ سیوا سمتی کے دو سو جوان کیسریئے بانے پہنے ہوئے جلوس کے ساتھ چلنے کو تیار تھے۔ قومی انجمن کے خادم بھی خاکی وردیاں پہنے جھنڈیاں لیے جمع ہوگئے۔ دیویوں کی تعداد ایک ہزار سے کم نہ تھی۔ تجویز کی گئی تھی کہ جلوس جمنا کے کنارے تک جائے۔ وہاں ایک عظیم الشان جلسہ ہو۔ منّی کو شہر کی طرف سے ایک بیش قرار تھیلی نذر کی جائے اور جلسہ برخاست ہوجائے۔ منّی کچھ دیر تک سکون کے عالم میں یہ ہنگامہ دیکھتی رہی۔ پھر شانتی کمار سے بولی۔ ”ڈاکٹر صاحب! آپ لوگوں نے میری جتنی عزّت کی میں اس کے لائق نہیں تھی۔ اب میری آپ سے یہی درخواست ہے کہ مجھے ہردوار یا کسی دوسرے تیرتھ استھان میں بھیج دیجیے۔ وہاں بھیک مانگ کر اور جاتریوں کی خدمت کر کے دن کاٹوں گی۔ یہ جلوس اور یہ دھوم دھام مجھ جیسی بدنصیب عورت کے لیے شوبھا نہیں دیتا۔ ان سب ہی بھائی بہنوں سے کہہ دیجیے اپنے اپنے گھر جائیں۔ میں خاک میں پڑی ہوئی تھی آپ لوگوں نے مجھے آسمان پر پہنچا دیا۔ اب اس کے اوپر جانے کی مجھ میں طاقت نہیں ہے۔ میرے سر میں چکّر آجائے گا۔ مجھے یہیں سے اسٹیشن روانہ کیجیے آپ کے پیروں پڑتی ہوں۔“

شانتی کمار اس انکسار پر حیرت میں آکر بولے۔ ”یہ کیسے ممکن ہے بہن منّی، اتنے مرد عورت جمع ہیں۔ ان کی عقیدت اور محبت کا تو کچھ لحاظ کیجیے۔ ان کی کتنی دل شکنی ہوگی۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ لوگ آپ کو چھوڑ کر کبھی نہ جائیں گے۔“

”آپ لوگ میرا سوانگ بنا رہے ہیں۔“

”ایسا نہ کہو۔ بہن! تمھاری عزّت کر کے ہم خود عزّت پا رہے ہیں اور تمھیں ہردوار جانے کی ضرورت کیا ہے۔ تمھارا شوہر تمھیں اپنے ساتھ لینے کے لیے آیا ہوا ہے۔“

منّی نے ڈاکٹر صاحب کی طرف تعجب سے دیکھا۔ ”میرا شوہر مجھے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آیا ہوا ہے۔ آپ نے کیسے جانا؟“

"مجھ سے تھوڑی دیر پہلے ملا تھا۔"
"کیا کہتا تھا؟"
"یہی کہ میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گا، اور اسے اپنے گھر کی دیوی سمجھوں گا۔"
"اس کے ساتھ کوئی بچّہ بھی تھا؟"
"ہاں تمھارا چھوٹا بچّہ اس کی گود میں تھا۔"
"بچّہ بہت دُبلا ہو گیا ہوگا؟"
"نہیں ایسا دُبلا تو نہیں تھا۔"
"خوش بھی تھا؟"
"ہاں خوب ہنس رہا تھا۔"
"میرے سامنے تو رویا نہیں۔"
"اب تو چاہیے پاؤں پاؤں چلنے لگا ہوگا؟"
"باپ کی گود میں تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چلتا ہوگا۔"
"اچھا ان کی کیا حالت تھی۔ بہت دُبلے ہوگئے ہیں؟"
"ہاں بہت پریشان نظر آتے تھے۔ یہیں کہیں ہوں گے۔ کہو تو تلاش کروں۔ شاید خود آتے ہوں۔"

منّی نے ایک لمحے کے بعد دردناک لہجے میں کہا۔ "نہیں انھیں میرے پاس نہ آنے دیجیے۔ میں آج ہی یہاں سے چلی جاؤں گی۔ شوہر اور بیٹے کی الفت میں پڑکر ان کا ستیاناس نہ کروں گی۔ یہ دھوم دھام دیکھ کر میرے شوہر مجھے ساتھ لے جانے پر تیار ہوگئے ہوں گے۔ لیکن ان کے دل میں کیا ہے میں جانتی ہوں۔ اب وہ میرے ساتھ رہ کر خوش نہیں رہ سکتے۔ میں اسی قابل ہوں کہ کسی ایسی جگہ چلی جاؤں جہاں مجھے کوئی نہ جانتا ہو۔ وہیں مزدوری کرکے یا بھیک مانگ کر اپنا پیٹ پال لوں گی۔"

وہ ایک لمحہ چُپ رہی، شاید دیکھتی تھی کہ ڈاکٹر صاحب کیا جواب دیتے ہیں جب انھوں نے کوئی جواب نہ دیا تو اس نے کانپتی ہوئی لیکن بلند آواز میں مجمع کو مخاطب کیا۔

"بہنو اور بھائیو! آپ نے جتنی میری آؤبھگت کی ہے اس کے لیے میں آپ کی کہاں تک بڑائی کروں۔ آپ نے ایک ابھاگنی کی لاج رکھ لی۔ اب مجھے جانے دیجیے۔ میں اسی

لائق ہوں کہ اپنا کالا منہ چھپائے کسی کونے میں پڑی رہوں۔ اس لائق نہیں ہوں کہ میری دُرگت کا مہاتم کیا جائے۔"

مجمع نے بہت شوروغل مچایا۔ دیویوں نے سمجھایا۔ معززین نے اصرار کیا، لیکن منّی جلوس پر راضی نہ ہوئی۔ آخر مجبور ہوکر ڈاکٹر صاحب نے مجمع کو رخصت کیا۔ اور منّی کو موٹر میں بٹھایا۔

منّی نے کہا۔ "اب مجھے کسی دور کے اسٹیشن پر لے چلیے۔ جہاں ایک بھی آدمی نہ ہو۔"

ڈاکٹر صاحب نے اِدھر اُدھر منتظر آنکھوں سے دیکھ کر کہا۔ "اتنی جلدی نہ کرو، بہن، تمھارا شوہر آتا ہوگا۔ جب یہ لوگ رخصت ہوجائیں گے تو وہ ضرور آئے گا۔"

منّی نے دل شکن انداز سے کہا۔ "اب ان سے نہیں ملنا چاہتی بابو جی، کبھی نہیں۔ انھیں اپنے سامنے دیکھتے ہی شاید مارے شرم کے میری جان نکل جائے۔ میں سچ کہتی ہوں میں مرجاؤں گی۔ آپ مجھے یہاں سے جلدی لے چلیے۔ اپنے بچّے کو دیکھ کر میرے دل میں ایک ایسی آندھی اُٹھے گی کہ دھرم اور بچار سب اس میں اُڑجائیں گے۔ اس موہ میں بھول جاؤں گی کہ میرا کلنک اس کی زندگی برباد کردے گا۔ میرا جی نہ جانے کیسا ہو رہا ہے۔ آپ مجھے یہاں سے جلد لے چلیے میں ان آنکھوں سے اسے نہیں دیکھنا چاہتی۔"

شانتی کمار نے موٹر چلا دی مگر دس بیس ہی گز گئے ہوں گے کہ منّی کا شوہر بچّے کو گود میں لیے دوڑتا اور موٹر روکو! موٹر روکو! پکارتا چلا آتا تھا۔ منّی کی اس پر نظر پڑی۔ اس نے موٹر کی کھڑکی سے سر نکال کر ہاتھ سے منع کرتے ہوئے چلّاکر کہا۔ "نہیں نہیں تم مت آؤ، میرے پیچھے مت آؤ۔ ایشور کے لیے مت آؤ۔"

پھر اس نے دونوں بازو پھیلا دیے گویا بچّے کو گود میں لے رہی ہو۔ اور غش کھاکر گر پڑی۔ شانتی موٹر تیزی سے چلا رہا تھا۔ نوجوان ٹھاکر بچّے کو لیے کھڑا رو رہا تھا۔ اور کئی ہزار آدمی موٹر کی طرف تک رہے تھے۔"

(۱۳)

منّی کے بَری ہونے کی خبر آناً فاناً سارے شہر میں پھیل گئی۔ ایسے خاطر خواہ فیصلے کی اُمید بہت کم آدمیوں کو تھی۔ کوئی کہتا تھا کہ جج صاحب کی بیوی نے شوہر سے لڑکر یہ

فیصلہ کرایا ہے۔ روٹھ کر میکے چلی جارہی تھی۔ بیوی جب کسی بات پر اڑ جائے تو شوہر مجبور ہوجاتا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا سرکار نے جج صاحب کو حکم دے کر یہ فیصلہ لکھوایا ہے۔ کیونکہ بھکارن کو سزا دینے سے شہر میں فساد ہوجانے کا اندیشہ تھا۔ امرکانت اس وقت جشن اور دعوت کے انتظام میں مصروف تھا۔ مگر یہ خبر پاکر ذرا دیر کے لیے سب کچھ بھول گیا۔ اور اس فیصلے کی ساری کارگزاری خود لینے لگا۔ گھر میں جاکر راما دیوی سے بولا۔ ''آپ نے دیکھا اماں جی۔ میں کہتا نہ تھا کہ منّی کو بری کراکے دم لوں گا! وہی ہوا، وکیلوں اور گواہوں کے ساتھ کتنا سر مغزن کرنا پڑا ہے کہ میرا دل ہی جانتا ہے۔'' باہر آکر دوستوں سے اور سامنے کے دکانداروں سے بھی اس نے یہی ڈینگ ماری۔

ایک دوست نے کہا۔ ''مگر عورت ہے دُھن کی پکّی۔ شوہر کے ساتھ نہ گئی نہ گئی، بے چارہ پیروں پڑتا رہ گیا۔'' امرکانت نے بزرگانہ گلہ مندی کے ساتھ کہا۔ ''جو کام خود نہ دیکھو وہی چوپٹ ہوجاتا ہے۔ میں تو اِدھر پھنس گیا۔ اُدھر کسی سے اتنا بھی نہ ہوسکا کہ اس عورت کو سمجھاتا۔ میں ہوتا تو مجال تھی کہ یوں چلی جاتی۔ میں جانتا کہ یہ حال ہوگا تو سارے کام چھوڑ کر چلا جاتا اور اسے سمجھاتا۔ میں تو سمجھتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب اور بیسیوں آدمی ہیں۔ میرے نہ رہنے سے ایسا کیا گھی کا گھڑا لڑھکا جاتا ہے لیکن وہاں کسی کو کیا پروا۔ نام تو ہوگیا کام ہو یا جہنّم میں جائے۔''

لالہ سمرکانت نے جشن اور دعوت میں بڑی فیاضی سے کام لیا۔ وہی امرکانت جو ان دور از کار رسوم کی برائیاں کرتے کبھی نہ تھکتا تھا۔ اب منہ تک نہ کھولتا۔ بلکہ اُلٹے اور بڑھاوے دیتا تھا۔ جو اہل مقدرت ہیں وہ ایسے موقعوں پر نہ خرچ کریں تو کب کریں۔ دولت زینت یہی ہے۔ ہاں گھر پھونک تماشا نہ دیکھنا چاہیے۔

امرکانت کو اب گھر سے خاص دل بستگی ہوتی جاتی تھی۔ یونیورسٹی تو جانے لگا تھا۔ لیکن جلسوں اور سبھاؤں سے جی چراتا تھا۔ اب اسے لین دین پر اتنا اعتراض نہ تھا۔ شام سویرے دُکان پر آبیٹھتا اور بڑی تن دہی سے کام کرتا۔ طبیعت جزرسی کی طرف مائل ہوگئی تھی۔ خستہ حالوں پر اُسے اب بھی رحم آتا تھا۔ لیکن اب وہ دُکان کی بندھی ہوئی کوڑیوں سے تجاوز نہ کرتا۔ اس ننّھے سے شیرخوار نے اونٹ کی ننّھی سی نکیل کی طرح اس کی زندگی کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی تھی۔ شمع ضمیر کے سامنے ایک پتنگے نے آکر اس کی شعاعوں

پر پردہ ڈال دیا تھا۔

تین مہینے گزر گئے۔ شام کا وقت تھا بچّہ پالنے میں سو رہا تھا۔ سکھدا ہاتھ میں پنکھا لیے ایک مونڈھے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ زرد لاغر اندام حاملہ مادریت کے شگفتہ جلال سے جیسے کھل اُٹھی تھی اس کے حُسن میں دوشیزگی کی شوخی نہ تھی۔ ماں کا متین، آسودہ اور پُرغرور انداز تھا۔

امرکانت کالج سے سیدھا گھر آیا اور بچّے کو فکرمند نظروں سے دیکھ کر بولا۔ "اب تو بخار نہیں ہے۔"

سکھدا نے آہستہ سے بچّے کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "نہیں اس وقت تو نہیں معلوم ہوتا۔ ابھی گود میں سو گیا تھا تو میں نے لِٹا دیا۔"

امر نے اپنے کُرتے کا بٹن کھولتے ہوئے کہا۔ "میرا تو آج وہاں بالکل جی نہ لگا۔ میں تو ایشور سے یہی دُعا کرتا ہوں کہ مجھے دنیا کی کسی چیز کی آرزو نہیں ہے۔ بس یہ بچّہ خیریت سے رہے۔ دیکھو کیسا مسکرا رہا ہے۔"

سکھدا نے میٹھی سرزنش کے ساتھ کہا۔"تم ہی نے دیکھ دیکھ کر نظر لگا دی ہے۔"

"میرا جی تو چاہتا ہے اس کا بوسہ لے لوں۔"

"نہیں، سوتے ہوئے بچّے کا بوسہ نہیں لینا چاہیے۔"

دفعتاً کسی نے ڈیوڑھی میں آکر پکارا۔ امر نے جاکر دیکھا تو بڑھیا پٹھانی لٹھیا کے سہارے کھڑی ہے۔ بولا۔ "آؤ بڑی بی! تم نے سُنا ہوگا، گھر میں بچّہ ہوا ہے۔"

بُڑھیا نے اندر آکر کہا۔ "اللہ کرے جُگ جُگ جیے اور میری عمر پائے۔ کیوں بیٹا! سارے شہر کو نیوتا ہو اور ہم پوچھے تک نہ گئے۔ کیا ہمیں سب سے غیر تھے۔ اللہ جانتا ہے جس دن یہ خوش خبری سُنی دل سے یہی دعا نکلی کہ بچّے کی عمر دراز ہو۔"

امر نادم ہوکر بولا۔"ہاں یہ غلطی مجھ سے ہوئی۔ پٹھانی معاف کرو، آؤ بچّے کو دیکھو آج اسے نہ معلوم کیوں بخار آگیا ہے۔"

بُڑھیا دبے پاؤں آنگن سے ہوتی ہوئی سامنے کے برآمدے میں پہنچی۔ اور بہو کو دعائیں دیتی ہوئی بچّے کو دیکھ کر بولی۔ "کچھ نہیں بیٹا نظر کا فساد ہے۔ میں ایک تعویذ دیے دیتی ہوں اللہ چاہے گا تو ہنسنے کھیلنے لگے گا۔"

سکھدا نے انکسار سے بُڑھیا کے پیروں کو آنچل سے چُھوا، اور بولی۔ "چار دن بھی اچھا نہیں رہتا ماتا، گھر میں کوئی بڑی بوڑھی تو ہے نہیں، میں کیا جانوں کیسے کیا ہوتا ہے۔ میری امّاں ہیں مگر وہ روز تو یہاں نہیں آسکتیں، نہ میں ہی روز ان کے پاس جاسکتی ہوں۔"

بڑھیا نے پھر دعائیں دیں اور بولی۔ "جب کوئی ضرورت پڑے تو مجھے بلا لیا کرو بیٹا! میں اور کس دن کے لیے جیتی ہوں۔ ذرا تم میرے ساتھ چلو بھیّا تعویذ دے دوں۔"

بُڑھیا نے اپنے شلوکے کی جیب سے ایک ریشمی کُرتا اور ٹوپی نکالی اور بچّے کے سرہانے رکھتی ہوئی بولی۔ "یہ میرے لال کی نذر ہے۔ بہو اسے منظور کرو۔" میں اور کس لائق ہوں۔ سکینہ کئی دن سے سی کر رکھے ہوئے تھی۔ چلا نہیں جاتا تھا۔ آج بڑی ہمت کرکے آئی ہوں۔"

سکھدا کے پاس رشتے داروں کے یہاں سے بدھاوے میں آئے اچھے اچھے کپڑے رکھے ہوئے تھے۔ لیکن اس پُرخلوص تحفے سے اس کے دل کو جو مسرّت ہوئی اور کسی سے بھی نہ ہوئی تھی۔ کیونکہ اس میں امارت کا غرور، نمود کی خواہش یا رواج کی خشکی نہ تھی۔

بُڑھیا چلنے لگی تو سکھدا نے ایک پوٹلی میں اسے تھوڑی سی مٹھائی دی۔ پان کھلائے اور بروٹھے تک، اسے رخصت کرنے آئی۔ امرکانت نے باہر آکر یکہ لیا اور بُڑھیا کے ساتھ ساتھ بیٹھ کر تعویذ لینے چلا۔ گنڈے، تعویذ، جنتر منتر پر اسے اعتقاد نہ تھا۔ لیکن بُزرگوں کی دعا پر تھا، اور اس تعویذ کو وہ محض دعا سمجھ رہا تھا۔

راستے میں بُڑھیا نے کہا۔ "میں نے تم سے کچھ کہا تھا بیٹا وہ تم بھول گئے؟"

امر سچ مچ بھول گیا تھا۔ شرماتا ہوا بولا۔ "ہاں اماں مجھے یاد نہیں آئی معاف کرو۔"

"وہی سکینہ کے بارے میں۔"

امر نے ہاتھ ٹھونک کر کہا۔ "بالکل خیال نہ رہا امّاں بالکل!"

"تو اب خیال رکھنا بیٹا! میرے اور کون بیٹھا ہوا ہے جس سے کہوں، ادھر سکینہ نے اور کئی رومال بنائے ہیں۔ کئی ٹوپیوں کے پلے بھی کاڑھے ہیں۔ مگر جب چیز بکتی نہیں تو دل نہیں بڑھتا۔"

"مجھے وہ چیزیں دے دو میں بکوا دوں گا۔"

"تمھیں تکلیف ہوگی۔"

"کوئی تکلیف نہیں، اس میں کاہے کی تکلیف۔"

بڑھیا امرکانت کو گھر کے اندر نہ لے گئی، ادھر اس کی حالت اور خراب ہوگئی تھی۔ روٹیوں کے بھی لالے تھے۔ گھر کی ایک ایک انگل زمین پر افلاس کا نقش کھنچا ہوا تھا۔ ایسے گھر میں امر کو کیا لے جائے۔ بُڑھاپا بے تکلف ہونے پر بھی بے شرم نہیں ہوتا۔ وہ اسے یکّے پر چھوڑ کر اندر گئی اور ایک لمحے میں تعویذ اور رومالوں کی بُقچی لے کر آ پہنچی۔

"تعویذ اس کے گلے میں باندھ دینا۔ پھر کل مجھ سے حال کہنا۔"

"کل میری تعطیل ہے دوچار دوستوں سے تذکرہ کروں گا، ممکن ہوا تو شام تک آجاؤں گا۔"

گھر آکر امر نے تعویذ بچّے کے گلے میں باندھا اور دُکان پر جا بیٹھا۔

لالہ جی نے پوچھا۔"کہاں گئے تھے؟ دُکان کے وقت کہیں مت جایا کرو۔"

امر نے معذرت کی۔ "آج پٹھانی آگئی تھی اس نے بچّے کے لیے ایک تعویذ دینے کو کہا تھا وہی لینے چلا گیا تھا۔" لالہ جی نے اس کی طرف مطمئن نظروں سے دیکھا اور مزا لے کر بولے۔"اب تو اچھا معلوم ہوتا ہے۔ بدمعاش نے میری مونچھیں پکڑ کر کھینچ لیں۔ میں بھی بچا کو کس کر ایک گھونسا دیا۔ ہاں خوب یاد آیا تم بیٹھو میں ذرا شاستری کے پاس سے جنم پتر لیتا آؤں۔ آج انھوں نے دینے کا وعدہ کیا تھا۔" لالہ جی چلے گئے تو امرکانت گھر میں پہنچا اور بچّے کو گود میں لے کر بولا۔

"کیوں جی تم ہمارے باپ کی مونچھیں اکھاڑتے ہو؟ خبردار جو پھر ان کی مونچھیں چھوئیں، نہیں تو دانت توڑدوں گا۔"

بچّے نے ان کی ناک پکڑ لی اور جیسے ہنومان نے سورج کو نگل لیا تھا اسی طرح اس کو نگلنے کی کوشش کرنے لگا۔

سکھدا ہنس کر بولی۔ "پہلے اپنی ناک بچاؤ۔ پھر باپ کی مونچھیں بچانا۔"

سلیم نے اتنے زور سے پکارا کہ سارا گھر ہل گیا۔

امرکانت نے باہر آکر کہا۔ "تم بڑے شیطان ہو یار، ایسا چلّائے کہ میں گھبرا گیا۔ کدھر سے آرہے ہو، آؤ کمرے میں چلو۔"

دونوں بغل والے کمرے میں گئے۔ سلیم نے رات ایک غزل کہی تھی وہی سنانے آیا

تھا۔ غزل کہہ لینے کے بعد جب تک وہ امر کو سُنا نہ لے اسے چین نہ آتا تھا۔

امر نے کہا۔ ”مگر میں تعریف نہ کروں گا سمجھ لو۔“

سلیم نے ہاتھ دکھا کر کہا۔ ”شرط تو جب ہے کہ تم تعریف نہ کرنا چاہو۔ جب بھی کرو۔“

یہ دُنیائے الفت میں ہوا کرتا ہے ہونے دو
تمھیں ہنسنا مبارک ہو کوئی روتا ہے رونے دو

امر نے جھوم کر کہا۔ ”لاجواب شعر ہے بھئی، بناوٹ نہیں ہے دل سے کہتا ہوں کتنی مجبوری و مایوسی ہے واہ۔“

سلیم نے دوسرا شعر پڑھا۔

قسم لے لو جو شکوہ ہو تمھاری بے وفائی کا
کیے کو اپنے روتا ہوں مجھے جی بھر کے رونے دو

امر نے کہا۔ ”غضب کا درد ہے، رونگٹے کھڑے ہوگئے۔“

اسی طرح سلیم نے پوری غزل سنائی اور امر نے جھوم جھوم کر سُنی۔

پھر باتیں ہونے لگیں۔ امر نے پٹھانی کے رومال دکھانے شروع کیے۔

”ایک بُڑھیا رکھ گئی ہے۔ غریب عورت ہے۔ جی چاہے دو چار لے لو۔“

سلیم نے رومالوں کو دیکھ کر کہا۔ ”چیز تو اچھی ہے، لاؤ ایک درجن لیتا جاؤں۔ کس نے بنائے ہیں؟“

”اسی بڑھیا کی ایک پوتی ہے۔“

”اچھا وہی تو نہیں جو ایک بار کچہری، پگلی کے مقدمے میں گئی تھی۔ معشوق تم نے اچھا چھانٹا۔“

امرکانت نے اپنی صفائی پیش کی۔ ”قسم لے لو جو میں اس کی طرف دیکھا بھی ہو۔“

”مجھے قسم لینے کی ضرورت نہیں، وہ مبارک ہو۔ میں تمھارا رقیب بننا نہیں چاہتا۔ رومال کتنے درجن کے ہیں؟“

”جو مناسب سمجھو دے دو۔“

”اس کی قیمت کاری گر پر منحصر ہے، اگر اس حسینہ نے بنائے ہیں تو فی رومال پانچ

روپے۔ بُڑھیا نے یا کسی اور نے بنائے ہیں تو فی رومال چار آنے۔"

"تم مذاق کرتے ہو، تمھیں لینا منظور نہیں۔"

"پہلے یہ بتاؤ کس نے بنائے ہیں؟"

"بنائے تو ہیں سکینہ ہی نے۔"

"اچھا، ان کا نام سکینہ ہے۔ تو میں فی رومال پانچ روپے دے دوں گا۔ شرط یہ ہے کہ تم مجھے ان کا گھر دکھا دو۔"

ہاں شوق سے لیکن اگر تم نے کوئی شرارت کی تو میں تمھارا جانی دُشمن ہو جاؤں گا۔ ہمدرد بن کر چلنا ہو تو چلو۔ میں تو چاہتا ہوں اس کی کسی بھلے مانس سے شادی ہو جائے۔ ہے کوئی تمھاری نگاہ میں ایسا آدمی، بس یہی سمجھ لو کہ اس کی تقدیر کُھل جائے گی۔ میں نے ایسی حیادار اور سلیقہ شعار لڑکی نہیں دیکھی۔

سلیم نے مسکرا کر کہا۔ "معلوم ہوتا ہے تم خود اس پر ریجھ چکے ہو۔ مگر حسن میں وہ تمھاری بیوی کے تلوے کے برابر بھی نہیں۔"

امرکانت نے مبصرانہ انداز سے کہا۔ "عورت میں صورت ہی سب سے زیادہ قابلِ تعریف چیز نہیں ہے، بھائی جان! میں تم سے سچ کہتا ہوں اگر میری شادی نہ ہوئی ہوتی اور مذہب ہمارے درمیان حائل نہ ہوتا تو مین اس سے شادی کرکے اپنے کو خوش نصیب سمجھتا۔"

یہ تو میں خود نہیں سمجھ رہا ہوں، شاید اس کا بھولاپن ہو۔ تم خود کیوں نہیں کرلیتے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ اس کے ساتھ تمھاری زندگی جنت بن جائے گی۔

سلیم نے مشتبہ انداز سے کہا۔ "میں نے اپنے دل میں جس عورت کا نقشہ کھینچ رکھا ہے وہ کچھ اور ہی ہے شاید ویسی عورت میری خیالی دنیا کے باہر کہیں ہوگی بھی نہیں۔ میری نگاہ میں ایسا کوئی آدمی آئے گا تو بتاؤں گا۔ اس وقت تو یہ رومال لیے لیتا ہوں، پانچ روپے سے کیا کم دوں۔ سکینہ سلائی کا کام بھی کرلیتی ہوگی؟ مجھے امید ہے میرے گھر سے اسے کافی کام مل جائے گا۔ اور تمھیں بھی ایک دوستانہ صلاح دیتا ہوں۔ میں تم سے بدگمان نہیں ہوں لیکن وہاں زیادہ آمد و رفت نہ رکھنا ورنہ بدنام ہوجاؤگے۔ تم چاہے کم بدنام ہو لیکن اس غریب کی تو زندگی ہی خراب ہوجائے گی۔ ایسے بھلے آدمیوں کو یہاں کمی نہیں

ہے جو اس معاملے کو مذہبی رنگ دے کر تمھارے پیچھے پڑجائیں گے۔ اس کی مدد تو کوئی نہ کرے گا لیکن تمھارے اوپر انگلی اٹھانے والے بہتیرے نکل آئیں گے۔"

امرکانت کے مزاج میں حددرجہ تحمل تھا۔ لیکن اس وقت وہ برہم ہوگیا۔ بولا۔"مجھے ایسے کمینے آدمیوں کی پرواہ نہیں ہے۔ اپنا دل صاف ہو تو کسی بات کا غم نہیں۔"

سلیم نے ذرا بھی بُرا نہ مان کر کہا۔ "تم ضرورت سے زیادہ سیدھے ہو یار! مجھے خوف ہے کسی آفت میں نہ پھنس جاؤ۔"

دوسرے دن امرکانت نے دُکان بڑھائی اور جیب میں پانچ روپے رکھے، پٹھانی کے گھر جا پہنچا۔ وہ سوچ رہا تھا سکینہ روپے پاکر کتنی خوش ہوگی۔

اندر سے آواز آئی "کون ہے؟"

امرکانت نے اپنا نام بتلایا۔

دروازہ فوراً کُھل گیا اور امرکانت نے اندر قدم رکھا۔ مگر چاروں طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا، پوچھا "آج چراغ نہیں جلایا اماں؟"

سکینہ آہستہ سے بولی "تیل تو ہے۔"

"پھر چراغ کیوں نہیں جلایا کیا دیا سلائی نہیں ہے؟"

"دیاسلائی بھی ہے۔"

"تو پھر چراغ جلاؤ۔ کل جو رومال لے گیا تھا وہ پانچ روپے میں بِک گئے ہیں۔ یہ روپے لے لو جھٹ پٹ چراغ جلاؤ۔"

سکینہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی سسکیوں کی آواز سُنائی دی۔

امر نے چونک کر پوچھا۔ "کیا بات ہے سکینہ! تم رو کیوں رہی ہو؟"

سکینہ نے سسکتے ہوئے کہا۔ "کچھ نہیں آپ جایئے، میں اماں کو روپے دے دوں گی۔"

امر نے بے قرار ہوکر کہا۔ "جب تک تم بتا نہ دوگی میں نہ جاؤں گا۔ تیل نہ ہو میں لادوں، دیاسلائی نہ ہو میں لادوں۔ کل ایک لیمپ لیتا آؤں گا۔ ڈبیا کے سامنے بیٹھ کر کام کرنے سے آنکھیں خراب ہوجاتی ہیں۔ چلتے وقت یاد ہی نہ رہی ورنہ ٹارچ لیتا آتا۔ گھر کے آدمی سے کیا پردہ۔ میں کہیں غیر سمجھتا تو اس طرح باربار کیوں آتا۔"

سکینہ سامنے کے سائبان میں جاکر بولی۔ "میرے کپڑے گیلے ہیں۔ آپ کی آواز سن کر میں نے چراغ بجھا دیا۔"

"تو گیلے کپڑے کیوں پہن رکھے ہیں؟"

"کپڑے میلے ہوگئے تھے۔ صابن لگا کر رکھ دیئے تھے اب اور کچھ نہ پوچھیے۔ کوئی دوسرا ہوتا تو میں دروازہ نہ کھولتی۔

امرکانت کلیجہ مسوس کر رہ گیا۔ اُف اتنا افلاس، پہننے کو کپڑے تک نہیں اور کل پٹھانی اس کے یہاں بدھاوے میں ریشمی کپڑے لے کر گئی تھی۔ اس افلاس میں یہ وضع داری۔ دو روپے سے کیا کم خرچ ہوئے ہوں گے۔ دو روپے میں دو پاجامے بن سکتے تھے۔ ان غریبوں کا حوصلہ کتنا بلند ہے، کتنا وسیع۔ رسوم کے لیے بھی کس حد تک قربانیاں کرنے کو تیار رہتے ہیں۔

اس نے درد سے کانپتے ہوئے لہجے میں سکینہ سے کہا۔ "تم چراغ جلا لو میں ابھی آتا ہوں۔"

چوک تک وہ ہوا کی رفتار سے گیا مگر بازار بند ہوچکا تھا۔ اب کیا کرے۔ سکینہ اب تک گیلے کپڑے پہنے بیٹھی ہوگی۔ آج دُکان داروں نے اتنی جلد کیوں دُکانیں بند کردیں۔ ابھی تو ایسی دیر نہیں ہوئی۔

وہ اسی رفتار سے گھر چلا۔ سکھدا کے پاس پچاس ساڑیاں ہیں۔ کیا ان میں وہ دو ساڑیاں نہ دے گی۔ مگر وہ پوچھے گی کیا کروگے تو وہ کیا جواب دے گا۔ صاف صاف کہنے سے تو شاید وہ بدگمان ہوجائے۔ نہیں اس وقت صفائی پیش کرنے کا موقع نہ تھا۔ سکینہ اس وقت گیلے کپڑے پہنے اس کا انتظار کر رہی ہوگی۔ سکھدا نیچے تھی وہ دبے پاؤں اوپر چلا گیا۔ صندوق کھولا اور اس میں سے چار ساڑیاں نکال کر دبے پاؤں چل دیا۔

سکھدا نے پوچھا۔ "اب کہاں جا رہے ہو، کھانا کیوں نہیں کھالیتے؟"

امر نے بروٹھے میں آکر جواب دیا۔ "ابھی آتا ہوں۔"

کچھ دور جانے پر اس نے سوچا۔ کل کہیں سکھدا نے اپنا صندوق کھولا اور اسے ساڑیاں نہ ملیں تو بڑی مشکل پڑے گی۔ نوکروں کے سر ہوجائے گی۔ کیا اس وقت وہ یہ کہنے کے لیے تیار ہوجائے گا کہ وہ ساڑیاں میں نے غریب عورت کو دے دیں۔ نہیں اس

میں اتنی جرأت نہیں ہے۔ تو کیا ساڑیاں لے جاکر رکھ دے؟ مگر وہاں سکینہ گیلے کپڑے پہنے بیٹھی ہوگی۔ پھر خیال آیا سکینہ ان ساڑیوں کو پاکر کتنی خوش ہوجائے گی۔ اس خیال نے اسے متوالا کردیا۔ وہ جلد جلد قدم بڑھاتا ہوا سکینہ کے گھر جا پہنچا۔

سکینہ نے اس کی آواز سنتے ہی دروازہ کھول دیا۔ چراغ جل رہا تھا۔ سکینہ نے اتنی دیر میں آگ جلا کر کپڑے خشک کرلیے تھے اور کرتا پاجامہ پہنے اوڑھنی اوڑھے کھڑی تھی۔ امر نے ساڑیاں چارپائی پر رکھ دیں اور بولا۔ "بازار میں نہ ملیں گھر جانا پڑا۔ ہمدردوں سے پردہ نہ رکھنا چاہیے۔"

سکینہ نے ساڑیوں کو لے کر دیکھا اور شرمائی ہوئی بولی۔ "بابو جی۔ آپ ناحق ساڑیاں لائے، اماں دیکھیں گی تو جل اُٹھیں گی۔ پھر شاید آپ کا آنا بھی مشکل ہوجائے۔ آپ کی شرافت اور ہمدردی کی جتنی تعریف کرتی تھیں اس سے میں نے کہیں زیادہ پایا۔ مگر یہی مناسب ہے کہ آپ یہاں زیادہ نہ آیا کریں۔ نہیں خواہ مخواہ لوگوں کو شبہ ہوگا۔ میری وجہ سے کوئی آپ پر شبہ کرے یہ مجھے گوارا نہیں۔"

آواز کتنی میٹھی تھی۔ انداز میں کتنا انکسار، کتنا اعتماد، کتنا اپناپن اور اس کے ساتھ ہی کتنی دوراندیشی۔ لیکن اگر بُڑھیا اس بے لوث ہمدردی کو شبہے کی نظر سے دیکھے تو یقیناً اس کا آنا جانا بند ہوجائے گا۔ اس نے اپنے دل کو ٹٹول کر دیکھا اس قسم کے شبہے کا کوئی سبب ہے۔ اس کا دل صاف تھا، نفس کی تحریک کا شائبہ بھی نہ تھا۔ پھر بھی اس دروازے کا بند ہوجانا ایک ایسا امکان تھا جس نے اسے متوحش کردیا۔ اس کی پامال اور محکوم بشریت یہیں اپنی فطری صورت میں نمودار ہوسکتی تھی۔ سکھدا کی شوکت، امارت اور آزاد روی جیسے اس کے سر پر سوار رہتی تھی۔ اس کے برعکس سکینہ اس کی خودداری کو متحرک کرتی تھی۔ اس کا حسنِ عمل سکینہ کی معصومیت کو اس طرح اپنے سائے میں لینا چاہتا تھا کہ اسے ہوا بھی نہ لگے۔ سکھدا اس کا دفتر تھی، سکینہ اس کا گھر۔ وہاں خادم تھا یہاں مخدوم۔ اس نے ساڑیاں اُٹھالیں اور دردمند لہجے میں بولا۔ "اگر یہ اندیشہ ہے تو میں اُن ساڑیوں کو لیے جاتا ہوں۔ لیکن کہہ نہیں سکتا کہ مجھے اس کا کتنا رنج ہے۔ رہا میرا آنا جانا اگر تمھاری منشا یہ ہے کہ میں نہ آؤں تو میں بھول کر بھی نہ آؤں گا۔ لیکن دوسروں کی انگشت نمائی کی مجھے پروا نہیں۔"

سکینہ نے عاجزی کے ساتھ کہا۔ "بابو جی! میں ہاتھ جوڑتی ہوں آپ میری جانب سے بدگمان نہ ہوں۔ آپ کی عنایتوں نے مجھ میں ایک ایسی اُمنگ بھر دی ہے جسے میں ایک طرح کا نشہ کہہ سکتی ہوں۔ ان سے میری تاریک زندگی میں رونق پیدا ہوگئی ہے۔ لیکن بدگوئی سے ڈرنا ہی پڑتا ہے۔"

"میں بدگوئی سے نہیں ڈرتا سکینہ! رتّی بھر بھی نہیں۔"

لیکن ایک لمحے میں وہ صورتِ حال سمجھ گیا اور بولا۔ "مگر تم ٹھیک کہتی ہو، دُنیا چاہے اور کچھ نہ کرے مگر بدنام تو کرہی سکتی ہے۔"

دونوں ایک منٹ تک خاموش بیٹھے رہے تب امر نے کہا۔ "تھوڑے سے اور رومال بنا لینا۔ میں کپڑا بھیجوا دوں گا۔" اس نے ساڑیاں اُٹھالیں اور باہر نکل آیا۔ سکینہ نے اس کا چہرہ دیکھا معلوم ہوتا تھا رویا ہی چاہتا ہے۔ اس کے جی میں آیا ساڑیاں اس کے ہاتھ سے لے کر چھاتی سے لگا لے۔ مگر شرم نے ہاتھ نہ اُٹھانے دیا۔ امر یوں لڑکھڑاتا ہوا دروازے سے باہر نکلا گویا اب گرا، اب گرا۔

(۱۴)

امرکانت کی طبیعت پھر گھر سے اُچاٹ ہونے لگی۔ سکینہ اس کی آنکھوں میں بسی ہوئی تھی۔ سکینہ کے یہ الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ "میں اپنے دل میں ایسی طاقت ایسی امنگ پاتی ہوں۔" یہ الفاظ اس کے مردانہ احساس کو غرور آمیز مسرّت سے پُر کر دیتے تھے۔ اس کی طبیعت پھر دُکان سے نفرت کرنے لگی۔ ایک حسینہ کی بے نفس دل جوئیوں اور حیادارانہ انکسار کا مزا پاجانے کے بعد اب سکھدا کی مصلحت اندیشیاں اسے بوجھ سی معلوم ہوتی تھیں۔ وہاں ہرے ہرے پتّوں میں روکھی پھیکی چیزیں تھیں۔ یہاں سونے چاندی کے تھالوں میں انواع و اقسام کی لطیف غذائیں، پر اُس میں خلوص تھا اور اِس میں نمود و نمائش، وہ خلوص اسے اپنی جانب کھینچتا تھا۔ یہ نمائش اسے اپنی طرف سے ہٹاتی تھی۔ بچپن ہی میں وہ ماں کی محبت سے محروم ہوگیا تھا۔ زندگی کے پندرہ سال اس نے ناخوش گوار حالات میں بسر کیے تھے۔ کبھی ماں ڈانٹتی، کبھی باپ بگڑتا۔ محض نینا کی ہمدردی اس کے مجروح دل پر مرہم رکھتی تھی۔ سکھدا بھی آئی تو وہی تحکم اور تمکنت لے کر۔ امر کا تشنہ کام دل کسی پیاسے طائر کی طرح محبت کا یہ ٹھنڈا سا یہ دیکھ کر اس کے نیچے آبیٹھا۔

اور وہاں ٹھنڈا سا یہ بھی تھا، پانی بھی تھا۔ طائر وہیں رم جائے تو تعجب کیا۔

اس دن سکینہ کا دل شکن افلاس دیکھ کر اس کے دل کو چوٹ لگی تھی۔ وہ شورش جو کچھ دنوں سے فرو ہوگئی تھی پھر بیدار ہوئی۔ وہ دھرم کے پیچھے لاٹھی لے کر دوڑنے لگا۔ ثروت کی سخت گیریوں کا اسے بچپن ہی سے تجربہ ہوتا آتا تھا۔ مذہب کی بندشیں اس سے کہیں سخت، کہیں نا قابلِ برداشت اور کہیں مہمل تھیں۔ مذہب کا کام دنیا میں اتحاد اور اتفاق پیدا کرنا ہونا چاہیے۔ یہاں مذہب نے عناد اور افتراق پیدا کردیا ہے۔ کھانے پینے میں، رسم و رواج میں مذہب کیوں مداخلت کرتا ہے۔ میں چوری کروں، خون کروں، دغا کروں، مذہب مجھ سے بازپُرس نہیں کرسکتا۔ اچھوت کے ہاتھ سے پانی لے لوں مذہب کی نگاہ میں گناہ گار ہوگیا۔ اچھا مذہب ہے۔ ہم مذہب کے دائرے سے باہر کسی سے روحانی تعلق بھی قائم نہیں کرسکتے۔ اِس مذہب نے روح کے ساتھ اخلاص و محبت کو بھی جکڑ رکھا ہے۔ یہ مذہب نہیں مذہب کا سوانگ ہے۔

امرکانت اسی ادھیڑبُن میں پڑا رہتا۔ بُڑھیا ہر مہینے اور کبھی کبھی مہینے میں دو تین بار رومالوں کی پوٹلیاں بناکر لاتی اور امر اسے مُنہ مانگے دام دے کر لے لیتا۔ راما دیوی اس کے جیب خرچ کے لیے جو روپے دیتیں وہ سب ان ہی رومالوں کی نذر ہوتے۔ سلیم بھی اس کاروبار میں اس کا شریک تھا۔ ان کے دوستوں میں ایسا کوئی نہ تھا جس نے ایک آدھ درجن رومال نہ خریدے ہوں۔ سلیم کے گھر سے سلائی کا کام بھی مل جاتا۔ بڑھیا کا سکھدا اور راما سے بھی ربط ضبط ہوگیا تھا۔ ان سے چکن کی ساڑیاں اور چادریں بنانے کا کام بھی ملنے لگا۔ لیکن اس دن سے امر بُڑھیا کے گھر نہ گیا۔ کئی بار مضبوط ارادہ کرکے گھر سے چلا۔ لیکن آدھے راستے سے لوٹ آیا۔

کالج میں ایک بار مذہب پر مباحثہ ہوا۔ امر نے اس موقعہ پر جو تقریر کی اس نے سارے شہر میں دھوم مچا دی۔ وہ انقلاب ہی میں ملک کی نجات سمجھتا تھا۔ ایسے انقلاب میں جو عالم گیر ہو۔ جو زندگی کے غلط اصولوں کا، مہلک رسوم کا اور بندشوں کا خاتمہ کردے۔ جو ایک نئے دور کا حامل ہو۔ ایک نئی دنیا آباد کرے۔ جو مٹی کے اَن گنت دیوتاؤں کو توڑ پھوڑ کر زمین دوز کردے، جو انسان کو ثروت اور مذہب کی بنیادوں پر ٹکنے والے نظامِ حکومت سے آزاد کردے۔ اس کے جسم کے ایک ایک ذرّے سے انقلاب انقلاب کی صدا

نکلتی رہتی تھی۔ لیکن صلح پسند ہندو سماج اس وقت تک کسی سے روک ٹوک نہیں کرتا جب تک کہ اس کے معاشرتی نظام پر علانیہ ضرب نہ پہنچائی جائے۔ کوئی انقلاب نہیں، انقلاب کے باوا کی تعلیم کیوں نہ دے۔ اسے خبر نہیں ہوتی لیکن تقریر کے حدود سے باہر عمل کے میدان میں کسی نے پاؤں بھی نکالا اور مذہب نے اس کی گردن پکڑی۔ امر کا انقلاب ابھی تک تقریروں اور تحریروں تک محدود ہے۔ ڈگری کا امتحان ختم ہوتے ہی وہ میدانِ عمل میں اُترنا چاہتا تھا لیکن ابھی امتحان میں ایک مہینہ باقی ہی تھا کہ ایک ایسا واقعہ ہوگیا جس نے اسے میدانِ عمل میں آنے پر مجبور کردیا۔ یہ سکینہ کا نکاح تھا۔

ایک دن شام کے وقت امرکانت دُکان پر بیٹھا ہوا تھا کہ بُڑھیا سکھدا کی چکن کی ساڑی لے کر آئی اور امر سے بولی۔ ”بیٹا اللہ کی مہربانی سے سکینہ کا نکاح طے ہوگیا۔ آٹھویں کو نکاح ہوجائے گا۔ میں نے اور سب سامان جمع کرلیا ہے۔ لیکن کچھ روپیوں سے مدد کرنا۔“

امر کی رگوں میں جیسے خون ہی خشک ہوگیا۔ وحشت کے عالم میں بولا۔”سکینہ کا نکاح! ایسی کیا جلدی تھی؟“

”کیا کرتی بیٹا! میری زندگی کا کیا بھروسا، پھر جوان لڑکی۔ بدنامی بھی تو ہے۔“

”سکینہ بھی راضی ہے؟“

بڑھیا نے اس کے اس طفلانہ سوال پر مسکرا کر کہا۔ ”لڑکیاں کبھی اپنے منہ سے کہتی ہیں بیٹا، وہ تو نہیں نہیں کیے جاتی ہیں۔“

امر نے تیز لہجے میں کہا۔ ”پھر بھی تم اس کی شادی کیے دیتی ہو؟“

پھر سنبھل کر بولا۔ ”روپے کے لیے دادا سے کہو۔“

”تم میری طرف سے سفارش کردینا، کہہ تو میں آپ لوں گی۔“

”میں سفارش کرنے والا کون ہوتا ہوں۔ دادا تمھیں جتنا جانتے ہیں اتنا میں نہیں جانتا۔“

بڑھیا کو وہیں کھڑے چھوڑ کر امر بدحواس سلیم کے پاس پہنچا۔ سلیم نے اس کی بوکھلائی ہوئی صورت دیکھ کر پوچھا۔ ”خیر تو ہے پریشان کیوں ہو؟“

امر نے دل کو قابو میں لاکر کہا۔ ”میں پریشان نہیں ہوں۔ تم خود پریشان ہوگے۔“

اچھا تو آؤ میں تمھیں اپنی تازہ غزل سناؤں۔ ایسے ایسے شعر نکالے ہیں کہ پھڑک نہ جاؤ تو میرا ذمہ۔"

امرکانت کی طبیعت اس وقت شعر و سخن کی جانب مائل نہ تھی۔ لیکن کرے کیا۔ سلیم نے مطلع پڑھا۔

بہلا کے سویرا کرتے ہیں، اس دل کو ان کی باتوں میں
دل جلتا ہے اپنا جن کی طرح برسات کی بھیگی راتوں میں

امر نے اوپری دل سے کہا۔ "شعر اچھا ہے۔"

سلیم مایوس نہ ہوا۔ دوسرا شعر پڑھا۔

کچھ میری نظر نے اٹھ کے کہا، کچھ اُن کی نظر نے جُھک کے کہا
جھگڑا جو برسوں میں چکتا، طے ہوگیا باتوں باتوں میں

امر فکرمند ہونے پر جھوم اُٹھا۔ "خوب کہا بھئی لاؤ قلم چوم لوں۔"

سلیم نے تیسرا شعر پڑھا۔

یہ یاس کا سناٹا تو نہ تھا، جب آس لگائے سُنتے تھے
مانا کہ تھا دھوکا ہی دھوکا، ان میٹھی باتوں میں

امر نے کلیجہ تھام لیا۔ غضب کا درد ہے بھئی۔ دل تڑپ اُٹھا۔"

سلیم نے چھیڑا "یہ غزل لے جاؤ ذرا اپنی معشوقہ کو سنا دینا۔ کیا بات ہے۔ ادھر ایک مہینے سے کوئی رومال نہیں بھیجا؟"

امر نے لاپروائی سے کہا۔ "اب اس کی شادی ہونے والی ہے۔ رومال کون بناتا۔ ایک ہی ہفتہ تو اور ہے۔"

"تم دُلہن کی طرف سے بارات میں جانا۔ میں دولھا کی طرف سے جاؤں گا۔"

امر یکایک تیز ہوگیا۔ اس کا چہرہ تمتما اُٹھا۔ آنکھیں نکال کر بولا۔ "لیکن میرے جیتے جی یہ شادی نہیں ہوسکتی۔ میں تم سے کہتا ہوں سلیم میں سکینہ کے دروازے پر جان دے دوں گا۔ سر پٹک کر مرجاؤں گا۔"

سلیم نے گھبرا کر پوچھا۔ "یہ تم کیسی باتیں کررہے ہو بھائی جان! کیا سچ مچ میرا گمان

صحیح تھا؟ میں تو شاعری ہی تک رہ گیا۔ تم تو معلوم ہوتا ہے حقیقت تک جا پہنچے۔"

امر نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔ "میں کچھ نہیں کہہ سکتا میری ایسی حالت کیوں ہورہی ہے سلیم، لیکن جب سے میں نے یہ خبر سُنی ہے میرے جگر پر جیسے آرا سا چل رہا ہے۔"

"آخر تم چاہتے کیا ہو۔ تم اس سے شادی تو نہیں کرسکتے۔"

"کیوں نہیں کرسکتے؟"

"بالکل بچّے نہ بن جاؤ۔ ذرا عقل سے کام لو۔"

"تمھارا یہی منشا تو ہے کہ وہ مسلمان ہے۔ میں ہندو ہوں، میں محبت کے سامنے مذہب کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتا۔ مطلق نہیں۔"

سلیم نے اسے قائل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "تمھارے خیالات تقریروں میں سن چکا ہوں، اخباروں میں پڑھ چکا ہوں۔ ایسے خیالات بہت اونچے اور پاکیزہ ہیں۔ اور کتنے ہی آدمیوں نے ان کا اظہار کرکے دنیا میں ناموری حاصل کی ہے۔ لیکن علمی بحث دوسری چیز ہے۔ اس پر عمل کرنا دوسری چیز، بغاوت پر علمی بحث کیجیے لوگ شوق سے سُنیں گے۔ بغاوت کے لیے تلوار اُٹھایئے...... گورنمنٹ ...... بس دشمن ہوجائے گی۔ علمی بحث سے کسی کو چوٹ نہیں لگتی۔۔ بغاوت سے گردنیں کٹتی ہیں۔ مگر تم نے سکینہ سے بھی پوچھا۔ اس کے کیا ارادے ہیں؟"

امر کچھ جھجکا۔ یہ نکتہ اس کے ذہن ہی میں نہ آیا تھا۔ اس نے شاید دل میں سمجھ لیا تھا۔ میرے کہنے کی دیر ہے وہ تو راضی ہے۔

"مجھے یقین ہے کہ وہ راضی ہے۔"

"کیسے یقین ہوا؟"

"اس نے ایسی گفتگو کی ہے جس کا منشا اس کے سوا اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔"

"تم نے اس سے کہا کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں؟"

"اس سے پوچھنے کی میں نے کوئی ضرورت نہ سمجھی۔"

"تو ایسی گفتگو کو جو تم سے اس نے محض ہمدردانہ طور پر کی تھی تم نے شادی کا وعدہ سمجھ لیا۔ واہ رہے آپ کی سمجھ۔ میں کہتا ہوں تم بھنگ تو نہیں کھا گئے۔ یا بہت پڑھنے

سے تمھارا دماغ تو نہیں خراب ہوگیا۔ پری سے زیادہ حسین بی بی، چاند سا بچّہ اور دنیا کی ساری نعمتوں کو آپ چھوڑ دینے پر تیار ہیں۔ اس جولاہے کی نمکین اور شاید سلیقہ دار چھوکری کے لیے۔ تم نے اسے بھی کوئی تقریر یا مضمون سمجھ رکھا ہے سارے شہر میں تہلکہ پڑجائے۔ بھونچال آجائے گا۔ شہر ہی میں نہیں سارے شمالی ہندوستان میں۔ آپ ہیں کس پھیر میں۔ جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑے تو تعجب نہیں۔"

امر کانت ان ساری مشکلات کا قیاس کرچکا تھا۔ ان سے اس کے فیصلے پر مطلق اثر نہ ہوا تھا۔ اگر اس قصور کے لیے دنیا اسے سزا دیتی تو اسے پروا نہیں۔ دنیا اس کی زندگی کو تباہ کرنے کا کوئی حق نہیں چاہتا۔ نتیجہ جو کچھ بھی ہو میں اس کے لیے تیار ہوں۔ یہ معاملہ میرے اور سکینہ کے درمیان ہے۔ سوسائٹی کو ہمارے بیچ میں دخل دینے کا کوئی مجاز نہیں ہے۔"

سلیم نے فکرمندانہ انداز سے سر ہلا کر کہا۔ "سکینہ کو اگر تم سے محبت ہے تو کبھی وہ تم سے شادی کرنا منظور نہ کرے گی۔ ہاں اگر تمھاری محبت کا تماشا دیکھنا چاہتی ہے تو شاید منظور کرلے۔ مگر میں پوچھتا ہوں اس میں ایسی کیا خوبی ہے جس کے لیے تم اتنی بڑی قربانی کرنے اور کئی زندگیوں کو خاک میں ملانے پر آمادہ ہو۔"

امر کو یہ تقریر ناگوار گزری، ناک سکوڑ کر بولا۔ "میں کوئی قربانی نہیں کر رہا ہوں اور نہ کسی کی زندگی کو خاک میں ملا رہا ہوں۔ میں صرف اس راستے پر جا رہا ہوں جدھر میرا ضمیر مجھے لے جا رہا ہے۔ میں کسی رشتے یا دولت کو اپنے گلے کی زنجیر نہیں بناسکتا۔ میں ان آدمیوں میں سے نہیں ہوں جو زندگی کی زنجیروں ہی کو زندگی سمجھتے ہیں۔ میں زندگی کی آرزوؤں کو زندگی سمجھتا ہوں۔ مجھے زندہ رکھنے کے لیے ایک ایسے دل کی ضرورت ہے جس میں آرزوئیں ہوں، تخیّل ہو، درد ہو اور سودا ہو۔ جو میرے ساتھ روسکتا ہو، میرے ساتھ چل سکتا ہو۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ میری زندگی میں روز بروز زنگ لگتا جا رہا ہے۔ ان چند سالوں میں میرا کتنا روحانی زوال ہوا ہے، اسے میں ہی سمجھتا ہوں۔ سکینہ ہی مجھے ان زنجیروں سے آزاد کرسکتی ہے۔ اسی کے ساتھ ہی میں روحانی بلندیوں پر اُڑ سکتا ہوں۔ اسی کے ساتھ ہی میں اپنے آپ کو پاسکتا ہوں۔" "تم کہتے ہو پہلے اس سے پوچھ لو۔ تمھارا خیال ہے وہ کبھی منظور نہ کرے گی۔ مجھے یقین ہے محبت جیسی انمول چیز پاکر کوئی اسے ٹھکرا ہی

نہیں سکتا۔"

سلیم نے پوچھا۔"بالفرض وہ کہے تم مسلمان ہوجاؤ۔"

"وہ ایسا نہیں کہہ سکتی۔"

"مان لو کہے تو؟"

"تو میں اُسی وقت ایک مولوی بلاکر کلمہ پڑھ لوں گا۔ مجھے اسلام میں کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی جسے میرا ضمیر قبول نہ کرتا ہو۔ سارے مذہبوں کی حقیقتیں ایک ہیں۔ حضرت محمدؐ کو خدا کا رسول مان لینے میں مجھے کوئی عذر نہیں۔ حسنِ خدمت، ایثار، رحم اور تہذیب نفس پر ہندو مذہب کی بنیاد قائم ہے۔ اسلام مجھے بدھ، کرشن اور رام کا احترام کرنے سے نہیں روکتا۔ پھر اس وقت میں اپنی خوشی سے ہندو نہیں ہوں۔ بلکہ اس لیے ہوں کہ ہندو خاندان میں پیدا ہوا۔ پھر بھی اسلام کی طرف اپنا طبعی میلان نہیں پاتا۔ ہاں سکینہ کی مرضی کے سامنے سر جھکا لوں گا۔ مگر اپنا ایمان یہ ہے کہ مذہب روح کے لیے ایک بندش ہے۔ میری عقل جسے قبول کرے وہی میرا مذہب ہے۔ باقی سب خرافات۔"

سلیم اس جواب کے لیے تیار نہ تھا۔ اس جواب نے اسے لاجواب کردیا۔ ایسے جذبات نے اس کے باطن کو کبھی ہیجان میں نہ ڈالا تھا۔ محبت کو وہ محض نفس پروری سمجھتا تھا۔ اس ذرا سی دل بستگی کو اتنا مبالغہ آمیز رنگ دے کر اس کے لیے اتنی قربانیاں کرنا، ساری دنیا میں رُسوا اور ذلیل ہونا اور چاروں طرف ایک طوفان برپا کردینا اسے جنون معلوم ہوتا تھا۔

اس نے سر ہلاکر کہا۔ "سکینہ کبھی منظور نہ کرے گی۔"

امر نے بے صبر ہوکر پوچھا۔ "تم ایسا کیوں سمجھتے ہو؟"

"اس لیے کہ اگر اسے ذرا بھی عقل ہے تو وہ ایک خاندان کو کبھی تباہ نہ کرے گی۔"

"اس کے یہ معنی ہیں کہ اسے میرے خاندان کی محبت مجھ سے زیادہ ہے۔ پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میرا خاندان کیوں تباہ ہوجائے گا۔ دادا کو اور سکھدا کو دولت مجھ سے زیادہ پیاری ہے۔ بچّے کو میں اسی طرح پھر بھی پیار کرسکتا ہوں۔ زیادہ سے زیادہ اتنا ہی ہوگا کہ میں گھر میں نہ جاؤں گا، اور ان کے گھڑے مٹکے نہ چھوؤں گا۔"

سلیم نے پوچھا۔ ”ڈاکٹر شانتی کمار سے بھی اس کا ذکر کیا ہے؟“

امر نے جیسے سلیم کی کوتاہ فہمی پر مایوس ہوکر کہا۔ ”میں نے ان سے ذکر کرنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ تم سے بھی میں صلاح لینے نہیں آیا ہوں۔ صرف دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے آیا ہوں۔ میرا ارادہ پختہ ہوچکا ہے۔ اگر سکینہ نے مایوس کردیا تو زندگی کا خاتمہ کردوں گا۔ راضی ہوگئی تو ہم دونوں چپکے سے کہیں چلے جائیں گے۔ کسی کو بھی خبر نہ ہوگی۔ دوچار مہینے بعد گھر والوں کو اطلاع دے دوں گا۔ نہ کوئی تہلکہ مچے گا نہ کوئی طوفان اُٹھے گا۔ یہ ہے میرا پروگرام۔ میں اسی وقت اس کے پاس جاتا ہوں اگر اس نے منظور کرلیا تو لوٹ کر پھر یہیں آؤں گا۔ اور انکار کردیا تو تم میری صورت نہ دیکھو گے۔“

یہ کہتا ہوا وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور تیزی سے سکینہ کے گھر کی طرف چلا۔ سلیم اسے روکنے کا ارادہ کرکے بھی نہ روک سکا۔ شاید وہ سمجھتا تھا کہ اس وقت اس کے سر پر بھوت سوار ہے۔ کسی کی نہ سُنے گا۔

ماگھ کی رات، کڑا کے کی سردی۔ آسمان پر دھواں چھایا ہوا۔ امرکانت ایک محویت کے عالم میں چلا جا رہا ہے۔ اسے سکینہ پر غصہ آنے لگا۔ خط تک نہ لکھا۔ کسی سے کہلوایا تک نہیں۔ پھر یکایک اس کے دل میں ایک عجیب وحشت کا غلبہ ہوا۔ سکینہ کہیں بُرا نہ مان جائے۔ ممکن ہے بُڑھیا نے اس کی رضامندی سے نکاح طے کیا ہو۔ ممکن ہے اس آدمی کی اس کے یہاں آمد و رفت بھی ہو۔ غالبًا وہ اس وقت وہاں بیٹھا بھی ہو۔ اگر ایسا ہوا تو امر وہاں سے چپ چاپ چلا جائے گا۔ کہیں بُڑھیا آگئی ہو تو اور مشکل پڑے۔ اس کے روبرو سکینہ سے کچھ کہہ ہی نہ سکے۔ وہ سکینہ سے تخلیہ میں بات کرنے کا موقع چاہتا تھا۔

سکینہ کے دروازے پر پہنچا تو اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ اس نے ایک لمحہ کان لگا کر سُنا کسی کی آواز نہ سُنائی دی۔ آنگن میں روشنی تھی۔ شاید سکینہ اکیلی ہے۔ منہ مانگی مراد ملی۔ آہستہ سے زنجیر کھٹکھٹائی۔ سکینہ نے پوچھ کر فوراً دروازہ کھول دیا اور بولی۔ ”اماں تو آپ ہی کے یہاں گئی ہوئی ہیں۔“

امر نے کھڑے کھڑے جواب دیا۔ ”ہاں مجھ سے ملی تھیں اور انھوں نے جو خبر سنائی وہ ایک بم کے گولے کی طرح مجھ پر پھٹ پڑی۔ میں بالکل ہوش میں نہیں ہوں۔ ابھی تک میں نے اپنے دل کا راز تم سے چھپایا تھا۔ اور سوچا تھا کہ اسے کچھ دن اور چھپائے

رہوں گا۔ لیکن اس خبر نے مجھے مجبور کردیا۔ کہ یہ راز تم سے کہوں۔ تم سُن کر جو فیصلہ کروگی اسی پر میری زندگی کا دارومدار ہے۔ نہیں کہہ سکتا کہ یہ آگ میرے دل میں کیوں کر لگی۔ لیکن جس دن تمھیں پہلی بار دیکھا اسی دن سے ایک چنگاری سی اندر بیٹھ گئی اور اب وہ ایک شعلہ بن گئی ہے۔ اگر اسے جلد بجھایا نہ گیا تو مجھے جلاکر خاک کردے گی۔ میں نے بہت ضبط کیا ہے سکینہ! گھٹ گھٹ کر رہ گیا ہوں۔ تمھارے قدموں پر میں اپنا سب کچھ قربان کرچکا ہوں۔"

وہ اپنی محبت کی داستان نہ جانے کتنی دیر تک سناتا رہا۔ جیسے تناسب اور توازن کا حِس ہی اس میں فنا ہوگیا ہو۔ جو باتیں کہنی چاہیے تھیں وہ بھی کہیں اور جو نہ کہنی چاہیے تھیں وہ بھی کہہ ڈالیں۔ اپنا گھر اب اس کے لیے جیل خانے سے بدتر تھا۔ اس کی حسین بی بی اس کے لیے سنگِ مرمر کی خوب صورت مورت تھی جس میں دل نہیں، درد نہیں۔ سکینہ کو پاکر اس کی ساری آرزوئیں پوری ہوجائیں گی۔

سکینہ جیسے گھبرا گئی۔ جہاں اس نے ایک ایک چٹکی آٹے کی امید کی تھی وہاں سخی نے اس کے سامنے بورے کھول کر رکھ دیئے۔ اس کے چھوٹے سے قدح میں اتنا ظرف کہاں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ان نوازشوں کو کیسے سمیٹے۔ آنچل اور دامن سب کچھ بھرجانے پر بھی تو نہ سمٹ سکے گی۔ اس کی آنکھیں آب گوں ہوگئیں۔ دل ایک بار اُچھلا پھر بیٹھ گیا۔ سر جھکا کر شرمائی ہوئی بولی۔"بابوجی! خدا جانتا ہے میرے دل میں آپ کی کتنی عزت اور محبت ہے۔ میں نے آپ کو اب تک اپنے محسن کے روپ میں دیکھا ہے اور چاہتی ہوں کہ ہمیشہ اسی روپ میں دیکھتی رہوں۔ بھکارن راج نہیں چاہتی اسے تو ایک ٹکڑا چاہیے۔ سوچیے میں کون ہوں، ایک غریب عورت جو مزدوری کرکے اپنی زندگی بسر کرتی ہے وہ آپ کی محبت کے قابل نہیں۔ صرف رحم کے قابل ہے۔ میرے باعث آپ کی رُسوائی ہو اس سے پہلے میں اپنی زندگی کا خاتمہ کردوں گی۔"

ایسے موقعوں پر ہمارے خیالات میں شاعرانہ رنگ پیدا ہوجایا کرتا ہے۔ جذبات کی گہرائی شاعر کے لیے مخصوص ہے اور عام بول چال میں اس کا اظہار نہیں ہوسکتا۔

امر نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔"اس خیال سے تو مجھے تسکین نہ ہوگی سکینہ! تم اس خیال کو دل سے نکال ڈالو کہ میں بہت بڑا آدمی ہوں اور تم ناچیز ہو۔ میں اپنا سب کچھ

تمھارے قدموں پر نثار کرچکا اور میں اب تمھارے پجاری کے سوا اور کچھ نہیں۔"

سکینہ اس کا کیا جواب دیتی، جذبات کا ایک دریا اس کے دل میں اُنڈا ہوا تھا۔ وہ کتنی خوش نصیب ہے۔ اس کے پاس اپنے جذبات کے اظہار کے لیے آنسو کے چند قطروں کے سوا الفاظ نہیں ہیں۔ وہ نہیں جانتی اس کی زندگی کس طرف جائے گی۔ لیکن جو کچھ بھی ہو۔ اس کے جسم پر چاہے کسی کا قبضہ ہوجائے وہ دل ہمیشہ امر کا رہے گا۔ وہ اپنی محبت کو غرض سے پاک رکھنا چاہتی ہے۔ وہ اس روحانی محبت میں دنیا کو نہیں آنے دے گی۔

اس کے لیے صرف اتنا یقین کافی ہے کہ امر کے گوشۂ دل میں اس کے لیے ایک حقیر سی جگہ ہے۔ اس یقین نے اس کے دل کو اتنا مضبوط کردیا کہ وہ بڑی سے بڑی مصیبتوں کو بھی ہنس کر جھیل سکتی ہے۔ اس نے امر کو اپنے یہاں آنے سے روکا تھا۔ امر کی بدنامی کے سوا اسے اپنی بدنامی کا خوف بھی تھا۔ مگر اب اسے مطلق خوف نہیں ہے۔ دنیا اس کے لیے اب امیدوں اور نعمتوں سے بھری ہوئی نظر آرہی تھی۔

امر نے کہا۔ "تمھاری قسمت کسی غیر سے وابستہ ہو یہ میرے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔"

"میں انکار کردوں گی، میں کہہ دوں گی، اگر تم نے میری شادی کا نام بھی لیا تو میں زہر کھالوں گی۔"

دفعتاً پٹھانی نے دروازہ کھولا۔ امر نے بات بنائی۔ "میں تو سمجھتا تھا کہ تم کب کی گھر آگئی ہوگی۔ بیچ میں کہاں رہ گئیں؟"

بُڑھیا نے شکوہ آمیز لہجے میں کہا۔ "تم نے تو آج ایسا روکھا جواب دیا بیٹا کہ میں رو پڑی۔ تمھارا ہی تو مجھے بھروسہ تھا اور تم نے مجھے یہ جواب دیا۔ مگر اللہ کا فضل ہے بہو جی نے مجھ سے وعدہ کیا کہ مجھے جتنے روپے درکار ہوں گے وہ مجھے دے دیں گی۔ وہیں دیر ہوگئی، کیا تم مجھ سے کسی بات پر ناراض ہو بیٹا؟"

امر نے اس کی دل جوئی کی۔ "نہیں اماں آپ سے بھلا کیا ناراض ہوتا۔ اس وقت دادا سے ایک بات پر جھگڑا ہوگیا تھا۔ اسی کا خمار تھا۔ میں بعد کو خود شرمندہ ہوا اور تم سے معافی مانگنے دوڑا آیا، میری خطا معاف کرتی ہو؟"

بُڑھیا رو کر بولی۔ "بیٹا تمھارے ٹکڑوں پر تو زندگی کٹی۔ تم سے ناراض ہوکر خدا کو

کیا منہ دکھاؤں گی۔ اس کھال سے تمھارے پاؤں کی جوتیاں بنیں تو بھی دریغ نہ کروں۔"

"بس مجھے تسکین ہوگئی اماں، اسی لیے آیا تھا۔"

امر دروازے پر پہنچا تو سکینہ نے دروازہ بند کرکے کہا۔ "کل ضرور آنا۔"

امر پر ایک گیلن کا نشہ چڑھ گیا بولا۔ "ضرور آؤں گا۔"

"میں تمھاری راہ دیکھتی رہوں گی۔"

"کوئی چیز تمھاری نظر کروں تو ناراض تو نہ ہوگی؟"

سکینہ مسکرائی۔"دل سے بڑھ کر بھی کوئی نذر ہوسکتی ہے۔"

امر اس طرح اکڑتا ہوا جا رہا تھا گویا دنیا کی بادشاہی پا گیا ہے۔

سکینہ نے دروازہ بند کرکے دادی سے کہا۔ "تم ناحق دوڑ دھوپ کر رہی ہو اماں! میں شادی نہ کروں گی۔"

"تو کیا یوں ہی بیٹھی رہے گی؟"

"ہاں جب میری مرضی ہوگی کرلوں گی۔"

"تو کیا میں ہمیشہ بیٹھی رہوں گی؟ بھلا یہ تو سوچ دنیا کیا کہے گی۔ نکاح طے ہوچکا سارا انتظام کرچکی اور اب تو کہتی ہے شادی نہ کروں گی۔"

"ان لوگوں سے کہہ دو لڑکی راضی نہیں ہے۔ شادی کے خیال ہی سے میری روح فنا ہوتی ہے۔ تمھارے بغیر میں کیسے رہ سکوں گی۔ یہ خیال ہی نہیں کرسکتی۔ اگر تم مجھے کوئی بلا سمجھتی ہو جسے سر سے ٹالنا ضروری ہے تو شادی کرنے سے کہیں اچھا ہے کہ مجھے زہر دے دو۔"

پٹھانی نے انگیٹھی کے سامنے بیٹھ کر سر پر ہاتھ رکھ لیا اور سوچنے لگی۔ اسی لیے یہ چھوکری اتنے دن سے منہ پُھلائے بیٹھی تھی۔ یہ چپکے چپکے رونا دھونا اسی لیے تھا۔ مگر اب اسے خود معلوم ہو رہا تھا کہ سکینہ کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتی۔ وہی تو اس کی تاریک زندگی کا چراغ تھی۔ اس محبت کے خیال میں اس کی ساری تشویش غائب ہوگئی۔

سکینہ باجرے کی روٹیاں مسور کی دال کے ساتھ رغبت سے کھا کر ٹوٹی کھاٹ پر لیٹی۔ اور پُرانے پھٹے لحاف میں مارے سردی کے پاؤں سکیڑ لیے۔ مگر اس کا دل مسرّت سے لبریز تھا۔ آج اسے جو نعمت ملی تھی اس کے سامنے کونین کی ساری دولت حقیر تھی۔

امر کانت کی زندگی میں ایک نئی تحریک رونما ہونے لگی۔ اب تک گھر والوں نے اس کے ہر کام کی تحقیر کی تھی۔ سب ہی اس کی لگام کھینچتے رہتے تھے، گھوڑے میں نہ وہ دم رہا تھا نہ وہ جوش۔ لیکن اب ایک ایسا آدمی آگیا تھا جو اسے بڑھاوے دیتا تھا۔ اس کی گردن پر ہاتھ پھیرتا تھا۔ جہاں ناہمدردی یا زیادہ سے زیادہ ایک تکلف آمیز ظاہر داری تھی۔ وہاں اب ایک حسینہ کی حوصلہ انگیزیاں تھیں جو مردوں میں جان ڈال سکتی ہیں۔ اس کا طبعی میلان جو پابندیوں میں پڑکر مفلوج سا ہوگیا تھا محبت کا اشتعال پاکر متحرک اور مضطرب ہوگیا ہے۔ اپنے اندر ایسی روحانی طاقت کا احساس اسے کبھی نہ ہوا تھا۔ سکینہ اپنی محبت کی بارشوں سے اس کے میدانِ عمل کو سیراب کرتی رہتی ہے۔ وہ خود اپنی کفیل نہیں ہوسکتی مگر اس کی محبت اس فقیر کی دعا ہے جو خود بھیک مانگ کر بھی دوسروں کو نعمتوں سے مالا مال کرسکتا ہے۔ امر بغیر کسی ضرورت کے سکینہ کے پاس نہیں جاتا۔ اِس میں اب وہ شوریدہ سری بھی نہیں رہی۔ موقع محل دیکھ کر کام ہوتا ہے۔ جن درختوں کی جڑیں گہری ہوتی ہیں انھیں باربار سینچنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ زمین ہی سے رطوبت کھینچ کر بڑھتے اور پھولتے پھلتے ہیں۔

ڈِگری کا امتحان ہوا لیکن امرکانت اس میں بیٹھا نہیں۔ پروفیسروں کو یقین تھا کہ اسے امتیاز ملے گا مگر وہ اپنی ضد پر اڑا رہا۔ زندگی کی تکمیل کے لیے تعلیم کی ضرورت ہے ڈِگری کی نہیں۔ ہماری ڈِگری ہے ہمارا اخلاق، ہماری سیرت، ہمارا لطفِ حیات، ہمارا جوشِ عمل۔ اگر یہ ڈِگری نہیں ملی، اگر ہمارا ضمیر بیدار نہیں ہوا تو حروف تہجی کے دُم چھلے بے سود ہیں، اسے اس تعلیم سے ہی نفرت ہوگئی تھی۔ جب وہ اپنے پروفیسروں کو فیشن کی غلامی کرتے، غرض کے لیے ناک رگڑتے، کم سے کم کام کرکے زیادہ سے زیادہ فائدے کے لیے ہاتھ پھیلاتے دیکھتا تو اس کا جی جل جاتا تھا۔

انھیں حضرات کے ہاتھوں میں قوم کی باگ ڈور ہے۔ یہی قوم کے معمار ہیں۔ انھیں اس کی پرواہ نہیں کہ ہندوستان کی خلقت دو آنے پیسوں پر گزر کرتی ہے۔ آمدنی کا اوسط فی کس پچیس روپے سالانہ سے زیادہ نہیں۔ مگر یہ ہمارے پروفیسر ہیں جنھیں پچاس روپے روز چاہئیں۔ اس ماضی کا یاد آتی ہے جب ہمارے اتالیق جھونپڑیوں میں رہتے تھے۔

مکروہات سے دور، خودغرضیوں سے الگ، بے لوث زندگی کے نمونے، بے غرض خدمت کے مجاور، کم سے کم لے کر زیادہ سے زیادہ دیتے تھے۔ وہ حقیقی دیوتا تھے اور ایک یہ پروفیسر ہیں جو معمولی بیوپاری یا دفتری عملوں سے بہتر نہیں۔ ان میں بھی وہی تنگ دلی ہے، وہی دولت کا غرور ہے، وہی اختیار کی ہوس ہے۔ ہماری تعلیم گاہیں کیا ہیں؟ دفتری حکومت کے صیغے ہیں اور ہمارے پروفیسر اس حکومت کے پُرزے ہیں، وہ خود گمراہ ہیں، تاریک ہیں، روشنی کیا پھیلائیں گے۔ جیسے وہ خود نفس کے غلام ہیں اسی طرح اپنے شاگردوں کو بھی غلامی میں ڈالتے ہیں۔ امر کی سلف پرستی زمانے کے حالات کے تغیر کو بالکل بھول جاتی۔ اس کے خیالی نظام میں عملی خدمت کے پتلے ہوتے۔ اتالیق جھونپڑوں میں رہنے والے، رعایا، حرص اور حسد سے خالی۔ نہ یہ آئے دن کے قضیے نہ بکھیڑے، اتنی عدالتوں کی ضرورت کیا اتنے محکمے کس لیے، ایسا معلوم ہوتا ہے غریبوں کی لاش نوچنے والے گِدھوں کا غول ہے۔ جس کی جتنی اونچی تعلیم ہے اس کی حرص بھی اسی مناسبت سے بڑھی ہوئی ہے۔ یا حرص اور غرض پروری ہی تہذیب و تکمیل کی علامتیں ہیں۔ غریبوں کو روٹیاں نہ میسّر ہوں، بے چارے کپڑے کو ترستے ہوں۔ مگر ہمارے روشن خیال بھائیوں کو شان سے زندگی بسر کرنے کی سہولتیں ملنی ضروری ہیں۔ اگر اس دنیا کو انسان نے بنایا ہے تو انصاف کا خون کیا ہے خدا نے بنایا ہے تو اسے کیا کہیں۔

وہ علی الصباح اُٹھ کر شانتی کمار کے سیوا آشرم میں پہنچ جاتا، اور دو پہر تک لڑکوں کو پڑھاتا رہتا۔ یہ مدرسہ ڈاکٹر صاحب کے بنگلے ہی میں تھا۔ نو بجے تک ڈاکٹر صاحب خود پڑھاتے تھے۔ اگرچہ یہاں فیس بالکل نہ لی جاتی تھی اور تعلیم کے بہترین اور جدید اصول کی پابندی کی جاتی تھی پھر بھی لڑکوں کی تعداد بہت کم تھی۔ سرکاری مدرسوں میں جہاں فیس، جرمانے اور چندوں کی بھرمار رہتی تھی لڑکوں کو بیٹھنے کی جگہ نہ ملتی تھی۔ یہاں کوئی جھانکتا بھی نہ تھا۔ مشکل سے دو ڈھائی سو لڑکے آتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے بھولے بھالے معصوم بچّوں کا فطری نشو و نما کیسے ہو۔ وہ کیسے باہمت، قناعت پسند، سچے خادم بن سکیں۔ یہی اس کا خاص مقصد تھا۔ احساسِ حسن کو جو انسانی فطرت کا خاص جزو ہے کیوں کر غیر مستحسن حالات سے الگ رکھا جائے کہ وہ تکمیل کے درجے تک پہنچے۔ مقابلے کے بجائے ہمدردی کی تحریک کیوں کر ہو۔ دونوں دوست انھیں مسئلوں کو سوچتے رہتے تھے۔ ان کے پاس تعلیم کا

کوئی دستور العمل تیار نہ تھا۔ غایت کو سامنے رکھ کر ہی طریقِ کار کا فیصلہ کرتے تھے۔ ان کے دو معاون اور تھے۔ ایک آتما نند سنیاسی تھے جو دنیا سے منہ موڑ کر خدمت میں اپنی زندگی وقف کر چکے تھے۔ دوسرے ایک موسیقی کے ماہر تھے۔ جن کا نام تھا برج ناتھ۔ ان دونوں آدمیوں کے آجانے سے اس مدرسے کو بہت تقویت ہوگئی تھی۔ ایک دن امر نے شانتی کمار سے کہا۔ "آخر آپ کب تک پروفیسری کرتے چلے جائیں گے۔ جس درخت کو ہم جڑ سے کاٹنا چاہتے ہیں اسی سے چمٹے رہنا تو آپ کے شایانِ شان نہیں۔"

شانتی کمار نے مسکرا کر کہا۔ "میں خود یہی سوچ رہا تھا۔ بھئی تامل یہی ہے کہ روپے کہاں سے آئیں گے۔ خرچ بہت کم ہے پھر بھی پانسو میں تو کلام ہی نہیں۔"

"آپ اس کی فکر نہ کیجیے روپے کہیں نہ کہیں سے آ ہی جائیں گے۔"

"میں امیدوں پر دیوار کھڑی نہیں کرتا۔ آخر مکان کا کرایہ ہے لڑکوں کے لیے دل چسپی کے سامان ہیں۔ موسیقی کے ساز ہیں، اور بیسیوں ہی خرچ ہیں۔"

"ہم لڑکوں کو کسی درخت کے نیچے بیٹھ کر پڑھا سکتے ہیں، مکان کی کیا ضرورت ہے؟"

"تم پرواز کی دُھن میں عملی رُخ کا بالکل لحاظ نہیں کرتے۔ کوری پرواز خیالی پلاؤ ہے۔"

امر نے کہا۔ "میں تو سمجھتا تھا آپ بھی معیار پسند ہیں۔"

شانتی کمار نے گویا اس چوٹ کو ڈھال پر روک کر کہا۔ "میری معیار پسندی میں عمل کا حصہ غالب ہے۔"

"اس کا یہ مطلب ہے کہ آپ قول و فعل میں توازن ضروری نہیں سمجھتے۔"

"جب تک مجھے روپے کہیں سے نہ ملیں میں کس اعتبار پر استعفیٰ دے دوں۔ مدرسہ میں نے کھولا ہے۔ اس کے جاری رکھنے کی ذمہ داری مجھ پر ہے۔ اگر تم روپے کا کوئی مستقل انتظام کرسکتے ہو تو میں استعفیٰ دے سکتا ہوں محض امید پر میں کچھ نہیں کرسکتا۔"

امرکانت نے ابھی اصولوں کے ساتھ سمجھوتا کرنا نہ سیکھا تھا۔ میدانِ عمل میں کچھ دن رہ جانے اور دنیا کے تلخ تجربے ہوجانے کے بعد ہماری فطرت میں جو پس و پیش پیدا ہوجایا کرتا ہے۔ اس کا اسے سابقہ نہ پڑا تھا۔ نو مریدوں کو اصولوں پر جو اٹل اعتقاد ہوتا

ہے وہ اس میں بھی تھا۔ ڈاکٹر صاحب پر اسے جو اعتقاد تھا اس میں کچھ جنبش پیدا ہوئی۔ اسے معلوم ہوا یہ محض زبان کے شیر ہیں جس کا صریح الفاظ میں یہ مطلب ہے کہ وہ دنیا کو دھوکا دیتے ہیں۔ ایسے آدمیوں کے ساتھ وہ کیسے اشتراکِ عمل کر سکتا ہے۔

"تو آپ استعفیٰ نہیں دے سکتے؟"

"اُس وقت تک نہیں جب تک روپے کا کوئی معقول انتظام نہ ہو جائے۔"

"ایسی حالت میں میں یہاں کام نہیں کر سکتا۔"

ڈاکٹر صاحب نے مفاہمت کے انداز سے کہا۔ "دیکھو امر کانت مجھے دنیا کا تم سے زیادہ تجربہ ہے۔ میری اتنی عمر نئے تجربات ہی میں گزری ہے۔ میں نے اس سے جو حقیقت دریافت کی ہے وہ یہ ہے کہ ہماری زندگی سمجھوتوں ہی پر قائم ہے۔ ابھی تم مجھے جو چاہو سمجھو مگر ایک زمانہ آئے گا کہ تمھاری آنکھیں کھلیں گی اور تمھیں معلوم ہوگا کہ زندگی میں واقعیت کا درجہ مثال سے کم نہیں۔"

امر نے آسمان میں اُڑتے ہوئے کہا۔ "اصولوں پر قربان ہو جانا اس سے کہیں اچھا ہے کہ اسے دھوکا دیا جائے۔" اور اسی وقت وہاں سے چل دیا۔

پہلے سلیم سے ملاقات ہوئی۔ سلیم اس مدرسے کو مداری کا تماشا کہا کرتا تھا۔ جہاں جادو کی لکڑی چھوا دینے ہی سے سونا بن جاتا ہے۔ وہ ایم۔ اے کی تیاری میں مصروف تھا۔ اس کی آرزو تھی کہ کوئی اچھی سی ملازمت مل جائے۔ اور فراغت سے زندگی بسر ہو۔ اصلاح اور تنظیم اور قومی تحریکوں سے اسے کوئی دل چسپی نہ تھی۔ اس نے یہ خبر سُنی تو خوش ہو کر بولا۔ "تم نے بہت اچھا کیا نکل آئے میں ڈاکٹر صاحب کو خوب جانتا ہوں۔ وہ ان لوگوں میں ہیں جو دوسروں کے گھر میں آگ لگا کر اپنا ہاتھ سینکتے ہیں۔ قوم کے نام پر جان تو دیتے ہیں مگر زبان سے۔"

سکھدا بھی خوش ہوئی۔ امر کانت کا اس مدرسے کے پیچھے پاگل ہو جانا اُسے بُرا لگتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب سے اسے چڑ تھی۔ وہی امر کو انگلیوں پر نچا رہے ہیں، انھیں کے پھیر میں پڑ کر وہ دوبارہ گھر سے بے زار ہو گیا ہے۔

لیکن جب شام کے وقت امر نے سکینہ سے اس کا ذکر کیا تو اس نے ڈاکٹر صاحب کی حمایت کی۔ "میں سمجھتی ہوں ڈاکٹر صاحب کا خیال درست ہے۔ بھوکے پیٹ خدا کی یاد

بھی نہیں ہوسکتی۔ جس کے سر روزی کی فکر سوار ہے وہ قوم کی خدمت کیا کرے گا۔ اور کرے گا تو امانت میں خیانت کرے گا۔ مانا کہ درختوں کے نیچے ہی لڑکوں کی تعلیم ہوسکتی ہے۔ لیکن وہ باغ کہاں۔ مکان کے اندر بستی میں بیٹھ کر بھی لڑکوں کو پڑھایا جاسکتا ہے۔ لیکن باغ جب تک وسیع نہ ہو اور بستی سے بالکل باہر، لڑکوں کی تعلیم نہیں ہوسکتی۔ ایسی جگہ شہر میں ہے کہاں اور شہر سے باہر جائے گا، کون۔ سوچو جو آدمی اپنے اصول کے خلاف نوکری کر کے بھی ایک کام کی بنیاد ڈالتا ہے وہ اس کے لیے کتنی بڑی قربانی کر رہا ہے۔"

پٹھانی نے کہا۔ "تم اس چھوکری کی باتوں میں نہ آؤ بیٹا۔ جاکر گھر کا دھندا دیکھو۔ جس سے گرہستی کا نباہ ہو۔ یہ سیلانی پن ان لوگوں کے لیے ہے جو گھر کے نکھٹو ہیں۔ تمھیں اللہ نے عزت دی ہے، مرتبہ دیا ہے، بال بچّے دیے ہیں تم ان خرافات میں نہ پڑو۔"

امر کو اب ٹوپیاں بیچنے سے فرصت مل گئی تھی۔ بُڑھیا کو راما دیوی کے ذریعے چکن کا کام اتنا زیادہ مل جاتا تھا کہ ٹوپیاں کون کاڑھتا۔ سلیم کے گھر سے بھی کچھ نہ کچھ کام آتا ہی رہتا تھا۔ سکینہ کے گھر میں کچھ خوش حالی نظر آنے لگی ہے۔ گھر میں سفیدی ہوگئی ہے۔ دروازے پر نیا پردہ پڑگیا ہے۔ دو چارپائیاں نئی آگئی ہیں۔ چارپائیوں پر دریاں بھی نئی ہیں اور کئی نئے برتن بھی آگئے ہیں۔ اردو کا ایک اخبار بھی آنے لگا ہے پٹھانی کو اپنے اچھے دنوں میں بھی اتنی فارغ البالی نصیب نہ ہوئی تھی۔ بس اسے اگر کوئی غم ہے تو یہ کہ سکینہ شادی پر رضامند نہیں۔

امر یہاں سے چلا تو اپنی غلطی پر نادم تھا۔ سکینہ کے ایک ہی جملے نے اس کے سارے شکوک کا ازالہ کردیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب سے اسے پھر وہی عقیدت ہوگئی تھی۔ سکینہ کی دور اندیشی، معاملہ فہمی اور صاف گوئی نے اسے متحیر اور فریفتہ کرلیا تھا۔ سکینہ سے اس کا تقرب جتنا زیادہ ہوتا جاتا اتنا ہی اس کا احترام بھی زیادہ بڑھتا جاتا تھا۔ سکھدا اپنی بے نیازی اور خود پروری سے اس پر حکومت کرتی تھی۔ وہ حکومت اسے ناگوار تھی۔ سکینہ اپنے انکسار اور شیریں زبانی سے اس پر حکومت کرتی تھی وہ حکومت اسے قبول تھی۔ سکھدا میں اختیار کا غرور تھا، سکینہ میں تسلیم کی عاجزی۔ سکھدا اپنے کو شوہر سے زیادہ عقل مند سمجھتی تھی، سکینہ سمجھتی تھی میں ان کے آگے ہیچ ہوں۔

ڈاکٹر صاحب نے مُسکرا کر پوچھا۔ "تو تمھارا یہی فیصلہ ہے کہ میں استعفیٰ دے دوں۔

حق یہ ہے کہ میں نے استعفیٰ لکھ رکھا ہے اور کل دے دوں گا۔ میں تمھارا اشتراک نہیں کھو سکتا۔ میں اکیلا کچھ بھی نہیں کرسکوں گا۔ تمھارے جانے کے بعد میں غور کیا تو معلوم ہوا کہ میں بے کار ہوس میں پڑا ہوا ہوں۔''

امرکانت بھی مسکرایا۔ ''نہیں میں نے جو غور کیا تو معلوم ہوا میں غلطی پر تھا۔''

ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ ''تم مذاق کر رہے ہو۔''

''نہیں میں بے ادبی کر بیٹھا تھا اسے معاف کیجیے۔''

(۱۶)

ادھر کچھ دنوں سے امرکانت میونسپل بورڈ کا ممبر ہوگیا تھا۔ لالہ سمرکانت کا شہر میں اتنا اقتدار تھا اور لوگوں میں امرکانت اتنا ہر دل عزیز تھا کہ وہ بلا دھیلا خرچ کیے انتخاب میں آگیا۔ اس کے مقابلے پر ایک نامی وکیل صاحب کھڑے تھے۔ انھیں اس کے چوتھائی ووٹ بھی نہ ملے۔ سکھدا اور لالہ سمرکانت دونوں ہی نے امرکانت کو باز رکھنا چاہا۔ دونوں اسے گھر کے کاموں میں پھنسانا چاہتے تھے۔ اب وہ فارغ التحصیل ہوچکا تھا۔ اور لالہ جی اس کے سر سارا بار ڈال کر خود الگ ہوجانا چاہتے تھے۔ امرکانت ان متفرق کاموں میں پڑگیا تو گھر کا کام کیا خاک کرے گا۔

ایک دن گھر میں چھوٹا موٹا طوفان برپا ہوگیا۔ لالہ جی اور سکھدا ایک طرف تھے، امرکانت دوسری طرف اور نینا ثالث تھی۔

لالہ جی نے توند پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ ''دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔ صبح ہوتے ہی مدرسے جاؤ۔ شام ہو تو کانگریس میں بیٹھو۔ اب یہ نئی زحمت مول لینے کو تیار ہوگئے۔ گھر میں آگ لگا دو۔''

سکھدا نے تائید کی۔''ہاں اور کیا۔ اب تمھیں گھر کا کام دھندا دیکھنا چاہیے۔ یا ان فضول کاموں میں پھنسنا۔ اب تک تو یہ تھا کہ پڑھ رہے تھے اب تو پڑھ چکے؟ آخر گھر دیکھنے والا بھی کوئی چاہیے۔ یہ روگ تو وہ پالے جس کے گھر میں دو چار آدمی ہوں یہاں گھر ہی کا کام کیا تھوڑا ہے کہ بے گار لے بیٹھے۔''

امر نے کہا۔ ''جسے آپ روگ اور بے گار اور دردِ سر کہہ رہے ہیں۔ میں اسے ذاتی معاملات سے کم نہیں سمجھتا۔ پھر جب تک آپ ہیں مجھے کیا غم اور سچ تو یہ ہے کہ میں

اس کام کے لیے بنایا ہی نہیں گیا۔ آدمی اس کام میں سرسبز ہوتا ہے جس سے اسے دل چسپی ہو۔ لین دین خرید و فروخت میں میرا جی بالکل نہیں لگتا۔ مجھے خوف ہوتا ہے کہیں میں بنا بنایا کام بگاڑ نہ بیٹھوں۔"

لالہ جی کو یہ دلیل عذرِ لنگ معلوم ہوئی۔ پوپلے مُنہ سے پان چباتے ہوئے بولے۔"یہ سب تمھاری منٹر دی ہے اور کچھ نہیں۔ میں نہ ہوتا تو کیا تم اپنے بال بچّوں کی پرورش نہ کرتے۔ مگر تم مجھ ہی کو پیسنا چاہتے ہو۔ ایک لڑکے وہ ہوتے ہیں جو گھر سنبھال کر باپ کو آزاد کردیتے ہیں۔ ایک تم ہو کہ باپ کی ہڈّیاں تک پیس ڈالنا چاہتے ہو۔"

بات بڑھنے لگی سکھدا نے دیکھا معاملہ طول پکڑ رہا ہے تو چُپ ہوگئی۔ نینا انگلیوں سے کان بند کرکے اوپر جا بیٹھی۔ یہاں دونوں پہلوانوں میں زور آزمائی ہونے لگی۔ بیٹے میں چُستی تھی، پھُرتی تھی، لچک تھی۔ بوڑھے میں پیچ تھا، دم تھا اور تجربہ تھا۔ پُرانا پھنکیت بار بار اسے دبانا چاہتا تھا۔ مگر جوان پٹھا نیچے سے کھِسک جاتا تھا۔ اس پر کوئی وار کارگر نہ ہوتا تھا۔ آخر لالہ جی نے غضب ناک ہوکر کہا۔"تو بابا اپنے بچّے لے کر الگ ہوجاؤ۔ میں تمھارا بوجھ نہیں اُٹھا سکتا۔ اس گھر میں رہوگے تو ماہوار کرایہ اور گھر میں جو کچھ خرچ ہوگا اس کا آدھا چُپکے سے نکال کر رکھ دینا پڑے گا۔ میں نے تمھاری زندگی بھر کا ٹھیکہ نہیں لیا ہے۔ گھر کو اپنا سمجھو تو تمھارا سب کچھ ہے۔ ایسا نہیں سمجھتے تو تمھارا یہاں کچھ نہیں۔ جب میں مرجاؤں تو جو کچھ ہے آکر لے لینا۔"

امرکانت پر بجلی سی گر پڑی۔ جب تک بچّہ نہ ہوا تھا اور وہ گھر سے کچھ بے زار سا رہتا تھا۔ اس وقت اسے دو ایک بار اس امکان کا اندیشہ ہوا تھا۔ لیکن بچّے کی ولادت کے بعد سے لالہ جی کے مزاج میں اور برتاؤ میں ایک خوشگوار تغیر ہوگیا تھا۔ اب امر کو ایسے بے دردانہ جملے کا بالکل خوف نہ تھا۔ لالہ جی کو جس کھلونے کی تمنا تھی انھیں وہ کھلونا دے کر وہ بے فکر ہوگیا تھا۔ لیکن آج اسے معلوم ہوا کہ وہ کھلونا ہوس کی زنجیر کو نہ توڑ سکا۔ والد اپنے لڑکے کی سہل انگاری یا تضیع اوقات پر ناراض ہوکر لعن طعن کرے، منہ پھیلائے یہ تو اس کی سمجھ میں آتا تھا۔ لیکن والدین اپنے ہی لڑکے سے گھر کا کرایہ اور روٹی کا خرچ مانگے یہ تو بے پناہ ہوس پروری کی انتہا تھی۔ اس کا ایک ہی جواب تھا کہ وہ آج ہی سکھدا اور بچّے کو لے کر کوئی دوسرا مامن تلاش کرے۔ اور پھر باپ سے کوئی علاقہ نہ رکھے۔ اور

اگر سکھدا معترض ہو تو اس سے بھی ترک تعلق کرلے۔ اس نے مطمئن ہوکر کہا۔ ”اگر آپ کی یہی مرضی ہے تو یہی سہی۔“

لالہ جی نے کھِسیانے ہوکر کہا۔ ”ساس کے بل بوتے پر کودتے ہوگے۔“

امرکانت نے دردناک لہجے میں کہا۔ ”دادا آپ زخم پر نمک نہ چھڑکیں۔ جس باپ نے پیدا کیا جب اس کے گھر میں میرے لیے ٹھکانا نہیں تو کیا آپ سمجھتے ہیں میں ساس اور سُسر کی روٹیاں توڑوں گا۔ آپ کی دعا سے اتنا بے غیرت نہیں ہوں۔ میں مزدوری کرسکتا ہوں اور اپنی محنت کی کمائی کھا سکتا ہوں۔ میں کسی فرد و بشر سے رحم کی بھیک مانگنا اپنی خودداری کے خلاف سمجھتا ہوں۔ ایشور نے چاہا تو میں آپ کو دکھا دوں گا کہ میں مزدوری کرکے بھی خدمتِ خلق کرسکتا ہوں۔“

سمرکانت سمجھ گئے ابھی اس کا نشہ نہیں اُترا۔ دو چار مہینے خانہ داری کے چرخے میں پڑے گا تو آنکھیں کھلیں گی۔ چُپ چاپ باہر چلے گئے۔ اور امرکانت اسی وقت طیش کے عالم میں ایک مکان کی تلاش میں چلا۔ اس کے چلے جانے کے بعد لالہ جی پھر اندر آئے۔ انھیں امید تھی کہ سکھدا ان کے زخم پر مرہم رکھے گی۔ لیکن سکھدا انھیں اپنے دروازے کے سامنے دیکھ کر بھی باہر نہ نکلی۔ امرکانت کے لااُبالی پن سے اسے کوفت ہوتی تھی۔ لیکن آج لالہ جی کی یہ انسانیت سے بعید بددماغی دیکھ کر اسے امر سے ہمدردی ہوگئی تھی۔ وہ اس کا قیاس بھی نہ کرسکتی تھی کہ کوئی باپ اتنا سنگ دل ہوسکتا ہے۔ آخر یہ لاکھوں کی دولت کس کام آئے گی۔ امر گھر سے لاپروا رہتا ہے۔ یہ سکھدا کو خود بُرا معلوم ہوتا تھا۔ لالہ جی اس کے لیے لڑکے کو تنبیہ کرتے ہیں۔ یہ بھی مناسب ہی تھا۔ لیکن گھر کا کرایہ اور روٹیوں کا خرچ مانگنا یہ تو ناتا ہی توڑنا تھا۔ جب وہ ناتا ہی توڑنے پر تلے ہوئے ہیں تو وہ ان کی خوشامد کیوں کرے۔ اس نے اپنے سارے زیور اُتار ڈالے۔ آخر یہ زیور بھی تو لالہ جی ہی کے عطیے ہیں۔ ماں کی دی ہوئی چیزیں بھی اس نے اُتار پھینکیں۔ اماں نے بھی جو کچھ دیا تھا جہیز ہی میں دیا تھا۔ اسے بھی لالہ جی نے اپنی بہی میں ٹانک لیا ہوگا۔ وہ اس گھر سے محض ایک ساری پہن کر جائے گی۔ خدا اس کے بچّے کو سلامت رکھے اسے کس کی پروا ہے۔ یہ لعلِ بے بہا تو اس سے کوئی چھین نہیں سکتا۔

امر کی جانب سے اس کی ساری شکایتیں مٹ گئیں۔ آخر میونسپلٹی کے لیے کھڑے

ہونے میں کیا بُرائی تھی۔ اعزاز اور امتیاز کس کو پیارا نہیں ہوتا۔ اس ممبری کے لیے لوگ لاکھوں روپے خرچ کرتے ہیں۔ کیا یہاں جتنے ممبر ہیں سب گھر کے نکھٹو ہی ہیں۔ امر اگر دنیاداری سے گریز کرتا ہے تو کوئی ایسا بُرا نہیں کرتا۔ جس کی سزا اتنی سخت ہو۔ کوئی دوسرا آدمی بیٹے کی اس پُرجوش خدمت پر خوش ہوتا اور اپنے کو خوش نصیب سمجھتا۔

یکایک امر نے آکر کہا۔ ”تم نے آج دادا کی باتیں سُن لیں۔ اب کیا صلاح ہے؟“

”صلاح کیا ہے آج ہی یہاں سے رخصت ہوجانا چاہیے۔ اس پھٹکار کے بعد تو میں اس گھر میں پانی پینا بھی حرام سمجھتی ہوں۔ کوئی مکان ٹھیک کرلو۔“

”مکان تو ٹھیک کر آیا۔ چھوٹا سا مکان ہے۔ صاف ستھرا پہاڑی دھیرج پر۔ دس روپیہ کرایہ ہے۔“

”میں بھی تیار ہوں۔“

”تو ایک تانگہ لاؤں؟“

”کوئی ضرورت نہیں پاؤں پاؤں چلیں گے۔“

”کچھ سامان تو لے چلنا ہی پڑے گا۔“

”اس گھر میں ہمارا کچھ نہیں ہے۔ میں نے تو اپنے گہنے تک اُتار دیئے۔ مزدوروں کی عورتیں گہنے پہن کر نہیں بیٹھا کرتیں۔“

سکھدا کی یہ غیرت مندی دیکھ کر امرکانت حیرت میں آگیا۔ بولا۔ ”لیکن گہنے تو تمھارے ہیں۔ ان پر کسی کا دعویٰ نہیں۔ پھر آدھے سے زیادہ تو تم اپنے ساتھ لائی تھیں۔“

اماں نے جو کچھ دیا جہیز میں دیا۔ لالہ جی نے جو کچھ دیا یہ سمجھ کر دیا کہ گھر ہی میں تو رہیں گے۔ اب تو ہمارا اسی چیز پر دعویٰ ہوگا جو ہم اپنی کمائی سے بنوائیں گے۔“

امر فکر کے بوجھ سے دب گیا یہ تو اس طرح ناتا توڑ رہی ہے کہ ایک تار بھی باقی نہ رہے۔ زیور عورتوں کو کتنے پیارے ہوتے ہیں۔ یہ وہ جانتا تھا بیٹے اور شوہر کے بعد انھیں اگر کوئی چیز پیاری ہوتی ہے تو یہ گہنے ہیں۔ کبھی کبھی تو گہنوں کے لیے وہ اپنے بیٹے اور شوہر سے بھی تن بیٹھتی ہیں۔ ابھی زخم تازہ ہے درد نہیں ہے۔ دو چار دن کے بعد یہ بے نیازی نالۂ درد بن جائے گی پھر تو بات بات پر طعنے ملیں گے بات بات پر تقدیر پر رونا ہوگا۔ گھر میں رہنا مشکل ہوجائے گا، بولا۔ ”میں تمھیں یہ صلاح نہ دوں گا۔ سکھدا جو چیز

اپنی ہے اسے اپنے ساتھ لے چلنے میں کوئی برائی نہیں سمجھتا۔"

سکھدا نے شوہر کی طرف پُرغرور نظروں سے دیکھا اور بولی۔ "تم سمجھتے ہو میں زیوروں کے لیے ماتم کروں گی اور اپنے کو کوسوں گی۔ تم نہیں جانتے کہ عورتیں موقع پڑنے پر کتنی بڑی قربانی کرسکتی ہیں، اس تحقیر کے بعد میں زیوروں کی طرف دیکھنا بھی گناہ سمجھتی ہوں پہننا تو دور رہا۔ اگر تم ڈرتے ہو کہ میں کل ہی سے تمھاری جان کھانے لگوں گی۔ تو میں تم کو یقین دلاتی ہوں کہ اگر گہنوں کا نام بھی میری زبان پر آئے تو زبان کاٹ لینا۔ میں یہ بھی کہے دیتی ہوں کہ تمھارے بھروسے پر نہیں جارہی ہوں میں خود اپنی فکر کرسکتی ہوں اور کروں گی۔ روٹیوں میں زیادہ خرچ نہیں ہوتا۔ خرچ ہوتا ہے تکلفات میں، ایک بار امارت کی شان دل سے نکال ڈالو۔ پھر چار آنے پیسے کافی ہیں۔"

نینا بھاوج کو گہنے اُتارتے دیکھ چکی تھی۔ اس کی روح فنا ہو رہی تھی کہ اکیلے اس قلعے میں کیسے رہے گی۔ بچے کے بغیر وہ تو ایک لمحہ بھی نہیں رہ سکتی۔ اسے اپنے باپ بھائی اور بھاوج سب ہی پر غصہ آرہا تھا۔ دادا کو کیا سوجھی اتنے روپے تو گھر میں بھرے ہوئے ہیں وہ کیا ہوں گے۔ بھائی صاحب بھی اگر گھڑی بھر دُکان پر بیٹھا کرتے تو ایسی کیا قیامت آجاتی۔ بھابی کو بھی نہ جانے کیا سنک سوار ہوگئی وہ نہ جاتیں تو بھیا دو چار دن میں ضرور ہی لوٹ آتے۔ بھابی کے ساتھ اگر وہ بھی چلی جائے تو دادا کے لیے کھانا کون پکائے گا وہ بھابی کو سمجھانا چاہتی تھی لیکن کیسے سمجھائے۔ یہ دونوں تو اس طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھتے بھی نہیں۔ بھیا نے ابھی سے آنکھیں پھیر لیں۔ بچہ بھی کتنا خوش ہے۔ غریب نینا کا دل درد سے پھٹا جاتا ہے۔

اس نے جاکر لالہ جی سے کہا۔ "دادا بھابی تو سب گہنا اُتار کر رکھے جاتی ہیں۔"

لالہ جی متفکر تھے، کچھ بولے ہی نہیں، شاید سُنا ہی نہیں۔

نینا نے ذرا زور سے کہا۔ "بھابی اپنے گہنے اُتار کر رکھے جاتی ہیں۔"

لالہ جی نے بے رُخی کے ساتھ کہا۔ "تو میں کیا کروں؟"

"تم ان سے جاکر کہتے کیوں نہیں؟"

"وہ نہیں پہننا چاہتیں تو میرا کیا اختیار ہے۔"

"تمھیں نے ان سے کہا ہوگا گہنے مت لے جانا۔ کیا تم ان کے بیاہ کے بھی گہنے

لے لوگے؟"

"ہاں میں سب لے لوں گا، اس گھر میں اس کا کچھ نہیں۔"

"یہ تمھاری ہٹ دھرمی ہے۔"

"جا اندر بیٹھ بک بک مت کر۔"

"تم جاکر انھیں سمجھاتے کیوں نہیں؟"

"بڑا قلق ہے تو تو ہی کیوں نہیں سمجھاتی؟"

"میں کون ہوتی ہوں سمجھانے والی۔ تم اپنے گہنے لے رہے ہو تو وہ میرے گہنے کیوں پہننے لگیں۔"

دونوں ایک لمحہ خاموش رہے پھر نینا نے کہا۔ "مجھ سے یہ بے انصافی نہیں دیکھی جاتی۔ تم ان کے گہنے ان سے نہیں لے سکتے۔ ایسا قانون نہیں ہے۔"

"تو یہ قانون کب سے جان گئی۔ معلوم ہوتا ہے بھائی سے یہی وِدّیا سیکھتی ہے۔"

"اگر سیکھتی ہوں تو کیا بُرا کرتی ہوں۔"

"اچھا بھائی سر مت کھا۔ کہہ دیا اندر جا۔ میں کسی کو منانے سمجھانے نہیں جاتا۔ میرا گھر ہے۔ اس میں جو کچھ ہے وہ میرا ہے۔ میں نے ان چیزوں کے لیے جان کھپائی ہے۔ اپنا خون جلایا ہے کسی کو کیوں لے جانے دوں؟"

نینا نے سر جُھکا لیا اور جیسے دل پر زور ڈال کر بولی۔ "تو پھر میں بھی بھابی کے ساتھ چلی جاؤں گی۔"

لالہ جی کا چہرہ تمتما اُٹھا۔ "چلی جا میں نہیں روکتا۔ ایسی اولاد سے بے اولاد ہی رہنا اچھا۔ خالی کردے میرا گھر۔ آج ہی اب خوب ٹانگیں پھیلاکر سوؤں گا۔ یہ فکر تو نہ ہوگی آج یہ نہیں ہے، کل وہ نہیں ہے۔ تمھارے رہنے سے مجھے کون سی راحت ملتی تھی۔"

نینا سُرخ آنکھیں کیے جاکر سکھدا سے بولی۔ "بھابی میں بھی تمھارے ساتھ چلوں گی۔"

سکھدا کو اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا۔ بولی۔ "ہمارے ساتھ! ہمارا تو ابھی گھربار نہیں ہے۔ نہ پاس پیسے ہیں ،نہ برتن بھانڈے نہ نوکر چاکر، ہمارے ساتھ کیسے چلوگی۔ پھر اس محل میں کون رہے گا۔"

نینا کی آنکھیں بھر آئیں۔ "جب سکھدا ہی جا رہی ہے تو اس گھر میں اس کا کیا رکھا ہے۔"

پگلی سلّو زور سے قہقہہ مار کر بولی۔ "تم سب جنے چلے جاؤ اب میں اس گھر کی رانی بنوں گی۔ اس کمرے میں اسی پلنگ پر مزے سے سوؤں گی۔ کوئی۔ بھکاری دروازے پر آئے گا تو جھاڑو لے کر دوڑوں گی۔"

امر پگلی کے دل کی باتیں سمجھ رہا تھ۔ نینا بھی چلے گی، سلّو بھی چلے گی مگر اس گھر میں ایک ہی تو رہنے کے قابل کمرہ ہے۔ وہاں نینا کہاں رہے گی اور پگلی کے نخرے تو جینا محال کریں گے۔ نینا سے بولا۔ "تم ہمارے ساتھ چلو گی تو دادا کو کون پکا کر کھلائے گا نینا! پھر ہم کہیں دور تو نہیں جاتے ہیں۔ وعدہ کرتا ہوں ایک بار روز تم سے مل جایا کروں گا۔ تم اور سلّو دونوں یہیں رہو اور ہمیں جانے دو۔"

نینا رو پڑی۔ "تمھارے بغیر میں اِس گھر میں کیسے رہوں گی بھیّا! سوچو دن بھر پڑے پڑے کیا کروں گی۔ مجھ سے تو چھن بھر بھی نہ رہا جائے گا۔ منّو کو یاد کرکے رویا کروں گی۔ دیکھتی ہو بھابی، میری طرف دیکھتا بھی نہیں۔"

امر نے کہا۔"تو منّو کو چھوڑ جاؤں۔ کیا ہرج ہے تیرے ہی پاس رہے گا۔"

سکھدا نے مداخلت کی۔ "واہ کیسی باتیں کر رہے ہو۔ رو رو کر جان دے دے گا۔ پھر میرا جی نہ مانے گا۔"

شام کو تینوں آدمی گھر سے نکلے۔ پیچھے پیچھے سلّو بھی ہنستی چلی جاتی تھی۔ سامنے کے دُکانداروں نے سمجھا کہ یہ لوگ کہیں نیوتے جارہے ہیں۔ مگر کیا بات ہے کسی کے پاس کوئی سامان نہیں۔ لالہ سمرکانت اپنے کمرے میں بیٹھے حقّہ پی رہے تھے۔ آنکھیں اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔

ایک گھنٹہ بعد وہ اُٹھے۔ صد دروازے پر تالا دیا اور پھر کمرے میں جاکر لیٹ گئے۔ ایک دُکان دار نے آکر پوچھا۔ "بھیّا اور بی بی کہاں گئے لالہ؟"

لالہ جی نے منہ پھیر کر کہا۔ "مجھے نہیں معلوم، میں نے سب کو گھر سے نکال دیا۔ میں نے دولت اس لیے نہیں پیدا کی ہے کہ لوگ موج اُڑائیں۔ جو پیسے کو پیسا سمجھے اسے موج اُڑانے کا حق ہے۔ جو پیسے کو مٹی سمجھے اسے پیسے دینا جرم ہے۔ میں آج بھی اٹھارہ

گھنٹے روز کام کرتا ہوں۔ اس لیے نہیں کہ لڑکے دولت کو مٹی سمجھیں۔ میری ہی گود کے لڑکے مجھے آنکھیں دکھائیں۔ دولت کی دولت دوں اوپر سے دھونس بھی سہوں۔ بس زبان نہ کھولوں چاہے کوئی گھر میں آگ لگا دے۔ گھر کا کام چولھے میں جائے۔ تمھیں سبھاؤں اور جلسوں میں مزا آتا ہے تو جاؤ جلسوں میں اپنا نبھاہ بھی کرو۔ ایسوں کے لیے میرا گھر نہیں ہے۔ لڑکا وہی ہے جو کہنا سُنے۔ جب لڑکا اپنے من کا ہوگیا تو کیسا لڑکا۔"

راما کو جوں ہی سلّو نے خبر دی وہ بدحواس دوڑی آئی، گویا بیٹی اور داماد پر کوئی بڑی مصیبت آپڑی ہے، وہ کیا غیر تھی۔ اس سے کوئی ناتا ہی نہیں اور الگ مکان لے لیا۔ واہ یہ بھی کوئی لڑکوں کا کھیل ہے۔ دونوں ہی بِللے۔ یہ چھوکری تو ایسی نہ تھی مگر اس لونڈے کے ساتھ اس کا بھی سر پھر گیا۔

رات کو آٹھ بج گئے تھے ہوا ابھی تک گرم تھی۔ راما پہنچی تو تینوں جلاوطن کوٹھے کی ایک چارپائی برابر چھت پر من مارے بیٹھے تھے۔ سارے گھر میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ بے چاروں پر خانہ داری کی نئی مصیبت پڑی تھی۔ پاس ایک پیسہ بھی نہیں۔ کچھ نہ سوجھتا تھا کہ کیا کریں۔ امر نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ "ارے تمھیں کیسے خبر مِل گئی اماں جی! اچھا اس چڑیل سلّو نے جاکر کہا ہوگا۔ کہاں ہے ابھی خبر لیتا ہوں۔"

راما اندھیرے میں زینے پر چڑھنے سے ہانپ گئی تھی۔ چادر اُتارتی ہوئی بولی۔ "میں کیا دشمن تھی کہ مجھ سے اس نے کہہ دیا تو بُرائی کی۔ کیا میرے گھر نہ تھا یا میرے گھر میں روٹیاں نہ تھیں۔ میں یہاں چھن بھر تو رہنے نہ دوں گی۔ وہاں پہاڑ سا گھر پڑا ہوا ہے۔ یہاں تم سب ایک بِل میں گھسے بیٹھے ہو۔ اُٹھو ابھی، ننھا سا بچّہ مارے گرمی کے کمھلا گیا۔ یہاں چارپائیاں بھی تو نہیں ہیں اور اتنی سی جگہ میں سوؤگے کیسے؟ تو تو ایسی نہ تھی سکھدا! تجھے کیا ہوگیا؟ بڑے بوڑھے دو بات کہیں تو غم کھانا ہوتا ہے کہ گھر سے نکل کھڑے ہوتے ہیں کیا ان کے ساتھ تیری عقل بھی گھاس کھا گئی۔"

سکھدا نے ساری داستان کہہ سنائی اور اس پیرائے میں کہ راما کو بھی لالہ سمرکانت ہی کی زیادتی معلوم ہوئی۔ "انھیں اگر اپنی دولت کا غرور ہے تو اسے لیے بیٹھے رہیں مرنے لگیں تو ساتھ لیتے جائیں۔"

امر نے کہا۔ "دادا کو یہ خیال نہ ہوگا کہ یہ سب کے سب گھر سے چلے جائیں

گے۔"

سکھدا کا غصہ اِس قدر جلد فرو ہونے والا نہ تھا۔ بولی۔"چلو، انھوں نے صاف کہا تمھارا یہاں کچھ نہیں ہے کیا وہ ایک دفعہ بھی آکر نہ کہہ سکتے تھے کہ تم لوگ کہاں جاتے ہو؟ ہم گھر سے نکلے اور وہ کمرے میں بیٹھے ٹکر ٹکر دیکھا کیے، بچّے پر بھی انھیں رحم نہ آیا۔ جب انھیں اتنا غرور ہے تو یہاں کیا آدمی ہی نہیں ہے۔ وہ اپنا محل لے کر رہیں ہم اپنی محنت مزدوری کرلیں گے۔ ایسا حریص آدمی تم نے کبھی دیکھا تھا اماں؟ بی بی تو گئیں، انھیں ڈانٹ بتائی بے چاری روتی چلی آئیں۔"

راما نے نینا کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "اچھا جو کچھ ہوا اچھا ہی ہوا۔" اب یہاں سے چلو دیر ہورہی ہے۔ میں مہراجن سے کھانا پکانے کو کہہ آئی ہوں۔ کھاٹیں بھی نکلوائی ہیں۔ لالہ سمرکانت کا گھر نہ اُجڑتا تو میرا گھر کیسے بستا۔"

نیچے روشنی ہوئی۔ سلّو نے کڑوے تیل کا چراغ جلا دیا تھا۔ راما کو یہاں پہنچا کر بازار دوڑ گئی۔ چراغ، تیل اور جھاڑوں لائی۔ چراغ جلا کر گھر میں جھاڑو لگا رہی تھی۔ سکھدا نے بچّے کو راما کی گود میں دے کر کہا۔ "آج تو معاف کرو اماں آئندہ دیکھا جائے گا۔ لالہ جی کو یہ کہنے کا موقع کیوں دیں کہ آخر سسرال ہی میں ٹھکانہ ملا۔ انھوں نے پہلے ہی تمھارے گھر کا دروازہ بند کردیا ہے۔ ہمیں دوچار دن یہاں رہنے دو۔ پھر ہم تمھارے پاس چلے آئیں گے۔ ذرا ہم بھی تو دیکھ لیں کہ ہم اپنے بوتے پر رہ سکتے ہیں یا نہیں۔"

امر کی نانی مر رہی تھی۔ اپنے لیے تو اسے کوئی فکر نہ تھی۔ سلیم یا ڈاکٹر کے یہاں چلا جائے گا۔ یہاں سکھدا اور نینا دونوں بغیر چارپائی کے کیسے سوئیں گی۔ کل ہی کہاں سے ہُن برس جائے گا کہ سارے سامان آجائیں گے۔ مگر سکھدا کی بات کیسے کاٹے۔

راما نے بچّے کی مچھلیاں لے کر کہا۔ "بھلا دیکھ لینا جب میں مرجاؤں، ابھی تو میں جیتی ہوں۔ وہ بھی تو تیرا ہی ہے یا کسی اور کا، چل جلدی کر۔"

سکھدا نے خودداری کے ساتھ کہا۔"اماں جب تک ہم اپنی کمائی سے اپنا گزر بسر نہ کرلیں گے تمھارے گھر نہ جائیں گے۔ جائیں گے مگر مہمان کی طرح۔ گھنٹے دو گھنٹے رہے اور چلے آئے۔"

راما نے امر سے اپیل کی۔ "دیکھتے ہو بیٹا اس کی باتیں۔ یہ مجھے بھی غیر سمجھتی ہے۔"

سکھدا نے بادل دردمند کہا۔ ”اماں بُرا نہ ماننا، آج دادا جی کا برتاؤ دیکھ کر مجھے معلوم ہوگیا کہ امیروں کو اپنی دولت کتنی پیاری ہوتی ہے۔ کون جانے کبھی تمھارے دل میں بھی ایسے ہی خیالات پیدا ہوں تو ایسا موقع آنے ہی کیوں دیا جائے۔ جب ہم مہمان کی طرح ......“

امر نے بات کاٹی۔ راما کے طبع نازک پر کتنا بے رحمانہ حملہ تھا۔

”تمھارے جانے میں تو کوئی ایسا حرج نہیں ہے۔ سکھدا تمھیں یہاں بڑی تکلیف ہو گی۔“

سکھدا نے ترشی کے ساتھ کہا۔ ”تو کیا تکلیفیں تم ہی جھیل سکتے ہو، میں نہیں جھیل سکتی۔ تم اگر تکلیفوں سے ڈرتے ہو تو جاؤ میں ابھی کہیں نہیں جاؤں گی۔“

نتیجہ یہ ہوا کہ راما نے سلّو کو گھر بھیج کر اپنے بستر منگوائے۔ کھانا پک چکا تھا وہ بھی منگوا لیا گیا۔ چھت پر جھاڑو دی گئی اور جیسے دھرم شالے میں مسافر ٹھیرتے ہیں اسی طرح ان لوگوں نے کھانا کھا کر رات کاٹی۔ بیچ بیچ میں مذاق بھی ہوتا جاتا تھا۔ مصیبت میں جو چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی نظر آتی ہے یہاں وہ کیفیت نہ تھی۔ تاریکی تھی لیکن وقتِ سحر کی، مصیبت تھی مگر سر پر نہیں۔ پیروں کے نیچے۔

دوسرے دن سویرے راما گھر چلی گئی۔ اس نے پھر سب کو ساتھ لے چلنے پر اصرار کیا لیکن سکھدا راضی نہ ہوئی۔ کپڑے، لتّے، برتن بھانڈے تخت یا پلنگ کوئی چیز لینے پر راضی نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ راما ناراض ہوگئی اور امرکانت کو بھی ناگوار گزرا۔ سکھدا اس پریشان حالی میں بھی اس پر حکومت کر رہی تھی۔

راما کے جانے کے بعد امر سوچنے لگا۔ روپے پیسے کا کیا انتظام ہو وہ وقت مدرسے جانے کا تھا وہاں جانا لازمی تھا۔ سکھدا ابھی خوابِ سحر میں مگن تھی اور نینا متفکر بیٹھی سوچ رہی تھی۔ کیسے گھر کا کام چلے گا۔ اسی وقت امر مدرسے چلا گیا۔ پر آج وہاں اس کا ذرا بھی جی نہ لگا۔ کبھی باپ پر غصہ آتا، کبھی سکھدا پر، کبھی اپنے آپ پر اس نے اپنی خانہ ویرانی کے متعلق ڈاکٹر صاحب سے کوئی ذکر نہ کیا۔ وہ کسی کی ہمدردی کا طالب نہ تھا۔ آج وہ اپنے دوستوں میں کسی کے پاس نہ گیا۔ اسے خوف ہوا لوگ اس کا حال سُن کر دل میں یہی سمجھیں گے کہ میں ان سے کچھ مدد چاہتا ہوں۔ دس بجے گھر لوٹا تو دیکھا سلّو آٹا گوندھ

رہی ہے اور نینا چوکے میں بیٹھی ترکاری پکا رہی ہے۔ کچھ پوچھنے کی ہمّت نہ پڑی۔ پیسے کہاں سے آئے نینا نے آپ ہی آپ کہا۔ ”سُنتے ہو بھیّا! آج سلو نے ہماری دعوت کی ہے۔ لکڑی، گھی، آٹا، دال سب بازار سے لائی ہے۔“

سلو بول اُٹھی۔”میں دعوت نہیں کرتی، میں اپنے پیسے جوڑ کر لے لوں گی۔“

نینا ہنستی ہوئی بولی۔”یہ بڑی دیر سے مجھ سے لڑ رہی ہے۔ یہ کہتی ہے میں پیسے لے لوں گی میں کہتی ہوں تو تو دعوت کر رہی ہے۔ بتاؤ بھیّا دعوت ہی تو کر رہی ہے۔“

”ہاں اور کیا دعوت تو ہے ہی۔“

سلو کا پوپلا منہ کُھل گیا جیسے وہ اپنی ہی نگاہ میں اونچی ہوگئی ہے، گویا اس کی زندگی منوّر ہوگئی ہے۔ اس کا افسردہ چہرہ گویا زندہ دلی میں نہا اُٹھا۔ اس نے ہاتھ دھوکر امرکانت کے لیے لوٹے میں پانی رکھ دیا تو اس کے پاؤں زمین پر نہ پڑتے تھے۔

امر کو ابھی تک امید تھی کہ دادا شاید سکھدا اور نینا کو بُلا بھیجیں۔ مگر ابھی تک کوئی بلانے نہ آیا اور نہ وہ خود آئے تو اس کا جی کھٹا ہوگیا۔

وہ جلدی سے نہایا۔ مگر یاد آیا دھوتی ہے نہیں گلے کی چادر پہن لی، کھانا کھایا اور رزق کی تلاش میں نکلا۔

سکھدا نے منہ لٹکا کر پوچھا۔”تم ایسے بے فکر ہوکر بیٹھ رہے گویا یہاں سارا انتظام مکمّل ہوگیا ہے۔ پس یہاں لاکر بٹھانا ہی جانتے ہو۔ صبح سے غائب ہوئے تو دوپہر کو لوٹے۔ کسی سے کام دھندے کے لیے کچھ کہا یا خدا چھپّر پھاڑ کر دے گا۔ یوں کام نہ چلے گا سمجھ گئے۔“

چوبیس گھنٹے کے اندر ہی سکھدا کے جذبات میں یہ انقلاب دیکھ کر امر رنجیدہ ہوگیا۔ کل کتنی بڑھ بڑھ کر باتیں کر رہی تھی۔ آج شاید پچھتا رہی ہے کہ کیوں گھر سے نکلے۔ بے اعتنائی سے بولا۔ ”ابھی تو کسی سے کچھ نہیں کہا۔“ اب جاتا ہوں کام کی تلاش میں۔“

”میں بھی ذرا جج صاحب کی بیوی کے پاس جاؤں گی۔ ان سے کسی ملازمت کی درخواست کروں گی۔ ان دنوں تو بڑی خاطر کرتی تھیں۔“

امر کچھ نہیں بولا۔ ہاں اسے معلوم ہوگیا کہ اس کی سخت آزمائش کے دن آگئے۔

امر کانت کا بازار کے سب ہی دُکان داروں سے یارانہ تھا۔ اس نے ایک کھدّر کی دُکان سے کمیشن پر کئی تھان کھدّر، کھدّر کی ساڑیاں، جمپر، کُرتے، چادریں وغیرہ لے لیں اور انھیں خود اپنی پیٹھ پر لاد کر بیچنے چلا۔

ایک دُکان دار نے کہا۔ "یہ کیا کرتے ہو بابو جی! ایک مجور لے لو، لوگ کیا کہیں گے، بھدّا معلوم ہوتا ہے۔" امر کے سینے میں انقلاب کا طوفان اُٹھ رہا تھا۔ اس کا بس چلتا تو آج مال داروں کا خاتمہ کردیتا۔ جو دُنیا کو جہنّم بنائے ہوئے ہیں۔ وہ بوجھ اُٹھا کر دکھانا چاہتا تھا مزدوری کرکے نباہ کرنا اس سے کہیں اچھا سمجھتا ہوں کہ کہیں حرام کی کمائی کھاؤں۔ تم سب موٹی توند والے حرام خور ہو، پکّے حرام خور۔ تم مجھے حقیر سمجھتے ہو اس لیے کہ میں اپنی پیٹھ پر بوجھ لادے ہوئے ہوں۔ کیا یہ بوجھ تمھاری بے ایمانی اور بے رحمی اور دغابازی کے بوجھ سے زیادہ شرمناک ہے جو تم اپنے سر پر لادے پھرتے ہو اور شرماتے ذرا بھی نہیں۔ اُلٹے اور دون کی لیتے ہو۔

اس وقت اگر کوئی صاحب ذرا امرکانت کو چھیڑ دیتے تو ان کی شامت ہی آجاتی۔ وہ سر سے پاؤں تک بارود بنا ہوا تھا یا بجلی کا زندہ تار۔

(۱۷)

امرکانت کھادی بیچ رہا ہے۔ تین بجے ہوں گے، لو چل رہی ہے، بگولے اُٹھ رہے ہیں۔ دُکان دار دُکانوں پر سو رہے ہیں۔ رئیس محلوں میں سو رہے ہیں۔ مزدور پیڑوں کے نیچے سو رہے ہیں اور امر کھادی کا گٹھا لادے، پسینے سے تر، سُرخ چہرہ، آنکھیں لال، گلی گلی پھر رہا ہے۔

ایک وکیل صاحب نے خس کا پردہ اُٹھا کر دیکھا اور بولے۔"ارے یار یہ کیا غضب کرتے ہو۔ میونسپل کمشنری کی تو لاج رکھتے، کیا کوئی مزدور نہیں ملتا تھا۔"

امر نے ترش رو ہوکر کہا۔"مزدوری کرنے سے میونسپل کمشنری کی شان میں بٹّہ نہیں لگتا۔ بٹّہ لگتا ہے دھوکے فریب کی کمائی کھانے سے۔"

"وہاں دھوکے فریب کی کمائی کھانے والا کون ہے بھائی! کیا وکیل، ڈاکٹر، پروفیسر، ساہوکار، ٹھیکیدار دھوکے دھڑی کی کمائی کھاتے ہیں؟"

"یہ ان کے دل سے پوچھیے۔ میں کسی کو بُرا کیوں کہوں۔"

"آخر آپ نے کچھ سمجھ کر ہی یہ فقرہ چست کیا۔"

"اگر آپ پوچھنا چاہتے ہیں تو میں کہوں گا، ہاں کھاتے ہیں۔ ایک آدمی دس روپے میں گزر کرتا ہے دوسرے کو دس ہزار کیوں چاہیے۔ یہ دھاندلی اسی وقت تک چلے گی جب تک پبلک کی آنکھیں بند ہیں۔ معاف کیجیے گا ایک آدمی پنکھے کی ہوا کھائے اور خس خانے میں بیٹھے اور دوسرا دوپہر کی دھوپ میں تپے۔ یہ نہ انصاف ہے نہ انسانیت۔ یہ دھاندلی ہے۔"

"چھوٹے بڑے تو بھائی صاحب ہمیشہ رہے ہیں اور رہیں گے۔ اخوت اور مساوات کا اصول تو کبھی خیال کے دائرے سے باہر نہیں نکلا۔"

"میں دنیا کا ٹھیکہ نہیں لیتا اگر انصاف اچھی چیز ہے تو وہ اس لیے خراب نہیں ہو سکتی کہ لوگ اس پر عمل نہیں کرتے۔"

اس کا منشا یہ ہے کہ آپ انفرادیت کے قائل نہیں۔ اشتراکیت کے قائل ہیں۔"

"میں کسی "یت" کا قائل نہیں، صرف انصاف کا پجاری ہوں۔"

"تو کیا سیٹھ جی سے الگ ہو گئے؟"

"انھوں نے میری زندگی کا ٹھیکہ نہیں لیا ہے۔"

"تو لائیے دیکھیں آپ کے پاس کیا کیا چیزیں ہیں؟"

امرکانت نے ان کے ہاتھ دس روپے کے کپڑے بیچے۔

امرکانت ان دنوں بڑا زود رنج، بڑا تندمزاج، بڑا صاف گو ہو گیا ہے۔

اس کی تلوار ہمیشہ میان سے باہر رہتی ہے۔ گاہکوں سے بات بات پر اُلجھتا ہے، پھر بھی اس کی بکری اچھی ہوتی ہے۔ زاہد دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جنھیں ترک میں روحانی مسرّت حاصل ہے۔ جو ترک کو ہی روحانی تکمیل کا ذریعہ خیال کرتے ہیں۔ جن کے لیے ترک انسانیت اخلاق اور مسرّت ہے۔ دوسرے وہ جو دل جلے زاہد ہوتے ہیں۔ جن کا زہد محض حالات و معاملات سے بیزار ہوتا ہے۔ جو اپنے زہد کی قیمت دنیا سے لینا چاہتے ہیں وہ خود جیتے ہیں اسی لیے دوسروں کو بھی جلاتے ہیں۔ امرکانت اسی طرح کا زاہد بنا ہوا تھا۔

تندرست آدمی اگر نیم کی پتّیاں چباتا ہے تو اپنی صحت کو بڑھانے کے لیے وہ شوق

سے پتّیاں توڑ لاتا ہے۔ شوق سے انھیں پیتا ہے اور شوق سے پیتا ہے۔ لیکن مریض وہی پتّیاں پیتا ہے تو ناک سکوڑ کر، منہ بناکر اور جھنجھلا کر اور اپنی تقدیر کو روکر۔

سکھدا جج صاحب کی بیوی کی سفارش سے لڑکیوں کے ایک مدرسے میں پچاس روپے پر نوکر ہوگئی ہے۔ امر دوبدو تو کچھ کہہ نہیں سکتا مگر دل میں جلتا رہتا ہے۔ گھر کا سارا کام، بچّے کو سنبھالنا، رسوئیں پکانا۔ ضروری چیزیں بازار سے منگوانا یہ سب اس کے متھے ہے۔ سکھدا ان کاموں کے قریب نہیں جاتی۔ امر آم کہتا ہے سکھدا املی کہتی ہے۔ دونوں میں ہمیشہ کھٹ پٹ ہوتی رہتی ہے۔ سکھدا اس خستہ حالی میں بھی اس پر حکومت کر رہی ہے۔ امر کہتا ہے آدھ سیر دودھ کافی ہے۔ سکھدا کہتی ہے سیر بھر آئے گا اور سیر بھر ہی منگاتی ہے، وہ خود دودھ نہیں پیتا۔ یہ بھی ایک مسئلہ متنازعہ ہے۔ وہ کہتا ہے ہم غریب ہیں، ہم مزدور ہیں۔ ہمیں مزدور کی طرح رہنا چاہیے۔ وہ کہتی ہے ہم مزدور نہیں ہیں اور نہ مزدوروں کی طرح رہیں گے۔ امرکانت اسے اپنی حقیقی نشوونما میں سدّ راہ سمجھتا ہے اور اس کو ہٹا نہ سکنے کے باعث اندر ہی اندر کڑھتا ہے۔

ایک دن بچّے کو کھانسی ہوگئی۔ امر بچّے کو لے کر ایک ہومیوپیتھ کے پاس جانے کو تیار ہوا۔ سکھدا نے کہا بچّے کو مت لے جاؤ۔ ہوا لگے گی۔ ڈاکٹر کو بلا لاؤ فیس ہی تو لے گا۔ امر کو مجبور ہوکر ڈاکٹر بلانا پڑا تیسرے دن بچّہ اچھا ہوگیا۔

ایک دن خبر ملی کہ لالہ سمرکانت کو بخار آگیا۔ امرکانت اس مہینے بھر میں ایک بار بھی گھر نہ گیا تھا۔ یہ خبر سُن کر بھی نہ گیا۔ وہ مریں یا جئیں اس سے کوئی سروکار نہیں۔ انھیں اپنی دولت پیاری ہے تو اسے اپنے سینے پر رکھے رہیں اور انھیں کسی کی ضرورت بھی کیا۔

لیکن سکھدا ضبط نہ کرسکی وہ اسی وقت نینا کو ساتھ لے کر چل دی۔

سمرکانت گھر والوں کے سوا اور کسی کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا نہیں کھاتے تھے۔ کئی دن تو انھوں نے دودھ پی کر کاٹے۔ کئی دن پھل کھاکر بسر کیے۔ لیکن روٹی کے لیے دل ترستا رہتا تھا۔ انواع و اقسام کی چیزیں بازار میں موجود تھیں لیکن روٹیاں کہاں۔ ایک دن ان سے نہ رہا گیا روٹیاں پکائیں اور ہوکے میں آکر کچھ زیادہ کھا گئے۔ بد ہضمی ہوگئی۔

ایک دن دست آئے اور دوسرے دن بخار آگیا۔ فاقوں سے کچھ تو پہلے ہی گھُل

چکے تھے۔ دو دن کی بیماری نے اور پست کردیا۔

سکھدا کو دیکھ کر بولے۔"ابھی آنے کی کیا جلدی تھی بہو۔ دو چار دن اور دیکھ لیتیں۔ تب تک یہ خزانے کا سانپ اُڑ گیا ہوتا، وہ لونڈا سمجھتا ہے مجھے دولت بچوں سے زیادہ پیاری ہے۔ لیکن یہ جوڑا تھا کس کے لیے؟ اپنے لیے؟ توبال بچّے پیدا کیوں کیے؟ اس لونڈے کو جو آج میرا دشمن بنا ہوا ہے چھاتی سے لگائے کیوں اوجھے، سیانے، ویدوں اور حکیموں کے پاس دوڑتا پھرا؟ خود کبھی اچھا نہیں کھایا۔ اچھا نہیں پہنا، کس کے لیے؟ کنجوسی کی، بے ایمانی کی، خوشامد کی، اپنے ضمیر کی ہتیا کی کس کے لیے؟ جس کے لیے چوری کی وہی آج مجھے چور کہتا ہے۔"

سکھدا سر جھکائے روتی ہے۔

لالہ جی نے پھر کہا۔ "میں جانتا ہوں جسے ایشور نے ہاتھ دیے ہیں وہ دوسروں کا محتاج نہیں رہتا۔ اتنا بے وقوف نہیں ہوں لیکن ماں باپ کی آرزو تو یہی ہوتی ہے کہ ان کی اولاد کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ جس طرح انھیں مرنا پڑے جس طرح انھیں دھکّے کھانے پڑے۔ جائز ناجائز سب کچھ کرنا پڑے وہی دقتیں اس کی اولاد کو نہ جھیلنی پڑیں۔ دنیا انھیں حریص، خودغرض اور بخیل کہتی ہے، ان کو پروا نہیں ہوتی۔ لیکن جب اپنی ہی اولاد اپنی تحقیر کرے تو سوچو بدنصیب باپ کے دل پر کیا گزرتی ہے۔ اسے معلوم ہوتا ہے ساری دنیا غارت ہوگئی۔ جو شاندار عمارت ایک ایک اینٹ جوڑ کر کھڑی کی تھی۔ جس کے لیے کوار کی دھوپ اور ماگھ کی بارش برداشت کی وہ ڈھے گئی، زمین دوز ہوگئی اور اس کے اینٹ پتھّر سامنے بکھرے پڑے ہیں۔ وہ گھر نہیں ڈھے گیا، وہ زندگی ڈھے گئی ساری زندگی کی آرزوئیں ڈھے گئیں۔"

سکھدا نے بچّے کو نینا کی گود سے لے کر سُسر کی چارپائی پر سلادیا اور پنکھا جھلنے لگی۔ بچّے نے بڑی بڑی جاندار آنکھوں سے بوڑھے دادا کی مونچھیں دیکھیں اور ان کے یہاں رہنے کی کوئی ضرورت نہ دیکھ کر انھیں اُکھاڑ پھینکنے کے لیے آمادہ ہوگیا۔ دونوں ہاتھوں سے مونچھیں پکڑ کر کھینچیں۔ لالہ جی نے سی سی تو کی لیکن بچّے کو ہٹایا نہیں۔ ہنومان نے بھی اتنی بے رحمی سے لنکا کے باغیچوں پر دست بُرد نہ کیا تھا۔ پھر بھی لالہ جی نے بچّے کے ہاتھوں سے مونچھیں نہ چھڑائیں۔ ان کی تمنائیں جو بے جان پڑی تھیں اس کشاکش سے گویا

زندہ ہو گئیں۔ ان شریر اُنگلیوں میں کوئی ایسی دعا، کوئی ایسا اعجاز تھا۔ ان کے روئیں روئیں میں سمایا ہوا بچہ جیسے متھ جانے پر مکھن کی طرح صورت پذیر ہو گیا ہو۔

دو دن سکھدا اپنے نئے گھر نہ گئی مگر امرکانت باپ کی پرسش کے لیے ایک دن بھی نہ آیا۔ سلّو بھی سکھدا کے ساتھ چلی گئی تھی۔ شام کو آتا، روٹیاں پکاتا، کھاتا اور کانگریس کے دفتر یا نوجوان سبھا میں چلا جاتا۔ کبھی کسی عام جلسے میں بولتا کبھی چندہ جمع کرتا۔

تیسرے دن لالہ جی اُٹھ بیٹھے۔ سکھدا دن بھر تو ان کے پاس رہی شام کے وقت اس نے جانے کی اجازت مانگی۔ لالہ جی نے پُرمحبت نظروں سے دیکھ کر کہا۔ ''میں جانتا کہ تم میری تیمارداری ہی کے لیے آئی ہو تو دس پانچ دن اور پڑا رہتا۔ بہو، میں نے تو جان بوجھ کر کوئی خطا نہیں کی لیکن کوئی خطا ہوئی ہو تو اسے معاف کردو۔'' سکھدا کے جی میں آیا کہ اپنی ضد ترک کردے لیکن اتنی تکلیف اُٹھانے کے بعد جب اس کی گرہستی کچھ جم چلی تھی پھر یہاں لوٹ آنا کچھ اچھا نہ لگتا تھا۔ علاوہ بریں وہاں وہ خود مختار تھی۔ خانہ داری کا انتظام اس کے ہاتھوں میں تھا۔ وہاں کی ایک ایک چیز میں اپناپن بھرا ہوا تھا۔ ایک ایک چیز پر اس کی کاوش اور جدت منقوش تھی۔ ایک ایک چیز پر اس کی مہر لگی ہوئی تھی۔ یہاں کی کوئی چیز اس کے لیے غرور کا باعث نہ تھی۔ یہاں سب کچھ ہونے پر بھی اس کے جذبۂ اقتدار کو تسکین نہ ہوئی تھی۔ لیکن لالہ جی کو سمجھانے کے لیے کسی بہانے کی ضرورت تھی۔ بولی۔ ''یہ آپ کیا کہتے ہیں دادا، ہم لوگ آپ کے بچّے ہیں، آپ ہمیں جو کچھ تعلیم یا نصیحت دیں گے وہ ہماری بھلائی کے لیے دیں گے میرا تو جی جانے کو بالکل نہیں چاہتا لیکن تنہا میرے چلے آنے سے کیا ہوگا۔ مجھے خود شرم آتی ہے کہ ہمیں الگ دیکھ کر دنیا کیا کہہ رہی ہوگی۔ جتنی جلد ہوسکے گا میں سب کو گھسیٹ لاؤں گی۔ جب تک آدمی کچھ دن ٹھوکریں نہیں کھالیتا اسے اپنے اوپر اعتبار نہیں ہوتا۔ آپ نے ایک طرح سے ہمیں ایک موقع عطا کردیا۔ میں ایک بار روز آپ کا کھانا پکا کر جایا کروں گی میں نہ آسکوں گی تو بی بی کو بھیج دوں گی۔''

اس دن سے سکھدا کا یہ معمول ہوگیا۔ وہ سویرے یہاں چلی آتی اور لالہ جی کا کھانا پکا کر لوٹ جاتی۔ پھر خود کھانا کھا کر مدرسے چلی جاتی۔ تیسرے پہر جب امرکانت کھادی

بیچنے چلا جاتا تو وہ نینا کو لے کر پھر آجاتی۔ اس کی غیرت میں اب وہ جلن نہ تھی۔ وہ یہ نہ دیکھ سکتی تھی کہ اس کے رہتے بوڑھے باپ کو کوئی تکلیف ہو۔

ان دنوں اسے سب سے زیادہ جو بات کھٹکتی تھی وہ امرکانت کا سر پر کھادی لے کر چلنا تھا۔ وہ کئی بار اس معاملے پر اس سے جھگڑا کر چکی تھی لیکن جب اس نے دیکھا کہ سمجھانے سے وہ ضد اور پکڑ لیتا ہے تو اس نے بولنا چھوڑ دیا۔ مگر ایک دن گھر جاتے وقت اس نے امرکانت کو کھادی کا بقچہ لیے دیکھ لیا۔ اس محلے کی ایک عورت بھی اس کے ساتھ تھی۔ سکھدا گویا زمین میں گڑ گئی۔

امر جوں ہی گھر آیا اس نے یہ معاملہ چھیڑ دیا۔ ''معلوم تو ہوگیا تم بڑے غیرت دار ہو۔ دوسروں کے لیے بھی کچھ رہنے دوگے یا سب اپنی ہی جیب میں رکھ لوگے۔ اب تو دنیا پر مشقت کی عظمت ظاہر ہوگئی۔ اب تو بقچہ لادنا چھوڑ دو۔ تمھیں شرم نہ آتی ہو لیکن تمھاری عزّت کے ساتھ ہماری عزّت بھی تو بندھی ہوئی ہے۔ تمھیں کوئی حق نہیں کہ تم مجھے یوں ذلیل کرو۔''

امر تو کمر کسے تیار ہی تھا بولا۔ ''یہ تو میں جانتا ہوں کہ میرا کچھ اختیار نہیں ہے۔ لیکن یہ پوچھ سکتا ہوں کہ تمھارے اختیاروں کی بھی کوئی حد ہے یا ان کی کوئی حد ہی نہیں۔''

''میں ایسا کوئی کام نہیں کرتی جس میں تمھاری بدنامی ہو۔''

''اگر میں یہ کہوں کہ جس طرح میرے مزدوری کرنے سے تمھاری توہین ہوتی ہے۔ اسی طرح تمھاری نوکری کرنے سے میری توہین ہوتی ہے تو شاید تمھیں یقین نہ آئے گا۔''

''تمھاری نیک نامی اور بدنامی کی ترازو ساری دنیا سے نرالی ہو تو میں لاچار ہوں۔''

''میں دنیا کا غلام نہیں ہوں اگر تمھیں غلامی پسند ہے تو شوق سے کرو۔ مگر مجھے مجبور نہیں کرسکتیں۔''

''نوکری نہ کروں تو تمھارے روپے بیس آنے روز میں کیا ہوگا۔''

''میرا خیال ہے کہ اس مُلک کے نوئے فی صدی آدمیوں کو اس سے بھی کم میں گزر کرنا پڑتا ہے۔''

"میں ان نوے فی صدی والوں میں نہیں۔ باقی دس فی صدی والوں میں ہوں۔ میں نے تم سے آخر بار کہہ دیا کہ تمھارا یہ بقچے ڈھونا میرے لیے نا قابلِ برداشت ہے اور اگر تم نے نہ مانا تو میں اپنے ہاتھوں سے یہ بقچہ زمین پر گرادوں گی۔ اس سے زیادہ میں تم سے کچھ نہیں کہنا سننا نہیں چاہتی۔"

ادھر ڈیڑھ مہینے سے امرکانت سکینہ کے گھر نہ گیا تھا۔ یاد تو اس کو روز آتی لیکن جانے کا موقع نہ ملتا۔ ایک عشرہ گزر جانے کے بعد اسے شرم آنے لگی کہ وہ پوچھے گی کہ اتنے دن کیوں نہیں آئے تو کیا جواب دوں گا۔ اس شرما شرمی میں وہ ایک مہینے اور نہ گیا۔ یہاں تک کہ آج سکینہ نے اسے ایک کارڈ لکھ کر خیریت دریافت کی تھی اور بشرطِ فرصت اسے دس منٹ کے لیے بلایا تھا۔ آج اماں جان برادری کی کسی تقریب میں جانے والی تھیں، بات چیت کرنے کا اچھا موقع تھا۔ ادھر امرکانت بھی اس زندگی سے اکتا گیا تھا۔ ان ڈیڑھ دو مہینوں میں اسے اس کا بھی کافی ثبوت مل چکا تھا کہ سکھدا کے ساتھ وہ کبھی خوش نہیں رہ سکتا۔ یہ زندگی اسے قید سی معلوم ہوتی تھی۔ وہ جو کچھ ہے وہی رہے گا۔ اس کی فطرت میں زیادہ تغیر کی امید نہیں۔ سکھدا بھی جو کچھ ہے وہی رہے گی۔ اس کی فطرت بھی نہیں تبدیل کی جاسکتی تو زندگی میں راحت کیسے نصیب ہو۔ دونوں کی زندگی کی رفتار الگ، نصب العین الگ۔ ارادے الگ، خواہشیں الگ، محض رسوم اور ظاہرداریوں کی خاطر وہ اپنی زندگی خاک میں نہیں ملا سکتا۔ اپنی روحانی ترقی کو نہیں روک سکتا۔ حیاتِ انسانی کا مقصد کچھ اور بھی ہے۔ محض کھانا اور مرجانا نہیں۔

وہ آج کھانا کھا کر کانگریس کے دفتر نہ گیا۔ آج اسے اپنی زندگی کے سب سے اہم مسئلے کو حل کرنا تھا۔ اسے اب زیادہ نہیں ٹال سکتا تھا۔ بدنامی کی کوئی فکر نہیں۔ دنیا اندھی ہے اور دوسروں کو اندھا بنائے رکھنا چاہتی ہے۔ جو خود اپنے لیے نئی راہ نکالتا ہے اس پر دنیا کے تنگ خیال ہنستے تو کیا تعجب، اس نے کھدر کی دو ساڑیاں اس کی نذر کرنے کے لیے نکال لیں اور لپکا ہوا جا پہنچا۔ سکینہ اس کے انتظار میں تھی۔ کنڈی کھٹکتے ہی دروازہ کھول دیا۔ اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔"واہ بابوجی! تم تو مجھے بھول ہی گئے۔ اسی کا نام محبت ہے؟"

امر نے شرمندہ ہوکر کہا۔ "یہ بات نہیں ہے سکینہ! شاید ہی کوئی ایسا لمحہ گزرا ہو کہ تمھاری یاد نہ آئی ہو۔ لیکن ادھر بڑی پریشانیوں میں پھنسا رہا۔"

سکینہ نے دردمندانہ انداز سے کہا۔ "میں نے سُنا تھا اماں جان کہتی تھیں، مجھے یقین نہ آتا تھا۔ تم سیٹھ جی سے کیسے علاحدہ ہوگئے۔ پھر یہ بھی سُنا کہ تم سر پر کھدر لاد کر بیچتے ہو۔ میں ہوتی تو تمھیں کبھی سر پر بوجھ نہ لادنے دیتی، میں وہ گٹھری اپنے سر پر رکھ لیتی اور تمھارے پیچھے پیچھے چلتی۔ میں یہاں آرام سے پڑی تھی اور تم اس کڑی دھوپ میں کپڑے لادے پھرتے تھے۔ میرا دل تڑپ کر رہ جاتا تھا۔"

کتنے پیارے، کتنے میٹھے الفاظ تھے، کتنے دل گداز، کتنے الفت میں ڈوبے ہوئے، سکھدا کی زبان سے بھی ایسے الفاظ کبھی نکل سکتے تھے، وہ تو محض حکم جتانا جانتی ہے۔ امرکانت کو اپنے اندر ایک ایسی طاقت کا احساس ہوا کہ اس بقچے کا چوگنا بوجھ لے کر چل سکتا ہے۔ لیکن وہ سکینہ کے دلِ نازک کو چوٹ نہ پہنچائے گا۔ آج سے وہ گٹھر لاد کر نہ چلے گا، بولا۔ "دادا کی خودغرضی پر جی جل رہا تھا۔ سکینہ وہ سمجھتے تھے میں ان کی دولت کا بھوکا ہوں۔ میں انھیں اور ان کے دوسرے مالدار بھائیوں کو دکھا دینا چاہتا ہوں کہ میں کڑی سے کڑی محنت کرسکتا ہوں اور کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانا شرمناک سمجھتا ہوں۔ سکھدا اس دن میرے ساتھ چلی آئی تھی لیکن ایک دن دادا نے جھوٹ موٹ کہلا دیا مجھے بخار آگیا ہے۔ بس وہاں پہنچ گئیں۔ تب سے دونوں وقت ان کا کھانا پکانے جاتی ہیں۔"

سکینہ نے سادگی سے کہا۔ "تو کیا یہ بھی تمھیں بُرا لگتا ہے۔ بوڑھے آدمی تنہا گھر میں پڑے رہتے ہیں اگر بہو ان کا کھانا پکانے چلی جاتی ہے تو کیا گناہ کرتی ہے۔ ان کی اس حرکت سے تو میرے دل میں ان کی عزت ہوگئی۔"

امر نے خفیف ہو کر کہا۔ "یہ شرافت نہیں ہے سکینہ! نہ انسانیت ہے، یہ ان کی دولت کی کشش ہے۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں جس نے مجھ سے کبھی جھوٹوں نہیں پوچھا کہ تمھاری طبیعت کیسی ہے۔ وہ ان کی بیماری کی خبر پاتے ہی بے قرار ہوجائے۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ ان کی دولت کی کشش ہے اور کوئی بات نہیں۔ میں اب اس تصنع کی زندگی سے تنگ آگیا ہوں۔ سکینہ کبھی کبھی تو جی میں آتا ہے سب کو چھوڑ چھاڑ کر بھاگ جاؤں۔ ایسی جگہ بھاگ جاؤں جہاں لوگوں میں آدمیت ہو۔ تمھیں آج فیصلہ کرنا پڑے گا چلو کہیں چھوٹی سی کٹیا بنالیں اور خودغرضی کی دنیا سے الگ محنت مزدوری کرکے زندگی بسر کریں۔ تمھیں اپنا رفیقِ زندگی بناکر پھر مجھے کسی اور چیز کی آرزو نہ رہے گی۔ میری روح

محبت کے لیے تڑپ رہی ہے۔ اس محبت کے لیے جس دل میں سوزی ہے۔ دل دہی ہے دلداری ہے۔ میں بوتل کی سرخ شراب پینا چاہتا ہوں۔ شاعروں کی خیالی شراب نہیں۔

اس نے سکینہ سے ہم آغوش ہونے کے لیے اپنی باہیں پھیلا دیں۔ اسی وقت دروازہ کھلا اور پٹھانی اندر آئی۔ دونوں سمٹ کر ایک ایک قدم پیچھے ہٹ گئے۔ مگر خاموشی سے شبہہ کے اور پختہ ہوجانے کا اندیشہ تھا۔ سکینہ سے تو کچھ نہ بن پڑا۔ امرکانت نے بات بنائی۔ "آج تم کہاں گئی تھیں اماں! میں یہ ساڑیاں دینے آیا تھا۔ تمھیں یہ تو معلوم ہوگا ہی کہ میں آج کل کھدّر بیچتا ہوں۔"

پٹھانی نے ساڑیوں کا جوڑا لینے کے لیے ہاتھ نہیں بڑھایا۔ اس کا سوکھا اور پچکا ہوا چہرہ تمتما اُٹھا۔ ساری جھرّیاں گویا اندرونی حرارت سے تن اُٹھیں۔ آنکھیں نکال کر بولی۔ "ہوش میں آ چھوکرے! یہ ساڑیاں لے جا اپنی بی بی اور بہن کو پہنا۔ یہاں تیری ساڑیوں کے بھوکے نہیں ہیں۔ تجھے شریف زادہ اور صاف دل سمجھ کر تجھ سے اپنی مصیبت کی داستان کہتی تھی یہ نہ جانتی تھی کہ تو ایسے شریف باپ کا بیٹا ہوکر شہداپن کرے گا۔ بس اب منہ نہ کھولنا۔ چپ چاپ چلا جا نہیں آنکھیں نکال لوں گی۔ تو ہے کس گھمنڈ میں، ابھی ایک اشارہ کردوں تو سارا محلّہ اکٹھا ہوجائے۔ ہم غریب ہیں، مصیبت کے مارے ہیں، روٹیوں کے محتاج ہیں۔ جانتا ہے کیوں؟ اس لیے کہ ہمیں آبرو پیاری ہے۔ خبردار جو کبھی ادھر کا رُخ کیا۔"

امرکانت پر فالج گر گیا۔ بجلی گر پڑی۔ ان فقیروں سے ہم ان کے جذباتِ دل کا اندازہ نہیں کرسکتے۔ جن میں قوتِ فکر ہے، تخیل ہے، وہی اس کا کچھ اندازہ کرسکتے ہیں۔ وہ اس طرح ششدر رہ گیا گویا اس کے اعصاب کی حرکت بند ہوگئی۔ ایک منٹ تک وہ اسی عالم میں کھڑا رہا۔ پھر دونوں ساڑیاں اُٹھالیں اور گولی کھائے ہوئے جانور کی طرح سر لٹکائے لڑکھڑاتا ہوا دروازے کی طرف چلا۔ دفعتاً سکینہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر روتے ہوئے کہا۔ "تم مجھے چھوڑے کہاں جارہے ہو امر؟ میں بھی تمھارے ساتھ چلتی ہوں۔ جنھیں اپنی آبرو پیاری ہے وہ اپنی آبرو لے کر رہیں میں بے آبرو ہی رہوں گی۔"

امرکانت نے ہاتھ چھڑا لیا اور آہستہ سے بولا۔ "زندہ رہیں گے تو پھر ملیں گے سکینہ! اس وقت تو جانے دو۔ میں اپنے ہوش میں نہیں ہوں۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے کچھ سمجھ کر دونوں ساڑیاں سکینہ کے ہاتھ پر رکھ دیں۔ اور باہر چلا گیا۔

سکینہ نے سسکیاں لیتے ہوئے پوچھا۔ "تو اب کب آؤگے؟"

امر نے پیچھے پھر کر کہا۔ "جب یہاں مجھے لوگ شہدا اور کمینہ نہ سمجھیں گے۔"

امر چلا گیا اور سکینہ ہاتھ میں ساڑیاں لیے دروازے پر کھڑی فضائے تاریک میں تکتی رہی۔

دفعتاً بڑھیا نے پکارا۔ "اب آکر بیٹھے گی کہ دروازے ہی پر کھڑی رہے گی۔ منہ تو کالا کراہی دیا اب اور کیا کرنے پر تلی ہوئی ہے۔"

سکینہ نے آتشیں نظروں سے دیکھ کر کہا۔ "اماں عاقبت سے ڈرو کیوں کسی بھلے آدمی پر تہمت لگاتی ہو تمھیں ایسی بات منہ سے نکالتے شرم نہیں آتی؟ ان کی نیکیوں کا یہ بدلہ دیا ہے۔ تم دنیا میں چراغ لے کر ڈھونڈھ آؤ ایسا شریف آدمی تمھیں نہ ملے گا۔"

پٹھانی نے ڈانٹ بتائی۔ "چپ رہ بے حیا کہیں کی شرماتی نہیں اوپر سے زبان چلاتی ہے۔ آج گھر میں کوئی مرد ہوتا تو سر کاٹ لیتا۔ میں ابھی جاکر لالہ سے کہتی ہوں جب تک اس پاجی کو شہر سے نہ نکلوا دوں گی میرا کلیجہ ٹھنڈا نہ ہوگا۔ میں اس کی زندگی غارت کردوں گی۔"

سکینہ نے بے باکانہ انداز میں کہا۔ "اگر ان کی زندگی غارت ہوتی تو میری بھی زندگی غارت ہوئی، اتنا سمجھ لو۔"

سکینہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ بُڑھیا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اتنی زور سے اپنی طرف کھینچا کہ وہ گرتے گرتے بچی اور اسی وقت گھر سے باہر نکل کر دروازے کی کنڈی لگادی۔

سکینہ باربار پکارتی رہی مگر بڑھیا نے پیچھے پھر کر بھی نہ دیکھا۔ وہ بے جان بُڑھیا جسے ایک ایک قدم رکھنا دشوار تھا اس وقت مجنونانہ جوش کے ساتھ دوڑتی ہوئی لالہ سمرکانت کے پاس چلی جا رہی تھی۔

(۱۸)

امرکانت گلی کے باہر نکل کر سڑک پر آیا۔ کہاں جائے، پٹھانی اسی وقت دادا کے پاس جائے گی۔ ضرور جائے گی۔ کتنی قیامت برپا ہوگی۔ کیسا کہرام مچے گا۔ کوئی دھرم کے

نام پر روئے گا، کوئی خاندان وقار کا ماتم کرے گا۔ دغا، فریب حرام کی کمائی، جعل سب معاف ہو سکتا ہے۔ نہیں ان حرکتوں کی تعریف ہوتی ہے۔ ایسے ہی حضرات قوم کے پیشوا بنے ہوئے ہیں۔ عیاشوں اور نفس پرستوں کے سامنے لوگ سجدے کرتے ہیں۔ لیکن خلوص اور عقیدت کے ساتھ محبت کرنا نا قابلِ مذمت ہے۔ نا قابلِ معافی ہے۔ نہیں امر اب گھر نہیں جاسکتا۔ گھر کے دروازے اس کے لیے بند ہیں اور وہ گھر تھا ہی کب۔ محض کھانے اور سونے کی جگہ تھی۔ اس کا پُرسان حال کون ہے۔

وہ ایک لمحہ کے لیے ٹھٹک گیا۔ سکینہ اس کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہے۔ تو کیوں نہ اسے ساتھ لے لے۔ پھر لوگ جی بھر کر روئیں پیٹیں اور کوسیں۔ اور آخر یہی تو اس کا منشاء تھا۔ لیکن پہلے دور سے جو پہاڑ ٹیلہ سا نظر آتا تھا اب اسے سامنے دیکھ کر اس پر چڑھنے کی ہمّت نہ ہوتی تھی۔ سارے مُلک میں تہلکہ مچ جائے گا۔ ایک میونسپل کمشنر ایک مسلمان لڑکی کو لے کر بھاگ گیا۔ ہر ایک زبان پر یہی چرچے ہوں گے۔ دادا شاید زہر کھالیں۔ مخالفوں کو تالیاں پیٹنے کا موقع مل جائے۔ اسے ٹالسٹائے کا افسانہ یاد آیا جس میں ایک آدمی اپنی محبوبہ کو لے کر بھاگ جاتا ہے لیکن اس کا نتیجہ کتنا دل خراش ہوتا ہے۔ امر خود کسی کے متعلق ایسی خبر سنتا تو اس سے نفرت کرتا۔ نہیں اب وہ گھر نہیں جاسکتا۔

یکایک بچّے کی یاد آگئی۔ اس کی تاریک زندگی میں وہی ایک شمع تھی۔ اس کا بے قرار دل اسی شمع کی طرف لپکا۔ بچّے کی دل فریب صورت سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔

کسی نے پکارا۔ "امر کانت یہاں کیسے کھڑے ہو؟"

امر نے پیچھے پھر کر دیکھا تو سلیم۔ سلیم کا آنا اس وقت اُسے بُرا معلوم ہوا۔ وہ کسی گوشے میں بیٹھ کر اپنے طرزِ عمل کا فیصلہ کرنا چاہتا تھا۔ بے رخی سے بولا۔"کچھ نہیں یونہی ایک ضرورت سے آگیا تھا۔ تم کدھر؟"

"ذرا چوک کی طرف گیا تھا۔ یہاں کیسے کھڑے ہو؟ کیا ادھر کا قصد ہے؟"

سلیم کے لہجے میں تمسخر کا پہلو تھا۔ امر کانت نے اس سے پیچھا چھڑانے کے ارادے سے کہا۔ "یہ تو کوئی ایسی مذاق کی بات نہ تھی۔"

ان الفاظ میں مایوسی اور درد کا ایک دریا بھرا ہوا تھا۔ سلیم نے اس کے چہرے کی طرف پُر سوال نظروں سے دیکھ کر کہا۔ "اور آپ کیا چاہتے ہیں؟ میں آپ کے ساتھ

ہمدردی کروں؟"

امر اس کے ساتھ جانے کی خواہش نہ ہونے پر بھی اضطراری طور پر اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ سلیم اس کی متفکر اور مغموم صورت دیکھ کر سمجھ گیا آج ضرور کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش آیا ہے ہمدردانہ انداز سے بولا۔ "کیا مجھ سے بھی پردہ داری کی ضرورت ہے؟"

امرکانت کو اب اس کے لہجے سے ہمدردی کا احساس ہوا اس کی آنکھیں بھر آئیں مگر کچھ بول نہ سکا۔

سلیم نے محبت سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "شاید تم سمجھتے ہو کہ میں تمھارے اعتماد کے قابل نہیں ہوں۔"

"یہ تو میں نے کبھی نہیں کہا۔"

"دل میں تو سمجھتے ہو۔ حالانکہ مجھے تم سے ایسی امید نہ تھی۔"

امر رقت آمیز لہجے میں بولا۔ "میں تم سے اس لیے کچھ نہیں کہنا چاہتا کہ تم میرے زخم پر مرہم رکھنے کے بجائے اس پر نمک چھڑکو گے۔ اور اگر سننا ہی چاہتے ہو تو سنو کہ آج وہ راز طشت ازبام ہوگیا۔ اور میرے لیے ڈوب مرنے کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے۔ پٹھانی اس وقت دادا کے پاس ہوگی اور واویلا مچ رہا ہوگا۔"

سلیم نے تشفی دیتے ہوئے کہا۔ "یہ تو کوئی ایسا سانحہ نہیں ہے جس کے لیے تم اس قدر مایوس ہو رہے ہو۔ چلو میں تمھارے ساتھ چلتا ہوں بڑھیا کو وہاں سے ذلیل کر کے نہ نکلوا دوں تو کہنا۔ مگر یار ہو تم احمق۔ بس اور کیا کہوں۔ بچھو کا منتر تو جانتے نہیں سانپ کے منہ میں اُنگلی ڈالنے چلے ہو۔ کہتا تھا ادھر زیادہ آیا جایا نہ کرو۔ آخر ہوئی وہی بات۔ خیریت ہوئی کہ بڑھیا نے محلے والوں سے فریاد نہیں کی ورنہ غضب ہوجاتا۔"

امر نے حقارت آمیز نظروں سے دیکھ کر کہا۔ "ایسی نصیحتیں میں تمھیں بھی کرسکتا ہوں بھائی جان، مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ تم میرے دل کی حالت کا اندازہ نہیں کرسکتے۔ نہ جانے وہ کون سی قوت ہے جو مجھے اس وقت سنبھالے ہوئے ہے ورنہ دل میں تو یہی آتا ہے کہ ساری دنیا سے الگ کسی گوشے میں جا بیٹھوں اور ایک دن فنا ہوجاؤں مجھ میں اخلاقی جرأت کی اس قدر کمی ہے یہ میں نے کبھی محسوس نہ کیا تھا۔ سکینہ میرے ساتھ آنے پر

آمادہ تھی۔ لیکن میری پست ہمتی نے .... کیا کہوں۔"

"اس وقت میرے گھر چلو۔ وہاں ڈاکٹر صاحب کو بلالیں اور آپس میں کوئی مشورہ کریں۔ میرا خیال ہے کہ یہ معاملہ اس قدر طول نہ کھینچے گا۔"

"مجھے تو خیال آتا ہے کہ ڈاکٹر سے اس معاملے میں صلاح لینا فضول ہے۔ جس نے اس کوچے میں قدم ہی نہیں رکھا وہ اس معاملے میں کیا صلاح دے سکتا ہے۔ اصل میں مَیں بدنصیب ہوں مجھے زندگی میں کبھی خوشی نصیب نہیں ہوئی اور نہ شاید کبھی نصیب ہوگی۔ معلوم نہیں اس وقت اس کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی۔ گوڈر میں یہ لعل کہاں سے آگیا۔ یہ تو خدا ہی جانے لیکن میری غم نصیب زندگی میں وہی چند لمحے یادگار ہیں جو اس کے ساتھ گزرے، میری وحشت مجھے کدھر لے جائے گی کچھ کہہ نہیں سکتا۔ تم سے صرف اتنی التجا ہے کہ ہر ممکن صورت سے سکینہ کی امداد کرتے رہنا۔ اس وقت دل کی جو کیفیت ہے وہ بیان نہیں کرسکتا۔ نہیں جانتا زندہ رہوں گا یا مروں گا۔ کشتی میں بیٹھ گیا ہوں یہ کہاں جاتی ہے کچھ خبر نہیں۔ کب کہاں یہ ناؤ کنارے لگے گی، مجھے خبر نہیں۔ بہت ممکن ہے کہ منجدھار ہی میں ڈوب جائے۔ اگر اس زندگی میں کوئی حقیقت نظر آئی تو یہ کہ دنیا میں کسی عادل اور رحیم خدا کا وجود نہیں۔ جو چیز جسے ملنی چاہیے اسے نہیں ملتی اس کا اُلٹا ہی ہوتا ہے۔ ہم زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں ہاتھ پاؤں نہیں ہلاسکتے۔ ہمیں ایک چیز دے دی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس کے ساتھ تمھیں زندگی بھر نباہ کرنا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ اس چیز پر قناعت کریں، چاہے ہمیں اس سے نفرت ہی کیوں نہ ہو۔ اگر ہم اپنی زندگی کے لیے کوئی دوسری راہ نکالتے ہیں تو ہماری گردن پکڑلی جاتی ہے۔ ہمیں کچل دیا جاتا ہے۔ اسی کو دنیا انصاف کہتی ہے۔ کم سے کم میں اس دنیا میں رہنے کے قابل نہیں ہوں۔"

سلیم بولا۔ "تم لوگ بیٹھے بٹھائے اپنی جان کو زحمت میں ڈالنے کی تدبیریں سوچتے رہتے ہو۔ گویا زندگی ہزار سال کی ہے۔ گھر میں روپے بھرے ہوئے ہیں۔ سارا گھر تمھارے اوپر نثار ہونے کو تیار ہے۔ پری جیسی بی بی اور آپ ایک جولاہے کی لڑکی کے پیچھے گھر بار چھوڑے بھاگے جا رہے ہیں، زہر کھانے کو تیار ہیں۔ میں تو اسے جنون کہتا ہوں۔ زیادہ سے زیادہ یہی تو ہوگا کہ تم دنیا میں کچھ نام کرجاؤگے میں یوں ہی گمنام پڑا رہوں گا۔ مگر انجام

دونوں کا ایک ہے۔"

امر نے جواب دیا۔"جس طرح تمھاری زندگی گزری ہے اس طرح میری زندگی گزرتی تو شاید میں بھی زندگی کو انھیں ظریفانہ نظروں سے دیکھتا۔ میں وہ درخت ہوں جسے کبھی پانی نہیں ملا۔ زندگی کی وہ عمر جب انسان کو محبت کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے، بچپن ہے۔ اس وقت پودے کو تری مل جائے تو ہمیشہ کے لیے اس کی جڑیں مضبوط ہوجاتی ہیں۔ اس وقت خوراک نہ پاکر اس کی حیات کی نمی خشک ہوجاتی ہے۔ میری ماں کا اسی زمانے میں انتقال ہوا اور تب سے میری روح کو اس کی غذا میسر نہ ہوئی۔ وہی بھوک میری زندگی ہے مجھے جہاں محبت کا ایک ریزہ بھی ملے گا میں بے اختیار اس کی طرف دوڑوں گا۔ یہ فطرت کا اٹل قانون ہے۔ اس کے لیے اگر کوئی مجھے خطاوار کہے تو کہے، میں اپنی خطا تسلیم نہیں کرتا۔"

باتیں کرتے کرتے سلیم کا مکان آگیا۔ سلیم نے کہا۔ "مگر گھر سے قطع تعلق کرلینا تو اس مسئلے کو حل کرنا نہیں ہے۔"

امر اپنے خیالوں میں اس قدر محو تھا کہ شاید سلیم کے الفاظ اس کے کانوں تک پہنچے ہی نہیں۔ اسی رو میں بولا۔"یہاں اپنا کون بیٹھا ہے جسے میرا درد ہو۔ دادا کو میری پروا نہیں شاید اور خوش ہوں کہ اچھا ہوا بلا ٹلی۔ سکھدا میری صورت سے بیزار ہے۔ میرے اور اس کے اصولوں میں کوئی مناسبت ہی نہیں۔ دوستوں میں لے دے کر ایک تم ہو۔ تم سے کبھی کبھی ملاقات ہوتی رہے گی۔ ماں ہوتی تو شاید اس کی محبت مجھے کھینچ لاتی۔ تب میری زندگی کی یہ رفتار ہی کیوں ہوتی۔ دنیا میں سب سے بدنصیب وہ ہے جس کی ماں بچپن میں مرگئی ہو۔"

امرکانت ماں کو یاد کرکے رو پڑا۔ اسے اب عالمِ طفلی کے دن یاد آئے۔ جب ماں اسے روتے دیکھ کر گود میں اُٹھا لیتی تھی اور وہ ماں کے آنچل میں منہ چھپا کر نہال ہوجاتا تھا۔

سلیم نے اندر جاکر چپکے سے اپنے نوکر کو لالہ سمرکانت کے پاس بھیجا کہ انھیں اپنے ساتھ لوا لائے۔ پھر باہر آکر اس نے امرکانت کو باتوں میں لگایا۔ "لیکن تم نے یہ بھی سوچا ہے کہ تمھاری دیوی کا کیا حال ہوگا۔ مان لو وہ بھی اپنی دل بستگی کا کوئی انتظام کرلے، بُرا

نہ ماننا۔"

امر نے اسے اَن ہونی بات سمجھتے ہوئے کہا۔ "ہندو عورت اتنی بے شرم نہیں ہوتی۔"

سلیم ہنسا۔ "بس آگیا ہندوپن۔ ارے بھائی جان ان معاملات میں ہندو اور مسلمان کا کیا ذکر۔ اپنی اپنی طبیعت ہے۔ ہندوؤں میں بھی دیویاں ہیں اور مسلمانوں میں بھی دیویاں ہیں۔ ہرجائیاں بھی دونوں ہی میں ہیں۔ پھر تمھاری بی بی تو نئے خیال کی عورت ہے۔ پڑھی لکھی آزاد خیال۔ سیر سپاٹے کرنے والی۔ سینما کی شوقین اور آرائش کی دل دادہ، ایسی عورت سے خدا کی پناہ۔ یہ یورپ کی برکت ہے۔ آج کل کی دیویاں جو کچھ نہ کر گزریں وہ تھوڑا ہے۔ پہلے لونڈے پیش قدمی کیا کرتے تھے۔ مردوں کی طرف سے چھیڑ چھاڑ ہوا کرتی تھی۔ اب زمانہ بدل گیا ہے اب عورتوں کی طرف سے چھیڑ چھاڑ ہوتی ہے۔"

امرکانت بے شرمی سے بولا۔ "اس کی فکر اُسے ہو جسے زندگی میں کچھ آرام ہو۔ جو زندگی سے بیزار ہے اس کے لیے کیا فکر۔ جس کی خوشی ہو، جائے۔ میں نہ کسی کا غلام ہوں نہ کسی کو اپنا غلام بنانا چاہتا ہوں۔"

سلیم نے قائل ہوکر کہا۔ "تو پھر حد ہوگئی۔ پھر کیوں نہ عورتوں کا مزاج آسمان پر چڑھ جائے۔ میرا خون تو اس خیال ہی سے اُبل پڑتا ہے۔ عورتوں اور مردوں کے مزاج میں، جسم کی بناوٹ، دل کے جذبات میں فرق ہے۔ عورت ایک کی ہوکر رہنے کے لیے بنائی گئی ہے۔ مرد آزاد رہنے کے لیے۔"

"یہ مردوں کی خودغرضی ہے۔"

"جی نہیں یہ حیوانی زندگی کا اصول ہے۔"

بحث میں شاخیں نکلتی گئیں۔ شادی کا مسئلہ پیش ہوا۔ پھر بے کاری کے مسئلے پر غور ہونے لگا۔ اس کے بعد کھانا آگیا۔ دونوں کھانے بیٹھے۔

ابھی دو چار ہی لقمے کھائے ہوں گے کہ ملازم نے لالہ سمرکانت کے آنے کی خبر دی۔ امرکانت جھٹ میز پر سے اُٹھا۔ کلّی کی۔ اپنی پلیٹ میز کے نیچے چھپا کر رکھ دی اور بولا۔ "انھیں کیسے معلوم ہوا میں یہاں ہو؟"

سلیم مسکرا رہا تھا۔

امر نے تیوری چڑھا کر کہا۔ ”یہ تمھاری شرارت معلوم ہوتی ہے۔ اسی لیے تم مجھے یہاں لائے تھے۔ آخر کیا نتیجہ ہوا۔ مفت کی ذلت ہوگی میری۔ مجھے ذلیل کرانے سے تمھیں کچھ مل جائے گا؟ میں اسے دوستی نہیں دشمنی کہتا ہوں۔“

سلیم کوئی جواب نہ دینے پایا تھا کہ لالہ سمرکانت نے کمرے میں قدم رکھا۔ تینوں ایک منٹ تک خاموش کھڑے رہے۔ سلیم کو خیال آیا شاید میری موجودگی اس خاموشی کا باعث ہے۔ اس نے لالہ جی کو اس نظر سے دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو۔ یہاں رہوں یا جاؤں۔ لالہ جی نے اس کے دل کی بات تاڑ کر کہا۔ ”نہیں تم سے کوئی بات پردے کی نہیں ہے۔ ہماری اور حافظ جی کی پرانی دوستی ہے۔ میں سب کچھ سُن چکا ہوں۔ للّو پٹھانی میرے پاس آئی تھی۔ میں نے اُسے بُری طرح پھٹکارا۔ میں نے کہہ دیا مجھے تیری بات کا یقین نہیں آتا۔ جس کی عورت لچھمی کا روپ ہو وہ کیوں کر چڑیلوں کے پیچھے اپنی عزت گنوائے گا۔ لیکن اگر کوئی بات ہے ہی تو اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں غلطی کس سے نہیں ہوتی۔ اپنی عمر میں ہم سبھوں نے بڑے بڑے تماشے کیے ہیں۔ بڑھیا کو دوچار سو روپے دے دیے جائیں گے۔ لڑکی کی کسی بھلے گھر میں شادی کردی جائے گی، چلو قصہ تمام ہوا۔ تمھیں گھر سے بھاگنے کی کیا ضرورت ہے۔ میری پروا مت کرو۔ لیکن تمھیں ایشور نے بال بچے دیے ہیں۔ سوچو تمھارے چلے جانے سے کتنی زندگیاں تباہ ہوجائیں گی۔ عورت تو عورت ہی ہے۔ بہن ہے رو رو کر مرجائے گی۔ راما دیوی بھی تم ہی لوگوں کی محبت سے یہاں پڑی ہوئی ہیں جب تم ہی نہ رہوگے تو وہ سکھدا کو لے کر چلی جائیں گی۔ میرا گھر تباہ ہوجائے گا۔ بیٹا سلیم میں کچھ بُرا تو نہیں کہہ رہا ہوں؟ جو کچھ ہوگیا وہ ہوگیا۔ آئندہ کے لیے احتیاط رکھو۔ تم خود سمجھ دار ہو میں تمھیں کیا سمجھاؤں نفس کو زنجیروں میں باندھ کر رکھنا پڑتا ہے نہیں تو آدمی کو نہ جانے کہاں کہاں لیے پھرے۔ تمھیں ایشور نے سب کچھ دیا ہے۔ کچھ گھر کا کام دیکھو۔ کچھ باہر کا کام دیکھو۔ مارے مارے پھرنے سے کیا فائدہ۔“

امر اس طرح بیٹھا رہا جیسے کوئی دیوانہ بک رہا ہے۔ آج تم ان میٹھی میٹھی باتوں سے مجھے فریب دینا چاہتے ہو۔ میری زندگی تم ہی نے برباد کی۔ تمھارے ہی ہاتھوں میری یہ حالت ہوئی۔ تم نے مجھے اپنے گھر کو گھر نہ سمجھنے دیا۔ تم مجھے چکّی کا بیل بنانا چاہتے ہو۔ امر

اپنے باپ کا اتنا ادب نہ کرتا تھا جتنا ان سے دبتا تھا۔

جوں ہی لالہ جی خاموش ہوئے۔ اس نے گستاخانہ لہجے میں کہا۔ ”دادا جی آپ کے گھر میں میری اتنی عمر برباد ہوگئی۔ اب میں اسے اور برباد نہیں کرنا چاہتا۔ آدمی کی زندگی کا منشاء محض کھانا اور مرجانا نہیں ہے۔ نہ دولت کمانا ہی اس کی زندگی کی منشاء ہے۔ میری حالت اب ناقابلِ برداشت ہورہی ہے۔ میں اب ایک نئی زندگی کا آغاز کرنے جارہا ہوں۔ جہاں مزدوری شرم کی چیز نہیں۔ جہاں عورت اپنے شوہر کو پستی اور زوال کی طرف نہیں لے جاتی بلکہ اس کی زندگی کو مسرت سے معمور کرتی ہے۔ میں رسوم اور خاندانی وقار کا غلام بن کر نہیں رہنا چاہتا۔ آپ کے گھر میں مجھے ہمیشہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا اور اس کش مکش میں میری زندگی ختم ہوجائے گی۔ آپ ٹھنڈے دل سے کہہ سکتے ہیں آپ کے گھر میں سکینہ کے لیے جگہ ہے؟“

لالہ جی نے پُرخوف نظروں سے دیکھ کر پوچھا۔ ”کس صورت میں؟“

”میری بی بی کی صورت میں۔“

”نہیں ایک بار نہیں اور سو بار نہیں۔“

”تو پھر میرے لیے بھی آپ کے گھر میں جگہ نہیں۔“

”اور تو کچھ نہیں کہنا ہے؟“

”جی نہیں۔“

لالہ جی کرسی سے اُٹھ کر دروازے کی طرف بڑھے۔ پھر پلٹ کر بولے۔

”بتا سکتے ہو کہاں جا رہے ہو؟“

”ابھی تک کچھ طے نہیں کرسکا۔“

”جاؤ ایشور تمھیں خوش رکھے۔ اگر کبھی کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے لکھنے میں تامّل نہ کرنا۔“

”مجھے امید ہے کہ میں آپ کو کوئی تکلیف نہ دوں گا۔“

”چلتے چلتے زخم پر نمک نہ چھڑکو۔“

دوسرا حصّہ

(ا)

شمال کے کوہستانی سلسلوں کے بیچ میں ایک چھوٹا سا ہرا بھرا گاؤں ہے۔ سامنے گنگا کسی دوشیزہ کی طرح ہنستی، اُچھلتی، ناچتی، گاتی چلی جا رہی ہے۔ گاؤں کے پیچھے ایک اونچا پہاڑ کسی بوڑھے جوگی کی طرح جٹا بڑھائے سیاہ، متین، خیال میں محو کھڑا ہے۔ یہ موضع گویا اس طفلی کی یاد ہے خوشیوں اور دلچسپیوں سے پُر۔ یا کوئی عالمِ شباب کا سنہرا خواب۔ اس گاؤں میں مشکل سے بیس پچیس جھونپڑے ہوں گے۔ پتھر کے ناہموار ٹکڑوں کو اوپر نیچے رکھ کر دیواریں بنا لی گئی ہیں۔ ان میں چھپّر ڈال دیے گئے ہیں۔ دروازوں پر بنکٹ کی ٹٹیاں ہیں۔ ان ہی کابکوں میں اس گاؤں کی مخلوق اپنے گائے، بیل، بھیڑ اور بکریوں کو لیے خدا جانے کب سے آباد ہے۔

ایک دن شام کے وقت ایک سانولا سا لاغراندام نوجوان موٹا کُرتا اونچی دھوتی اور چمرودھے جوتے پہنے، کندھے پر لٹیا ڈول رکھے، بغل میں ایک بُقچی دبائے اس گاؤں میں آیا اور ایک بُڑھیا سے بولا۔ ”کیوں ماتا یہاں ایک پردیسی کو رات بھر رہنے کا ٹھکانا مل جائے گا؟“

بُڑھیا سر پر لکڑی کا ایک گٹھا رکھے ایک بوڑھی گائے کو مرغزار کی طرف سے ہانکتی چلی آتی تھی۔ نوجوان کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ پسینے میں تر، سر اور منہ پر گرد جمی ہوئی، چہرے پر مایوسی، آنکھوں میں تشنگی۔ گویا زندگی میں کوئی جائے امن ڈھونڈھتا ہو۔ بولی۔”یہاں تو رہداس رہتے ہیں بھیّا۔“

امر کانت اسی طرح مہینوں سے دیہاتوں کی خاک چھانتا چلا آرہا ہے۔ اس اثناء میں سینکڑوں گاؤں کا دورہ کرلیا ہے۔ کتنے ہی آدمیوں سے اس کا ربط ضبط ہوگیا ہے۔ کتنے ہی اس کے معاون اور کتنے ہی مداح بن گئے ہیں۔ شہر کا وہ نازک بدن نوجوان دُبلا تو ہوگیا ہے لیکن دھوپ اور لو، آندھی اور مینہہ، بھوک اور پیاس سہتے سہتے اس کی مردانگی گویا اندر سے نکل پڑی ہے۔ یہی اس کی آنے والی زندگی کی تیاری ہے۔ وہ دیہاتیوں کی سادگی اور نیک دلی، اُنس اور قناعت سے روز بروز متاثر ہوتا رہتا ہے۔ ایسے سیدھے سادے بے لوث آزاد منش آدمیوں پر آئے دن جو مظالم ہوتے رہتے ہیں ان نظاروں نے اس کے مزاج میں تلخی پیدا کردی ہے۔ جس پُرسکون زندگی کی امید اسے دیہاتوں کی طرف کھینچ لائی تھی اس کا وہاں نام بھی نہ تھا۔ ظلم اور بیداد کا راج تھا اور امر کی روح اس راج کے خلاف جھنڈا اُٹھائے پھرتی تھی۔

امر کانت نے انکسار کے ساتھ کہا۔ ''میں ذات پات نہیں مانتا ماتا جی۔ جو سچّا ہو وہ چمار بھی ہو تو عزّت کے لائق ہے۔ جو دغا باز، جھوٹا اور مکّار ہو وہ برہمن بھی ہو تو عزّت کے لائق نہیں۔ لاؤ لکڑی کا گٹھا میں لیتا چلوں۔'' اس نے بڑھیا کے سر سے لکڑی کا گٹھا اُتار کر اپنے سر پر رکھ لیا۔

بُڑھیا نے دعا دے کر پوچھا۔ ''کہاں جاؤگے؟''

یوں ہی مانگتا کھاتا چلا آتا ہوں۔ آنا جانا کہیں نہیں ہے۔ رات کو سونے کو تو جگہ مل جائے گی؟''

''جگہ کی کون کمی ہے بھیّا۔ مندر کے چبوترے پر سو رہنا۔ کسی سادھو سنت کے پھیر میں تو نہیں پڑگئے ہو؟ میرا بھی ایک لڑکا ان کے جال میں پھنس گیا، پھر کچھ پتہ نہ چلا۔ اب تک تو کئی لڑکوں کا باپ ہوتا۔''

دونوں گاؤں میں پہنچ گئے۔ بُڑھیا نے اپنی جھونپڑی کی ٹٹّی کھولتے ہوئے کہا۔ ''لاؤ لکڑی یہاں رکھ دو، تھک گئے ہوگے، تھوڑا سا دودھ رکھا ہے پی لو۔ اور سب جانور تو مرگئے۔ یہی گائے رہ گئی ہے۔ پاؤ بھر دودھ دیتی ہے۔ کھانے کو تو پاتی نہیں دودھ کہاں سے دے۔ میرے گھر کا دودھ تو پی لوگے نا؟''

امر ایسی مادرانہ محبت کے تبرّک کو رد نہ کرسکا۔ بڑھیا کے ساتھ جھونپڑی میں گیا۔

تو اس کا دل کانپ اُٹھا۔ گویا افلاس چھاتی پیٹ پیٹ کر رو رہا ہو اور ہمارا اونچا طبقہ عیش میں ڈوبا ہوا ہے۔ اسے رہنے کو بنگلہ چاہیے۔ کھانے کو نعمت اور پہننے کو ریشم۔ غریب فاقے کریں وہ دولت کے انبار لگائے گا۔ تکلّفات میں روپے اُڑائے گا۔ ایسی دنیا غارت کیوں نہیں ہو جاتی۔

بُڑھیا نے ایک پیتل کے کٹورے میں دودھ اُنڈیل دیا اور آپ گھڑا اُٹھا کر پانی لینے چلی۔ امر نے کہا۔ ''میں کھینچ لاتا ہوں ماتا، رسّی تو کنوئیں پر ہو گی؟''

''نہیں بیٹا، تم کہاں جاؤ گے پانی بھرنے۔ ایک رات کے لیے آگئے تو تم سے پانی بھرواؤں گی؟''

بڑھیا ہائیں ہائیں کرتی رہ گئی۔ امرکانت نے گھڑا اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ اور کنوئیں پر جا پہنچا۔ بڑھیا بھی محبت کی زنجیر میں بندھی ہوئی اس کے پیچھے پیچھے گئی۔

کنوئیں پر کئی عورتیں پانی کھینچ رہی تھیں۔ امرکانت کو دیکھ کر ایک حسینہ نے پوچھا۔''کوئی مہمان ہیں کیا سلونی کاکی؟''

بُڑھیا نہال ہوکر بولی۔''مہمان نہ ہوتے تو پانی بھرنے کیسے آتے؟ تیرے گھر بھی ایسے مہمان آتے ہیں؟''

حسینہ نے ترچھی نظروں سے امر کو دیکھ کر کہا۔ ''ہمارے مہمان تو اپنے ہاتھ سے پانی بھی نہیں پیتے کاکی۔ ایسے بھولے بھالے مہمان کو تو میں اپنے گھر لے جاؤں گی۔''

امرکانت کا کلیجہ دھک سے ہوگیا تھا۔ یہ حسینہ وہی منّی تھی جو خون کے مقدمے میں بَری ہوگئی تھی۔ وہ اتنی لاغراندام، اتنی مغموم نہیں نظر آتی۔ اس کا حسن شگفتہ ہوگیا ہے اور جسم میں ایک دلکش تناسب پیدا ہوگیا ہے۔ مسرّت ہی زندگی کی حقیقت ہے وہ ماضی کی پروا نہیں کرتا۔

لیکن شاید مُنّی نے امرکانت کو نہیں پہچانا، اس کی صورت اتنی تبدیل ہوگئی تھی۔ چہرے پر نفاست کی جگہ مزدوروں کی سی بیکسی چھائی ہوئی تھی۔

امر نے جھینپتے ہوئے کہا۔ ''میں مہمان نہیں ہوں دیوی، پردیسی ہوں، آج اس گاؤں میں آنکلا۔ اِس رشتے سے گاؤں بھر کا مہمان ہوں۔''

حسینہ نے مسکرا کر کہا۔ ''تب ایک دو گھڑوں سے گلا نہ چھوٹے گا۔ دو سو گھڑے

بھرنے پڑیں گے۔ نہیں تو گھڑا اِدھر بڑھا دو۔ جھوٹ تو نہیں کہتی کاکی؟"
اس نے امرکانت کے ہاتھ سے گھڑا لے لیا اور جھٹ پھندا لگا کنوئیں میں ڈال، بات کی بات میں گھڑا کھینچ لیا۔
امرکانت گھڑا لے کر چلا گیا تو منّی نے سلونی سے کہا۔ "کسی بھلے گھر کا آدمی ہے کاکی۔ دیکھا کتنا شرماتا ہے۔ میرے یہاں سے اچار منگوا لینا۔ آٹا واٹا تو ہے؟"
سلونی نے کہا۔"باجرے کا ہے۔ گیہوں کہاں سے لاتی۔"
"تو میں آٹا لیے آتی ہوں۔ نہیں چلو دے دوں۔ وہاں کام دھندے میں پھنس جاؤں گی تو بھول جاؤں گی۔"
تین سال قبل منّی کو گاؤں کے مکھیا کا لڑکا ہردوار سے لے آیا تھا۔ تین ہفتے سے ایک دھرم شالے کے دروازے پر خستہ حال پڑی ہوئی تھی، بڑے بڑے آدمی دھرم شالے میں آتے تھے۔ سینکڑوں ہزاروں خیرات کرتے تھے، پر اس بیکس پر کسی کو رحم نہ آتا تھا۔ مکھیا کا جوان بیٹا جوتا بیچنے گیا تھا، اسے دیکھ کر اسے رحم آگیا۔ گاڑی پر لاد کر گھر لایا۔ دوا دارو ہونے لگی۔ چودھری بگڑے یہ مردہ کیوں لایا۔ مگر وہ نوجوان شب و روز دوڑدھوپ کرتا رہا۔ وہاں ڈاکٹر وید کہاں تھے۔ بھبوت اور دعا کا بھروسہ تھا۔ ایک اوجھے کی تعریف سُنی، مُردوں کو جِلا دیتا ہے۔ رات کو اسے بلانے چلا، چودھری نے کہا دن ہونے دو تب جانا۔ نوجوان نہ مانا۔ رات ہی کو چل دیا۔ گنگا بڑھی ہوئی تھی۔ اس کو پار کر کے جانا تھا۔ سوچا تیر کر نکل جاؤں گا۔ کون بہت چوڑا پاٹ ہے۔ سینکڑوں ہی بار اس طرح آجا چکا تھا۔ بے خوف پانی میں گھس پڑا۔ مگر لہریں تیز تھیں۔ پاؤں اُکھڑ گئے۔ دوسرے دن دو کوس پر اس کی لاش ملی۔ ایک چٹان سے چمٹی پڑی تھی۔ اس کے مرتے ہی منّی جی اُٹھی اور تب سے یہیں ہے۔ یہی اس کا گھر ہے۔ وہ اپنی ذات بھول گئی۔ وہ طور و طریق بھول گئی اور اونچی ذات کی ٹھکرائین اچھوتوں کے ساتھ اچھوت بن کر یہاں آرام سے رہنے لگی۔ وہ گھر کی مالکن تھی۔ باہر کا سارا کام وہ کرتی، رسوئیں، پانی، کوٹنا، پیسنا اس کی دونوں دیورانیوں کے سپرد تھا۔ وہ اب غیر نہ تھی۔ چودھری کی بڑی بہو ہوگئی تھی۔
سلونی کو لے جاکر منّی نے ایک تھال میں آٹا، اچار اور دہی رکھ کر دیا۔ مگر سلونی کو یہ تھال لے کر گھر میں جاتے شرم آتی تھی۔ مہمان دروازے پر بیٹھا ہوا ہے۔ سوچے گا

اس کے گھر میں آٹا تک نہیں ہے۔ ذرا اندھیرا ہوجائے تو جاؤں۔

منّی نے پوچھا۔"کیا سوچتی ہو کاکی؟"

"سوچتی ہوں ذرا اندھیرا ہوجائے تو جاؤں۔ اپنے من میں کیا کہے گا۔"

"چلو میں پہنچا دیتی ہوں۔ کہے گا کیا۔ کیا سمجھتا ہے۔ یہاں دھنا سیٹھ بستے ہیں۔ میں تو کہتی ہوں وہ باجرے کی ہی روٹیاں کھائے گا، گیہوں کی چھوئے گا بھی نہیں۔"

دونوں پہنچیں تو دیکھا امر دروازے پر جھاڑو دے رہا ہے۔ وہاں مہینوں سے جھاڑو نہیں دی گئی تھی۔ زمین ایسی معلوم ہونے لگی گویا اُلجھے بکھرے بالوں میں کنگھی کردی گئی ہو۔

سلونی تھالی لے کر جلدی سے اندر چلی گئی۔ منّی نے کہا۔ "اگر ایسی مہمانی کروگے تو یہاں سے کبھی نہ جانے پاؤگے۔" اس نے امر کے پاس جاکر اس کے ہاتھ سے جھاڑو چھین لی۔ امر نے کوڑے کو پیروں سے ایک جگہ بٹور کر کہا۔

"دیکھو تو کیسا اچھا لگنے لگا۔"

"کل چلے جاؤگے تو یہ باتیں یاد آئیں گی۔ پردیسی کا کیا اعتبار، پھر ادھر کیوں آنے لگے۔"

منّی کا چہرہ اُداس ہوگیا۔ امر نے پُرخلوص لہجے میں کہا۔"جب کبھی اِدھر آنا ہوگا تو تمھارے درشن کرنے ضرور آؤں گا۔ ایسا خوب صورت گاؤں میں نے نہیں دیکھا۔ ندی، پہاڑ، جنگل اس کا تو سماں ہی نرالا ہے۔ جی چاہتا ہے یہیں رہ جاؤں اور کہیں جانے کا نام نہ لوں۔"

منّی نے اشتیاق سے کہا۔ "تو رہ کیوں نہیں جاتے؟"

مگر پھر سوچ کر بولی۔"تمھارے گھر میں اور لوگ بھی تو ہوں گے وہ تمھیں یہاں کیوں رہنے دیں گے۔"

"میرے گھر میں ایسا کوئی نہیں ہے۔ جسے میرے مرنے جینے کا غم ہو، میں دنیا میں بالکل اکیلا ہوں۔"

منّی مصر ہوکر بولی۔"تو یہیں رہ جاؤ، کون بھائی ہو تم؟"

"یہ تو میں بالکل بھول گیا جو بلا کر پریم سے ایک روٹی کھلا دے وہی میرا بھائی

ہے۔"

تو کل مجھے آلینے دینا تب جانا، ایسا نہ ہو چپکے سے بھاگ جاؤ۔"

امرکانت نے جھونپڑی میں آکر دیکھا تو بڑھیا چولھا جلا رہی تھی۔ گیلی لکڑی سے چولھا نہ جلتا تھا۔ پوپلے منہ میں پھونک بھی نہ تھی۔ امر کو دیکھ کر بولی۔"تم یہاں دھوئیں میں کیوں آگئے بیٹا۔ جاکر باہر بیٹھو۔ یہ چٹائی اُٹھا لے جاؤ۔"

امر نے چولھے کے پاس جاکر کہا۔"تم ہٹ جاؤ میں آگ جلائے دیتا ہوں۔"

سلونی نے حجت آمیز سختی سے کہا۔ "تو باہر کیوں نہیں جاتا بھائی۔ مردوں کا تو اس طرح رسوئی میں گھسنا اچھا نہیں لگتا۔" بڑھیا ڈر رہی تھی کہ امرکانت دو قسم کے آٹے نہ دیکھ لے۔ شاید اسے دکھانا چاہتی تھی کہ میں بھی گیہوں کا آٹا کھاتی ہوں۔ امر یہ راز کیا سمجھے بولا۔"اچھا تو آٹا نکال دے میں گوندھ دوں۔"

سلونی نے حیران ہوکر کہا۔ "تو کیسا لڑکا ہے۔ بھائی، جاکر باہر کیوں نہیں بیٹھتا۔"

اسے اپنے وہ دن یاد آئے جب اسے اپنے بچّے اماں اماں کہہ کر گھیر لیتے تھے۔ اس اُجڑے ہوئے گھر میں آج کتنے دنوں کے بعد دیا جلا تھا۔ مگر کل پھر وہی اندھیرا ہوجائے گا۔ وہی سنّاٹا۔ نہ جانے کیوں امرکانت کی طرف اس کی طبیعت مائل ہو رہی تھی۔ کون جانے کہاں سے آیا ہے کہاں جائے گا۔ مگر یہ جانتے ہوئے بھی وہ امر کو پیار کر رہی تھی۔ شاید اس کی طفلانہ حرکتیں، باربار گھر میں آنا اور ہر ایک کام میں دخل دینا، اس کے مادرانہ جذبات کو جو مدتوں سے خشک ہوگئے تھے سینچتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ گویا اپنے ہی بچّوں کی آوازیں خاموشی کی اتھاہ گہرائیوں سے اس کے کانوں میں آرہی تھیں۔

ایک لڑکا لالٹین لیے ایک دری کندھے پر رکھے آیا اور دونوں چیزیں اس کے پاس رکھ کر بیٹھ گیا۔

امر نے پوچھا۔ "دری کہاں سے لائے؟"

"کاکی نے تمھارے لیے بھیجا ہے۔ وہی کاکی جو ابھی آئی تھیں۔"

امر نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔"اچھا تم ان کے بھتیجے ہو۔ تمھاری کاکی تم کو مارتی تو نہیں؟"

لڑکے نے سر ہلا کر کہا۔"کبھی نہیں وہ تو ہمیں کھلاتی ہیں۔ دُرجن کو نہیں کھلاتی۔ وہ

بڑا بدمعاش ہے۔"

امر نے مسکرا کر پوچھا۔"کہیں پڑھنے جاتے ہو؟" لڑکے نے نیچے کا ہونٹ سکیڑ کر کہا۔ "کہاں جائیں، ہمیں کون پڑھائے۔ مدرسے میں تو کوئی جانے نہیں دیتا۔ ایک دن دادا ہم دونوں کو لے کر گئے تھے، پنڈت جی نے نام لکھ لیا۔ مگر ہمیں سب سے الگ بٹھاتے تھے۔ سب لڑکے ہمیں چمار چمار کہہ کر چڑاتے تھے۔ دادا نے نام کٹا لیا۔"

امر کی خواہش ہوئی کہ چودھری سے جاکر ملے۔ کوئی خوددار آدمی معلوم ہوتا ہے۔ پوچھا۔"تمھارے دادا کیا کر رہے ہیں؟"

بچّے نے لالٹین سے کھیلتے ہوئے کہا۔ "بوتل لیے ہوئے بیٹھے ہیں۔ بُھنے چنے رکھے ہیں۔ بس ابھی بک جھک کریں گے۔ خوب چلّائیں گے۔ کسی کو ماریں گے۔ کسی کو گالیاں دیں گے، دن بھر کچھ نہیں بولتے جہاں بوتل چڑھائی کہ بک چلی۔"

امر نے اِس وقت ان سے ملنا مناسب نہ سمجھا۔

سلونی نے پکارا۔"بھیّا روٹی تیار ہے۔ آؤ گرم گرم کھالو۔"

امرکانت نے ہاتھ دھوئے اور اندر پہنچا۔ پیتل کی تھالی میں روٹیاں تھیں پتھر کی پیالی میں دہی، پتّے پر اچار۔ لوٹے میں پانی رکھا ہوا تھا۔ تھالی پر بیٹھ کر بولا۔"تم بھی کیوں نہیں کھاتیں؟"

"تم کھالو بیٹا میں پھر کھالوں گی۔"

"نہیں یہ نہ ہوگا میرے ساتھ کھالو۔"

"رسوئیں جھوٹی ہوجائے گی کہ نہیں۔"

"ہوجانے دو، میں ہی تو کھانے والا ہوں۔"

"رسوئیں میں بھگوان رہتے ہیں۔ اسے جھوٹا نہیں کرنا چاہیے۔"

"تو میں نہ کھاؤں گا۔"

"بھائی تو بڑا خراب لڑکا ہے۔"

رسوئیں میں دوسری تھالی کہاں تھی۔ سلونی نے ہتھیلی پر باجرے کی روٹیاں لے لیں اور رسوئیں کے باہر نکل آئی۔ امر نے باجرے کی روٹیاں دیکھ لیں بولا۔"یہ نہ ہوگا کاکی۔ مجھے تو پُھلکے دے دیے اور آپ مزے دار روٹیاں اُڑا رہی ہو۔"

"تو کیا کھائے گا باجرے کی روٹیاں۔ ایک دن کے لیے آپڑا تو باجرے کی روٹیاں کھلاؤں۔"

"میں تو مہمان نہیں ہوں۔ یہی سمجھ لو کہ تمھارا کوئی کھویا ہوا لڑکا آگیا۔"

"پہلے دن اس لڑکے کی بھی مہمانی کی جاتی ہے۔ مگر یہاں کا ہے کی مہمانی۔ نہ دارو نہ سکار۔"

"میں تو دارو سکار چھوتا تک نہیں۔"

امرکانت نے باجرے کی روٹیوں کے لیے زیادہ اصرار نہ کیا۔ ورنہ بڑھیا کو رنج ہوتا۔ بڑھیا بولی۔"اس عمر میں تو بھگتی اچھی نہیں لگتی بیٹا، یہی تو کھانے پینے کے دن ہیں۔ بھگتی تو بڑھاپے میں اچھی لگتی ہے۔"

"بھگت نہیں ہوں کاکی میرا من ہی نہیں چاہتا۔"

"ماں باپ بھگت رہے ہوں گے۔"

"ہاں وہ دونوں جنے بھگت تھے۔"

امر نے چند لفظوں میں اپنا قصہ کہہ سُنایا۔ بڑھیا نے پوچھا۔"تو گھر سے روٹھ کر آئے ہو۔"

"ایک بات پر دادا سے تکرار ہوگئی۔ میں چلا آیا۔"

"گھر والی تو رورو کر مری جاتی ہوگی؟ کبھی اسے خط پتر لکھتے ہو؟"

"اسے میری پرواہ نہیں کاکی۔ بڑے گھر کی لڑکی ہے۔ اپنے عیش و آرام میں مگن ہے۔ میں کہتا ہوں چل کسی گاؤں میں کھیتی باڑی کریں۔ اسے شہر اچھا لگتا ہے۔"

امرکانت نے کھانا کھا چکنے کے بعد اپنی تھالی اُٹھالی اور باہر آکر مانجھنے لگا۔ سلونی بھی پیچھے پیچھے آکر بولی۔"تمھاری تھالی میں مانجھ دیتی تو چھوٹی ہوجاتی؟"

امر نے ہنس کر کہا۔"تو کیا میں اپنی تھالی مانجھ کر چھوٹا ہوجاؤں گا۔"

"یہ تو اچھا نہیں لگتا کہ ایک دن کے لیے کوئی آئے تو تھالی مانجھنے لگے۔ اپنے من میں سوچتے ہوگے کہاں اس بھکارن کے یہاں آکر ٹھہرے۔"

امر کو بھکارن کے بے لوث پاکیزہ محبت میں جو راحت ملی وہ ماں کی گود کے سوا اور کہیں نہیں ملی تھی۔

اس نے تھالی دھو دھا کر رکھ دی۔ دری بچھا کر زمین پر لیٹنے ہی والا تھا کہ پندرہ بیس لڑکوں کی ایک جماعت آ کر کھڑی ہو گئی۔ دو تین لڑکوں کے سوا اور کسی کے جسم پر ثابت کپڑے نہ تھے۔ امرکانت اُٹھ بیٹھا گویا تماشا ہونے والا ہے۔

جو لڑکا ابھی دری لے کر آیا تھا بولا۔"اتنے لڑکے ہیں ہمارے گاؤں میں۔ دو تین لڑکے نہیں آئے کہتے ہیں وہ کان کاٹ لیں گے۔"

امرکانت نے اُٹھ کر ان سبھوں کو ایک قطار میں کھڑا کیا۔ اور ایک ایک کر کے نام پوچھا۔ پھر بولا۔"تم میں سے جو جو لڑکے روز ہاتھ منہ دھوتے ہیں وہ اپنا ہاتھ اُٹھائیں۔"

کسی لڑکے نے ہاتھ نہ اُٹھایا۔ شاید یہ سوال ہی ان کی سمجھ میں نہ آیا۔

امر نے تعجب کا اظہار کر کے کہا۔"ایں تم میں سے کوئی روز ہاتھ منہ نہیں دھوتا؟"

سبھوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ دری والے لڑکے نے ہاتھ اُٹھا دیا۔ اسے دیکھتے ہی دوسروں نے بھی ہاتھ اُٹھا دیا۔

امر نے پھر پوچھا۔"تم میں سے کون کون لڑکے روز نہاتے ہیں۔ ہاتھ اُٹھائیں۔"

اب کی بار پہلے کسی نے ہاتھ نہ اُٹھایا پھر ایک ایک کر کے سبھوں نے ہاتھ اُٹھا دیا۔ اس لیے نہیں کہ سب ہی روز نہاتے تھے بلکہ اس لیے کہ وہ دوسروں سے گھٹ کر نہ رہیں۔

سلونی کھڑی تھی بولی۔"تو تو مہینے میں ایک بار بھی نہیں نہاتا رے جنگلی۔ تو کیوں ہاتھ اُٹھائے ہوئے ہے؟"

جنگلی نے خفیف ہو کر کہا۔"تو گدڑی کون روز نہاتے ہیں؟"

سب ہی ایک دوسرے کی قلعی کھولنے لگے۔

امر نے ڈانٹا۔"اچھا آپس میں لڑو مت۔ میں ایک بات پوچھتا ہوں اس کا جواب دو، روز منہ ہاتھ دھونا اچھی بات ہے یا نہیں؟"

"سبھوں نے کہا۔"اچھی بات ہے۔"

"بس جاؤ میں دو چار روز میں پھر آؤں گا اور دیکھوں گا کہ کون کون سے لڑکے صفائی سے رہتے ہیں۔"

جب لڑکے چلے گئے تو امر لیٹا۔ تین مہینے کی متواتر بادیہ پیمائی سے اس کی طبیعت

بیزار ہوگئی تھی۔ سکون کے لیے طبیعت بے قرار تھی۔ کیوں نہ وہ اس گاؤں میں سکونت اختیار کرلے۔ یہاں اسے کون جانتا ہے؟ اور بس ایک لمحے میں یہیں اس کا ایک چھوٹا سا گھر بن گیا۔ سکینہ اس گھر میں آگئی، گائے بیل بھی آئے اور آخر میں نیند بھی آگئی۔

(۲)

امرکانت سویرے اُٹھا۔ منہ ہاتھ دھوکر گنگا اشنان کیا اور چودھری سے ملنے چلا۔ چودھری کا نام گودڑ تھا۔ اس گاؤں میں کوئی زمیندار نہ رہتا تھا۔ گودڑ کا دروازہ ہی چوپال کا کام دیتا تھا۔ امر نے دیکھا نیم کے درخت کے نیچے تخت پڑا ہوا ہے۔ دو تین بانس کی چارپائیاں۔ دو تین پیال کے گدّے۔ گودڑ کی عمر ساٹھ سے متجاوز تھی مگر ابھی ٹانٹا تھا۔ اس کے سامنے اس کا بڑا لڑکا پیاگ بیٹھا جوتا سی رہا تھا۔ دوسرا لڑکا کاشی بیلوں کو سانی پانی کر رہا تھا۔ منّی گوبر لگانے گئی تھی۔ تیجا اور دُرجن دونوں دوڑ دوڑ کر کنویں سے پانی لا رہے تھے۔ ذرا پورب کی طرف ہٹ کر دو عورتیں برتن مانجھ رہی تھیں۔ یہ دونوں گودڑ کی بہوئیں تھیں۔

امر نے چودھری کو رام رام کیا اور پیال کی گدّی پر بیٹھ گیا۔ چودھری نے پدرانہ شفقت سے اس کی آؤ بھگت کی۔ ”مزے میں بیٹھو بھیا۔ منّی نے رات ہی کہا تھا۔ دو چار دن رہو پھر چلے جانا۔ منّی تو کہتی تھی تم کو کوئی کام مل جائے تو یہیں ٹِک جاؤگے۔“

امر نے شرماتے ہوئے کہا۔ ”ہاں کچھ ارادہ تو ایسا ہی ہے۔“

گوڈر نے ناریل سے دُھواں نکال کر کہا۔ ”کام کی کون کمی ہے۔ گھاس بھی کرلو تو روپے روز کی مجوری ہوجائے۔ نہیں جوتے کا کام ہے۔ تلیاں بناؤ، چرسے بناؤ۔ محنت کرنے والا آدمی بھوکوں نہیں مرتا۔ دھیلی کی مجوری کہیں نہیں گئی ہے۔“

یہ دیکھ کر کہ امر کو ان دونوں میں کوئی تجویز پسند نہیں آئی۔ اس نے ایک تیسری تجویز پیش کی۔ ”کھیتی باڑی کی مرضی ہو تو کھیتی کر۔ سلونی بھابی کے کھیت ہیں۔ تب تک وہی جوتو۔“

پیاگ نے چلّاتے ہوئے کہا۔ کھیتی کے جھنجھٹ میں نہ پڑنا بھیا، چاہے کھیتی میں کچھ ہو یا نہ ہو لگان جرور دو۔ کبھی اولا پالا، کبھی سوکھا بوڑا، ایک نہ ایک بلا سر پر سوار رہتی ہے۔ کہیں بیل مرگیا یا کھلیان میں آگ لگ گئی تو سب سواہا، گھاس سب سے اچھی، نہ کسی

کے نوکر نہ چاکر، نہ کسی کا لینا نہ دینا۔ سویرے کُھرپی اُٹھائی اور دوپہر تک لوٹ آئے۔"

کاشی بولا۔"مجوری مجوری ہے اور کسانی کسانی ہے، مجور لاکھ ہو تو مجور ہی کہلائے گا۔ سر پر گھاس لیے چلے جارہے ہیں کوئی اُدھر سے پکارتا ہے او گھاس والے کوئی ادھر ہے۔ کسی کی مینڈ پر گھاس کرلو تو گالیاں ملیں۔ کسانی میں مرجاد ہے۔"

پیاگ کا سُوا چلنا بند ہوگیا۔"مرجاد لے کے چاٹو، اِدھراُدھر سے کماکر لاؤ۔ وہ بھی کھیتی میں جھونک دو۔"

چودھری نے فیصلہ کیا۔ گھاٹا نفع تو ہر روزگار میں ہے بھیا، بڑے بڑے سیٹھوں کا دیوالہ نکل جاتا ہے۔ کھیتی کے برابر کوئی روجگار نہیں، جو کمائی اور تقدیر اچھی ہو۔ تمھارے یہاں بھی نجرنجرانے کا یہی حال ہے بیٹا۔

امر بولا۔"ہاں دادا سب ہی جگہ یہی حال ہے۔ سب ہی غریبوں کا لہو چوستے ہیں۔"

چودھری نے شک کا سہارا لیا۔"بھگوان نے چھوٹے بڑے کا فرق کیوں لگا دیا۔ اس کا بھید سمجھ میں نہیں آتا۔ ان کے تو سب ہی لڑکے ہیں تو سب کو ایک آنکھ کیوں نہیں دیکھتا۔"

پیاگ نے اس شک کا ازالہ کیا۔"پچھلے جنم کا پھل ہے۔ جس نے جیسے کرم کیے ویسے پھل پارہا ہے۔"

چودھری نے اس کی تردید کی۔"یہ سب من کو سمجھانے کی باتیں ہیں بیٹا جس میں غریبوں کے آنسوں پچھ جائیں۔ لوگ سمجھتے رہیں کہ بھگوان نے ہم کو غریب بنا دیا تو آدمی کیا کرے۔ مگر یہ کوئی انصاف نہیں ہے کہ ہمارے بال بچے تک کام میں لگے رہیں اور پیٹ بھر کر کھانا نہ ملے اور ایک ایک اپسر کو دس دس ہجار کی طلب ملے۔ دس توڑے روپے ہوئے گدھے سے بھی نہ اُٹھیں۔"

امر نے مسکراکر کہا۔"تم تو دادا ناستک (منکر) ہو۔"

چودھری نے عاجزی سے کہا۔"بیٹا چاہے ناستک کہو چاہے مورکھ کہو۔ مگر دل پر چوٹ لگتی ہے تو منہ سے آہ نکلتی ہے۔ تم تو پڑھے لکھے ہوگے؟"

"ہاں کچھ پڑھا تو ہے۔"

"انگریجی تو نہ پڑھی ہوگی؟"

"نہیں کچھ انگریزی بھی پڑھی ہے۔"

چودھری خوش ہوکر بولا۔"تب تو بھیا ہم تمھیں نہ جانے دیں گے۔ بال بچوں کو بلا لو اور یہیں رہو۔ ہمارے بال بچے بھی کچھ پڑھ جائیں گے۔ پھر شہر بھیج دیں گے وہاں جات برادری کون پوچھتا ہے۔ کہہ دیں گے ہم چھتری ہیں۔"

امر مسکرایا۔ "اور جو بعد میں کھُل گیا؟"

چودھری کا جواب تیار تھا۔ "تو ہم کہہ دیں گے ہمارے باپ دادا چھتری تھے۔ ابھی تو تم نے جل پان نہ کیا ہوگا؟ کہاں گیا تیجا؟ جا بہو سے کچھ کھانے کو مانگ لا۔ بھیا بھگوان کا نام لے کر یہیں ٹک جاؤ۔ تین چار بیگھے سلونی کے پاس ہیں۔ دو بیگھے ہمارے ساجھے میں کرلینا۔ اتنا بہت ہے۔ بھگوان دے تو کھائے نہ چکے۔"

لیکن جب سلونی بلائی گئی اور اس سے یہ تجویز کی گئی تو وہ بدک گئی اور منہ بنا کر بولی۔"تمھارا من ہے اپنی جمین ان کے نام کردوں اور میں ہَوا کھاؤں، یہی تو۔"

چودھری نے ہنس کر کہا۔"نہیں نہیں جمین تیرے ہی نام رہے گی پگلی۔ یہ تو تیرے آسامی رہیں گے۔ یہی سمجھ لو کہ تو ان کو بٹائی پر دے رہی ہے۔"

سلونی نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔"بھیا میں اپنی جمین کسی کے نام نہیں لکھتی۔ یوں ہمارے مہمان ہیں۔ دوچار دس دن رہیں۔ مجھ سے جو کچھ ہوسکے گا میں ان کی کھاطر کروں گی۔ تم بٹائی پر لیتے ہو تو لے لو۔ جس کو کبھی دیکھا نہ سُنا، جان نہ پہچان اسے کیسے بٹائی پردے دوں۔"

پیاگ نے چودھری کی طرف ملامت آمیز نظروں سے دیکھ کر کہا:

"دل بھر گیا جی یا ابھی نہیں، کہتے ہو عورتیں مورکھ ہوتی ہیں۔ یہ بُڑھیا چاہے تو ہم کو اور تم کو کھڑے کھڑے بیچ ڈالے، یہ منہ ہی کی میٹھی ہے۔"

سلونی تنک اُٹھی۔"تمھارے کہنے سے باپ دادا کی جمین چھوڑدوں۔ میرے ہی پیٹ کا لڑکا مجھی کو چرانے چلا ہے۔"

کاشی نے سلونی کی حمایت کی۔"ٹھیک تو کہتی ہے۔ بے جانے سُنے آدمی کو اپنی جمین کیسے سونپ دے؟"

امرکانت کو اس مناظرے میں فلسفیانہ لطف آرہا تھا۔ مسکرا کر بولا۔"ہاں دادی تم ٹھیک کہتی ہو، پردیسی کا کیا بھروسہ۔"

منّی بھی دروازے پر کھڑی یہ باتیں سُن رہی تھی، بولی۔"پاگل ہوگئی ہو کاکی، تمھارے کھیت کوئی سر پر اُٹھا لے جائے گا۔ پھر ہم لوگ تو ہیں ہی۔ جب تمھیں کوئی دھوکا دے گا تو ہم پوچھیں گے نہیں؟"

کسی بھڑکے ہوئے جانور کو بہت سے آدمی گھیر نے لگتے ہیں تو وہ اور بھی بھڑک جاتا ہے۔ سلونی سمجھ گئی کہ یہ سب کے سب مجھے مل کر لٹوانا چاہتے ہیں۔ ایک بار نہیں کرکے پھر ہاں نہ کی۔ جھجک کر چلی گئی۔

پیاگ بولا۔"چڑیل ہے چڑیل۔"

امر نے خفیف ہوکر کہا۔"تم نے ناحق اس سے کہا دادا! مجھے کیا، یہ گاؤں نہ سہی اور گاؤں سہی۔" منّی کا چہرہ فق ہوگیا۔

گودڑ بولے۔"نہیں بھیّا کیسی باتیں کرتے ہو، میرے ساجھی دار بن کر رہو، مہنت جی سے کہہ کر دو چار بیگھے کا بندوبست کرادیں گے۔ تمھاری جھونپڑی الگ بن جائے گی۔ کھانے پینے کی کوئی بات نہیں۔ ایک بھلا آدمی تو گاؤں میں ہوجائے گا۔ نہیں کبھی ایک چپراسی گاؤں میں آگیا تو سب کی سانس اوپر تلے ہونے لگتی ہے۔"

آدھ گھنٹے میں سلونی پھر لوٹی اور چودھری سے بولی۔"تمھیں میرے کھیت بٹائی پر کیوں نہیں لے لیتے؟" چودھری نے گھڑک کر کہا۔"مجھے نہیں چاہیے۔ دھرے رہ اپنے کھیت۔"

سلونی نے امر سے التجا کی۔"بھیّا تم ہی سوچو میں نے کچھ بے جا کہا۔ انجان آدمی کو کوئی اپنی چیز دیتا ہے؟"

امر نے دل جوئی کی۔"نہیں کاکی! تم نے بہت ٹھیک کیا۔ اس طرح اعتبار کرلینے سے دھوکا ہوجاتا ہے۔"

سلونی کو کچھ تشفی ہوئی۔"تم سے تو بھیّا میری رات ہی بھر کی جان پہچان ہے نہ۔ جس کے پاس آج کل میرے کھیت ہیں وہ تو میرا ہی بھائی بند ہے۔ اس سے چھین کر تمھیں دے دوں تو وہ کیا کہے گا۔ تم ہی سوچو اگر میں بے جا کہتی ہوں تو میرے منہ پر تھپڑ مارو۔ وہ میرے ساتھ بے ایمانی کرتا ہے، یہ جانتی ہوں پر ہے تو اپنا ہی بھائی بند۔ اس کے منہ کی روٹی چھین کر تمھیں دے دوں تو تم مجھے بھلا کیا کہوگے تمھیں بولو۔"

سلونی نے یہ دلیل خود سوچ کر نکالی تھی یا کسی اور نے سمجھا دی تھی، کون جانے پر اس نے گودڑ کو لاجواب کردیا۔

(۳)

دو مہینے گزر گئے۔

پوس کی ٹھنڈی رات کالا کمبل اوڑھے پڑی ہوئی تھی۔ اونچا پہاڑ ستاروں کا تاج پہنے کھڑا تھا۔ جھونپڑیاں گویا اس کی وہ چھوٹی چھوٹی آرزوئیں تھیں جنھیں وہ ٹھکرا چکا تھا۔

امر کی جھونپڑی میں ایک لالٹین جل رہی ہے۔ مدرسہ کھلا ہوا ہے۔ پندرہ بیس لڑکے کھڑے ابھمنو کا قصہ سُن رہے ہیں۔ سب کے سب کتنے خوش ہیں۔ ان کے زرد چہرے چمک رہے ہیں۔ آنکھیں جگمگا رہی ہیں۔ شاید وہ بھی ابھمنو ہی جیسے دلیر، ویسے ہی فرض شناس ہونے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ انھیں کیا خبر ایک دن انھیں دریودھنوں اور جراسندھوں کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پڑیں گے۔ ماتھے رگڑنے پڑیں گے۔ کتنی بار وہ غنیم کے نرغے سے بھاگنے کی کوشش کریں گے اور بھاگ نہ سکیں گے۔

گودڑ چودھری چوپال میں بوتل اور کُپّی لیے کچھ دیر تصورات میں ڈوبے بیٹھے رہے۔ پھر کُپّی پھینک دی، بوتل اُٹھا کر طاق پر رکھ دی اور منّی کو پکار کر کہا۔"پردیسی سے کہہ آ کھانا کھالیں۔ اس بھلے آدمی کو جیسے بھوک ہی نہیں لگتی۔ پہر رات گئی ابھی تک کھانا کھانے کی سُدھ ہی نہیں۔"

منّی نے بوتل کی طرف دیکھ کر کہا۔"تم جب تک پی لو میں نے تو اسی لیے نہیں بُلایا۔"

گودڑ نے نفرت آمیز لہجے میں کہا۔"آج تو پینے کو جی نہیں چاہتا، بیٹی کون بڑی اچھی چیز ہے؟"

منّی حیرت سے گودڑ کا منہ تکنے لگی۔ اسے یہاں آئے تین سال سے زیادہ ہوئے کبھی چودھری کو ناغہ کرتے نہیں دیکھا۔ کبھی چودھری کے منہ سے ایسی زاہدانہ باتیں نہیں سُنیں۔ گھبرا کر بولی۔ "آج تمھارا جی اچھا نہیں کیا دادا؟"

چودھری نے ہنس کر کہا۔"جی کیوں نہیں اچھا ہے۔ منگائی تو تھی پینے ہی کے لیے مگر اب جی نہیں چاہتا۔ پردیسی کی بات آج میرے من میں بیٹھ گئی۔ کہتے ہیں۔ جہاں سَو

میں اسّی آدمی بھوکے مرتے ہوں وہاں دارو پینا غریبوں کا لہو پینے کے برابر ہے۔ کوئی دوسرا کہتا تو نہ مانتا، مگر ان کی بات جیسے دل میں بیٹھ جاتی ہے۔"

منّی متفکر ہوگئی۔"تم ان کے کہنے میں نہ آؤ دادا، اب چھوڑنا تمھیں نقصان کرے گا، کہیں بدن میں درد نہ ہونے لگے۔"

چودھری نے مضبوط ارادے کے ساتھ کہا۔"چاہے درد ہو، چاہے بائی ہو، اب پیوں گا نہیں۔ اپنی عمر میں ہجاروں روپے کی دارو پی گیا۔ ساری کمائی نسے میں اُڑا دی، اتنے روپے سے کوئی پُن کا کام کرتا تو گاؤں کا بھلا ہوتا اور جس بھی ملتا، مورکھ کو اسی سے بُرا کہا ہے۔ سُنا ہے صاحب لوگ بہت پیتے ہیں۔ مگر ان کی بات نرالی ہے۔ وہ یہاں کے راجا ہیں۔ لوٹ کا دھن پاتے ہیں۔ وہ نہ پئیں تو کون پیے۔ دیکھتی ہے اب کاسی اور پیاگ کو بھی کچھ لکھنے پڑھنے کا چسکا لگ رہا ہے۔"

مدرسہ بند ہوا، امر دونوں لڑکوں کی انگلی پکڑے ہوئے آکر چودھری سے بولا۔"مجھے تو آج دیر ہوگئی۔ دادا تم نے کھا پی لیا؟"

چودھری کا دل محبت سے لبریز ہوگیا۔"ہاں اور کیا، میں ہی تو پہر رات سے جُتا ہوا ہوں۔ میں ہی جوتے لے کر بزار گیا تھا۔ اسی طرح بیان دوگے تو مجھے تمھارا مدرسہ بند کرنا پڑے گا۔"

امر کے مدرسے میں اب لڑکیاں بھی پڑھنے لگی تھیں، اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ کھانا کھا کر چودھری لیٹے۔ امر چلنے لگا تو منّی نے کہا۔"آج لالہ تم نے بڑا بھاری پالا مارا، دادا نے آج ایک گھونٹ بھی نہیں پی۔"

امر اُچھل کر بولا۔"سچ۔ کیا کہتے تھے؟"

"تمھارا جس گاتے تھے اور کیا کہتے۔ میں تو سمجھتی تھی کہ مرکر ہی چھوڑیں گے۔ مگر تمھاری نصیحت کام کر گئی۔"

امر کے دل میں کئی دن سے منّی سے دریافت حال کی خواہش ہو رہی تھی۔ لیکن موقع نہ پاتا تھا۔ آج موقع پاکر اس نے پوچھا۔"مجھے پہچانتی ہو منّی۔ میں تو تمھیں خوب پہچانتا ہوں۔"

منّی کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ اس نے چبھتی ہوئی آنکھوں سے امر کو دیکھ کر

کہا۔ ”تم نے کہہ دیا تو مجھے یاد آیا۔ میں نے تم کو کہیں دیکھا تھا۔“

”کاشی کے مقدمے کی بات یاد کرو۔“

”اچھا یاد آگیا۔ تمھیں ڈاکٹر صاحب کے ساتھ روپے جمع کرتے پھرتے تھے۔ مگر تم یہاں کیسے آگئے؟“

”دادا سے لڑائی ہوگئی، تم یہاں کیسے پہنچیں؟ اور ان لوگوں کے بیچ میں کیسے آپڑیں؟“

منّی گھر میں جاتی ہوئی بولی۔ ”پھر کبھی بتاؤں گی۔ مگر تمھارے ہاتھ جوڑتی ہوں یہاں کسی سے کچھ نہ کہنا۔“

امر نے اپنی کوٹھری میں جاکر بچھاون کے نیچے سے دھوتیوں کا ایک جوڑا نکالا اور سلونی کے گھر جا پہنچا۔ سلونی بھیتر پڑی نیند کو لانے کے لیے ایک گیت گارہی تھی۔ امر کی آواز سُن کر ٹٹّی کھول دی اور بولی۔ ”بیٹا آج تو بڑا اندھیرا ہے۔ کھانا کھاچکے، میں تو ابھی چرکھا کات رہی تھی۔ پیٹھ میں درد ہونے لگا تو آکر لیٹ گئی۔“

امر نے دھوتیوں کا جوڑا نکال کر کہا۔ ”یہ دھوتیوں کا جوڑا لایا ہوں، اسے لے لو تمھارا سوت پورا ہوجائے تو میں لے لوں گا۔“

سلونی اس دن سے امر سے بدگمان ہونے کے باعث اس سے شرماتی تھی۔ ایسے شریف آدمی پر اس نے کیوں شک کیا۔ یہ خیال اسے تکلیف دے رہا تھا۔ شرماتی ہوئی بولی۔ ”ابھی تم کیوں لائے بھیا، سوت کت جاتا تو لاتے۔“

امر کے ہاتھ میں لالٹین تھی۔ بُڑھیا نے جوڑا لے لیے اور اس کی تہیں کھول کر للچائی ہوئی آنکھوں سے دیکھنے لگی۔ دفعتاً اس نے تعجب سے کہا۔ ”یہ تو دو ہیں بیٹا! میں دو لے کر کیا کروں گی ایک تم لیتے جاؤ۔“

امرکانت نے کہا۔ ”ایک سے کیسے کام چلے گا، دونوں رکھ لو۔“

سلونی کو اپنی زندگی کے سُنہرے دنوں میں دو دھوتیاں میسّر نہ ہوئی تھیں۔ شوہر اور بیٹے کے زمانے میں بھی ایک دھوتی سے زیادہ نہ ملی تھی اور آج ایسی خوب صورت دو دو ساڑیاں مل رہی ہیں، زبردستی دی جارہی ہیں۔ اس کے قلب سے گویا دودھ کی دھاریں بہنے لگیں۔ بیوہ کا غم اور غم نصیب ماں کی حسرت دعا بن کر اس کے ہر بُنِ مو سے نکلنے لگی۔

امر کانت کوٹھری سے باہر نکل آیا۔ سلونی روتی رہی۔

اپنی جھونپڑی میں آکر شش و پنج کی حالت میں کھڑا رہا۔ پھر اپنا روزنامچہ لکھنے بیٹھ گیا۔ اسی وقت چودھری کے گھر کا دروازہ کھلا اور منّی کلسا لیے پانی بھرنے نکلی۔ ادھر لالٹین جلتی دیکھ کر وہ یہاں چلی آئی اور دروازے پر کھڑی ہوکر بولی۔ "ابھی سوئے نہیں لالہ، رات تو بہت ہوگئی۔"

امر نے باہر نکل کر کہا۔ "ہاں ابھی نیند تو نہیں آئی، کیا پانی نہیں تھا؟"

"ہاں آج سب پانی اُٹھ گیا۔ پیاس لگی تو کہیں ایک بوند پانی نہیں۔"

"لاؤ میں کھینچ لادوں، تم اس اندھیری رات میں کہاں جاؤں گی؟"

"اندھیری رات میں شہر والوں کو ڈر لگتا ہے، ہم تو گاؤں کے ہیں۔"

"نہیں نہیں، میں تمھیں نہیں جانے دوں گا۔"

"تو کیا میری جان تمھاری جان سے زیادہ پیاری ہے؟"

"میری جیسی ایک لاکھ جانیں تمھاری جان پر نچھاور ہیں۔"

منّی نے اس کی طرف مخمور نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ "تمھیں بھگوان نے عورت کیوں نہیں بنا دیا لالہ؟ اتنا نازک دل تو کسی مرد کا نہیں دیکھا۔ میں تو کبھی کبھی سوچتی ہوں تم یہاں نہ آتے تو اچھا ہوتا۔"

امر مسکرا کر بولا۔ "میں نے تمھارے ساتھ کیا بُرائی کی ہے منّی؟"

منّی نے حسرت ناک لہجے میں کہا۔ "بُرائی نہیں، جس بیکس بچّے کو کوئی پوچھنے والا نہ ہو، اسے گود، کھلونے اور مٹھائیوں کا چسکا ڈال دینا کیا بُرائی نہیں ہے۔ یہ سکھ پاکر کیا وہ لاڈلا بیٹا پیار کے بغیر رہ سکتا ہے؟"

امر نے کہا۔ "بیکس تو میں تھا منّی، تم نے مجھے گود اور پیار کا چسکا ڈال دیا۔ میں نے تو رو رو کر تمھیں دق ہی کیا ہے۔"

منّی نے کلسا زمین پر رکھ دیا اور بولی۔ "میں تم سے باتوں میں نہ جیتوں گی لالہ لیکن تم نہ تھے تو میں بڑے چین سے رہتی تھی۔ گھر کا دھندا کرتی تھی۔ روکھا سوکھا کھاتی تھی اور سو رہتی تھی۔ تم نے میری وہ بے فکری چھین لی۔ اپنے من میں کہتے ہوگے بڑی چنچل عورت ہے۔ کہو جب مرد عورت ہوجائے تو عورت کو مرد بننا ہی پڑے گا۔ جانتی ہوں تم

مجھ سے بھاگے بھاگے پھرتے ہو، مجھ سے گلا چھڑاتے ہو، یہ بھی جانتی ہوں کہ میں تمھیں پا نہیں سکتی لیکن پھر بھی تمھارے پیچھے پھرتی ہوں۔ میں تم سے اور کچھ نہیں مانگتی۔ بس اتنا ہی چاہتی ہوں کہ تم مجھے اپنی سمجھو۔ مجھے معلوم ہو کہ میں بھی عورت ہوں میرے سر پر بھی کوئی آدمی ہے۔ میری زندگی بھی کسی کے کام آسکتی ہے۔"

امر نے اب تک منّی کو اس طرح دیکھا تھا جیسے ہر ایک جوان کسی حسینہ کو دیکھتا ہے۔ محبت سے نہیں محض رنگین مزاجی سے۔ مگر اس التجا نے اس کے آتشِ شوق کو بیدار کردیا۔ دودھاری گائے کے بھرے ہوئے تھنوں کو دیکھ کر ہم خوش ہوتے ہیں۔ اِن تھنوں میں کتنا دودھ ہوگا، محض اس کی مقدار کا خیال ہمارے ذہن میں آتا ہے ہم گائے کو پکڑ کر دوہنے کے لیے تیار نہیں ہوجاتے۔ لیکن دودھ کا کٹورا آجانا دوسری بات ہے۔ امر نے دودھ کے کٹورے کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔"آو ہم تم کہیں چلے چلیں۔ منّی وہاں میں کہوں گا یہ میری ...."

منّی نے اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور بولی۔"بس اور کچھ نہ کہنا۔ مرد سب ایک سے ہوتے ہیں۔ میں کیا کہتی تھی اور تم کیا سمجھ گئے۔"

منّی نے کلسا اُٹھا لیا اور کنویں کی طرف چلی۔ امر منّی کے اس التفات کے بعد احتراز دیکھ کر حیران رہ گیا۔ واقعی حسینہ کا دل پہیلی ہے۔

دفعتاً منّی نے پکارا۔"لالہ تازہ پانی لائی ہوں، ایک لوٹا لاؤں؟"

امر کو پیاس لگی تھی مگر کہا۔"ابھی تو پانی پینے کو جی نہیں چاہتا۔"

(۴)

تین مہینے تک امر نے کسی کو خط نہیں لکھا۔ کہیں بیٹھنے کی مہلت ہی نہ ملی۔ سکینہ کا حال چال جاننے کے لیے دل تڑپ تڑپ کر رہ جاتا تھا۔ نینا کی یاد بھی اکثر آتی رہتی تھی۔ بے چاری رو روکر مری جاتی ہوگی۔ بچّے کا ہنستا ہوا پھول سا مکھڑا آنکھوں میں بسا رہتا تھا مگر کہیں اپنا پتہ ٹھکانا ہو تو خط لکھے۔ یہاں آنے کے کئی دن بعد اس نے تین خط لکھے، سکینہ سلیم اور نینا کے نام۔ سکینہ کا خط سلیم کے لفافے ہی میں بند کردیا تھا۔ آج جواب آگئے ہیں۔ ڈاکیہ ابھی چٹھیاں دے گیا ہے۔ امر لبِ دریا کی تنہائی میں جاکر ان خطوں کو پڑھ رہا ہے۔ وہ نہیں چاہتا بیچ میں کوئی خلل انداز ہو۔ لڑکے آآکر پوچھیں گے کس کا خط ہے۔

نینا نے لکھا ہے۔

"بھلا آپ کو اتنے دنوں بعد میری یاد تو آئی۔ میں آپ کو اتنا سنگ دل نہ سمجھتی تھی۔ آپ کے بغیر اس گھر میں کیسے رہتی ہوں یہ آپ کیا جانیں، کیونکہ آپ آپ ہیں اور میں میں۔ ساڑھے چار مہینے گزر جائیں اور آپ کا ایک خط نہ آئے۔ آنکھوں سے کتنے آنسو نکل گئے کہہ نہیں سکتی۔ رونے کے سوا آپ نے اور کام ہی کیا چھوڑا ہے۔ آپ کے بغیر میری زندگی اتنی سونی ہو جائے گی، یہ مجھے نہ معلوم تھا۔ آپ کی اتنے دنوں کی خاموشی کا سبب میں سمجھتی ہوں۔ مگر آپ کا وہ خیال غلط ہے۔ آپ میرے بھائی ہیں۔ بیرن ہیں۔ راجا ہوں تو میرے بھائی ہیں۔ رنک ہوں تو میرے بھائی ہیں۔ دنیا آپ کا مذاق اڑائے، سارے ملک میں آپ کی رُسوائی ہو پھر بھی آپ میرے بھائی ہیں۔ آپ آج مسلمان یا عیسائی ہو جائیں تو کیا آپ میرے نہ ہوں گے۔ جو رشتہ بھگوان نے جوڑ دیا ہے، کیا آپ اسے توڑ سکتے ہیں، اتنا منہ زور میں آپ کو نہیں سمجھتی۔ اس سے بھی پیارا کوئی رشتہ دنیا میں ہے۔ ماں میں ماتا ہے۔ بہن میں کیا ہے نہیں جانتی۔ مگر وہ ماتا سے کہیں نازک تر ہے۔ ماں شرارتوں کی سزا بھی دیتی ہے۔ بہن عفو کی مورتی ہے۔ بھائی انصاف کرے یا بے انصافی۔ تحقیر کرے یا پیار۔ بہن کے پاس عفو کے سوا اور کچھ نہیں ہے، وہ صرف اس کی محبت کی بھوکی ہے۔ جب سے آپ گئے ہیں کتابوں کی طرف دیکھنے کو بھی جی نہیں چاہتا کسی کام میں جی نہیں لگتا۔ چرخا بھی پڑا میرے نام کو رو رہا ہے۔ بس اگر دل بستگی کی کوئی چیز ہے تو وہ منو ہے، وہ میرے گلے کا ہار ہو گیا ہے۔ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں چھوڑتا۔ اس وقت سو گیا ہے تب خط لکھ سکی ہوں۔ نہیں اس نے مصور رسم الخط میں وہ خط لکھا ہوتا جسے بڑے بڑے عالم بھی نہ پڑھ سکتے۔ بھابھی کو بھی اس سے اتنی محبت نہیں رہی۔ آپ کا نام کبھی ان کی زبان پر نہیں آتا۔ اب انھیں مذہبی کتابوں سے خاص دلچسپی ہو گئی ہے۔ مجھ سے بہت کم بولتی ہیں۔ راما دیوی انھیں لے کر لکھنؤ جانا چاہتی تھیں مگر نہیں گئیں۔ ایک دن ان کی گائے کا بیاہ تھا۔ شہر کے ہزاروں دیوتاؤں کی دعوت ہوئی۔ ہم لوگ بھی گئے تھے۔ یہاں کے گئو شالے کے لیے انھوں نے دس ہزار کا عطیہ دیا ہے۔

اب دادا جی کا حال سنیے۔ آج کل وہ ایک ٹھاکر دُوارہ بنوا رہے ہیں۔ زمین تو پہلے ہی لے چکے تھے۔ پتھر جمع ہو رہا ہے۔ ٹھاکر دوارے کی بنیاد رکھنے کے لیے راجا صاحب کو

دعوت دی جائے گی۔ نہ جانے کیوں دادا اب کسی پر ناراض نہیں ہوتے۔ یہاں تک کہ زور سے بولتے بھی نہیں۔ دال میں نمک تیز ہوجانے پر وہ تھالی پٹک دیتے تھے۔ اب کتنا ہی نمک تیز ہو بولتے بھی نہیں۔ سُنتی ہوں کہ آسامیوں پر بھی اتنی سختی نہیں کرتے۔ جس دن بُنیاد پڑے گی بہت سے آسامیوں کی بقایا معاف کردیں گے۔ پٹھانی کو اب پانچ کی جگہ پچیس ملنے لگے ہیں۔ لکھنے کو تو بہت سی باتیں ہیں مگر لکھوں گی نہیں۔ آپ اگر یہاں آئیں تو چُھپ کر آیئے گا۔ کیونکہ لوگ بہت برگشتہ ہو رہے ہیں۔ ہمارے گھر کوئی نہیں آتا جاتا۔"

دوسرا خط سلیم کا تھا۔

"میں نے سمجھا تھا کہ تم گنگا جی میں ڈوب مرے اور نام کو پیاز کی مدد سے دو تین قطرے آنسو بہادئے تھے۔ اور تمھاری روح کی نجات کے لیے ایک برہمن کو ایک کوڑی خیرات بھی کردی تھی۔ مگر اب یہ معلوم کرکے رنج ہوا کہ آپ زندہ ہیں اور میرا ماتم بے کار ہوا۔ آنسوؤں کا تو غم نہیں آنکھوں کو کچھ فائدہ ہی ہوا مگر اس کوڑی کا غم ضرور ہے۔ بھلے آدمی کوئی پانچ پانچ مہینے تک یوں چُپ سادھ لیتا ہے؟ خیریت یہ ہے کہ تم یہاں موجود نہیں ہو۔ بڑے قومی خادم کی دُم بنے ہو۔ جو آدمی اپنے پیارے دوستوں سے اتنی بے وفائی کرے، وہ قوم کی خدمت کیا خاک کرے گا؟

خدا کی قسم روز تمھاری یاد آتی تھی۔ کالج جاتا ہوں مگر جی نہیں لگتا۔ تمھارے ساتھ کالج کی رونق چلی گئی۔ ادھر ابا جان سول سروس کی رٹ لگا لگا کر اور بھی جان لیے لیتے ہیں۔ آخر کبھی آؤ گے بھی یا کالے پانی کی سزا بھگتے رہوگے؟

کالج کا حال بدستور سابق ہے۔ وہی تاش ہے وہی لکچروں سے بھاگنا ہے۔ وہی میچ ہے۔ ہاں کانووکیشن کا رُخ اچھا رہا۔ وائس چانسلر نے سادہ معاشرت پر زور دیا۔ تم ہوتے تو اس کا مزہ اُٹھاتے۔ مجھے تو وہ پھیکا معلوم ہوتا تھا۔ سادہ زندگی کا سبق تو سب دیتے ہیں مگر کوئی نمونہ بن کر دکھاتا نہیں۔ یہ جو کوڑیوں لیکچرار اور پروفیسر ہیں کیا سب کے سب سادہ زندگی کے نمونے ہیں؟ وہ زندگی کا معیار اونچا کر رہے ہیں تو لڑکے بھی ان کی تقلید کیوں نہ کریں۔ وائس چانسلر صاحب معلوم نہیں سادہ زندگی کا سبق اپنے اسٹاف کو کیوں نہیں پڑھاتے۔ پروفیسر بھاٹیہ کے پاس تیس جوڑے جوتے ہیں۔ بعض بعض پچاس روپے کے ہیں

خیر ان کی بات چھوڑو۔ پروفیسر چکرورتی تو بڑے کفایت شعار مشہور ہیں۔ جورو نہ جاتا، اللہ میاں سے ناتا۔ پھر بھی جانتے ہو کتنے نوکر ہیں، ان کے پاس؟ صرف بارہ۔ تو بھائی ہم لوگ تو نوجوان ہیں۔ ہمارے دلوں میں نیا شوق ہے، نئے ارمان ہیں۔ گھر والوں سے مانگیں گے وہ نہ دیں گے تو لڑیں گے۔ دوستوں سے قرض لیں گے دُکان داروں کی خوشامد کریں گے مگر شان سے رہیں گے ضرور۔ وہ جہنم میں جارہے ہیں تو ہم بھی جہنم میں جائیں گے مگر ان کے پیچھے پیچھے۔

سکینہ کا حال بھی کچھ سُننا چاہتے ہو۔ ماما کو بیسیوں ہی بار بھیجا۔ کپڑے بھیجے، روپے بھیجے مگر کوئی چیز نہ لی۔ ماما کہتی ہے دن بھر میں ایک آدھ چپاتی کھالی نہیں چپ چاپ پڑی رہتی ہے۔ دادی سے بول چال بند ہے۔ کل تمھارا خط آتے ہی اس کے پاس بھیج دیا تھا۔ اس کا جواب جو آیا ہوبہو نقل بھیجتا ہوں۔ اصل خط اس وقت دیکھنے کو ملے گا جب یہاں آؤ گے۔

”بابوجی! آپ کو مجھ بدنصیب کے کارن یہ سزا ملی اس کا مجھے بڑا رنج ہے۔ اور کیا کہوں جیتی ہوں اور آپ کو یاد کرتی ہوں۔ اتنا ارمان ہے کہ مرنے سے پہلے ایک بار آپ کو دیکھ لیتی۔ لیکن اس میں بھی آپ کی بدنامی ہے۔ اور میں تو بدنام ہو ہی چکی۔ کل آپ کا خط ملا۔ تب سے کتنی ہی بار یہ سودا اُٹھ چکا ہے کہ آپ کے پاس چلی آؤں، کیا آپ ناراض ہوں گے؟ مجھے تو یہ خوف نہیں ہے۔ مگر دل کو سمجھاؤں گی اور شاید ابھی مروں گی نہیں۔ کچھ دیر تک تو غصّے کے مارے تمھارا خط نہ کھولا مگر کب تک، خط کھولا، پڑھا، روئی پھر روئی۔ رونے میں اتنا مزا ہے کہ جی نہیں بھرتا، اور انتظار کی تکلیف نہیں سہی جاتی۔ خدا آپ کو سلامت رکھے۔“

دیکھا یہ خط کتنا دردناک ہے۔ میری آنکھوں میں آنسو بہت کم آتے ہیں لیکن یہ خط دیکھ کر ضبط نہ کرسکا۔ کتنے خوش نصیب ہو تم۔“

امر نے سر اُٹھایا تو اس کی آنکھوں میں نشہ تھا۔ وہ نشہ جس میں بے خبری نہیں حیات ہے۔ سرخی نہیں چمک ہے۔ جنوں نہیں، خودفراموشی نہیں بیداری ہے۔ اس کی فضائے دل میں کبھی ایسا زلزلہ نہ آیا تھا۔ اس کا دل کبھی اتنا فراخ، اتنا بلند، اتنا مسرور نہ تھا۔ آنکھوں کے سامنے دو مورتیں کھڑی ہوگئیں۔ ایک تکلیف میں ڈوبی ہوئی، جواہرات

سے مرصع، غرور کے نشے میں چور۔ دوسری سادہ، دل کشی سے مزیّن، شرم اور انکسار سے سر جھکائے ہوئے۔ اس کی روح اس خوش گوار میٹھے شربت سے ہٹ کر اس میٹھے پانی کی طرف لپکی۔ اس نے خط کے اس حصّے کو پھر پڑھا۔ پھر ایک ہیجان کے عالم میں دریا کے کنارے ٹہلنے لگا۔ سکینہ سے کیوں کر ملے۔ یہ دیہاتی زندگی اسے پسند آئے گی؟ کتنی نازک بدن ہے، کتنی نازک طبع۔ وہ اور یہ پُرمشقت زندگی! کیسے جاکر اس کی دل جوئی کرے۔ اس کی وہ صورت یاد آئی جب اس نے کہا میں بھی چلتی ہوں۔ اُف کتنا ہنگامہ خیز تقاضا تھا۔ کسی مزدور کو گڑھا کھودتے کھودتے جیسے کوئی ہیرا مل جائے اور وہ اپنی نادانی سے اسے کانچ کا ٹکڑا سمجھتا رہے۔

اتنا ارمان ہے کہ مرنے سے پہلے آپ کو دیکھ لیتی، یہ جملہ جیسے اس کے دل پر نقش ہوگیا تھا۔ اس کا دل گویا دریا دلی کی لہروں پر تیرتا ہوا سکینہ کی طرف بہا جا رہا تھا۔ لہروں کی طرف محویت کے عالم میں تکتے تکتے اسے معلوم ہوا کہ میں بھی بہا جارہا ہوں۔ وہ چونک کر گھر کی طرف چلا۔ دونوں آنکھیں آنسوؤں سے تر۔ ناک کی نوک پر سرخی اور دونوں گال مرطوب۔

(۵)

گاؤں میں ایک آدمی سگائی لایا ہے۔ اس جشن میں ناچ، گانا دعوت ہو رہی ہے اس کے دروازے پر نقارے بج رہے ہیں۔ سارے گاؤں کے مرد، عورت، بچّے جوان جمع ہیں۔ ناچ شروع ہوگیا ہے۔

پیاگ نے کہا۔"چلو بھیّا تم بھی کچھ کرتب دکھاؤ۔ سُنا ہے تمھارے دیس میں لوگ خوب ناچتے ہیں۔"

امرکانت نے معذرت سی کی۔"بھائی مجھے تو ناچنا نہیں آتا۔"

اس کا جی چاہتا ہے کہ ناچنا آتا تو اس وقت سب کو حیرت میں ڈال دیتا۔

جوان مرد اور عورتوں کے جوڑے بندھے ہوئے ہیں۔ ہر ایک جوڑا دس منٹ تھرک کر چلا جاتا ہے۔ رقص میں کتنا نشہ اور کتنی خوشی ہے یہ امرکانت کو آج معلوم ہوا۔

ایک حسینہ گھونگھٹ بڑھائے میدان میں آتی ہے۔ اِدھر سے پیاگ نکلتا ہے۔ دونوں ناچنے لگتے ہیں۔ حسینہ کے اعضا میں اتنی لچک ہے، اس کے جسم کی حرکتوں میں جذبات کا

ایسا اظہار ہے کہ لوگوں پر محویت کا عالم طاری ہے۔

اس جوڑے کے بعد دوسرا جوڑا آتا ہے۔ جوان گٹھیلے جسم کا آدمی ہے۔ سینہ فراخ قبضے چڑھے ہوئے۔ کچھنی کاچھے۔ گلے میں سونے کی مُہر ڈالے۔ حسینہ کو دیکھ کر امر چونک اُٹھا۔ یہ تو منّی ہے۔ آج منّی نے گھیر دار لہنگا پہنا ہے۔ گلابی اوڑھنی اوڑھی ہے اور پاؤں میں گھنگرو باندھے ہیں۔ گلابی گھونگھٹ میں دونوں لب پھولوں کی طرح کھلے ہوئے ہیں۔ دونوں آدمی کبھی ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر کبھی ایک دوسرے کی کمر پر ہاتھ رکھ کر، کبھی کولھوں کو تال سے مٹکا کر ناچنے میں محو ہیں۔ سب ہی لوگ مفتون نگاہوں سے ان بازیگروں کے کرتب دیکھ رہے ہیں۔ کیا پھرتی ہے۔ کیا لچک ہے اور ان کی ایک ایک لچک میں، ایک ایک حرکت میں کتنی شعریت ہے اور کتنا جنوں۔ دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے تھرکتے ہوئے میدان کے اِس سرے سے اُس سرے تک چلے جاتے ہیں اور کیا مجال جو ایک جنبش بھی بے تال ہو۔

پیاگ نے کہا۔"دیکھتے ہو بھیّا، بھابی کیسا ناچ رہی ہے۔ اپنا جوڑ نہیں رکھتی۔"

امر نے بے دلی سے کہا۔"ہاں دیکھ تو رہا ہوں۔"

"جی چاہتا ہو تو اُٹھو، میں اس لونڈے کو بلا لوں۔"

"نہیں مجھے ناچنا نہیں ہے۔"

منّی ناچ رہی تھی کہ امر اُٹھ کر گھر چلا آیا۔ یہ بے شرمی اب اس سے نہیں دیکھی جاتی۔

ایک ہی لمحے بعد منّی بھی وہاں پہنچ گئی اور بولی۔"تم چلے کیوں آئے لالہ، کیا ناچ اچھا نہ لگا؟"

امر نے منہ پھیر کر کہا۔"کیا میں آدمی نہیں ہوں کہ اچھی چیز کو بُرا سمجھوں۔"

منّی اور قریب آکر بولی۔"تو پھر چلے کیوں آئے؟"

امر نے بے رُخی سے کہا۔"مجھے ایک پنچایت میں جانا ہے۔ لوگ بیٹھے میری راہ دیکھ رہے ہوں گے۔ تم نے کیوں ناچنا بند کر دیا؟"

منّی بھولے پن سے بولی۔"تم چلے آئے تو ناچتی کیا؟"

امر نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔"سچے دل سے کہہ رہی ہو منّی؟"

منّی اس سے آنکھیں ملا کر بولی۔ "میں تم سے جھوٹ کبھی نہیں بولتی۔"

"میری ایک بات مانو، پھر کبھی مت ناچنا۔"

منّی رنجیدہ ہوکر بولی۔ "تم تو اتنی ذرا سی بات پر روٹھ گئے۔ ذرا کسی سے پوچھو میں آج کتنے دنوں کے بعد ناچی ہوں۔ دو سال میں نگاڑے کے پاس نہیں گئی۔ لوگ کہہ کہہ کر ہار گئے۔ آج تم ہی مجھے لے گئے اور اب اُلٹے تمھیں ناراض ہوتے ہو۔"

منّی گھر میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد کاشی نے اس سے آکر کہا۔ "بھابی تم یہاں کیا کر رہی ہو۔ وہاں سب لوگ تمھیں بُلا رہے ہیں۔"

منّی نے دردسر کا بہانا کیا۔

کاشی آکر امر سے بولا۔ "تم کیوں چلے آئے بھیّا۔ کیا گنواروں کا ناچ گانا اچھا نہ لگا؟"

امر نے کہا۔ "نہیں جی ایک پنچایت میں جانا ہے۔ دیر ہورہی ہے۔"

کاشی بولا۔ "بھابی نہیں ہے۔ اس کے ناچ کے بعد اب دوسروں کا رنگ نہیں جم رہا ہے۔ تم چل کر کہہ دو تو شاید مان جائے۔ یہ دن روز روز تھوڑے ہی آتا ہے۔ برادری والی بات ہے۔ لوگ کہیں گے ہمارے یہاں کام آپڑا تو منہ چُھپانے لگے۔"

امر نے شش و پنج میں پڑکر کہا۔ "تم نے سمجھایا نہیں؟" پھر اندر جاکر بولا۔ "کیا مجھ سے روٹھ گئی منّی؟"

منّی آنگن میں آکر بولی۔ "تم مجھ سے روٹھ گئے یا میں تم سے روٹھ گئی۔"

"اچھا میرے کہنے سے چلو۔"

"جیسے بچّے مچھلی کو کھلاتے ہیں اسی طرح تم مجھے کھلا رہے ہو لالہ۔ جب چاہے رُلا دیا۔ جب چاہے ہنسا دیا کیوں؟"

"یہ میری غلطی تھی منّی معاف کرو۔"

"اب تو منّی جب ہی ناچے گی جب تم اس کا ہاتھ پکڑ کر کہوگے چلو ہم تم ناچیں اب وہ اور کسی کے ساتھ نہ ناچے گی۔"

"تو اب ناچنا سیکھوں؟"

منّی نے اپنی فتح کا احساس کرکے کہا۔ "میرے ساتھ ناچنا چاہوگے تو آپ سیکھو گے۔"

"تم سکھا دوگی؟"

"تم مجھے رونا سکھا رہے ہو، میں تمھیں ناچنا سکھا دوں گی۔"

"اچھا چلو۔"

یونی ورسٹی کے جلسوں میں امر کئی بار ڈارمے کھیل چکا تھا۔ اسٹیج پر ناچا بھی تھا۔ پر اس ناچ اور اُس ناچ میں بڑا فرق تھا۔ وہ اہلِ مذاق کی مہذب تفریح تھی یہ اہلِ مشقت کی رندانہ شوخیاں۔ اس کا دل سہا جاتا تھا۔

اس نے کہا۔"منّی میں تم سے ایک درخواست کرتا ہوں۔"

منّی نے ٹھنک کر کہا۔"تو تم ناچوگے نہیں۔"

"یہی درخواست تو تم سے کررہا ہوں۔"

امر ٹھہرو ٹھہرو کہتا رہا مگر منّی لوٹ پڑی۔

امر بھی اپنی کوٹھری میں چلا آیا اور کپڑے پہن کر پنچایت میں چلا گیا۔ اس کا وقار بڑھ رہا ہے۔ آس پاس کے موضعوں میں کوئی پنچایت ہوتی تو اسے ضرور مدعو کیا جاتا ہے۔"

(٦)

سلونی نے اپنے گھر کی جگہ مدرسے کے لیے دے دی۔ لڑکوں کی تعداد بہت زیادہ ہوگئی ہے۔ سلونی سے کسی نے اس جگہ کا تقاضا نہ کیا، اس پر کوئی دباؤ نہیں ڈالا گیا۔ بس ایک دن امر کانت اور چودھری بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ نیا مدرسہ کہاں بنایا جائے گا۔ گاؤں میں تو بیلوں کے باندھنے تک کی جگہ نہیں۔ سلونی ان کی باتیں سُنتی رہی۔ تب یکایک بول اُٹھی۔ "میرا گھر کیوں نہیں لے لیتے۔ بیس ہاتھ آگے بیس ہاتھ پیچھے خالی جگہ پڑی ہوئی ہے کیا اتنی زمین میں تمھارا کام نہ چلے گا؟"

دونوں آدمی حیرت میں آکر سلونی کا منہ تکنے لگے۔"

امر نے پوچھا۔"اور تو رہے گی کہاں کاکی؟"

سلونی نے کہا۔"مجھے گھر دوار لے کر کیا کرنا ہے بیٹا! تمھاری کوٹھری میں آکر ایک کونے میں پڑرہوں گی۔"

گودڑ نے دل میں حساب لگا کر کہا۔"زمین تو بہت نکل آئی۔"

امر نے سر ہلا کر کہا۔"میں کاکی کا گھر نہیں لینا چاہتا! مہنت جی سے مل کر گاؤں کے باہر مدرسہ بنواؤں گا۔"

کاکی نے آزردہ خاطر ہو کر کہا۔"کیا میری جگہ میں کوئی چھوت لگی ہے بھیّا؟"

گودڑ نے فیصلہ کردیا۔"سلونی کا گھر مدرسے کے لیے لے لیا جائے۔ اسی میں ایک کوٹھری امر کے لیے بنا دی جائے دوسری سلونی کے لیے۔ ایک کنارے گائے باندھ لے ایک کنارے پڑ رہے گی۔"

آج سلونی جتنی خوش ہے اتنی شاید کبھی نہ خوش ہوئی ہو۔ وہی خبیث بڑھیا۔ جس کے دروازے پر کوئی بیل باندھ دیتا تو لڑنے کو تیار ہوجاتی، جو بچّوں کو اپنے دروازے پر گولیاں تک نہ کھیلنے دیتی۔ آج اپنے بزرگوں کی یادگار مدرسے کی نذر کرکے اپنے کو خوش نصیب سمجھ رہی ہے۔ کچھ مہمل سی بات ہے۔ لیکن بخیل ہی سخی ہوسکتا ہے۔ ہاں اس کی سخاوت کا مدعا ایسا ہونا چاہیے جو اس کی جان سے پیاری دولت کے ہم وزن ہو۔

فوراً کام شروع ہوگیا۔ گھروں سے لکڑیاں نکل آئیں۔ مزدور نکل آئے۔ پیسے نکل آئے۔ کسی سے آرزو منّت نہ کرنا پڑی۔ یہ ان کا اپنا مدرسہ ہے۔ انھیں کے بچّے تو اس میں پڑھتے ہیں اور ان تھوڑے سے دنوں میں ہی تعلیم کا کچھ کچھ اثر بھی نظر آنے لگا ہے بچّے اب صاف رہتے ہیں۔ جھوٹ کم بولتے ہیں۔ جھوٹے بہانے نہیں کرتے۔ گالیاں نہیں بکتے اور گھر سے کوئی چیز چُرا کر نہیں لے جاتے۔ نہ اتنی ضد ہی کرتے ہیں۔ گھر کے معمولی کام شوق سے کرتے ہیں۔ ایسے مدرسے کی کون مدد نہ کرے گا۔ پھاگن کی فرحت بخش صبح سُنہرے کپڑے پہنے پہاڑ پر کھیل رہی تھی۔ امر کئی لڑکوں کے ساتھ اشنان کرکے لوٹا۔ مگر یہ کیا بات ہے آج ابھی تک کوئی کام پر نہیں آیا۔ معمولاً تو اس کے اشنان کرکے لوٹنے کے پہلے ہی کام شروع ہوجاتا تھا۔ آج اتنی دیر ہوگئی اور کسی کا پتہ نہیں۔

دفعتاً منّی سر پر کلسا رکھے آکر کھڑی ہوگئی۔ امر نے مسکرا کر کہا۔"وہ دیکھو سورج دیوتا تمھیں گھور رہے ہیں۔"

منّی نے کلسا اُتار کر ہاتھ میں لے لیا اور بولی۔"اور تم بیٹھے دیکھ رہے ہو۔"

پھر ایک لمحے کے بعد اس نے کہا۔"تم تو آج کل جیسے گاؤں میں رہتے ہی نہیں ہو۔ مدرسہ کیا بنا تمھارے درشن ہی مشکل ہوگئے ہیں ڈرتی ہوں کہیں تم سنک نہ جاؤ۔"

"میں تو دن بھر یہیں رہتا ہوں۔ تم البتہ نہ جانے کہاں غائب رہتی ہو۔ آج یہ سب آدمی کہاں چلے گئے۔ ایک بھی نہیں آیا۔"

"گاؤں میں ہے ہی کون۔"

"کہاں چلے گئے سب؟"

"واہ تمھیں خبر ہی نہیں۔ پہر رات رہے سرومن پور کے ٹھاکر کی گائے مر گئی۔ سب کے سب وہیں گئے ہیں، آج گھر گھر شکار پکے گا۔"

امر نے اشکراہ کے انداز سے کہا۔"مری ہوئی گائے۔"

"ہمارے یہاں بھی تو کھاتے ہیں یہ لوگ۔"

"کیا جانے میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ تم تو..................."

مُنّی نے نفرت سے منہ بناکر کہا۔"میں تو ادھر نظر اُٹھا کر دیکھتی بھی نہیں۔"

"سمجھاتی نہیں ان لوگوں کو۔"

"ہونہہ سمجھانے سے مانتے ہیں اور میرے سمجھانے سے۔"

امرکانت کے خاندان میں گوشت ممنوع چیز تھی۔ اسے اس کی بو سے بھی نفرت تھی۔ محض مُردہ گوشت کے تذکرے ہی سے اس کا جی متلانے لگا۔ اس نے چھوت چھات اور افتراق و امتیاز کو دل سے نکال ڈالا تھا۔ مگر منہیات سے اسے جو نفرت تھی اس میں ذرہ بھر بھی کمی نہیں ہوئی اور وہ دس گیارہ مہینے سے انھیں مُردہ خوروں کے گھر میں کھانا کھا رہا ہے۔

اس نے ناک سکوڑ کر کہا۔"آج میں کھانا نہ کھاؤں گا مُنّی۔"

"میں تمھارا کھانا الگ پکاؤں گی۔"

"نہیں نہیں جس گھر میں وہ چیز پکے گی اس گھر میں مجھ سے نہ کھایا جائے گا۔ مجھے قے ہو جائے گی۔"

دفعتاً شور سُن کر امر نے آنکھیں اُٹھائیں تو دیکھا کہ پندرہ بیس آدمی بانس کی بلّیوں پر اس مُردہ گائے کو لادے چلے آرہے ہیں۔ سامنے کئی لڑکے اچھلتے کودتے تالیاں بجاتے چلے آرہے تھے۔

کتنا نفرت انگیز نظارہ تھا۔ امر وہاں کھڑا نہ رہ سکا۔ دریا کی طرف بھاگا۔

منّی نے کہا۔ ”تمھارے بھاگ جانے سے کیا ہوگا۔ بھلا جاکر سمجھاتے تو کچھ اثر بھی ہوتا۔“

”میری بات کون سُنے گا منّی۔“

”تمھاری بات نہ سُنیں گے تو اور کس کی بات سُنیں گے۔“

”اور جو کسی نے نہ مانا۔“

”اور جو مان گئے۔ آؤ کچھ بد لو۔“

”اچھا کیا بدتی ہو؟“

”مان جائیں تو مجھے ایک اچھی سی ساڑی لادینا۔“

”اور نہ مانیں تو تم مجھے کیا دوگی؟“

”ایک کوڑی۔“

اتنی دیر میں وہ لوگ اور قریب آگئے۔ چودھری سالارِ قافلہ کی طرح آگے آگے لپکے چلے آتے تھے۔

منّی نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”لاتو رہے ہو لیکن لالہ بھاگے جارہے ہیں۔“

گودڑ نے حیرت میں آکر پوچھا۔ ”کیوں بھاگے جارہے ہیں۔ کیا ہوا؟“

”کہتے ہیں میں تم لوگوں کے ہاتھ کا پانی نہ پیوں گا۔“

پیاگ نے اکڑ کر کہا۔ ”بکنے دو۔ ہمارے ہاتھ کا پانی نہ پئیں گے تو ہم چھوٹے نہ ہوجائیں گے۔“

کاشی بولا۔ ”آج بہت دن بعد تو سکار ملا۔ اِس میں بھی یہ آفت۔“

گودڑ نے سمجھوتے کے انداز میں کہا۔ ”آخر کہتے کیا ہیں؟“

منّی جھنجھلا کر بولی۔ ”انھیں سے جاکر پوچھو، جو چیز اونچی ذات والے نہیں کھاتے اسے ہم کیوں کھائیں۔ اسی سے تو لوگ ہمیں نیچ سمجھتے ہیں۔“

پیاگ نے جوش میں آکر کہا۔ ”تو کیا ہم کسی بامھن ٹھاکر کے گھر بیٹی بیاہنے جاتے ہیں؟ بامھنوں کی طرح کسی کے دروازے پر بھیک مانگنے تو نہیں جاتے۔ یہ تو اپنا اپنا رواج ہے۔“

منّی نے ڈانٹ بتائی۔ ”یہ کوئی اچھی بات ہے کہ سب لوگ ہمیں نیچ سمجھیں۔ محض

زبان کی لذت کے لیے۔"

گائے وہیں رکھ دی گئی۔ دو تین آدمی گنڈاسے لے کر دوڑے۔ امر کھڑا دیکھ رہا تھا کہ منّی منع کر رہی ہے پر کوئی اس کی سُن نہیں رہا ہے۔ اس نے ادھر سے منہ پھیر لیا گویا اسے قے ہوجائے گی۔ منہ پھیر لینے پر بھی وہی نظارہ اس کی آنکھوں میں پھرنے لگا۔ اس حقیقت کو وہ کیسے بھول جائے کہ اس سے پچاس قدم کے فاصلے پر مُردہ گائے کی بوٹیاں کی جارہی ہیں۔

گودڑ نے اسے گنگا کی طرف جاتے دیکھ کر تشویشناک لہجے میں کہا۔"وہ تو سچ مچ گنگا کی طرف بھاگے جا رہے ہیں۔ بڑا سنکی آدمی ہے کہیں ڈوب نہ جائے۔"

پیاگ بولا۔"تم اپنا کام کرو کوئی نہیں ڈوبے گا۔ کسی کو اپنی جان اتنی بھاری نہیں ہوتی۔" منّی نے اس کی طرف غصّے کی نظروں سے دیکھا۔"جان انھیں پیاری ہوتی ہے جو کمینے ہیں اور کمینے بنے رہنا چاہتے ہیں۔ جس میں شرم ہے جو کسی کے سامنے سر نیچا نہیں کرنا چاہتا وہ ایسی بات پر جان بھی دے سکتا ہے۔"

منّی نے آزردہ خاطر ہوکر کہا۔"دادا تم ان کی باتیں سُن رہے ہو اور منہ نہیں کھولتے۔ ان سے سگائی ہی کرلوں گی تو کیا تمھاری ہنسی ہوجائے گی۔ اور جو میرے من میں یہ بات آجائے گی تو روکنے والا ہی کون ہے اب اسی بات پر میں دیکھتی ہوں گھر میں کیسے مانس جاتا ہے۔ پہلے میری گردن پر گنڈاسا چلے گا۔"

منّی بیچ میں گھس کر گائے کے پاس بیٹھ گئی اور للکار کر بولی۔"اب جسے گنڈاسا چلانا ہو چلائے میں بیٹھی ہوں۔"

پیاگ نے مایوس ہوکر کہا۔" بتیا کے بل کھیت کھاتی ہو کیا۔"

منّی بولی۔"تمھیں جیسوں نے برادری کو اتنا بدنام کردیا ہے۔ اس پر کوئی سمجھاتا ہے تو لڑنے کو تیار ہوتے ہو۔"

گودڑ چودھری خیال میں غرق کھڑے تھے۔ دنیا میں ہوا کا رُخ کدھر ہے اس سے وہ بے خبر نہ تھے۔ کئی بار اس معاملے پر امرکانت سے تبادلۂ خیالات کرچکے تھے۔ مدبرانہ انداز سے بولے۔"بھائیو! گاؤں کے سب آدمی جمع ہیں بتاؤ اب کیا صلاح ہے؟"

ایک بلند قامت نوجوان بولا۔"صلاح جو تمھاری ہے۔ وہ سب کی ہے، چودھری تو تم

ہو۔"

پیاگ نے اپنے والد کو ڈگمگاتے دیکھ کر دوسروں کو للکار کر کہا:

"کھڑے منہ تکتے ہو۔ اتنے آدمی تو ہو۔ کیوں نہیں منّی کا ہاتھ پکڑ کر ہٹا دیتے۔ میں گنڈاسا لیے کھڑا ہوں۔"

منّی نے طیش میں آکر کہا۔ "میرا ہی مانس کھا جاؤگے تو کیا ہرج ہے وہ بھی تو مانس ہی ہے؟" اور کسی کی پیش قدمی نہ دیکھ کر پیاگ خود آگے بڑھا اور منّی کا ہاتھ پکڑ کر اسے وہاں سے گھسیٹنا چاہتا تھا کہ کاشی نے اسے زور سے دھکّا دیا اور لال آنکھیں کرکے بولا۔ "بھیّا اگر تم نے ان کے بدن پر ہاتھ رکھا تو خون ہوجائے گا کہے دیتا ہوں۔ ہمارے گھر میں اس گئوماس کی بو تک نہ جانے پائے گی۔ آئے وہاں سے بڑے بہادر بن کر۔"

ایک بلند قامت نوجوان ثالث بن کر بولا۔ "مری گائے کے مانس میں ایسا کون سا مجا رکھا ہے جس کے لیے سب لوگ مرے جارہے ہو۔ اس کی کھال نکال لو اور لاش کو گڈھا کھود کر گاڑ دو۔ وہ کی جب امر بھیّا کی صلاح ہو۔ ہم کو تو انھیں کی صلاح پر چلنا ہے۔ ان کی راہ پر چل کر ہمارا بھلا ہوگا۔ ساری دنیا تو اسی لیے ہم کو اچھوت سمجھتی ہے کہ ہم دارو سراب پیتے ہیں، مردہ مانس کھاتے اور چمڑے کا کام کرتے ہیں۔ اور ہم میں کیا برائی ہے۔ دارو ہم نے چھوڑ دی بھگوان نے چھڑادی پھر مُردہ مانس میں کیا رکھا ہے۔ رہا چمڑے کا کام اسے کوئی بُرا نہیں کہہ سکتا۔ اور کہے بھی تو ہمیں اس کی پروا نہیں۔ چمڑا بنانا، بیچنا بُرا کام نہیں ہے۔"

گودڑ نے اسے تحسین کی نظروں سے دیکھا۔ "تم لوگوں نے بھورے کی بات سُن لی، تو یہی سب کی صلاح ہے۔"

بھورے بولا۔ "اگر کسی کو اُجر کرنا ہے تو کرلے۔"

ایک بوڑھے نے کہا۔ "ایک ہمارے تمھارے چھوڑ دینے سے کیا ہوتا ہے ساری برادری تو کھاتی ہے۔"

بھورے نے جواب دیا۔ "برادری کھاتی ہے تو کھانے دو۔ اپنا اپنا دھرم اپنے اپنے ساتھ ہے۔"

گودڑ نے بھورے کو مخاطب کرکے کہا۔ "تم ٹھیک کہتے ہو بھورے لڑکوں کا پڑھنا ہی

لے لو۔ پہلے کوئی بھیجتا تھا اپنے لڑکوں کو؟ مگر جب ہمارے لڑکے پڑھنے لگے تو دوسرے گاؤں کے لڑکے بھی آگئے۔"

کاشی بولا۔"برادری ہمیں اس لیے سجا نہیں دے گی کہ ہم مردار نہیں کھاتے۔ اِس کا میں جما لیتا ہوں۔ دیکھ لینا آج کی بات سانجھ تک چاروں طرف پھیل جائے گی اور لوگ بھی ہماری دیکھا دیکھی مُردار چھوڑدیں گے۔ امر بھیا کا کتنا نام ہے کس کی مجال ہے کہ ان کی بات کاٹ دے۔"

پیاگ نے دیکھا اب دال نہ گلے گی تو جل کر بولا۔"اب عورتوں کا راج ہے۔ عورتیں جو کچھ نہ کریں وہ تھوڑا ہے۔"

یہ کہتا ہوا وہ گنڈاسا لیے گھر چلا گیا۔

گودڑ لپکے ہوئے گنگا کی طرف چلے اور ایک گولی کے ٹپے سے امر کو پکار کر بولے۔"وہاں کیا کھڑے ہو بھیا چلو گھر، سب جھگڑا طے ہوگیا۔"

امر خیالوں میں غرق تھا۔ آواز اس کے کانوں تک نہ پہنچی۔

چودھری نے اور قریب جاکر کہا۔"یہاں کب تک کھڑے رہوگے بھیا۔"

"نہیں دادا مجھے یہیں رہنے دو۔ تم وہاں گنڈاسا چلاؤگے مجھ سے دیکھا نہ جائے گا۔ جب تم فرصت پاجاؤگے تب میں آجاؤں گا۔"

"بہو کہتی تھی تم ہمارے گھر کھانے کو بھی نہیں کہتے۔"

"ہاں دادا جی آج تو نہ کھاؤں گا مجھے تو قے ہوجائے گی۔"

"لیکن ہمارے یہاں تو آئے دن یہ دھندا لگا رہتا ہے۔"

"رفتہ رفتہ میری عادت بھی پڑجائے گی۔"

"تم ہمیں اپنے من میں راچھس سمجھ رہے ہوگے۔"

امر نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔"نہیں دادا، میں تو تم لوگوں سے کچھ سیکھنے، تمھاری کچھ خدمت کرکے اپنی بھلائی کرنے آیا ہوں یہ تو اپنی اپنی برادری کا رواج ہے۔ چین ایک بہت بڑا ملک ہے وہاں بہت سے آدمی بدھ بھگوان کو مانتے ہیں۔ ان کے گھر میں کسی جانور کو مارنا منع ہے۔ اس لیے وہ لوگ مردہ جانور ہی کھاتے ہیں۔ کتے، بلّی، گیدڑ، کسی کو بھی نہیں چھوڑتے۔ تو کیا وہ ہم سے نیچے ہیں۔ کبھی نہیں۔ ہمارے ہی ملک میں کتنے چھتّری

گوشت کھاتے ہیں۔ وہ زبان کی لذّت کے لیے جانوروں کو مارتے ہیں تم ان سے تو کہیں اچھے ہو۔"

گودڑ نے ہنس کر کہا۔"بھیّا تم بڑے بدھمان ہو۔ تم سے کوئی نہ جیتے گا۔ چلو اب گاؤں میں مُردہ کوئی نہ کھائے گا۔ ہم لوگوں نے یہ طے کرلیا۔ ہم نے کیا طے کیا بہو نے طے کیا۔ مگر کھال تو نہ پھینکنے دوگے؟"

امر نے خوش ہوکر کہا۔"نہیں دادا کھال کیوں پھینکوگے؟ جوتے بنانے سے بڑھ کر اور کون سار روزگار ہوگا۔ مگر کیا بھابی بہت بگڑی تھیں؟"

گودڑ بولا۔"بگڑی ہی نہیں تھی بھیّا، وہ تو جان تک دینے کو تیار تھی، گائے کے پاس بیٹھ گئی اور بولی۔"اب چلاؤ گنڈاسا۔ پہلا گنڈاسا میری گردن پر پڑے گا۔ پھر کس کی ہمّت تھی کہ گنڈاسا چلاتا۔"

امر کا دل جیسے چھلانگ مار کر منّی کے قدموں میں لوٹنے لگا۔"

(۷)

کئی مہینے گزر گئے۔ گاؤں میں پھر مردار گوشت نہ آیا۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ دوسرے علاقے کے چماروں نے بھی مُردار کھانا چھوڑ دیا۔ عملِ خیر کچھ متعدی ہوا کرتا ہے۔

امر کانت کا مدرسہ اب نئی عمارت میں آگیا تھا۔ تعلیم سے لوگوں کو کچھ ایسی رغبت ہوگئی تھی کہ جوان تو کیا بوڑھے بھی آبیٹھتے اور کچھ نہ کچھ حاصل کرلیتے۔ امر دوسرے ملکوں کی تمدنی اور سیاسی ترقیاں، نئی نئی ایجادیں، نئے نئے خیالات بیان کرتا۔ غیر ملکوں کے رسم و رواج، طور و طریق، عوام کی دلچسپی کے موضوع تھے اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ یہ حرف ناشناس جاہل، پیچیدہ سیاسی مسائل کتنی آسانی سے سمجھ جاتے ہیں۔ سارے گاؤں میں ایک نئی زندگی نظر آتی تھی۔

دن بھر کی محنت کے بعد امر لیٹا ہوا ایک افسانہ پڑھ رہا تھا کہ منّی آکر کھڑی ہوگئی۔ امر پڑھنے میں اتنا محو تھا کہ منّی کے آنے کی خبر نہ ہوئی۔ راجستھان کی دلیر راجپوتنیوں کی جانبازیوں کی داستان تھی۔ ان بے نظیر جانبازیوں کی جن کی دنیا کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ہے۔ جنھیں پڑھ کر آج بھی ہماری گردن غرور سے اونچی ہوجاتی ہے۔ زندگی کو کسی

نے اتنا حقیر نہ سمجھا ہوگا۔ حفظِ ننگ کی ایسی نظیریں اور کہاں ملیں گی۔ آج کی عقلی دلیلیں ان قربانیوں کی کتنی ہی تحقیر کریں ہماری عقیدت تو ان دیویوں کے قدموں پر ہمیشہ سر جُھکاتی رہے گی۔

منّی چپ چاپ کھڑی امر کے چہرے کی طرف تکتی رہی۔ ابر کا وہ ننھا سا ٹکڑا جو آج ایک سال ہوئے اس کے فضائے دل میں کسی طائر کی طرح اُڑتا ہوا آگیا تھا۔ رفتہ رفتہ پورے آسمان پر مسلط ہوگیا تھا۔ ایامِ گزشتہ کی سوزشوں میں جھُلسی ہوئی تمنائیں یہ طراوت پاکر پھر سرسبز ہوتی جاتی تھیں۔ وہ ویران زندگی کسی باغیچے کی طرح یہ ترشح پاکر برگِ گل سی شگفتہ ہوگئی۔ اوروں کے لیے تو اس کی دیورانیاں کھانا پکاتی تھیں۔ امر کے لیے وہ خود پکاتی۔ بے چارے دو روٹیاں تو کھاتے ہیں اور یہ گنوارنیں موٹے موٹے روٹ بناکر رکھ دیتی ہیں۔ وہ ایک نئی جنت کی تشکیل کرنے لگی ہے۔ ایک نئی مسرّت کا خواب دیکھنے لگی ہے۔

ایک دن سلونی نے اس سے مسکراکر کہا۔ "امر بھیّا تیرے ہی بھاگ سے یہاں آگئے۔ منّی اب تیرے دن پھریں گے۔"

منّی نے خوشی کو جیسے مٹھی میں دبا کر کہا۔ "کیا کہتی ہو کاکی۔ کہاں میں کہاں وہ۔ مجھ سے کئی سال چھوٹے ہوں گے۔ پھر ایسے گیانی اور ایسے نیک۔ ان کی بدیّا کا تو جیسے کوئی چھور ہی نہیں۔ میں تو ان کی جوتیوں کے برابر بھی نہیں۔"

کاکی نے کہا۔ "یہ سب ٹھیک ہے منّی۔ پر تیرا جادو ان پر چل گیا ہے۔ میں دیکھ رہی ہوں۔ شرمیلے آدمی ہیں اس سے تجھ سے کچھ کہتے نہیں مگر تو ان کے دل میں سما گئی ہے۔ کیا تجھے اتنا بھی نہیں سوجھتا۔"

منّی کا چہرہ کھِل اُٹھا تھا۔ "تمھاری دعا ہے کاکی تو میرا منورتھ بھی پورا ہوجائے گا۔"

منّی ایک لمحے تک امرکانت کے چہرے کی طرف دیکھتی رہی۔ تب اندر جاکر اس کی چارپائی نکال لائی، امر کا دھیان ٹوٹا، بولا۔ "رہنے دو میں ابھی نکالے لیتا ہوں۔ تم میرا اتنا دُلار کروگی منّی تو میں آرام طلب ہوجاؤں گا۔ آؤ تمھیں ہندو دیویوں کی داستان سُناؤں۔"

منّی نے پوچھا۔ "کوئی کہانی ہے کیا؟"

"نہیں کہانی نہیں ہے سچّے حالات ہیں۔"

امر نے مسلمانوں کے حملے، راجپوت سورماؤں کے کارنامے اور چھترانیوں کے جوہر کا

تذکرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ان دیویوں کو آگ میں جل جانا منظور تھا۔ مگر یہ منظور نہ تھا کہ غیر کی نگاہ بھی ان پر پڑے۔ اپنی آن پر مٹتی تھیں، ہماری دیویوں کا یہ معیار تھا۔ آج یورپ کی کیا حالت ہے جرمن فوجیں فرانس پر چڑھ آئیں اور فرانس کے مردوں سے گاؤں خالی ہوگئے تو فرانس کی عورتیں جرمنی کے سپاہیوں اور افسروں پر مائل ہی ہو گئیں۔“

منّی ناک سکوڑ کر بولی۔ ”فرانس کی عورتیں بڑی چنچل ہوں گی۔“

”نئے زمانے کی یہی رفتار ہے۔“

”ایسا زمانہ چولھے میں جائے، لیکن وہ چھترانیاں جیتے جی کیسے جلتی تھیں؟ ان کا کلیجہ بڑا مضبوط ہوتا ہوگا۔“

امر نے کتاب بند کردی۔ ”بڑا مشکل ہے منّی، یہاں تو ذرا سی چنگاری لگ جاتی ہے تو بلبلا اُٹھتے ہیں۔ جب ہی تو آج ساری دنیا ان کی پوجا کرتی ہے۔ میں تو جب یہ داستان پڑھتا ہوں تو رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ یہ جی چاہتا ہے کہ جس پاک سرزمین پر ان دیویوں کی چتائیں بنیں ان کی راکھ سر پر چڑھاؤں۔ آنکھوں میں لگاؤں اور وہیں مر جاؤں۔“

منّی کسی دوسرے خیال میں ڈوبی ہوئی زمین کی طرف تک رہی تھی۔

امر نے پھر کہا۔ ”کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوجاتا تھا کہ مردوں کو اپنی طرف سے بے فکر کرنے کے لیے عورتیں لڑائی سے پہلے ہی جل مرتی تھیں۔ آدمی کو جان اتنی پیاری ہوتی ہے کہ زندہ درگور بوڑھے بھی نہیں مرنا چاہتے۔ بڑے بڑے مہاتما بھی موت کے نام سے کانپتے ہیں۔ مگر ان دیویوں کے لیے زندگی بھی کھیل تھی۔“

منّی اب بھی خیال میں مستغرق تھی۔ اس کے چہرے پر کسی باطنی درد کی علامت نظر آ رہی تھی۔

امر نے پوچھا۔ ”کیا سوچ رہی ہو منّی چہرہ کیوں اداس ہے؟“

منّی خفیف تبسم کے ساتھ بولی۔ ”مجھ سے پوچھتے ہو، مجھے کیا ہوا ہے۔“

”کچھ بات تو ہے، مجھ سے چھپاتی ہو۔“

”نہیں جی کوئی بات نہیں۔“

ایک منٹ کے بعد اس نے پھر کہا۔ ”تم سے آج اپنا حال کہوں گی سنو گے؟“

”بڑے شوق سے۔ میں نے تو تم سے کئی بار کہا۔ تم نے سُنایا ہی نہیں۔“

”میں تم سے ڈرتی ہوں۔ تم مجھے بے شرم اور نہ جانے کیا کیا سمجھنے لگو گے۔“

”اگر تم مجھے اتنا بے رحم سمجھتی ہو تو بہتر ہے مت کہو۔ لیکن مجھے یہ نہ معلوم تھا کہ تم میری طرف سے اتنی بدگمان ہو۔“

منّی نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔”تم لالہ ذرا ذرا سی بات پر چڑ جاتے ہو۔ جب ہی عورت سے تمھاری نہیں پٹتی۔ اچھا لو سنو جو جی میں آئے سمجھنا۔ میں جب کاشی سے چلی تو تھوڑی دیر تک مجھے ہوش نہ رہا۔ کہاں جاتی ہوں، کیوں جاتی ہوں، کہاں سے آئی ہوں یہ سب بھول گئی۔ میں گاڑی میں بیٹھ کر رونے لگی۔ اپنے پیاروں کی محبت ندی کی طرح دل میں امنڈ پڑی اور میں اس میں ڈوبنے اُترنے لگی۔ اب معلوم ہوا میں کیا کچھ کھو کر چلی جارہی ہوں۔ ایسا نظر آتا تھا کہ میرا بچّہ میری گود میں آنے کے لیے ہمک رہا ہے۔ میں اس کو یاد کرنے لگی۔ اس کا ہنسنا رونا۔ اس کی توتلی باتیں اس کا سنبھل سنبھل کر چلنا۔ اسے چپ کرنے کے لیے چندا ماموں کو دکھانا اسے سلانے کے لیے لوریاں سُنانا۔ ایک ایک بات یاد آنے لگی۔ میری وہ چھوٹی سی دنیا کتنی سکھ سے بھری ہوئی تھی۔ اس لعل کو گود میں لے کر میں کتنی نہال ہوجاتی تھی۔ گویا دنیا کی دولت میرے پیروں کے نیچے ہے۔ گویا دل کی ساری آرزوئیں اسی بچّے میں آکر جمع ہوگئی ہوں۔ اپنا ٹوٹا پھوٹا جھونپڑا۔ اپنے میلے کچیلے کپڑے، قرض دام کی فکر، اپنی غریبی، اپنی بدنصیبی یہ سب ہی چبھنے والے کانٹے جیسے پھول بن جاتے تھے۔ اگر کوئی خواہش تھی تو یہ کہ میرا بچّہ کبھی میری آنکھوں سے دور نہ ہو اور آج اسی کو چھوڑ کر میں نہ جانے کہاں چلی جا رہی تھی۔ دل کی ساری یادگاریں سامنے دوڑنے والے درختوں کی طرح گویا میرے ساتھ دوڑتی چلی آرہی تھیں اور انھیں کے ساتھ میرا بچّہ بھی دوڑتا چلا آتا تھا۔ آخر میں آگے نہ جاسکی۔ دنیا ہنستی ہے ہنسے، برادری مجھے نکالتی ہے نکال دے۔ میں اپنے بچّے کو چھوڑ کر نہ جاؤں گی۔ محنت مزدوری کرکے بھی تو گزر ہوسکتا ہے۔ اپنے لعل کو آنکھوں سے دیکھتی رہوں گی۔ اسے میری گود سے کون چھین سکتا ہے۔ میں اس کے لیے جی مری ہوں۔ میں نے اسے اپنے خون سے پالا ہے۔ وہ میرا ہے میں اسے چھوڑ نہیں سکتی۔

جوں ہی لکھنؤ آیا میں گاڑی سے اُتر پڑی۔ میں نے ارادہ کرلیا تھا کہ لوٹتی ہوئی گاڑی سے بنارس لوٹ جاؤں گی جو کچھ ہونا ہوگا ہوگا۔

"میں کتنی دیر تک پلیٹ فارم پر کھڑی رہی معلوم نہیں۔ بجلیوں کی بتّیوں سے سارا اسٹیشن جگمگا رہا تھا۔ میں بار بار قلیوں سے پوچھتی تھی۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجھے ان کا جواب یاد نہ رہتا تھا۔ کیوں کہ میں وہی سوال بار بار کرتی تھی۔ خیر گاڑی آئی۔ میں نے اپنا سامان سنبھالا۔ دل دھڑکنے لگا۔ مسافر چڑھنے اُترنے لگے۔ قلی نے آکر کہا۔ "اسباب زنانے ڈبّے میں رکھوں یا مردانے میں؟"

"میرے منہ سے آواز نہ نکلی۔"

"قلی نے میرے چہرے کی طرف تکتے ہوئے پوچھا۔"زنانے ڈبّے میں اسباب رکھ دوں؟"

"میرا ارادہ تبدیل ہوگیا۔ میں اس گاڑی سے نہ جانا چاہتی تھی۔"

"اب دوسری گاڑی دس بجے دن کو ملے گی۔"

"میں اُسی گاڑی سے چلوں گی۔"

امر نے پوچھا۔"تم اس گاڑی سے چلی کیوں نہ گئیں؟"

منّی نے جواب دیا۔"نہ جانے کیسا جی ہونے لگا۔ جیسے کوئی میرے ہاتھ پاؤں باندھے لیتا ہو۔ ان ناپاک ہاتھوں سے اپنے لعل کو کیسے اُٹھاؤں گی۔ مجھے اپنے شوہر پر غصّہ آرہا تھا وہ میرے ساتھ آیا کیوں نہیں۔ اگر اسے میری پروا ہوتی تو مجھے اکیلا کیوں آنے دیتا۔ اسی گاڑی سے وہ بھی آسکتا تھا۔ ضرور اس کی طبیعت بدل گئی۔ جب وہ مجھے نہیں چاہتا تو میں بھی اس کے پاس نہ جاؤں گی۔ اور نہ جانے کون کون سے خیالات ذہن میں آکر مجھے جبراً روکنے لگے۔ میں مسافرخانے میں من مارے بیٹھی تھی کہ ایک صاحب اپنی عورت کے ساتھ آکر میرے ہی قریب دری بچھا کر بیٹھ گئے۔ عورت کی گود میں ایک سال بھر کا بچّہ تھا۔ ایسا پھول سا بچّہ، ایسا گلابی رنگ، ایسی کٹورا سی آنکھیں، ایسا مکھن سا جسم، میں اپنے کو بھول کر اسے دیکھنے لگی۔ اپنے پرائے کی سُدھ جاتی رہی۔ ایسا معلوم ہوا کہ میرا ہی بچّہ ہے۔ لڑکا ماں کی گود سے اُتر کر آہستہ آہستہ رینگتا ہوا میری طرف آیا۔ میں پیچھے ہٹ گئی لڑکا اور آگے بڑھا میں دوسری طرف چلی گئی۔ بچّہ رونے لگا۔ پھر بھی میں اس کے قریب نہ آئی۔ اس کی ماں نے میری طرف شکوہ آمیز نظروں سے دیکھ کر بچّے کو دوڑ کر اُٹھا لیا۔ مگر بچّہ مچلنے لگا اور باربار میری طرف ہاتھ بڑھانے لگا۔ میں دور کھڑی رہی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا

کہ میرے ہاتھ کٹ گئے ہیں۔ گویا میرا ہاتھ لگتے ہی وہ سونے سا بچّہ کچھ اور ہوجائے گا۔ اس میں سے کچھ نکل جائے گا۔

عورت نے کہا۔ ”لڑکے کو ذرا اُٹھا لو دیوی! تم تو جیسے بھاگ رہی ہو۔ جو پیار کرتے ہیں ان کے پاس تو ابھاگا جاتا نہیں۔ جو منہ پھیر لیتے ہیں ان کی طرف دوڑتا ہے۔“

”لالہ میں تم سے نہیں کہہ سکتی کہ ان باتوں نے میرے دل کو کتنی چوٹ پہنچائی۔ اسے کیسے سمجھاؤں کہ میں روسیاہ ہوں، بدنصیب ہوں اور یہ بات معلوم ہونے پر کیا وہ پھر مجھ سے اپنا بچّہ اُٹھا لینے کو کہے گی۔“

”میں نے قریب آکر بچّے کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھا اور ڈرتے ڈرتے اسے اُٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ یکایک بچّہ چلّا کر ماں کی طرف بھاگا۔ گویا اس نے کوئی خوفناک صورت دیکھ لی۔ اب سوچتی ہوں تو سمجھ میں آتا ہے کہ بچوں کی یہی عادت ہے۔ لیکن اُس وقت مجھے ایسا معلوم ہوا کہ سچ مچ میرا چہرہ کسی بُھتنی کا سا ہوگیا۔ میں شرم سے پانی پانی ہوگئی۔“

”ماں نے بچّے سے کہا۔“اب جاتا کیوں نہیں رے۔ بلا تو رہی ہیں۔ کہاں جاؤگی بہن۔؟“

”میں نے ہردوار بتایا۔ وہ دونوں بھی ہردوار ہی جا رہے تھے۔ میں بڑی خوش ہوئی کہ ہردوار تک تو ساتھ رہے گا۔ لیکن بچّہ پھر میری طرف نہ آیا۔

”تھوڑی دیر میں وہ میاں بیوی تو سوگئے لیکن میں بیٹھی رہی۔ ماں کے سینے سے چمٹا ہوا بچّہ بھی سو رہا تھا۔ میرے دل میں طوفانی ولولہ اُٹھا کہ بچّے کو اُٹھا کر پیار کروں لیکن دل کانپ رہا تھا کہ کہیں بچّہ رونے نہ لگے یا ماں جاگ جائے تو دل میں کیا کہے گی۔ میں بچّے کا چاند سا مکھڑا دیکھ رہی تھی۔ وہ شاید کوئی سپنا دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ میری طبیعت قابو سے باہر ہوگئی۔ میں نے سوتے ہوئے بچّے کو سینے سے لگا لیا۔ مگر ایک ہی لمحے میں مجھے ہوش آگیا۔ میں نے بچّے کو پھر لِٹا دیا۔ ماں نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا پھر بچّے کو سینے سے لگا کر آنکھیں بند کرلیں اس ایک لمحے کے پیار میں کتنی روحانی خوشی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرا ہی بچّہ روپ بدل کر میرے پاس آگیا ہے۔

”دیوی جی کا دل بہت سخت تھا۔ بات بات پر اس بچّے کو جھڑک دیتیں۔ کبھی کبھی مار

بیٹھتی تھیں۔ مجھے اس وقت ایسا غصہ آتا تھا کہ انھیں خوب ڈانٹوں۔"

"جب دوسرے دن ہم لوگ ہردوار کی گاڑی میں بیٹھے تو بچّہ میرا ہوچکا تھا۔ میں تم سے کیا کہوں بابو جی۔ میری چھاتی میں دودھ بھی آگیا لیکن بچّے کو پلاتے ڈرتی تھی۔"

"ہردوار میں ہم لوگ ایک دھرم شالے میں ٹھہرے۔ میں اس بچّے کے دامِ محبت میں بندھی ہوئی اس کنبے کے پیچھے پیچھے پھرتی رہی۔ میں ان کی لونڈی تھی۔ بچّے کی ساری خدمت میرے ذمے آگئی۔ یہاں تک کہ میں اسے دودھ بھی پلانے لگی۔ ماں کا جیسے گلا چھوٹ گیا۔ لیکن میں اس خدمت پر خوش تھی۔ دیوی جی جتنی ہی آرام طلب اور مغرور تھیں ان کے شوہر اتنے ہی بامروّت اور شریف تھے۔ میری طرف کبھی آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھتے۔ اگر میں کمرے میں اکیلی ہوتی تو کبھی اندر نہ آتے، کچھ کچھ تمھاری جیسی عادت تھی۔ مجھے ان پر رحم آتا تھا۔ اس عورت کے ساتھ ان کی زندگی اس طرح کٹ رہی تھی گویا چوہا بلّی کے پنجے میں آگیا ہو۔ وہ انھیں بات بات پر جھڑکتی۔ بے چارے کھِسیانے ہوکر رہ جاتے۔"

"پندرہ دن گزر گئے تھے دیوی جی نے گھر لوٹنے کے لیے کہا۔ ان کے شوہر ابھی کچھ دن اور وہاں رہنا چاہتے تھے۔ اسی بات پر تکرار ہوگئی۔ میں برآمدے میں بچّے کو لیے کھڑی تھی۔ دیوی جی نے گرم ہوکر کہا۔"تمھیں رہنا ہوتو رہو۔ میں تو آج جاؤں گی۔ تمھاری ہی آنکھوں نے راستہ نہیں دیکھا ہے۔"

"شوہر نے ڈرتے ڈرتے کہا۔"یہاں دس پانچ دن رہنے میں ہرج ہی کیا ہے۔ مجھے تو تمھاری صحت میں کوئی خاص تبدیلی نظر نہیں آتی۔"

"دیوی جی نے آنکھیں مٹکا کر کہا۔"آپ میری صحت کی فکر چھوڑیے میں اتنی جلدی نہیں مری جا رہی ہوں۔ تم قسم کھاسکتے ہو کہ میری صحت کے خیال سے یہاں ٹھہرے ہو۔"

"شوہر نے پوچھا۔"اور کس لیے آیا تھا؟"

"آئے چاہے جس کام کے لیے ہو۔ مگر تم میری صحت کے خیال سے نہیں ٹھہرے ہو۔ یہ پٹّیاں اُن عورتوں کو پڑھانا جو تمھارے ہتھ کنڈے سمجھتی نہ ہوں۔ میں تمھاری نس نس پہچانتی ہوں۔ تم ٹھہرنا چاہتے ہو عیش کے لیے۔"

"بابو جی نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔"اچھا اب رہنے دو بنّی۔ خفیف نہ کرو، میں آج ہی چلنے کا انتظام کرتا ہوں۔"

"دیوی جی اتنی آسان فتح پاکر خوش نہ ہوئیں۔ ابھی ان کے دل میں غبار بھرا ہوا تھا، بولیں۔"ہاں چلنے کا انتظام کیوں نہ کروگے۔ یہی تو تم چاہتے تھے۔ یہاں پیسے خرچ ہوتے ہیں نہ، لے جاکر اسی کال کوٹھری میں ڈال دو۔ میں مروں یا جیوں، تمھاری بلا سے۔ میں مرجاؤں گی تو دوسری آجائے گی۔ بلکہ اور نئی نویلی۔ تمھاری چاندی ہی چاندی ہے۔ سوچا تھا یہاں کچھ دن رہوں گی مگر جب رہنے بھی دو۔"

امرکانت نے پوچھا۔"اس شخص نے سچ مچ کچھ شرارت کی تھی یا جھوٹا الزام تھا۔"

منّی نے منہ پھیر کر مسکراتے ہوئے کہا۔"تمھاری عقل بڑی موٹی ہے لالہ! وہ عورت مجھ پر شبہ کر رہی تھی بے چارے بابو جی دبے جاتے تھے کہ کہیں وہ چڑیل بات کھول کر نہ کہہ دے۔ ہاتھ جوڑتے تھے، منتیں کرتے تھے، پر وہ کسی طرح نہ مانتی تھی۔ آنکھیں مٹکا کر بولی۔"ایشور نے مجھے بھی دو آنکھیں دی ہیں۔ اندھی نہیں ہوں۔ میں تو اندر پڑی پڑی کراہوں اور تم باہر عیش کرو۔ تمھیں تو دل بہلانے کے لیے کوئی شغل چاہیے۔"

"رفتہ رفتہ مجھ پر حقیقت کھلنے لگی۔ دل میں ایسی جلن ہوئی کہ ابھی اس کا منہ نوچ لوں۔ بابو جی کا لحاظ نہ ہوتا تو میں نے انھیں اس بدگمانی کا مزہ چکھا دیا ہوتا۔ جہاں سوئی نہ چبھے وہاں برچھی چبھائے دیتی تھی۔

"آخر بابو جی کو بھی غصّہ آیا۔"

"تم بالکل جھوٹ بولتی ہو، سراسر جھوٹ۔"

"ہاں سراسر جھوٹ بولتی ہوں۔"

"کھا جاؤ اپنے بیٹے کی قسم۔"

"مجھے چپ چاپ وہاں سے ٹل جانا چاہیے تھا۔ لیکن اپنے دل کو کیا کہوں۔ جس سے یہ بے انصافی دیکھی نہیں جاتی۔ میرا چہرہ مارے غصّے کے تمتما اُٹھا۔ میں نے اس کے سامنے جاکر کہا۔"بہو جی اب زبان بند کرو نہیں اچھا نہ ہوگا۔ میں طرح دیتی جاتی ہوں اور تم سر چڑھتی جاتی ہو۔ میں تمھیں شریف سمجھ کر تمھارے یہاں ٹھہر گئی تھی۔ اگر جانتی کہ تم

اتنی بدگمان ہو تو تمھارے سائے سے بھاگتی۔ میں ہرجائی نہیں ہوں۔ ایشور نے مجھے بھی بال بچّے دیے ہیں۔ قسمت کا کھیل ہے کہ یہاں اکیلی پڑی ہوں۔"

"ابھی میرے منہ سے پوری بات نہ نکلنے پائی تھی کہ میرے شوہر میرے بچّے کو گود میں لیے آنگن میں کھڑے ہوگئے۔ اور مجھے دیکھتے ہی لپک کر میری طرف چلے۔ میں دیکھ کر ایسی سہم اُٹھی گویا کوئی شیر آگیا ہو اور فوراً اپنی کوٹھری میں جاکر اندر سے دروازہ بند کرلیا۔ چھاتی دھڑدھڑ کررہی تھی مگر کواڑ کی دراز سے آنکھیں لگا کر دیکھ رہی تھی۔ ان کا چہرہ کمھلایا ہوا تھا۔ بالوں پر گرد جمی ہوئی تھی اور چہرے سے مایوسی جھلک رہی تھی۔ کندھے پر کمبل اور لٹیا ڈور رکھے ہاتھ میں لٹھ لیے ایک وحشت کے عالم میں کھڑے تھے۔

"بابو جی نے باہر آکر ان سے پوچھا۔"اچھا آپ ہی ان کے شوہر ہیں۔ آپ خوب آئے۔ ابھی تو وہ آپ ہی کا ذکر کر رہی تھیں۔ آئیے آرام سے بیٹھیے، مگر بہن اندر کیوں بھاگ گئیں۔ یہاں پردیس میں کیسا پردہ؟"

"میرے مالک کو تو تم نے دیکھا ہی ہے۔ ان کے سامنے بابو جی ایسے نظر آتے تھے جیسے سانڈ کے سامنے ناٹا بیل۔"

"انھوں نے بابو جی کو کوئی جواب نہ دیا۔ میرے دروازے پر آکر بولے۔"منّی یہ کیا ستم کر رہی ہو۔ میں تین دن سے تمھیں برابر تلاش کر رہا ہوں آج ملیں بھی تو اندر جا بیٹھیں۔ ایشور کے لیے دروازہ کھول دو اور میری بپتا کی کہانی سُن لو۔ پھر تمھاری جو مرضی ہو کرنا۔"میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ بچّے کو گود میں لے لینے کے لیے دل بے تاب ہو رہا تھا۔ مگر نہ جانے اندر کس کونے میں کوئی بیٹھا کہہ رہا تھا۔ خبردار جو بچّے کو گود میں لیا۔ ایک من کہتا تھا کہ شوہر سے بے اعتنائی مت کرو۔ ایشور نے بیوی اور ماں کا جو ناتا جوڑ دیا ہے وہ کیا کسی کے توڑے ٹوٹ سکتا ہے؟ دوسرا من کہتا تھا کہ تو اب اپنے شوہر کو شوہر اور بیٹے کو بیٹا نہیں کہہ سکتی۔ تو اب اس قابل نہیں رہی۔ بچّے نے کواڑ کو اپنی ننھی ننھی ہتھیلیوں سے پیچھے ڈھکیلنے کے لیے زور لگا کر کہا۔"توال تھولو۔"

"یہ توتلے بول کتنے میٹھے تھے۔ جیسے سنّاٹے میں خوف طاری ہوجانے پر ہم گانے لگتے ہیں۔ اپنی ہی آواز سے ہمیں دوکیلے پن کا احساس ہوتا ہے اسی طرح میں بھی اس وقت اپنے امنڈتے ہوئے پیار کو روکنے کے لیے بول اُٹھی۔"اب تم کیوں میرے پیچھے پڑے ہو؟

کیوں نہیں سمجھ لیتے کہ میں مرگئی؟ مرد ہو کر اتنے دل کے کچے ہو ایک خانہ خراب عورت کے لیے اپنی عزت میں کیوں داغ لگاتے ہو۔ جاکر اپنی شادی کرلو۔ اس زندگی میں میرا اب تم سے ناتا نہیں۔ ہاں ایشور سے یہی دعا مانگتی ہوں کہ دوسرے جنم میں تم پھر مجھے ملو۔ میری کیوں ٹیک توڑ رہے ہو۔ مجھ پر رحم کرو۔ آج ہی یہاں سے چلے جاؤ، نہیں میں زہر کھالوں گی۔ اس روسیاہ کے ساتھ تمھارا کوئی میل نہیں ہے۔"

"میرے شوہر نے پُردرد لہجے میں کہا۔ "تمھارے لیے سب کچھ جھیل لوں گا، منّی! مجھے بھائی بند اپنے بیگانے کی پروا نہیں ہے۔ میں یا تو تمھیں لے کر جاؤں گا یا یہیں دریا میں ڈوب مروں گا۔ اگر میرے دل میں تمھاری طرف سے ذرا بھی میل ہو تو ایشور مجھے نرک کی آگ میں ڈھکیل دے۔ اگر تمھیں نہیں چلنا ہے تو تمھارا بچہ تمھیں سونپ کر میں جاتا ہوں۔ اسے مارو یا جِلاؤ۔ میں پھر کبھی تمھارے پاس نہ آؤں گا، اگر کبھی میری سُدھ آئے تو چلّو بھر پانی دے دینا۔"

"بابو جی سوچیے میں کیسی مصیبت میں گرفتار تھی۔ میرے شوہر مجھے محض دھمکی نہیں دے رہے ہیں۔ یہ میں جانتی تھی۔ جان کو وہ کتنا ناچیز سمجھتے ہیں۔ یہ بھی مجھ سے پوشیدہ نہ تھا۔ پھر بھی میں اپنا دل سخت کیے اندر کھڑی رہی۔ ذرا بھی نرم پڑی اور ستیا ناس ہوا۔ میں نے پتھر کا کلیجہ کرکے کہا۔ "اگر تم بچّے کو میرے پاس چھوڑ گئے تو اس کے ذمے دار تم ہوگے۔ کیونکہ میں اس کی درگت دیکھنے کے لیے زندہ نہیں رہنا چاہتی۔ اس کی پرورش کا بار تمھارے اوپر ہے۔ میرے لیے زندگی میں اگر کوئی تمنا تھی تو یہی کہ میرا لڑکا اور شوہر خیریت سے رہیں، تم یہ خوشی مجھ سے چھین لینا چاہتے ہو تو چھین لو۔"

"میں نے دیکھا کہ میرے شوہر نے بچّے کو اُٹھا لیا۔ جیسے ایک لمحہ پہلے انھوں نے اسے گود سے اُتار دیا تھا۔ اور اُلٹے پاؤں لوٹ پڑے۔ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور ہونٹ کانپ رہے تھے۔"

"دیوی جی نے بھلمنسی سے کام لے کر انھیں بٹھانا چاہا اور پوچھنے لگیں۔ کیا بات ہے؟ کیوں روٹھے ہو؟ لیکن وہ مخاطب نہ ہوئے۔ بابو صاحب پھاٹک تک انھیں پہنچانے گئے۔ میرا دل اب بھی کانپ رہا تھا کہ کہیں کوئی آفت نہ آجائے۔ دیویوں اور دیوتاؤں کی منوتیاں کر رہی تھی کہ میرے پیاروں کی حفاظت کرنا۔"

”جوں ہی بابو جی لوٹے میں نے آہستہ سے کواڑ کھول کر پوچھا۔ ”کدھر گئے کچھ کہتے تھے؟“

”بابو جی نے پُرملامت نظروں سے دیکھ کر کہا۔ ”کہتے کیا۔ منہ سے آواز بھی تو نکلے، ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے جاکر روک لو۔ وہ دریا کی طرف گئے ہیں۔ تم اتنی رحم دل ہوکر بھی اتنی بے مروّت ہو یہ مجھے آج معلوم ہوا۔ بے چارا بچّوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رو رہا تھا۔“ میں بیکسی کے اس درجے کو پہنچ گئی تھی جب انسان غیروں کو بھی اپنا سمجھنے لگتا ہے۔ تند لہجے میں بولی۔ ”پھر بھی تم یہاں دوڑے چلے آئے ان کے ساتھ اور کچھ دیر رہ جاتے تو کیا چھوٹے ہوجاتے یا دیوی جی کو کوئی اُٹھا لے جاتا۔ یہ جانتے ہو کہ اس وقت وہ اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہیں پھر بھی انھیں چھوڑ کر بھاگ چلے آئے۔“

”دیوی جی بولیں۔ ”یہاں نہ دوڑ آتے تو کیا جانے میں کہیں بھاگ جاتی۔ لو آکر گھر میں بیٹھو میں جاتی ہوں پکڑ کر گھسیٹ نہ لاؤں تو اپنے باپ کی نہیں۔“

”دھرم شالے میں بیسیوں ہی آدمی ٹھہرے ہوئے تھے۔ سب اپنے اپنے دروازے پر کھڑے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ دیو جی جوں ہی نکلیں چار پانچ آدمی ان کے ساتھ ہولیے پر آدھ گھنٹے میں سبھی ناکام لوٹے معلوم ہوا کہ وہ اسٹیشن کی طرف چلے گئے۔

”لیکن میں جب تک انھیں گاڑی پر سوار ہوتے نہ دیکھ لوں مجھے چین کہاں۔ گاڑی صبح جائے گی رات بھر وہ اسٹیشن پر رہیں گے، جوں ہی اندھیرا ہوگیا میں اسٹیشن پر جا پہنچی۔ وہ ایک درخت کے نیچے کمبل بچھائے بیٹھے تھے۔ میرا بچّہ لوٹے کو گاڑی بنا کر ڈور سے کھینچ رہا تھا۔ باربار گرتا تھا اور پھر اُٹھ کر کھینچنے لگتا تھا۔ میں ایک درخت کی آڑ میں کھڑی ہوکر یہ تماشا دیکھنے لگی۔ طرح طرح کے خیالات دل میں آنے لگے۔ آخر مجھے کس کا ڈر ہے میں اپنے شوہر کے ساتھ یہاں رہنے لگوں تو برادری کیا کرسکتی ہے۔ لیکن کیا اب میں وہ ہوسکتی ہوں جو پہلے تھی؟

ایک پل کے بعد پھر وہی خیالات، وہ صاف کہہ رہے ہیں ان کا دل صاف ہے۔ گڑے مُردے اُکھاڑنے کی ان کی عادت نہیں۔ نہ وہ اتنے بدمزاج ہیں کہ مجھے جلانے میں انھیں مزا آتا ہے۔ ان کے دل میں اب بھی وہی محبت ہے اور وہی خلوص ہے۔ میں ناحق

شش و پنج میں پڑ کر اپنی اور ان کی زندگی برباد کر رہی ہوں۔ لیکن کیا اب میں وہ ہو سکتی ہوں۔ جو پہلے تھی؟ وہ میری عزت پہلے سے زیادہ کریں گے یہ میں جانتی ہوں۔ میں گھی کا بھی گھڑا لڑھکا دوں گی تو وہ کچھ نہ کہیں گے۔ ان کے برتاؤ میں ذرا بھی فرق نہ ہوگا۔ لیکن وہ بات کہاں جو پہلے تھی۔ اب تو میری حالت اس مریض کی سی ہوگی جسے کوئی غذا مرغوب نہیں ہوتی۔ اب تو مجھے رسّی بھی سانپ نظر آئے گی۔

تو پھر اب میں زندہ ہی کیوں رہوں۔ جب زندگی میں کوئی مسرّت نہیں، کوئی آرزو نہیں تو جینا بے سود ہے۔ کچھ دن اور رو لیے تو اس سے کیا حاصل۔ کون جانے کیا کیا ذلّتیں سہنی پڑیں۔ کیا کیا رسوائیاں ہوں اس سے تو مرجانا کہیں اچھا ہے۔

یہ فیصلہ کر کے میں اُٹھی۔ سامنے ہی وہ سو رہے تھے۔ بچّہ بھی ان کی گود میں چمٹا ہوا تھا۔ آہ کتنا دل شکن نظارہ تھا۔ میری کائنات بخیل کی دولت کی طرح میرے سامنے پڑی ہوئی تھی۔ بخیل اسے خرچ نہیں کرتا۔ کسی کو دیتا بھی نہیں۔ اس کے لیے یہی خیال باعثِ تسکین ہے کہ اس کے پاس دولت ہے۔ اس خیال ہی سے اسے کتنی تقویت اور کتنا اطمینان ہوتا ہے۔ میں اسی رشتے کو توڑنے جا رہی تھی۔

میں نے ڈرتے ڈرتے گویا اپنی جان اپنے ہاتھوں میں لیے شوہر کے پاس گئی۔ لیکن وہاں ایک لمحہ بھی کھڑی نہ رہ سکی۔ جیسے لوہا کھنچ کر مقناطیس سے جا لپٹتا ہے اسی طرح میں بھی ان کی طرف کھنچی جا رہی تھی۔ میں نے اپنے ارادے کا پورا زور لگا کر اپنے کو دور ہٹا لیا اور اسی عالم میں ڈرتے ہوئے دریا کے کنارے آگئی اور یکایک کود پڑی۔"

امرکانت نے درد سے بے تاب ہو کر کہا۔"اب نہیں سُنا جاتا منّی پھر کبھی کہنا۔"

منّی مسکرا کر بولی۔"واہ اب رہ ہی کیا گیا۔ میں کتنی دیر پانی میں رہی کہہ نہیں سکتی۔ جب ہوش آیا تو اسی گھر میں پڑی ہوئی تھی۔ میں بہتی چلی جاتی تھی تڑکے چودھری کا بڑا لڑکا سمیرا اشنان کرنے گیا اور مجھے اُٹھا لایا۔ تب سے میں یہیں ہوں۔

اچھوتوں کی اس جھونپڑی میں مجھے جو آرام اور اطمینان میسّر ہوا اس کی کیا تعریف کروں۔ افسوس سمیرا اس دنیا میں نہیں ہے۔ میں ابھی اچھی طرح اٹھنے بیٹھنے بھی نہ پائی تھی کہ اس نے جنت کی راہ لی۔

امرکانت کے دل میں ایک کانٹا برابر کھٹک رہا تھا وہ کچھ تو نکلا اور کچھ باقی تھا۔

جھجکتا ہوا بولا۔ "سمیر کی نیت نہ جانے کیسی رہی ہو۔"

منّی کے تیور بدل گئے۔ "ہاں اسے مجھ سے محبت تھی اور بہت زیادہ محبت تھی تو اس میں میری کیا خطا؟ اور تم نے مجھ سے یہ سوال پوچھا ہی کیوں۔ خواہ مخواہ زخم پر نمک چھڑک رہے ہو۔ جاؤ اب میں اپنا قصہ نہیں کہتی۔"

امرکانت نے معذرت کے انداز سے کہا۔ "نہیں نہیں میرا یہ منشا نہیں تھا تم بالکل غلط سمجھیں میں نے یوں ہی پوچھ لیا۔

منّی نے پھر کہنا شروع کیا۔ "بات یہ ہوئی کہ جب میں بھلی چنگی ہوگئی تو ایک دن اس نے مجھے چھیڑا۔ میں نے غصّے کو ہنسی میں لپیٹ کر کہا۔ "کیا تم اس طرح مجھ سے نیکی کا بدلہ چاہتے ہو؟ اگر یہ بات ہے تو پھر تم لے جاکر مجھے دریا میں ڈُبا دو۔ اگر اس نیت سے تم نے میری جان بچائی تو تم نے میرے ساتھ بڑا ستم کیا۔ تم جانتے ہو میں کون ہوں؟ میں ٹھکرانی ہوں۔ کبھی بھول کر بھی مجھ سے ایسی بات نہ کرنا ورنہ دریا یہاں سے دور نہیں ہے۔ سمیرا ایسا پشیمان ہوا کہ سر نہ اُٹھا سکا۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرے اس برتاؤ نے اس کا دل توڑ دیا۔ اس دن سے اداس رہنے لگا۔ ایک دن میری پسلیوں میں درد ہونے لگا۔ گاؤں والوں کو بھوت کا شبہ ہوا۔ سمیرا اوجھا کو بلانے گیا۔ ندی چڑھتی ہوئی تھی رات کو ناؤ نہ تھی۔ تیر کر اس پار جانا چاہا۔ ڈوب گیا۔ مجھے اس کی موت کا اتنا صدمہ ہوا کہ شاید اتنا ہی اپنے سگے بھائی کے مرنے کا ہوتا۔ ان نیچوں میں بھی ایسے دیوتا ہوتے ہیں۔ اس کا مجھے یہیں آکر پتا لگا۔ کچھ دن اور جی جاتا تو اس گھر کے بھاگ جاگ جاتے۔

امرکانت نے پوچھا۔ "پھر تمھیں اپنے شوہر اور بیٹے کا کچھ حال نہ معلوم ہوا؟"

منّی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ روتے روتے ہچکی بندھ گئی سسک سسک کر بولی۔ "ملا کیوں نہیں۔ سویرے وہ پھر دھرم شالے میں گئے۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ میں رات ہی سے غائب ہوں تو مجھے ڈھونڈھنے لگے، جدھر کوئی بتا دیتا ادھر ہی چلے جاتے۔ ایک مہینے تک سارے علاقے میں مارے مارے پھرے۔ اس مایوسی اور رنج سے ان کے دماغ میں کچھ فتور آگیا۔ پھر ہردوار آئے۔ مگر اب کی دفعہ بچّہ ان کے ساتھ نہ تھا، کوئی پوچھتا کہ تمھارا لڑکا کیا ہوا تو ہنسنے لگتے۔ جب میں اچھی ہوگئی تو جی میں آیا کہ ہردوار جاکر دریافت کروں کہ وہ کہاں گئے۔ ایک مہینے سے زیادہ ہوگیا تھا ملنے کی امید تو نہ تھی پر

یہ بھی خیال تھا کہ ایک چٹھی لکھ کر چھوڑ آؤں گی۔ اس دھرم شالے کے سامنے پہنچی تو دیکھا کہ بہت سے آدمی دروازے پر جمع ہیں میں بھی چلی گئی۔ بیچ میں ایک لاش پڑی ہوئی تھی۔ لوگ کہہ رہے تھے۔ وہی پگلا ہے وہی جو عورت کو کھوجتا پھرتا تھا۔ میں پہچان گئی وہی میرے مالک تھے۔ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ جس بات سے ڈرتی تھی وہی ہوگئی۔ جانتی کہ یہ شامت آنے والی ہے تو ان کے ساتھ ہی نہ چلی جاتی۔ لیکن آدمی بڑا بے حیا ہے۔ اب بھی مرتے نہ بنا۔ اب کس کے لیے مرتی۔ کھاتی پیتی بھی ہوں، ہنستی بھی ہوں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ بس یہی میری رام کہانی ہے۔"

تیسرا حصّہ

(۱)

لالہ سمرکانت کی زندگی کے سارے منصوبے خاک میں مل گئے۔ انھوں نے خیال کیا تھا کہ زندگی کے آخری دنوں میں اپنا سب کچھ بیٹے کو سونپ کر اور بیٹی کی شادی کر کے کسی گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر ایشور کی یاد کریں گے۔ لیکن دل کی دل ہی میں رہ گئی۔ یہ تو مانی ہوئی بات تھی کہ وہ آخری سانس تک آرام سے بیٹھنے والے آدمی نہ تھے۔ لڑکے کو عروج پر بڑھتے دیکھ کر ان کے حوصلے اور بھی بڑھتے۔ لیکن کہنے کو ہوگیا۔ اس درمیان میں امرکانت ڈھرے پر آتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ لیکن جب اس کی عقل ہی میں فتور آگیا تو اس سے کیا امید کی جاسکتی تھی۔ امرکانت میں اور چاہے جتنی برائیاں ہوں اس کے کردار کے متعلق کسی طرح کا اندیشہ نہ تھا۔ لیکن بُری صحبت میں پڑکر اس نے دھرم بھی کھویا، آبرو بھی کھوئی اور اطوار بھی کھوئے۔ سمرکانت ناجائز تعلقات کو بہت معیوب نہ سمجھتے تھے۔ رئیسوں میں یہ رواج زمانۂ قدیم سے چلا آتا ہے۔ وہ رئیس ہی کیا جو اس طرح کے ناٹک نہ کھیلے۔ لیکن دھرم چھوڑنے کو تیار ہوجانا، کھلے خزانے خاندانی روایات سے انحراف کرنا یہ تو جنون ہے۔ بالکل گدھاپن۔

سمرکانت کی عملی زندگی ان کی مذہبی زندگی سے بالکل الگ تھی۔ دنیاوی معاملات اور لین دین میں وہ دھوکے دھڑی، دغا فریب سب کچھ جائز سمجھتے تھے۔ ان کے آئینِ تجارت میں سن یا کپاس میں کوڑا بھر دینا، گھی میں آلو یا گھیاں گبڑ دینا جواز کے دائرے سے باہر نہ تھا۔ مگر بغیر نہائے منہ میں پانی ڈالنا بھی ایسا گناہ تھا جس کا کوئی کفارہ نہ تھا۔ ان چالیس

برسوں میں شاید ہی کوئی دن ایسا ہوا ہو کہ انھوں نے شام کی آرتی نہ کی ہو۔ تلسی دل ماتھے پر نہ چڑھایا ہو۔ خلاصہ یہ ہے کہ ان کا مذہب نمائش کی چیز تھا جس کا حقیقی زندگی سے کوئی تعلق نہ تھا۔

سلیم کے گھر سے لوٹ کر پہلا کام جو انھوں نے کیا وہ سکھدا کو پھٹکار بتلانا تھا اس کے بعد نینا کی باری آئی۔ دونوں کو رُلا کر وہ اپنے کمرے میں گئے اور خود رونے لگے۔

راتوں رات یہ خبر سارے شہر میں پھیل گئی۔ اس پر لوگوں نے من مانے حاشیے چڑھائے۔ سمرکانت دن بھر گھر سے نہ نکلے۔ یہاں تک کہ آج اشنان کرنے بھی نہ گئے۔ کئی آسامی روپے لے کر آئے منیم تجوری کی کنجی مانگنے گیا۔ لالہ جی نے ایسا ڈانٹا کہ وہ چپکے سے باہر نکل آیا۔ آسامی روپے لے کر لوٹ گئے۔

خدمت گار نے چاندی کا حقہ لاکر سامنے رکھ دیا۔ تمباکو جل گیا۔ لالہ جی نے منہ سے نہ لگایا۔ دس بجے سکھدا نے آکر پوچھا۔

"آپ کیا کھائیں گے؟"

لالہ جی اسے خشمگیں نگاہوں سے دیکھ کر بولے۔"مجھے بھوک نہیں ہے۔" سکھدا چلی گئی۔ دن بھر کسی نے کچھ نہ کھایا۔

نو بجے رات کو نینا نے آکر کہا۔ "دادا آپ آرتی میں نہ جایئے گا؟"

لالہ جی چونکے۔"ہاں جاؤں گا کیوں نہیں، تم لوگوں نے کچھ کھایا یا نہیں؟"

نینا بولی۔"کسی کو بھوک ہی نہیں تھی۔ کون کھاتا۔"

سکھدا بھی آپہنچی اور بولی۔"جب آپ ہی جان دے رہے ہیں تو دوسروں پر آپ کیوں بگڑتے ہیں۔"

لالہ جی چادر اوڑھ کر جاتے ہوئے بولے۔"میرا کیا بگڑا ہے کہ میں جان دوں۔ یہاں تھا تو مجھے کون سا آرام دیتا تھا۔ میں نے بیٹے کا سکھ ہی نہ جانا۔ تب بھی جلا رہا تھا اب بھی جلا رہا ہے۔ چلو کھانا پکاؤ میں آکر کھاؤں گا۔ جو گیا اسے جانے دو۔ جو ہیں انھیں کو اس جانے والے کی کسر پوری کرنی ہے۔ میں کیوں جان دینے لگا۔ یہ گرہستی میں نے جوڑی ہے اس کے چلانے کا بار بھی مجھ پر ہے۔ جب تک دم میں دم ہے اس چکی کو پیستا رہوں گا۔ آرام میری تقدیر ہی میں نہیں لکھا ہے۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس لونڈے کو

یہ سوجھی کیا۔ اس کی تو ایسی عادت نہ تھی۔ اس کو ایشور کی لیلا کہتے ہیں۔

ٹھاکر دوارے میں لوگ جمع ہوگئے تھے۔ لالہ سمرکانت کو دیکھتے ہی کئی صاحبوں نے پوچھا۔"امر کہیں چلے گئے کیا سیٹھ جی! کیا بات ہوئی؟"

لالہ جی نے گویا اس وار کو رد کرتے ہوئے کہا۔"کچھ نہیں اس کی بہت دنوں سے گھومنے گھامنے کی خواہش تھی چلا گیا۔ پچھلے جنم کا تپسوی ہے۔ اس کا بس چلے تو میری ساری گرہستی ایک دن میں لٹا دے۔ مجھ سے یہ نہیں دیکھا جاتا۔ بس یہی جھگڑا ہے۔ میں نے غریبی کا مزا چکھا ہے۔ اس نے ابھی غریبی کا مزا نہیں چکھا۔ سال چھ مہینے دنیا کی ہوا کھائے گا تو آنکھیں کھل جائیں گی۔ تب اسے معلوم ہوجائے گا کہ دنیا کی خدمت بھی وہی شخص کرسکتا ہے جس کے پاس پیسے ہیں۔"

کسی کو اور کچھ پوچھنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ مگر احمق پجاری پوچھ ہی بیٹھ۔"سُنا ہے کسی جولاہے کی لڑکی سے پھنس گئے تھے۔"

یہ بے ہودہ سوال سن کر لوگوں نے زبان دبا کر منہ پھیر لیے۔ لالہ جی نے پجاری کو قاتل نظروں سے دیکھا اور تند لہجے میں بولے۔"ہاں پھنس گئے تھے تو پھر؟ کرشن بھگوان نے ایک ہزار رانیوں کے ساتھ بھوگ کیا تھا۔ راجا شانتنوں نے مچھوے کی لڑکی کے ساتھ نہیں شادی کی تھی؟ کون راجا ہے جس کے محل میں سو دو سو عورتیں نہ ہوں۔ امر نے ایسا کیا تو کوئی نئی بات نہیں۔ تم جیسے بھکاری اپنا ہی پیٹ نہیں پال سکتے تو عورت کو کیا رکھیں گے؟ تمھارے لیے یہی جواب ہے۔ سمجھ داروں کے لیے یہ جواب ہے کہ جس گھر میں پری جیسی عورت بیٹھی ہو وہ کیوں جھوٹے پتل چاٹنے لگا۔"

یہ کہتے ہوئے لالہ جی مورت کے سامنے گئے۔ لیکن آج ان کے من میں عقیدت کا جوش نہ تھا۔ آفت کے مارے امید سے ایشور کی پرستش کرتے ہیں۔ قسمت کے پورے خوف سے۔ آفت رسیدوں پر جتنی زیادہ مصیبتیں پڑتی ہیں ان کا اعتقاد بھی اتنا ہی زیادہ بڑھتا ہے۔ خوش نصیب پر جب آفت آتی ہے تو وہ باغی ہوجاتا ہے۔ وہ ایشور کو بھی اپنی دولت کے سامنے جھکانا چاہتا ہے۔ لالہ جی کا بے چین دل آج سونے اور ریشم سے جگمگاتی ہوئی مورتی میں صبر اور تشفی کا پیغام نہ پاسکا۔ کل تک یہی مورت انھیں طاقت اور ہمت عطا کرتی تھی۔ اسی مورت سے آج ان کا غم نصیب دل انحراف کر رہا تھا۔ ان کی پرستش

کا یہی انعام ہے!!

وہ چلنے لگے تو برہمچاری جی بولے۔"لالہ جی اب کی یہاں سری بالمیکی جی کی کتھا کا بچار ہے۔"

لالہ جی نے پیچھے پھر کر کہا۔"ہاں ہاں ہونے دو۔"

ایک بابو صاحب نے کہا۔"یہاں تو کسی میں اتنی مقدرت نہیں ہے۔ آپ ہی مدد کریں تو کتھا بیٹھ سکتی ہے۔"

سمرکانت نے جوش کے ساتھ کہا۔"ہاں ہاں میں اس کی ساری ذمہ داری لینے کو تیار ہوں۔ بھگوت بھجن سے بڑھ کر دولت کا اور کیا مناسب خرچ ہوسکتا ہے۔"

لوگ ان کا یہ جوش دیکھ کر تعجب میں آگئے۔ وہ بخیل تھے اور کسی مذہبی کام میں پیش قدمی نہ کرتے تھے۔ لوگوں نے سمجھا تھا ان سے دس بیس روپے ہی مل جائیں تو غنیمت ہے۔ انھیں یوں بازی مارتے دیکھ کر اور لوگ بھی گرمائے۔ سیٹھ دھنی رام نے کہا۔"آپ سے سارا بار لینے کو نہیں کہا جاتا لالہ جی۔ آپ صاحبِ مال سہی لیکن اوروں کو بھی تو عقیدت ہے چندے سے ہونے دیجیے۔" سمرکانت بولے۔"تو اور لوگ آپس میں چندہ کرلیں۔ جتنی کمی رہ جائے گی میں پوری کردوں گا۔"

دھنی رام کو خوف ہوا کہ کہیں یہ حضرت سستے نہ چھوٹ جائیں بولے۔"آپ کو جتنا لکھنا ہو لکھ دیں۔"

سمرکانت نے کہا۔"پہلے آپ لکھیے۔"

کاغذ قلم دوات لائی گئی دھنی رام نے لکھا ایک سو ایک۔

سمرکانت نے برہم چاری جی سے پوچھا۔"آپ کا کیا تخمینہ ہے؟"

برہم چاری جی کا تخمینہ ایک ہزار کا تھا۔

سمرکانت نے آٹھ سو ننانوے روپے لکھ دیے اور وہاں سے چلے آئے۔

سچی عقیدت کی کمی کو وہ دولت سے پورا کرنا چاہتے تھے۔ روحانی عقیدت میں جتنی کمی ہوتی ہے اتنا ہی نمائش میں اضافہ ہوتا ہے۔

(۲)

امرکانت کا خط لیے ہوئے نینا اندر گئی تو سکھدا نے پوچھا۔ ”کس کا خط ہے؟“

نینا نے خط کا مضمون بتادیا۔

سکھدا نے کہا۔ ”اچھا ان کا خط ہے! کہاں ہیں؟“

”ہردوار کے پاس کسی گاؤں میں ہیں۔“

آج پانچ مہینے سے دونوں میں امرکانت کا مطلق ذکر نہ آیا تھا۔ گویا کوئی زخم تھا جسے چھوتے ہی دونوں ہی کے دل کانپتے تھے۔ سکھدا نے پھر کچھ نہ پوچھا بچّے کے لیے ایک فراک سی رہی تھی۔ پھر اسی میں مصروف ہوگئی۔

نینا خط کا جواب لکھنے لگی آج پانچ مہینے کے بعد آپ کو میری یاد آئی ہے۔ نہ جانے کیا کیا لکھنا چاہتی تھی۔ آخر کئی گھنٹوں کے بعد وہ خط تیار ہوا جو ہم پہلے دیکھ چکے ہیں۔ خط لے کر وہ بھابی کو دکھانے گئی۔ سکھدا نے دیکھنے کی ضرورت نہ سمجھی۔

نینا نے دل شکستہ ہوکر کہا۔ ”تمھاری طرف سے کچھ لکھ دوں؟

”نہیں کوئی ضرورت نہیں۔“

”تمھیں اپنے ہاتھ سے لکھ دو۔“

”مجھے کچھ لکھنا ہی نہیں ہے۔“

نینا رونی صورت لیے چلی گئی۔ خط ڈاک میں بھیج دیا گیا۔

سکھدا کو امر کے نام سے بھی چڑ ہے۔ اس کے کمرے میں امر کی ایک تصویر تھی۔ اسے اس نے اُتار کر رکھ ہی نہیں دیا بلکہ توڑ کر پھینک دیا۔ اب اس کے پاس امر کی یاد دلانے والی کوئی چیز نہ تھی۔ یہاں تک کہ بچے سے بھی اس کا جی پھر گیا تھا۔ بچّہ بیشتر نینا کے پاس رہتا تھا۔ مگر وہ شکستہ خاطر نہ تھی۔ اس کی خودپروری کئی گنی بڑھ گئی ہے۔ اس کی خود اعتمادی بھی کہیں زیادہ ہوگئی ہے اور وہ اب کسی کی دست نگر نہیں رہنا چاہتی۔ محبت کے سوا اور کسی طرح کا دباؤ اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔ اس کی تکلف پسندی گویا خوداری کے جنگل میں کھو گئی ہے۔

لیکن حیرت کا مقام تو یہ ہے کہ سکینہ سے اسے مطلق پُرخاش نہیں ہے۔ وہ اسے بھی اپنی ہی طرح بلکہ اپنے سے کہیں زیادہ قابلِ رحم سمجھتی ہے اس غریب مسلمان چھوکری

کی کتنی رسوائی ہوئی اور اب بے چاری اس سنگ دل کے نام کو رو رہی ہے۔ حضرت کا وہ سارا جوش ٹھنڈا ہوگیا۔ ایسے چھچوروں کا اعتبار ہی کیا۔ وہاں کوئی دوسرا شکار تاک لیا ہوگا۔ سکینہ سے ملنے کا اسے بار بار اشتیاق ہوتا تھا۔ مگر سوچ سوچ کر رہ جاتی تھی۔

ایک دن پٹھانی سے معلوم ہوا کہ سکینہ بہت بیمار ہے۔ اس دن سکھدا نے اس سے ملنے کا مصمم ارادہ کرلیا۔ نینا کو بھی ساتھ لے لیا۔ پٹھانی نے راستے میں کہا "میں تمھیں گھر دکھا کر کہیں چلی جاؤں گی بہو جی۔ مجھ سے تو جب ہی سے بول چال بند ہے۔ ایسی اچھی شادی طے ہو رہی تھی اس نے منظور ہی نہ کی۔ میں بھی چپ ہوں دیکھوں کب تک اس کے نام پر بیٹھی رہتی ہے۔ میرے جیتے جی تو لالہ گھر میں قدم نہ رکھنے پائیں گے، ہاں مرنے کے بعد کی نہیں کہہ سکتی۔"

سکھدا نے چھیڑا۔"کسی دن ان کا خط آجائے اور سکینہ ان کے پاس چلی جائے تو کیا کرو گی؟"

بڑھیا آنکھیں نکال کر بولی۔"مجال ہے کہ اس طرح چلی جائے۔ خون پی ڈالوں۔"

سکھدا نے پھر چھیڑا۔"جب وہ مسلمان ہونے کو کہتے ہیں تب تمھیں کیا انکار ہے؟"

پٹھانی نے کان پر ہاتھ رکھ کر کہا۔"ارے بیٹا جس کا زندگی بھر نمک کھایا۔ اس کا گھر اُجاڑ کر اپنا گھر بساؤں۔ یہ شریفوں کا کام نہیں ہے۔ میری تو سمجھ ہی میں نہیں آتا۔ اس چھوکری میں کیا دیکھ کر بھیا جی ریجھ پڑے۔"

اپنا گھر دکھا کر پٹھانی تو پڑوس کے گھر میں چلی گئی۔ دونوں عورتوں نے سکینہ کے دروازے کی کنڈی کھٹکھٹائی۔ سکینہ نے دروازہ کھولا تو دونوں کو دیکھ کر گھبرا سی گئی۔ جیسے کہیں بھاگنا چاہتی ہو۔ کہاں بٹھائے کیا خاطر کرے۔

سکھدا نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔"تم پریشان نہ ہو بہن ہم اس چارپائی پر بیٹھے جاتے ہیں۔ تم تو ایسی معلوم ہو جیسے چھ مہینے کی مریض ہو۔ ایک بے وفا آدمی کے چکمے میں پڑکر کیا جان دے دوگی؟"

سکینہ کا زرد چہرہ زرد سے سرخ ہوگیا۔ اسے ایسا گمان ہوا کہ سکھدا اس سے جواب طلب کر رہی ہے۔ تم نے میرا بنا بنایا گھر کیوں اُجاڑ دیا۔ اس کا سکینہ کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ وہ سیلاب کچھ اس ناگہانی طور پر نازل ہوا کہ وہ اس کی رو میں بہہ گئی۔ پہلے بادل کا

ایک ٹکڑا آسمان کے ایک کونے میں نظر آیا۔ دیکھتے دیکھتے سارے آسمان پر بادل چھا گئے۔ اور ایسے زوروں کی بارش ہوئی کہ وہ خود اس میں بہہ گئی۔ وہ کیا بتائے کیسے کیا ہوا۔ بادل کے اس ٹکڑے کو کون کہہ سکتا تھا کہ سیلاب لا رہا ہے۔

اس نے سر جُھکاکر کہا۔ ”عورت کی زندگی اور ہے ہی کس لیے۔ بہن وہ اپنے دل سے لاچار ہے۔ جس سے وفا کی امید کرتی ہے وہی دغا دیتا ہے۔ اس میں کیا اختیار۔ لیکن بے وفاؤں سے محبت نہ ہو تو محبت میں مزہ ہی کیا ہے۔ شکوہ شکایت، بے تابی اور بے قراری یہی تو محبت کے مزے ہیں۔ پھر میں تو وفا کی امید بھی نہ کرتی تھی۔ اس وقت بھی جانتی تھی کہ یہ سیلاب دو چار گھڑی کا مہمان ہے۔ لیکن میری تسکین کے لیے تو اتنا ہی کافی تھا کہ جس آدمی کی میں سب سے زیادہ عزت کرتی تھی اس نے مجھے اس لائق تو سمجھا۔ میں اسی کاغذ کی ناؤ پر بیٹھ کر اس ساگر کو پار کردوں گی۔“

سکینہ کی یہ روانیٔ بیان دیکھ کر سکھدا حیرت میں آگئی۔ کہیں جھجک نہیں، کہیں پردہ داری نہیں جو اس کے خلوص کا پتا دے رہا تھا۔ لیکن ابھی اس کے دل کا غبار نہ نکلا تھا۔ بولی۔ ”یہی تو مردوں کے ہتھکنڈے ہیں۔ پہلے تو ایسے بن جائیں گے کہ گویا ساری شرافت ان ہی پر ختم ہے پھر طوطوں کی طرح آنکھیں پھیر لیں گے۔“

سکینہ نے بے باکانہ لہجے میں کہا۔ ”بہن، بننے سے کوئی شریف نہیں بن جاتا۔ شرافت انسان کے دل میں ہوتی ہے۔ آپ کی عمر چاہے سال دو سال مجھ سے زیادہ ہو لیکن اس معاملے میں مجھے آپ سے کہیں زیادہ تجربہ ہے۔ یہ میں غرور سے نہیں کہتی۔ شرم سے کہتی ہوں۔ خدا نہ کرے غریب کی لڑکی حسین ہو۔ غریبی میں حسن بلائے جان ہے۔ وہاں بڑوں کا تو کہنا ہی کیا، چھوٹوں کی رسائی بڑی آسانی سے ہوجاتی ہے۔ اماں بڑی پارسا ہیں۔ مجھے پاک دامن سمجھتی ہوں گی۔ کسی آدمی کو دروازے پر کھڑا نہیں ہونے دیتیں لیکن اس وقت بات آپڑی ہے تو کہنا ہی پڑتا ہے کہ مجھے مردوں کے دیکھنے اور پرکھنے کے کافی موقعے ملے ہیں۔ سب ہی نے مجھے تفریح کی جنس سمجھا۔ اور میری غربت سے اپنی ہوس پوری کرنی چاہی۔ اگر کسی نے مجھے عزت اور اعتماد کی نگاہ سے دیکھا تو وہ بابو جی تھے۔ میں خدا کو گواہ کرکے کہتی ہوں کہ انھوں نے مجھے ایک بار بھی ایسی نگاہوں سے نہیں دیکھا اور نہ ایک کلمہ بھی منہ سے ایسا نکالا جس سے نفس پرستی کی بو آئی ہو۔ یہ ان کا

خلوص تھا جس نے میرے دل پر اپنا گہرا نقش جمالیا۔ انھوں نے مجھے نکاح کی دعوت دی۔ میں نے اسے منظور کرلیا۔ اب جب تک وہ خود دعوت کو رد نہ کریں میں ان کی پابند ہوں۔ چاہے مجھے عمر بھر یوں ہی رہنا پڑے۔ ان تھوڑی سی مختصر ملاقاتوں ہی میں مجھے ان پر اعتماد ہوگیا ہے کہ میں عمر بھر ان کے نام پر بیٹھی رہ سکتی ہوں۔ مجھے اب افسوس ہوتا ہے کہ کیوں نہ ان کے ساتھ چلی گئی۔ میرے رہنے سے کچھ تو انھیں آرام ہوتا۔ کچھ تو ان کی خدمت کرسکتی۔ مجھ پر ان کی نگاہ پڑی یہ اس کا کافی ثبوت ہے کہ ان پر رنگ و روپ کا جادو نہیں چل سکتا۔ حور بھی آجائے تو اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھیں گے۔ لیکن خدمت اور احسان کا جادو بڑی آسانی سے ان پر چل سکتا ہے۔ یہی خوف ہے۔ میں آپ سے سچے دل سے کہتی ہوں بہن میرے لیے اس سے بڑی خوشی کی بات اور نہیں ہوسکتی کہ آپ میں اور ان میں صفائی ہوجائے اور دلوں کی کدورت مٹ جائے۔ کیونکہ میرا یہ بھی ارادہ تھا کہ میں آپ کی سوت نہ بنوں۔ میں ان کے ساتھ نہ گئی اس کا یہی سبب تھا۔ مجھ پر تو انھوں نے جو شفقت کی ہے وہی میرے لیے کافی ہے۔ لیکن بُرا نہ مانو تو ایک بات کہوں؟"

سکھدا نے جواب دیا۔"تم جس صاف دلی سے باتیں کر رہی ہو اس سے مجھے تمھاری کوئی بات بھی بُری نہ معلوم ہوگی۔ شوق سے کہو۔"

سکینہ نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔"اب تو ان کا پتا معلوم ہوگیا ہے۔ آپ ایک بار ان کے پاس چلی جائیں۔ وہ خدمت کے غلام ہیں اور خدمت ہی سے آپ انھیں اپنا بناسکتی ہیں۔"

سکھدا نے پوچھا۔"بس یا اور کچھ؟"

"بس اور میں آپ کو کیا سمجھاؤں گی۔ آپ مجھ سے زیادہ سمجھ دار ہیں۔"

سکھدا نے ترش ہوکرکہا۔"انھوں نے میرے ساتھ دغا کی ہے میں ایسے کمینے آدمی کی خوشامد نہیں کرسکتی۔ اگر آج میں کسی مرد کے ساتھ بھاگ جاؤں تو تم سمجھتی ہو وہ مجھے منانے جائیں گے۔ ہاں شاید میری گردن کاٹنے جائیں۔ میں عورت ہوں اور اتنی سنگ دل نہیں ہوسکتی۔ لیکن ان کی خوشامد تو میں مرتے دم تک نہیں کرسکتی۔"

یہ کہتی ہوئی سکھدا اُٹھ کھڑی ہوئی۔ سکینہ دل میں پچھتائی کہ کیوں ضرورت سے

زیادہ بہناپا جتا کر اس نے سکھدا کو ناراض کردیا۔ دروازے تک معافی مانگتی ہوئی آئی۔ دونوں تانگے پر بیٹھیں تو نینا نے کہا۔ ”تمھیں غصہ بہت جلد آجاتا ہے بھابی۔“

سکھدا نے جل کر کہا۔ ”تم تو ایسا کہوگی ہی اپنے بھائی کی بہن ہو نا۔ دنیا میں ایسی کون عورت ہے جو ایسے شوہر کو منانے جائے گی۔ ہاں شاید سکینہ چلی جاتی۔ اس لیے کہ اسے ایسی چیز مل گئی ہے جس کی اسے امید نہ تھی۔“

نینا نے کہا۔ ”وہ اپنے دل میں تمھیں کیا سمجھ رہی ہوگی؟“

سکھدا لاپرواہی سے بولی۔ ”اس کی مجھے پروا نہیں ہے۔ مگر ایک بات مجھے معلوم ہوگئی۔ اس چھوکری میں وہ سارے اوصاف موجود ہیں جو مردوں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ ایسی ہی عورتیں مردوں کے دلوں پر راج کرتی ہیں۔ میرے دل میں تو کبھی تسلیم کی یہ کیفیت پیدا ہی نہ ہوئی۔ میں ان سے ہنس کر بولنے اور اپنے حسن و شباب کی نمائش ہی میں پڑی رہ گئی۔ نہ کبھی پریم کیا۔ نہ کبھی پریم پایا مجھے برسوں میں جو چیز نہ ملی وہ اسے منٹوں میں مل گئی۔ آج مجھے کچھ علم ہوا کہ مجھ میں کیا عیب ہے۔ سکینہ نے میری آنکھیں کھول دیں۔ میں اس سے ہمدردی کرنے آئی مگر یہاں سے کچھ سبق لے کر جا رہی ہوں۔ لیکن انھیں تو میں کبھی معاف نہیں کرسکتی۔ اگر میں اپنا قصور مان بھی لوں تو وہ الزام سے بری نہیں ہوسکتے۔“

(۳)

ایک مہینے سے ٹھاکر دوارے میں کتھا ہو رہی ہے۔

سودن جی اس فن کے ماہر ہیں۔ ان کی کتھا میں ناٹک کا لطف بھی ہے اور نظم کا بھی۔ جتنی آسانی سے وہ خلقت کو رُلا سکتے ہیں اتنی ہی آسانی سے ہنسا بھی سکتے ہیں۔ روایتوں کے تو وہ گویا دریا ہیں۔ اور بیان میں اتنے مشاق کہ جو تمثیل بیان کرتے ہیں اس کی تصویر کھینچ دیتے ہیں۔ سارا شہر اُمڈ پڑا ہے۔ راما بائی تو شام ہی سے ٹھاکر دوارے میں آ پہنچتی ہیں۔ بیاس جی اور ان کے بھجن گانے والے سب انھیں کے مہمان ہیں۔ نینا بھی للّو کو گود میں لے کر پہنچ جاتی۔ صرف سکھدا کو کتھا میں دلچسپی نہیں ہے، وہ نینا کے بار بار اصرار کرنے پر بھی نہیں آتی۔ اس کا سرکش دل گویا ساری دنیا سے مقابلہ کرنے کے لیے ننگی تلوار لیے کھڑا رہتا ہے۔ کبھی کبھی تو اس کی طبیعت اتنی بے قرار ہوجاتی ہے کہ مذہب

ز

اور اخلاق کی ساری پابندیوں کو توڑ کر پھینک دے۔ ایسے نفس پرستوں کی یہی سزا ہے کہ ان کی عورتیں بھی ان ہی کے نقشِ قدم پر چلیں تب ان کی آنکھیں کھلیں گی اور انھیں معلوم ہوگا کہ جلنا کسے کہتے ہیں، ایک وہ خاندانی عزّت و وقار کے نام کو روئے لیکن یہ بے داد بہت دنوں نہ چلے گی۔ اب کوئی اس گمان میں نہ رہے کہ شوہر چاہے جو کچھ کرے اس کی عورت اس کے پاؤں دھو دھوکر پیئے گی۔ اسے اپنا مالک سمجھے گی۔ اس کے پاؤں دبائے گی اور وہ اس سے ہنس کر بولے گا تو اپنے کو خوش نصیب سمجھے گی۔ وہ دن لدگئے۔

آج نینا بحث کر بیٹھی۔ "تم کہتی ہو کہ مرد کے اطوار کی آزمائش کرلینی چاہیے کیا آزمائش کرنے میں دھوکا نہیں ہوتا۔ جن لوگوں میں آزمائش کا عام رواج ہے کیا ان کے یہاں طلاقیں نہیں ہوتی رہتیں ہیں؟ تو سمجھتی ہوں طلاق کی مثالیں انھیں کے یہاں زیادہ ملتی ہیں۔"

سکھدا بولی۔ "تو طلاق کو تم بُرا کیوں سمجھتی ہو۔ وہاں یہ تو نہیں ہوتا کہ مرد گلچھرے اُڑائے اور عورت اس کے نام کو روتی رہے۔"

نینا نے جیسے رٹے ہوئے الفاظ دُہرائے "جہاں محبت نہیں ہے وہاں مسرت بھی نہیں ہوسکتی۔ ان ظاہری بندشوں سے کچھ نہ ہوگا۔"

سکھدا نے جواب دیا۔ "اگر دیکھ بھال کرنے میں کبھی کبھی دھوکا ہوسکتا ہے تو آج کل اندھی شادیوں میں ہمیشہ ہی دھوکا ہوتا ہے۔ طلاق یہاں جاری ہوجانے دو تو معلوم ہوگا کہ ہماری زندگی کتنے آرام سے گزرتی ہے۔"

نینا اس کا کوئی جواب نہ دے سکی۔ کل بیاس جی نے پچھم کی شادیوں کا موازنہ ہندوستانی شادیوں سے کیا تھا۔ وہی دلیلیں نینا کو یاد تھیں ان کے ختم ہوجانے کے بعد وہ بحث کو جاری نہ رکھ سکی بولی۔ "تمھیں کتھا میں چلنا ہے یا نہیں۔ یہ بتاؤ؟"

"تم جاؤ میں نہیں جاتی۔"

نینا ٹھاکر دوارے میں پہنچی تو کتھا شروع ہوگئی تھی۔ آج بہت زیادہ ہجوم تھا۔ نوجوان سبھا کے طلباء اور اتالیق بھی آئے ہوئے تھے۔ مدھوسودن جی کہہ رہے تھے۔ "رام راون کی کتھا اس دنیا کی اس زندگی کی سچّی داستان ہے۔ اسے چاہو تو سننا پڑے گا نہ چاہو گے تو سننا پڑے گا۔ ہمارے ہی اندر رام بھی ہیں، راون بھی ہیں، سیتا بھی ہیں کیکئی بھی ہیں۔"

دفعتاً پچھلی صفوں میں کچھ ہل چل مچی۔ برہم چاری جی کئی آدمیوں کو ہاتھ پکڑ کر اُٹھا رہے تھے اور زور زور سے گالیاں بک رہے۔ ہنگامہ برپا ہوگیا۔ لوگ اِدھر اُدھر سے اُٹھ کر وہاں جمع ہوگئے۔ کتھا بند ہوگئی۔

سمرکانت نے پوچھا۔"کیا بات ہے برہم چاری جی؟"

برہم چاری جی نے لال آنکھیں نکال کر کہا۔"بات کیا ہے۔ یہاں لوگ بھگوان کی کتھا سُننے آتے ہیں کہ اپنا دھرم بھرشٹ کرنے آتے ہیں۔ بھنگی، چمار جسے دیکھو گھُسا چلا آتا ہے۔ ٹھاکر جی کا مندر نہ ہوا سرائے ہوئی۔"

سمرکانت نے کڑک کر کہا۔"نکال دو سبھوں کو مار کر۔"

ایک بڈھے نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔"ہم تو یہاں دروجّے پر بیٹھے تھے سیٹھ جی نے جہاں جوتے رکھے ہیں۔ ہم کیا ایسے نادان ہیں کہ آپ لوگوں کے بیچ میں جاکر بیٹھ جاتے۔"

برہم چاری جی نے اسے ایک لات جماتے ہوئے کہا۔"تو یہاں آیا کیوں۔ دیکھتا نہیں یہاں سے وہاں تک دری بچھی ہوئی ہے۔ سب کا بھربھنڈ ہوگیا کہ نہیں۔ پرشاد ہے، چرنامرت ہے، گنگاجل ہے۔ سب مٹی ہوا کہ نہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ تو بوڑھا ہوگیا مٹھوا۔ مرنے کے دن آگئے۔ پر تجھے اتنی عقل نہ آئی۔ چلا ہے وہاں سے بڑا بھگت کی دُم بن کر۔"

سمرکانت نے بگڑ کر پوچھا۔"اور بھی پہلے کبھی آیا تھا کہ آج ہی آیا ہے؟"

مٹھوا نے خطاوارانہ انداز سے کہا۔"روج آتے ہیں مہاراج۔ یہیں دروجّے پر بیٹھ کر بھگوان کی کتھا سنتے ہیں۔"

برہم چاری نے سر پیٹ لیا۔"بدمعاش روز یہاں آتے تھے۔ روز سب کو چھوتے تھے۔ ان کا چھوا ہوا پرشاد روز لوگ کھاتے تھے۔ اس سے بڑھ کر اندھیر اور کیا ہوسکتا ہے۔" دین داروں کے سر پر جنون سوار ہوگیا۔ کئی آدمی جوتے لے لے کر ان غریبوں پر پل پڑے۔ بھگوان کے مندر میں بھگوان کے بھگتوں کے ہاتھوں بھگوان کے بھگتوں پر جوتوں کی بارش ہونے لگی۔

ڈاکٹر شانتی کمار اور ان کے مدرس ذرا دیر تک کھڑے یہ تماشا دیکھتے رہے۔ جب جوتے چلنے لگے تو سوامی آتمانند اپنا موٹا سا سونٹا لے کر برہم چاری جی پر لپکے۔

ڈاکٹر صاحب کو اندیشہ ہوا کہ کوئی فساد نہ کھڑا ہوجائے۔ لپک کر آتمانند کے ہاتھوں سے سونٹا چھین لیا۔

آتمانند نے خونبار نظروں سے دیکھ کر کہا۔"آپ یہ ستم دیکھ سکتے ہیں۔ میں نہیں دیکھ سکتا۔"

شانتی کمار نے ان کا غصہ ٹھنڈا کیا اور بلند آواز سے بولے۔"واہ رے خدا پرستو واہ! کیا کہنا ہے تمھاری خدا پرستی کا۔ جو شخص زیادہ سے زیادہ جوتے لگائے گا، اس پر بھگوان اتنے ہی زیادہ خوش ہوں گے اس کے لیے جنت سے سیدھے بمان آئے گا۔ مگر اب چاہے جتنا مارو پیٹو دھرم تو بھرشٹ ہو ہی گیا۔"

برہم چاری جی، لالہ سمرکانت، سیٹھ دھنی رام اور دیگر علم برداروں نے متحیر ہوکر ڈاکٹر شانتی کمار کی طرف دیکھا۔ جوتے چلنے بند ہوگئے۔

شانتی کمار اس وقت دھوتی پہنے، ماتھے پر چندن لگائے، گلے میں چادر ڈالے بیاس جی کے چھوٹے بھائی سے معلوم ہو رہے تھے۔ یہ ان کا وہ فیشن نہ تھا۔ جس پر غیر مذہبیت کا الزام لگایا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے پھر للکار کر کہا۔"آپ لوگوں نے ہاتھ کیوں بند کرلیے، لگائیے خوب کس کس کر، اور جوتوں سے کیا ہوتا ہے بندوقیں منگائیے اور ان بے دھرموں کا خاتمہ کردیجیے۔ اور تم دھرم کو ناپاک کرنے والو تم سب بیٹھ جاؤ اور جتنے جوتے کھاسکو کھاؤ۔ تمھیں اتنی بھی خبر نہیں کہ یہاں سیٹھ مہاجنوں کے بھگوان رہتے ہیں۔ تمھاری اتنی مجال کہ ان کے بھگوان کے مندر میں قدم رکھو۔ تمھارے بھگوان کہیں کسی جھونپڑے میں یا درخت کے نیچے پڑے ہوں گے۔ یہ بھگوان جواہرات کے زیور پہنتے ہیں۔ موہن بھوگ اور ملائی کھاتے ہیں۔ چیتھڑے پہننے والوں اور ستو کھانے والوں کی صورت نہیں دیکھنا چاہتے ہیں۔"

برہم چاری جی کالے دیو کی سی مہیب صورت بنا کر بولے۔ "تم تو بابو جی اندھیر کرتے ہو۔ شاستروں میں کہاں لکھا ہے کہ ان نیچوں کو مندر میں آنے دیا جائے۔"

شانتی کمار نے تمسخر کے انداز سے کہا۔"کہیں نہیں۔ شاستروں میں یہ لکھا ہے کہ گھی میں چربی ملا کر بیچو، ڈنڈی مارو، رشوتیں کھاؤ، نقلی بہی کھاتے بناؤ اور جو صاحبِ اختیار ہیں

ان کے دروازے پر ناک رگڑو، چاہے وہ شاستروں کو پیروں سے ٹھکراتے ہوں۔ تمھارے شاستروں میں اگر یہی لکھا ہے تو کرو۔ ہمارے شاستر میں تو یہ لکھا ہے کہ بھگوان کی نگاہ میں نہ کوئی چھوٹا ہے نہ بڑا۔ نہ کوئی پاک ہے نہ کوئی ناپاک، ان کی گود سب کے لیے کھلی ہوئی ہے۔"

سمرکانت نے دیکھا کہ وہاں اور کئی اصحاب بھی ڈاکٹر صاحب کے ہم خیال ہیں تو تحمل آمیز لہجے میں بولے۔"ڈاکٹر صاحب تم ناحق اتنا خفا ہو رہے ہو۔ شاستروں میں کیا لکھا ہے کیا نہیں لکھا ہے۔ یہ تو پنڈت ہی جانتے ہیں۔ ہم تو جیسے رواج دیکھتے ہیں ویسا کرتے ہیں۔ ان پاجیوں کو سوچنا چاہیے تھا یا نہیں۔ انھیں تو یہاں کا حال معلوم ہے کہیں باہر سے تو نہیں آئے ہیں۔"

شانتی کمار کا خون کھول رہا تھا بولے۔"آپ لوگوں نے جوتے کیوں مارے؟"

برہم چاری نے اُجڈپن سے کہا۔"اور کیا پان پھول لے کر پوجتے؟"

شانتی کمار برانگیختہ ہوکر بولے۔"کوڑھ مغزوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر یہ حلوے بہت دن کھانے کو نہ ملیں گے مہراج، سمجھ گئے! اب وہ زمانہ آرہا ہے کہ بھگوان بھی پانی سے نہائیں گے دودھ سے نہیں۔"

سب لوگ ہاں ہاں کرتے ہی رہے مگر شانتی کمار اور آتمانند اور کئی آدمی اُٹھ کر چل دیے۔

(۴)

اس دن پھر کتھا نہ ہوئی۔ کچھ لوگوں نے برہمچاری جی ہی کو مطعون کرنا شروع کیا۔ بے چارے ایک گوشے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ انھیں اُٹھانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اور اُٹھایا بھی تھا تو نرمی سے اُٹھاتے مارپیٹ سے کیا فائدہ تھا؟

دوسرے دن وقت معینہ پر کتھا شروع ہوئی۔ لیکن سامعین کی تعداد بہت کم ہوگئی تھی۔ مدھوسودن جی نے رنگ جمانے کی بہت کوشش کی۔ لوگ جمائیاں لے رہے تھے اور پچھلی صفوں میں تو بہت سے آدمی دھڑلے سے سو رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ مندر کا آنگن کچھ چھوٹا ہوگیا ہے۔ دروازے کچھ نیچے ہوگئے ہیں۔ ادھر نوجوان سبھا کے سامنے کھلے میدان میں شانتی کمار کی تقریر ہورہی تھی۔ برجناتھ، سلیم آتمانند وغیرہ آنے والوں کا

خیرمقدم کر رہے تھے۔ برجناتھ مدھوسودن کی بھجن منڈلی کا سرغنہ تھا۔ وہ بھی ان سے ناراض ہوکر مخالف جماعت میں جا ملا تھا۔ تھوڑی دیر میں دریاں چھوٹی پڑ گئیں اور ذرا دیر گزرنے پر میدان بھی چھوٹا پڑ گیا۔ زیادہ تر لوگ ننگے بدن تھے۔ خال خال پھٹے پُرانے کپڑے پہنے نظر آتے تھے۔ ان کے جسم سے تمباکو اور کثافت کی بو آرہی تھی۔ مردوں سے زیادہ عورتیں تھیں۔ میلی بدسلیقہ اور بے زیور۔ ریشم اور مرصع زیوروں کا کہیں نام نہ تھا۔ مگر ان کے دلوں میں صفائی تھی۔ سادگی تھی، خلوص تھا۔ نئے آنے والوں کو دیکھ کر لوگ جگہ روکنے کے لیے پاؤں نہ پھیلاتے تھے۔ یوں نہ تاکتے تھے جیسے کوئی دشمن آگیا ہو۔ بلکہ سمٹ جاتے تھے۔ بہت خوشی سے انھیں جگہ دے دیتے تھے۔

نو بجے کتھا شروع ہوئی وہ دیوی دیوتاؤں اور اوتاروں کی مبالغہ آمیز داستان نہ تھی۔ رشیوں اور منیوں کے فضائل اور کمالات کا قصہ نہ تھا، چھتریوں کی شجاعت اور سخاوت کے افسانے نہ تھے۔ نہ دیوتاؤں اور راکششوں کے خوں ریز معرکوں کے کارنامے تھے۔ یہ اس نفسِ پاک کا تذکرہ تھا۔ جس کے یہاں ظاہر و باطن کی پاکیزگی ہی مذہب کا حقیقی اصول ہے۔ وہی اعلا ہے جس کا باطن پاک ہے۔ وہ ادنیٰ ہے جس کا باطن کثیف ہے۔ جس نے نسلی امتیاز کا اصول قائم کرکے قوم کے ایک حصّے کو فرشتہ اور دوسرے کو شیطان نہیں بنایا۔ کسی کے لیے ترقی اور نجات کا دروازہ نہیں بند کیا۔ ایک کی پیشانی پر تقدس کا تلک اور دوسرے کی پیشانی پر پستی کا داغ نہیں لگایا۔ اس تذکرے میں روحانی عروج کا ایک زندہ پیغام تھا جسے سن کر ناظرین کو ایسا محسوس ہوتا تھا گویا ان کی اندرونی زنجیریں ٹوٹ گئی ہیں اور دنیا جنت کا نمونہ بن گئی ہے۔

نینا کو بھی مذہب کی رسوم سے چڑھ تھی۔ امرکانت اس موضوع پر اکثر گفتگو کیا کرتا تھا۔ ان غریبوں پر یہ ظلم دیکھ کر اس کے خون میں اُبال آگیا تھا۔ سمرکانت کا ادب نہ ہوتا تو اس نے وہیں برہمچاری جی کو پھٹکار بتائی ہوتی۔ اس لیے جب شانتی کمار نے تلک دھاریوں کو آڑے ہاتھوں لیا تو اس کی روح جیسے شگفتہ ہوکر وجد کرنے لگی۔ امرکانت سے کتنی ہی بار ان کا ذکرِ خیر سن چکی تھی۔ اس وقت ان کی تقریر سے اس درجہ متاثر ہوئی کہ جاکر ان سے کہے کہ تم دھرم کے سچّے دیوتا ہو۔ تمھیں نمسکار کرتی ہوں۔ اپنے آس پاس کے آدمیوں کو غضب ناک دیکھ کر اسے اندیشہ ہو رہا تھا کہ کہیں یہ لوگ شانتی کمار پر

ٹوٹ نہ پڑیں۔ اس کے جی میں آتا تھا جاکر ڈاکٹر کے پاس کھڑی ہوجائے اور ان کی حفاظت کرے جب وہ بہت سے آدمیوں کے ساتھ مندر سے چلے گئے تو اسے اطمینان ہوا۔ وہ بھی سکھدا کے ساتھ چلی گئی۔

سکھدا نے راستے میں کہا۔''یہ بھنگی چمار آج نہ جانے کہاں سے پھٹ پڑے۔ اس پر ڈاکٹر صاحب اُلٹے انھیں کو شہ دے رہے تھے۔''

نینا نے کہا۔''ایشور نے تو کسی کو اونچا اور کسی کو نیچا نہیں بنایا۔''

''ایشور نے نہیں بنایا تو کس نے بنایا؟''

''انسان کی خودغرضی نے۔''

''چھوٹے بڑے دنیا میں ہمیشہ رہے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔''

نینا نے بحث کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اس کے لیے یہ مسئلہ بحث سے خارج تھا۔

دوسرے دن شام کو اُسے خبر ملی کہ آج نوجوان سبھا میں الگ کتھا ہوگی تو اس کا دل وہاں جانے کے لیے بے قرار ہوگیا۔ وہ مندر میں سکھدا کے ساتھ تو گئی مگر اس کا جی اُچاٹ ہو رہا تھا۔ جب سکھدا جھپکیاں لینے لگی اور اس نے یہ عمل شروع کردیا تو وہ چپکے سے باہر آئی اور ایک تانگے میں بیٹھ کر نوجوان سبھا کو چلی۔ اس کا ارادہ دور ہی سے مجمع کو دیکھ کر لوٹ آنے کا تھا۔ جس میں سکھدا کو اس کے آنے کی خبر نہ ہو۔ لیکن جب وہاں گیس کی روشنی نظر آئی اور برجناتھ کے روحانیت میں ڈوبے ہوئے بھجن کی آواز کانوں میں آئی تو اسے اب شوق پر قابو نہ رہا۔ وہ بھول گئی کہ اسے چند لمحوں میں مندر واپس جانا ہے۔ آخر جب تانگہ اس مقام پر پہنچا تو شانتی کمار تقریر کرنے کے لیے کھڑے ہوگئے تھے۔ خلقت کا ایک سمندر اُمڈا ہوا تھا اور ڈاکٹر صاحب کا جلال اس سمندر کے اوپر نور کی بارش کررہا تھا۔ نینا کچھ دیر تانگے میں مسحور بیٹھی سُنتی رہی۔ پھر اُتر کر پچھلی قطار میں سب کے پیچھے کھڑی ہوگئی۔

ایک بُڑھیا بولی۔''کب تک کھڑی رہوگی بیٹا! آگے جاکر بیٹھ جاؤ۔''

نینا نے کہا۔''میں بڑے آرام سے ہوں سنائی تو دے رہا ہے۔''

بڑھیا آگے تھی۔ اس نے نینا کا ہاتھ پکڑ کر اپنی جگہ پر کھینچ لیا اور خود اس کی جگہ پیچھے ہٹ گئی۔ نینا نے آج شانتی کمار کو روبرو دیکھا۔ ان کے چہرے پر روحانیت کا جلوہ تھا۔

گویا وہ اس کثافت سے اُٹھ کر دنیائے لطیف میں جا پہنچے ہوں۔ گویا وہاں کی ہوا میں کوئی برقی لہر پیدا ہوگئی جن خستہ حال چہروں پر وہ پھٹکار برستے دیکھا کرتی تھی ان پر آج کتنا افتخار تھا۔ گویا وہ آج کوئی نعمت پاگئے ہیں۔ اتنی شرافت اتنا اخلاق ان لوگوں میں اس نے کبھی نہ دیکھا تھا۔

شانتی کمار کہہ رہے تھے۔"کیا تم ایشور کے گھر سے ہمیشہ کے لیے غلامی کا پٹہ لے کر آئے ہو؟ تم دل و جان سے دوسروں کی خدمت کرتے ہو، مگر تم غلام ہو، سماج میں تمھاری کوئی جگہ نہیں۔ تم سماج کی بنیاد ہو لیکن تمھاری کوئی قدر نہیں تم مندروں میں نہیں جاسکتے، ایسی زبردستی اس بدنصیب ملک کے سوا اور کہاں ہوسکتی ہے۔ کیا تم اس طرح مظلوم اور پامال بنے رہنا چاہتے ہو؟"

ایک آواز آئی۔"ہمارا کیا بس ہے۔"

شانتی کمار نے ولولہ انگیز لہجے میں کہا۔"تمھارا بس اسی وقت کچھ نہیں جب تک تم سمجھے ہو کہ تمھارا بس کچھ نہیں۔ مندر کسی ایک شخص یا فرقے کی چیز نہیں ہے اگر کوئی تمھیں روکتا ہے تو یہ اس کی زیادتی ہے۔ مت ٹلو اس مندر کے دروازے سے چاہے تمھارے اوپر گولیوں کی بارش ہی کیوں نہ ہو۔"

کل کی ماردھاڑ نے ان آدمیوں کو مشتعل کردیا تھا۔ دن بھر اسی معاملے کا ذکر ہوتا رہا۔ بارود تیار تھی اس میں چنگاری کی کسر تھی، یہ الفاظ چنگاری کا کام کرگئے۔ اجتماع کی قوت نے ان کی ہمتیں بڑھا دیں۔ لوگوں نے پہلو بدلے، آستینیں سنبھالیں اور ایک دوسرے کی طرف دیکھا گویا پوچھ رہے ہوں چلتے ہو یا ابھی کچھ سوچنا باقی ہے اور پھر ٹھنڈے پڑگئے۔ ہمت نے چوہے کی طرح بِل سے سر نکالا اور پھر اندر کھینچ لیا۔

نینا کی پاس والی بُڑھیا نے کہا۔"اپنا مندر لیے رہیں ہمیں کیا کرنا ہے۔"

نینا نے گویا گرتی ہوئی دیوار کو سنبھالا۔"مندر کسی ایک کا تھوڑا ہی ہے۔"

شانتی کمار نے گونجتی ہوئی آواز میں کہا۔"کون چلتا ہے میرے ساتھ اپنے ٹھاکر جی کے درشن کرنے؟"

بڑھیا نے سہم کر کہا۔"بھیا اندر کوئی نہ جانے دے گا۔"

شانتی کمار مٹھی باندھ کر بولے۔"یہی تو دیکھنا ہے کون نہیں جانے دیتا۔ ہمارا ایشور

کسی کی ملکیت نہیں ہے جو صندوق میں بند کرکے رکھا جائے۔ آج ہمیں اس معاملے کا تصفیہ کرنا ہے ہمیشہ کے لیے۔"

بے شمار خلقت شانتی کمار کے ساتھ مندر کی طرف چلی۔

نینا کا دل دھڑکنے لگا مگر بالآخر وہ بھی جتھے کے پیچھے پیچھے ہولی وہ اس خیال سے مسرور تھی کہ بھیا اس وقت یہاں ہوتے تو کتنا خوش ہوتے۔ اس کے ساتھ ہی طرح طرح کے وسوسے بھی پانی کے بلبلوں کی طرح اُٹھ رہے تھے۔

جتھا جیسے جیسے آگے بڑھتا تھا اور لوگ آکر ملتے جاتے تھے۔ لیکن جب مندر قریب آگیا تو ان کی ہمتوں نے جواب دے دیا۔ جس اختیار سے وہ ہمیشہ محروم رہے اس کے لیے ان کے دل میں کوئی پُرزور کشش نہ تھی۔ صرف کل کی مار کا غصہ تھا۔ وہ قوت جو انصاف کے احساس سے پیدا ہوئی وہاں نہ تھی۔ پھر بھی آدمیوں کی تعداد بڑھتی جاتی تھی۔ جان پر کھیلنے والے بہت کم لوگ تھے۔ اجتماع کی دھونس جماکر فتح پانے کی امید ہی انھیں آگے بڑھا رہی تھی۔

جتھا مندر کے سامنے پہنچا تو دس بج گئے تھے۔ برہمچاری جی کئی پجاریوں اور پنڈتوں کے ساتھ انھیاں لیے مندر کے دروازے پر کھڑے تھے۔ لالہ سمرکانت میں بھی جوانی کا جوش عود کر آیا تھا۔

نینا کو برہمچاری جی پر ایسا غصہ آرہا تھا کہ جاکر پھٹکارے تم بڑے دھرماتما بنے ہوئے ہو۔ آدھی رات تک اس مندر میں جُوا کھیلتے ہو۔ پیسے پیسے پر جان دیتے ہو، پیسے پیسے پر ایمان بیچتے ہو۔ جھوٹی شہادتیں دیتے ہو۔ دروازے دروازے بھیک مانگتے ہو۔ پھر بھی تم مذہب کے ٹھیکیدار ہو۔ تمھارے قرب سے بھی دیوتاؤں کو کلنک لگتا ہے۔

نینا کے دل میں ایک طوفان سا کھڑا ہوا۔ وہ پیچھے سے بھیڑ کو چیرتی ہوئی مندر کے دروازے کی طرف چلی آرہی تھی کہ شانتی کمار کی نگاہ اس پر پڑگئی۔ چونک کر بولے۔"تم یہاں کہاں نینا؟ میں نے سمجھا تھا تم اندر کتھا سن رہی ہوگی۔"

نینا نے نمائشی غصے سے کہا۔"آپ نے تو راستہ روک رکھا ہے کیسے جاؤں؟"

شانتی کمار نے بھیڑ کو ہٹاکر کہا۔"مجھے معلوم ہوتا ہے تم روٹھی کھڑی ہو۔"

نینا نے ذرا ٹھنک کر کہا۔"آپ ہمارے ٹھاکر جی کو بھرشٹ کرنا چاہتے ہیں؟"

شانتی کمار یہ مذاق نہ سمجھ سکے رنجیدہ ہو کر بولے۔"کیا تمھارا بھی یہی خیال ہے نینا؟"

نینا اور رڈا جمایا۔"آپ ہریجنوں کو مندر میں بھردیں گے، دیوتا بھرشٹ نہ ہوں گے؟"

شانتی کمار نے متین لہجے میں کہا۔"میں نے تو سمجھا تھا دیوتا بھرشٹوں کو بھی پاک کرتے ہیں خود بھرشٹ نہیں ہوتے۔"

یکایک برہمچاری جی نے گرج کر کہا۔"تم لوگ کیا یہاں بلوہ کرنے آئے ہو۔ ٹھاکر جی کے مندر کے دروازے پر؟"

ایک آدمی نے آگے بڑھ کر کہا۔"ہم فوجداری کرنے نہیں آئے ہیں۔"

سمرکانت نے اسے دھکا دے کر کہا۔"تمھارے باپ دادا بھی کبھی درشن کرنے آئے کہ تم ہی سب سے بہادر ہو؟"

شانتی کمار نے اسے سنبھالتے ہوئے کہا۔"باپ دادا نے جو کام نہیں کیا وہ پوتوں پرپوتوں کے لیے منع ہے؟ باپ دادا تو بجلی اور تار کا نام تک نہ جانتے تھے پھر آج ان چیزوں کا اتنا کیوں استعمال ہو رہا ہے۔ خیالوں میں تغیر ہوتا ہی رہتا ہے اسے آپ روک نہیں سکتے۔"

سمرکانت نے طعنہ دے کر کہا۔"اسی لیے تو ہمارے خیال میں یہ تغیر ہوا ہے کہ ٹھاکر جی کی پوجا چھوڑ کر ان کے مخالف بن بیٹھیں۔"

شانتی کمار نے اس کی تردید کی۔"میں ٹھاکر جی کا مخالف نہیں ہوں مخالف وہ ہیں جو ان کے بھگتوں کو پوجا نہیں کرنے دیتے۔ کیا یہ لوگ ہندو رسم و رواج کے پابند نہیں ہیں؟ پھر آپ نے مندر کا دروازہ کیوں بند کردیا؟"

برہمچاری نے آنکھیں نکال کر کہا۔"جو لوگ ماس کھاتے ہیں شراب پیتے ہیں اور بُرے بُرے کام کرتے ہیں وہ مندر میں نہیں جاسکتے۔"

شانتی کمار نے مصالحت آمیز انداز میں کہا۔ "گوشت اور شراب تو بہت سے برہمن اور چھتری اور ویش بھی کھاتے ہیں۔ آپ انھیں کیوں نہیں روکتے۔ کیا اونچی ذات والے چوری نہیں کرتے۔ زنا نہیں کرتے، رشوت نہیں لیتے، آپ انھیں کیوں نہیں روکتے، ایسے

لوگ یہاں کیوں پیر اور پجاری بنے ہوئے ہیں؟"

مجمع کو پیش قدمی کرتے دیکھ کر سمرکانت نے ڈنڈا سنبھالا اور بولے۔"یوں نہ مانیں گے برہمچاری جی ذرا جاکر تھانے میں اطلاع دو یہ لوگ فوجداری کرنے آئے ہیں۔"

اس وقت بہت سے پنڈت پجاری جمع ہوگئے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں لاٹھیاں تھیں۔ اسی کے کُندے سے وہ مجمع کو ہٹانے لگے۔ بھگدڑ مچ گئی۔ کوئی پورب بھاگا کوئی پچھم۔ شانتی کمار کے سر پر بھی ایک ڈنڈا پڑا مگر وہ اپنی جگہ سے ایک قدم بھی نہ ہلے۔ بلکہ بھاگنے والوں کو سمجھاتے رہے۔"بھاگو مت، بھاگو مت، سب کے سب وہیں بیٹھ جاؤ۔ ٹھاکر جی کے نام پر اپنے کو قربان کردو، اپنے حق کے لیے۔"

مگر دوسری لاٹھی سر پر اتنے زور سے پڑی کہ پوری بات بھی منہ سے نہ نکلنے پائی اور وہ گر پڑے سنبھل کر پھر اُٹھنا چاہتے تھے کہ تابڑ توڑ کئی لاٹھیاں پڑگئیں یہاں تک کہ وہ بے ہوش ہوگئے۔

(۵)

نینا باربار دروازے پر آتی اور سمرکانت کو بیٹھے دیکھ کر لوٹ جاتی ہے۔ آٹھ بج گئے اور لالہ جی اس وقت تک گنگا اشنان کرنے نہیں گئے۔ نینا رات بھر کروٹیں بدلتی رہی۔ اس سانحے کے بعد اسے نیند کب آسکتی تھی۔ اس نے شانتی کمار کو چوٹ کھاکر گرتے دیکھا تھا لیکن بے حس و حرکت کھڑی تھی۔ اتنا بھی نہ ہوسکا کہ قریب جاکر خون کا بہنا ہی بند کردیتی۔ امرکانت نے اسے فوری معالجے کی موٹی موٹی باتیں سکھا دی تھیں مگر اس موقع پر تو وہ کچھ نہ کرسکی۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ ایک ہجوم نے انھیں چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ پھر اس نے دیکھا کہ ڈاکٹر آیا اور شانتی کمار کو ایک ڈولی میں لٹاکر لے گیا۔ پھر بھی وہ اپنی جگہ سے نہ ہلی۔ اس کا دل کسی صیدِ گرفتار کی طرح بار بار بھاگنا چاہتا تھا۔ مگر وہ خود کو دونوں ہاتھوں سے پکڑے ہوئے پوری طاقت سے اسے روک رہی تھی۔

آخر اس نے کلیجہ مضبوط کیا اور دروازے سے نکل کر برآمدے میں آگئی۔

سمرکانت نے پوچھا۔"کہاں جاتی ہے؟"

"ذرا مندر تک جاتی ہوں۔"

سمرکانت نے تشویشناک لہجے میں کہا۔"وہاں کا راستہ ہی بند ہے، جانے کہاں کے

چمار سیار آکر دروازے پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ کسی کو اندر جانے ہی نہیں دیتے۔ پولیس انھیں اُٹھانے کی کوشش کر رہی ہے مگر بدمعاش کچھ سُنتے ہی نہیں۔ یہ سب اسی شانتی کمار کا پاجی پن ہے۔ اسی کے اشارے سے یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ ولایت جاکر اپنا دھرم تو کھو ہی آیا تھا اب یہاں ہندو دھرم کی جڑ کھود رہا ہے۔ ایسے شہدوں کو اور کیا سوجھے گی۔ اس کی صحبت نے امر کو چوپٹ کیا۔ اسے نہ جانے کس نے پروفیسر بنا دیا۔"

نینا نے دور ہی سے یہ تماشا دیکھ کر لوٹ آنے کا بہانہ کیا اور مندر کی طرف چلی۔ پھر کچھ دیر کے بعد وہ ایک گلی میں ہوکر اسپتال کی طرف چل پڑی۔ داہنے بائیں چونکی آنکھوں سے تکتی ہوئی وہ تیزی سے چلی جارہی تھی۔ گویا چوری کرنے جاری ہو۔

اسپتال میں پہنچی تو دیکھا ہزاروں آدمیوں کی بھیڑ لگی ہوئی ہے اور کالج کے لڑکے اِدھر اُدھر دوڑ رہے ہیں۔ سلیم نظر آیا وہ اسے دیکھ کر لوٹنا چاہتی تھی کہ برجناتھ مل گیا۔ بولا۔"ارے نینا تم کہاں؟ ڈاکٹرصاحب کو رات بھر ہوش نہیں آیا۔ سلیم اور میں ان کے پاس بیٹھے رہے اِس وقت جاکر آنکھیں کھولی ہیں۔"

اتنے اجنبی آدمیوں کے سامنے نینا کیسے ٹھہرتی؟ مگر یہاں آنا بے کار نہ ہوا۔ داکٹرصاحب کا حال معلوم ہوگیا۔

وہ راستے ہی میں تھی کہ سیکڑوں آدمیوں کو دوڑے آتے ہوئے دیکھا۔ وہ گلی میں چُھپ گئی۔ شاید فساد ہوگیا۔ اب وہ گھر کیسے پہنچے گی۔ حسنِ اتفاق سے آتمانند مل گئے۔ نینا کو پہچان کر بولے۔"تم یہاں کیسے آئیں؟ وہاں تو گولیاں چل رہی ہیں۔ پولیس کپتان نے آکر فائر کرادیا۔"

نینا کے چہرے کا رنگ اُڑگیا۔ جیسے رگوں میں خون کی حرکت ہی بند ہوگئی ہو۔ پھر بولی۔"کیا آپ اُدھر ہی سے آرہے ہیں؟"

"ہاں مرتے مرتے بچا۔ ایک گلی سے نکل آیا۔ ہم لوگ تو چُپ چاپ کھڑے تھے۔ بس کپتان نے فائر کرنے کا حکم دے دیا۔"

"میں گھر کیسے پہنچوں گی؟"

"اس وقت تو ادھر سے جانے میں جوکھم ہے۔"

پھر ایک لمحے کے بعد شاید اپنی بزدلی پر شرمندہ ہو کر کہا۔"مگر گلیوں میں کوئی خوف

نہیں ہے۔ چلو میں تمھیں پہنچادوں۔ کوئی پوچھے تو کہہ دینا لالہ سمرکانت کی بیٹی ہوں۔"

نینا نے دل میں کہا یہ حضرت سیاسی لیڈر بنتے ہیں۔ پھر بھی اتنے ڈرپوک، پہلے تو غریبوں کو بھڑکایا اور جب مار پڑی تو سب سے پہلے بھاگ کھڑے ہوئے، موقعہ نہ تھا، نہیں تو ان کی ایسی خبر لیتی کہ یاد کرتے۔ ان کے ساتھ کئی گلیوں کا چکّر لگاتے ہوئے دس بجے گھر پہنچی۔ آتمانند پھر اسی راستے سے لوٹ گئے۔ نینا نے ان کا شکریہ تک ادا نہیں کیا۔ اس کے دل میں ان کی اب ذرا بھی عزت نہ تھی۔

وہ پیچھے کی کھڑکی سے اندر گئی تو دیکھا سکھدا صدر دروازے پر کھڑی ہے اور سامنے سڑک سے لوگ بھاگتے چلے جا رہے ہیں۔

سکھدا نے پوچھا۔"تم کہاں چلی گئی تھیں، بی بی! یہاں تو پولیس نے فائر کردیا۔ بے چارے بھاگے جارہے ہیں۔"

"مجھے تو راستے ہی میں پتہ لگا۔ گلیوں میں چھپتی ہوئی آئی ہوں۔"

"لوگوں نے دوکانوں کے دروازے تک بند کرلیے۔"

لالہ جی جاکر پولیس والوں کو منع کیوں نہیں کرتے؟"

"انھیں کے حکم سے تو گولی چلی ہے، منع کیسے کریں گے؟"

"اچھا دادا ہی نے گولی چلوائی ہے۔"

"ہاں انھیں نے جاکر کپتان سے کہا اور اب گھر میں چُھپے بیٹھے ہیں میں ان لوگوں کا مندر میں جانا اچھا نہیں سمجھتی لیکن گولیاں چلتے دیکھ کر میرا خون کھول رہا ہے۔ جس دھرم کی حفاظت کے لیے گولیوں کی ضرورت ہو۔ وہ دھرم کبھی سچا ہو ہی نہیں سکتا۔ دیکھو دیکھو آدمی گر پڑا اس کی چھاتی سے خون بہہ رہا ہے۔"

یہ کہتی ہوئی وہ سمرکانت کے سامنے جاکر بولی۔"خون کی ندی بہہ جائے لیکن مندر کا دروازہ نہ کھلے گا۔"

سمرکانت نے غضب ناک آنکھوں سے دیکھ کر کہا۔"کیا کہتی ہو بہو! ان ڈوم چماروں کو مندر میں گھسنے دوں۔ تو تو امر سے بھی دو ہاتھ آگے بڑھی جاتی ہے۔"

سکھدا نے بحث نہ کی وہ خوددار عورت تھی۔ وہی عالی ظرفی جو غرور بن کر اسے نفاست پسند بنائے ہوئے تھی اور جو اسے کمتر درجے کے لوگوں سے ملنے نہ دیتی تھی۔ جو

اسے اپنی مرضی کے خلاف کوئی امر دیکھ کر مشتعل کردیا کرتی تھی اس وقت حمیت کی صورت میں اُبل پڑی، وہ ایک جنون کی حالت میں گھر سے نکلی اور پولیس کے سامنے کھڑی ہوکر بھاگنے والوں کو للکارتی ہوئی بولی۔"بھائیو! کیوں بھاگے جارہے ہو؟ یہ بھاگنے کا موقعہ نہیں ہے۔ سینہ کھول کر سامنے کھڑے ہونے کا موقعہ ہے۔ دکھا دو کہ تم حق کے لیے کتنی دلیری سے اپنی جان قربان کرتے ہو۔ بھاگنے والوں کو کبھی فتح نہیں ہوتی۔"

بھاگنے والوں کے پاؤں سنبھل گئے۔ ایک عورت کو گولیوں کے سامنے کھڑا دیکھ کر بزدلی بھی شرمندہ ہوگئی۔ ایک بُڑھیا نے اس کے پاس آکر کہا۔"بیٹی ایسا نہ ہو تمھارے گولی لگ جائے۔"

سکھدا نے دلیرانہ انداز سے کہا۔"جہاں اتنے آدمی مرگئے وہاں میرے مرجانے سے کوئی نقصان نہ ہوگا۔ بھائیو، بہنو بھاگو مت۔ تمھاری جانوں کی قربانی پاکر ہی ٹھاکر جی تم سے خوش ہوں گے۔"

خوف کی طرح بے خوفی بھی متعدی ہوتی ہے۔ ایک لمحے میں اُڑتی پتّیوں کی طرح بھاگنے والے آدمیوں کی ایک دیوار سی کھڑی ہوگئی۔ اب ڈنڈے پڑیں یا گولیوں کی بارش ہو انھیں غم نہیں۔

بندوقوں سے دھائیں دھائیں کی آوازیں نکلیں۔ ایک گولی سکھدا کے کانوں کے پاس سے سن سے نکل گئی۔ تین چار آدمی گر پڑے مگر دیوار جوں کی توں اچل کھڑی رہی۔

پھر بندوقیں چھوٹیں۔ چار پانچ آدمی پھر گرے۔ لیکن دیوار نے جنبش نہ کی۔

بڑا جگردوز نظارہ تھا۔ لوگ اپنے پیاروں کو آنکھوں کے سامنے تڑپتے دیکھتے تھے۔ مگر کسی کی آنکھوں میں آنسوؤں کی بوند نہ تھی۔ ان میں اتنی جرأت کہاں سے آگئی تھی؟ وہ فوج جو ایک دن بندوق کی پہلی آواز پر بھاگ کھڑی ہوتی ہے۔ دوسرے دن جان کی بازی کھیل جاتی ہے۔ مگر یہ کرائے کے سپاہیوں کا حال ہے جن میں حق اور انصاف کی طاقت نہیں ہوتی۔ جو محض پیٹ کے لیے یا لوٹ کے لیے لڑتے ہیں۔ اس مجمع میں ہر ایک مرد عورت چاہے وہ کتنا ہی جاہل کیوں نہ ہو سمجھنے لگا کہ ہم اپنے دھرم اور حق کے لیے سینہ سپر ہو رہے ہیں اور حق کے لیے مرجانا اچھوتوں کے آئین میں بھی اتنا ہی قابلِ فخر ہے جتنا برہمنوں کے آئین میں۔

مگر یہ کیا، پولیس کے جوان کیوں سنگین اُتار رہے ہیں۔ بندوقیں کیوں کندھوں پر رکھ لی گئیں؟ یہ سب کے سب پیچھے کی طرف کیوں گھومے جاتے ہیں۔ ان کی چارچار کی قطاریں بن رہی ہیں۔ مارچ کا حکم ملتا ہے۔ سب کے سب مندر کی طرف لوٹے جا رہے ہیں۔ ایک کانسٹبل بھی یہاں نہیں رہا۔ صرف لالہ سمرکانت اور پولیس سپرنٹنڈنٹ میں کچھ باتیں ہورہی ہیں اور خلقت اسی طرح سکھدا کے پیچھے ثابت قدم کھڑی ہے۔ ایک لمحے میں سپرنٹنڈنٹ بھی چلا جاتا ہے۔ پھر لالہ سمرکانت سکھدا کے قریب آکر بلند آواز میں کہتے ہیں۔"مندر کھل گیا ہے کسی کے لیے کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔" مجمعے میں ہل چل پڑجاتی ہے لوگ دیوانے ہوہوکر سکھدا کے پیروں پر گرتے ہیں اور تب مندر کی طرف دوڑتے ہیں۔

مگر دس منٹ کے بعد ہی مجمع اسی مقام پر لوٹ آتا ہے۔ سیوا آشرم کے رضاکار ڈولیاں لے کر آتے ہیں اور زخمیوں کو اُٹھا لے جاتے ہیں۔ جاں نثاروں کے آخری مراسم کی تیاریاں ہونے لگتی ہیں۔ بزازوں کی دوکان سے کپڑے کے تھان آجاتے ہیں۔ کہیں سے بانس کہیں سے رسیاں۔ فاتحوں نے دھرم پر ہی فتح نہیں پائی ہے۔ دِلوں پر بھی فتح پائی ہے۔ سارا شہر ان کی تعظیم کرنے کے لیے بے قرار ہو اُٹھا ہے۔

شام کے وقت ان حق کے شہیدوں کے جنازے نکلے۔ سارا شہر پھٹ پڑا۔ جنازے پہلے مندر کے دروازے پر گئے۔ مندر کے دونوں دروازے کُھلے ہوئے تھے۔ پُجاری اور برہمچاری کسی کا پتہ نہ تھا۔ سکھدا نے مندر سے تلسی دل لاکر جنازوں پر رکھا اور گنگاجل چھڑکا۔ انھیں دروازوں کو کُھلوانے کے لیے ان شہیدوں نے جانیں قربان کیں اب دروازہ کُھلا ہوا ہے۔ شہیدوں کا استقبال کرنے کے لے ہاتھ پھیلائے ہوئے ہے۔ مگر یہ روٹھنے والے اب دروازے کی طرف آنکھ اُٹھاکر بھی نہیں دیکھتے۔ کیسی عجیب فتح ہے۔ جس کے لیے جان دی اسی سے اتنے بے نیاز!

ذرا دیر کے بعد لاشیں ندی کی طرف چلیں۔ وہی لوگ جو ایک گھنٹہ پہلے ان سے نفرت کرتے تھے اس وقت ان پر پھولوں کی بارش کر رہے تھے۔ قربانی میں جادو کی تاثیر ہے۔

اور سکھدا! وہ تو فتح کی دیوی تھی۔ قدم قدم پر اس کے نام کے نعرے اُٹھتے تھے اور

کہیں پھولوں کی برکھا ہوتی تھی، کہیں میووں، کہیں روپیوں کی۔ گھنٹہ بھر پہلے شہر میں اس کا کہیں شمار نہ تھا۔ اس وقت وہ شہر کی رانی ہے، اسے اس وقت دونوں طرف کے اونچے اونچے مکان کچھ نیچے اور سڑک کے دونوں طرف کھڑے ہونے والے انسان جیسے کچھ چھوٹے معلوم ہوتے تھے۔ مگر اتنا انکسار، اتنی فروتنی، اتنا اخلاق اس میں کبھی نہ تھا۔ گویا اس تحسین و احترام کے بوجھ سے اس کا سر جُھکا جاتا تھا۔

ادھر گنگا کے کنارے چتائیں جل رہی تھیں۔ ادھر مندر اس تقریب کے جشن میں چراغوں کی روشنی میں جگمگا رہا تھا۔ گویا شہیدوں کی روحیں چمک رہی تھیں۔

(۶)

دوسرے دن مندر میں کتنی دھوم دھام ہوئی۔ شہر میں کتنی ہل چل مچی۔ شہر کے مضافات میں کتنا جشن منایا گیا یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں، سارے دن مندر میں عقیدت مندوں کا تانتا بندھا رہا۔ برہم چاری جی آج پھر رونق افروز ہوگئے تھے اور جتنی نذریں انھیں آج ملیں اتنی شاید عمر بھر میں نہ ملی ہوں گی۔ اس ترشح سے ان کے دل کا غبار شاید بہت کچھ فرو ہوگیا تھا۔ مگر اونچی ذاتوں کے لوگ اب بھی مندر میں جسم بچا کر آتے اور ناک سکوڑتے ہوئے کترا کر نکل جاتے تھے۔ سکھدا مندر کے دروازے پر کھڑی لوگوں کا انتظار کر رہی تھی۔ عورتوں سے گلے ملتی تھی، بچوں کو پیار کرتی تھی اور مردوں کو نمسکار کرتی تھی۔

کل کی سکھدا اور آج کی سکھدا میں کتنا فرق ہوگیا ہے۔ عیش اور تن پروری پر جان دینے والی حسینہ آج ایثار اور انکسار کی پُتلی بنی ہوئی ہے۔ اِن غریبوں کا اعتقاد، ولولہ اور انہماک دیکھ کر اس کے دل میں مسرت کی لہریں سی اُٹھ رہی ہیں۔ کسی کے جسم پر ثابت کپڑے نہیں ہیں۔ بہتوں کو آنکھوں سے سوجھتا بھی نہیں۔ نقاہت کے مارے سیدھے پاؤں نہیں پڑتے۔ مگر حسنِ اعتقاد سے دوڑے چلے آرہے ہیں۔ گویا کائنات کی دولت مل گئی ہو۔ گویا دنیا سے رنج و غم اور افلاس بالکل مٹ گیا ہو۔ ان کا خلوص اور فدائیانہ جوش دیکھ دیکھ کر سکھدا میں قوتِ عمل کا طوفان سا اُٹھا ہوا ہے۔ جو بڑے تن پرور ہوتے ہیں وہی اولو العزم بھی ہوتے ہیں۔ چھوٹے بڑے سب ہی سکھدا کے پیروں تلے آنکھیں بچھا رہے تھے اور ان کی یہ ارادت سکھدا میں خدمت کا ایک پُرافتخار ولولہ پیدا کر رہی تھی۔ کل اس نے

جو کچھ کیا وہ ایک عارضی جنون کی حالت میں کیا تھا۔ اس کا انجام کیا ہوگا اس کی اسے مطلق فکر نہ تھی۔ ایسے موقعوں پر سود و زیاں کا خیال ہمت کو پست کردیتا ہے۔ آج وہ جو کچھ کر رہی تھی اس میں ارادے کی پاکیزگی اور نیک نفسی شامل تھی۔ اسے اپنی طاقت اور صلاحیت کا علم ہوگیا ہے وہ نشہ ہوگیا ہے جس میں نفس کا شائبہ بھی نہیں ہوتا۔ اب سکھدا شہر کی رانی ہے۔ شہر میں جتنی قومی تحریکیں ہوتی ہیں ان کا آغاز سکھدا ہی کے ہاتھوں ہوتا ہے۔ کوئی تقریب ہو، کوئی ثواب کا کام ہو، کوئی قومی فلاح کی تجویز ہو۔ سکھدا ہی اس کی روحِ رواں ہوتی ہے۔ اس کا جی چاہے یا نہ چاہے معتقد اسے کھینچ لے جاتے ہیں۔ اس کی موجودگی ہر ایک جلسے کی کامیابی کے لیے لازمی ہوگئی ہے۔ تعجب یہ ہے کہ وہ تقریر بھی کرنے لگی ہے۔ اور اس کی تقریر میں چاہے زبان کی خوبیاں نہ ہوں مگر سچے جذبات ضرور ہوتے ہیں۔ شہر میں کئی قومی ادارے ہیں جو پہلے بے جان سے پڑے ہوئے تھے۔ سکھدا کے آتے ہی ان میں جان پڑگئی ہے۔ منشیات کے انسداد کی انجمن ایک عرصے سے مضمحل پڑی ہوئی تھی۔ نہ کوئی تبلیغ تھی نہ تنظیم۔ ان کا سکریٹری ایک دن سکھدا کو کھینچ لے گیا۔ دوسرے ہی دن انجمن کے کارکن اور رضاکار اور معاون سب ہی جاگ اُٹھے۔ کئی بیبیاں گھر گھر منادی کے لیے تیار ہوگئیں اور ہر ایک محلے میں پنچائتیں بننے لگیں۔ ایک نئی زندگی پیدا ہوگئی۔

اب سکھدا کو غریبوں کی خستہ حال کا مشاہدہ کرنے کا موقع ملا۔ اب تک اس معاملے میں اسے جو کچھ علم تھا وہ سُنی سُنائی باتوں پر ہی منحصر تھا، اب آنکھوں سے دیکھ کر اسے معلوم ہوا کہ دیدن اور شنیدن میں بڑا فرق ہے۔ شہر کی ان اندھیری اور تنگ گلیوں میں جہاں ہوا اور روشنی کا گزر بھی نہ ہوتا تھا، جہاں کی زمین ہی نہیں دیواریں بھی سیلی رہتی تھیں، جہاں تعفن کے مارے ناک پھٹتی تھی۔ شہر کے کاری گر اور مزدور افلاس اور مرض کے پیروں تلے دبے ہوئے اپنی بے سروساماں زندگی کو موت کے ہاتھوں سے چھیننے میں جان گھلا رہے تھے۔ سکھدا کو اب معلوم ہوا کہ امرکانت کو خودپروری اور عیش پرستی سے جو نفرت تھی وہ کتنی صحیح تھی۔ اسے خود اپنے شاندار مکان میں رہتے، اچھے اچھے کپڑے پہنتے اور غذائیں کھاتے شرم آتی تھی۔ نوکروں سے کام لینا اب اسے جبر معلوم ہوتا تھا۔ اب وہ اپنے گھر میں خود جھاڑو لگاتی ہے۔ خود اپنے کپڑے دھوتی ہے۔ اس کے مزاج میں

سادگی اور خوداعتمادی پیدا ہوگئی ہے۔ اب وہ منہ اندھیرے اٹھتی ہے اور گھر کے کام دھندوں میں لگ جاتی ہے۔ نینا تو اب اس کی پرستش کرتی ہے۔ لالہ جی اپنے گھر کی یہ حالت دیکھ دیکھ کر دل میں کڑھتے ہیں مگر کرتے کیا؟ سکھدا کے ہاں اب ہمیشہ دربار لگا رہتا ہے۔ بڑے بڑے لیڈر، بڑے بڑے عالم اس کی زیارت کو آتے رہتے تھے۔ اس لیے لالہ جی اب اس سے کچھ دبتے تھے۔ خانہ داری کے تفکرات سے ان کا دل بے زار ہونے لگا تھا۔ جس گھر میں ان سے کسی کو ہمدردی نہ ہو اس گھر سے انھیں کیا اُنس ہوتا۔ جہاں اپنے خیالات کی حکومت ہو وہی اپنا گھر ہے۔ جو اپنے خیالات سے موافق ہوں وہی اپنے سگے ہیں۔ یہ گھر اب ان کے لیے سرائے تھا۔ سکھدا اور نینا دونوں ہی سے انھیں کچھ کہتے اختلاف کا اندیشہ ہوتا تھا۔

ایک دن سکھدا نے نینا سے کہا۔" اب تو اس گھر میں رہنے کو جی نہیں چاہتا۔ لوگ کہتے ہوں گے آپ تو محل میں رہتی ہیں اور ہمیں کفایت کا سبق دیتی ہیں۔ مہینوں دوڑتے ہوگئے مگر نشہ بازی میں ذرا بھی کمی نظر نہیں آتی ہماری باتوں پر کوئی کان ہی نہیں دیتا۔ بہت سے آدمی تو اپنی مصیبتوں کو بھول جانے کے لیے ہی نشہ کرتے ہیں۔ وہ ہماری کیوں سُننے لگے۔ ہماری باتوں کا اثر تو جب ہی ہوگا جب ہم بھی ان ہی کی طرح زندگی بسر کریں۔"

کئی دن سے سردی چمک گئی تھی اور پوس کی ٹھنڈی ہوا مرطوب ہوکر آسمان کو کہرے کے غلاف میں ڈھکے ہوئے تھی۔ کہیں کہیں پالا بھی پڑگیا تھا۔ للّو باہر جاکر کھیلنا چاہتا تھا۔ وہ لپٹاتا ہوا چلنے لگا تھا۔ مگر نینا اُسے سردی کے خوف سے روکے ہوئے تھی۔ اس کے سر پر اونی کنٹوپ باندھتے ہوئے بولی۔" یہ تو ٹھیک ہے لیکن ان کی طرح رہنا ہمارے لیے ممکن بھی ہے۔ یہ سوچو۔ میں تو شاید ایک ہی مہینے میں مرجاؤں۔"

سکھدا نے گویا دل میں ایک فیصلہ کرکے کہا۔" میں تو سوچ رہی ہوں کسی گلی میں ایک چھوٹا سا گھر لے کر رہوں۔ اس کا کنٹوپ اُتار کر چھوڑ کیوں نہیں دیتی، بچوں کو گملوں کے پودے بنانے کی ضرورت نہیں جنھیں لو کا جھونکا بھی خشک کرسکتا ہے۔ انھیں تو جنگل کا درخت بنانا چاہیے جو دھوپ اور بارش اولے اور پالے کسی کی پروا نہیں کرتے۔"

نینا نے مسکرا کر کہا۔" شروع سے تو اس طرح رکھا نہیں۔ اب بے چارے کی اصلاح

کرنے چلی ہو۔ کہیں ٹھنڈ ونڈ لگ جائے تو لینے کے دینے پڑیں۔"

"اچھا بھئی جیسے چاہو رکھو مجھے کیا کرنا ہے۔"

"کیوں للّو کو اپنے ساتھ اس چھوٹے سے گھر میں نہ رکھوگی؟"

"جس کا لڑکا ہے وہ چاہے جس طرح رکھے، میں کون ہوتی ہوں۔"

"اگر بھیّا کے سامنے تم اس طرح رہتیں تو وہ تمھارے قدموں کا بوسہ لیتے۔"

سکھدا نے متکبرانہ لہجے میں کہا۔"میں تو جو اُس وقت تھی وہی اب بھی ہوں۔ جب دادا جی سے بگڑکر انھوں نے الگ مکان لیا تھا تو کیا میں نے ان کا ساتھ نہ دیا۔ وہ مجھے نفاست پسند اور شوقین سمجھتے تھے۔ لیکن میں کبھی نفاست کی لونڈی نہیں رہی۔ ہاں میں دادا جی کو ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مجھ میں یہی عیب تھا۔ میں اب بھی رہوں گی تو ان کی مرضی سے۔ تم دیکھ لینا میں اس طرح یہ ذکر چھیڑوں گی کہ وہ ذرا بھی اعتراض نہ کریں گے۔ چلو ذرا ڈاکٹر شانتی کمار کو دیکھ آئیں مجھے تو ادھر اُدھر جانے کی فرصت ہی نہ ملی۔"

نینا ایک بار روز شانتی کمار کو دیکھ آتی تھی۔ ہاں سکھدا سے کچھ نہ کہتی۔ ڈاکٹر صاحب اب اُٹھنے بیٹھنے لگے تھے۔ پر اب بھی اتنے کمزور تھے کہ لاٹھی کے سہارے بغیر ایک قدم بھی نہ چل سکتے تھے۔ چوٹیں انھوں نے کھائیں۔ چھ مہینے سے اسپتال میں پڑے ہوئے تھے اور نام ہوا سکھدا کا۔ یہ صدمہ انھیں اور گھُلائے ڈالتا تھا۔ اگرچہ انھوں نے اپنے مخلص دوستوں سے بھی کبھی اپنا دردِ دل نہیں کہا، مگر یہ کانٹا کھٹکتا ضرور تھا۔ اگر سکھدا عورت نہ ہوتی اور وہ بھی اپنے عزیز شاگرد اور دوست کی بیوی تو شاید وہ شہر چھوڑکر بھاگ جاتے۔ سب سے بڑا ستم یہ تھا کہ ان چھ مہینوں میں سکھدا دوتین بار سے زیادہ انھیں دیکھنے نہ گئی تھی وہ بھی امرکانت کے دوست تھے اور اس اعتبار سے سکھدا کو ان سے کوئی خاص اُنس نہ تھا۔

نینا کو سکھدا کے ساتھ جانے میں کوئی عذر نہ ہوا۔ راما دیوی نے کچھ دنوں سے کار رکھ لی تھی، پر وہ رہتی تھی سکھدا ہی کی سواری میں۔ دونوں بیٹھ کر چلیں، نینا نے للّو کو بھی لے لیا۔

سکھدا نے کچھ دور جانے کے بعد کہا۔"یہ سب امیروں کے چونچلے ہیں۔ میں چاہوں تو دو تین آنے میں گزر کرسکتی ہوں۔"

سادگی اور خوداعتمادی پیدا ہوگئی ہے۔ اب وہ منہ اندھیرے اٹھتی ہے اور گھر کے کام دھندوں میں لگ جاتی ہے۔ نینا تو اب اس کی پرستش کرتی ہے۔ لالہ جی اپنے گھر کی یہ حالت دیکھ دیکھ کر دل میں کڑھتے ہیں مگر کرتے کیا؟ سکھدا کے ہاں اب ہمیشہ دربار لگا رہتا ہے۔ بڑے بڑے لیڈر، بڑے بڑے عالم اس کی زیارت کو آتے رہتے تھے۔ اس لیے لالہ جی اب اس سے کچھ دبتے تھے۔ خانہ داری کے تفکرات سے ان کا دل بے زار ہونے لگا تھا۔ جس گھر میں ان سے کسی کو ہمدردی نہ ہو اس گھر سے انھیں کیا اُنس ہوتا۔ جہاں اپنے خیالات کی حکومت ہو وہی اپنا گھر ہے۔ جو اپنے خیالات سے موافق ہوں وہی اپنے سگے ہیں۔ یہ گھر اب ان کے لیے سرائے تھا۔ سکھدا اور نینا دونوں ہی سے انھیں کچھ کہتے اختلاف کا اندیشہ ہوتا تھا۔

ایک دن سکھدا نے نینا سے کہا۔"اب تو اس گھر میں رہنے کو جی نہیں چاہتا۔ لوگ کہتے ہوں گے آپ تو محل میں رہتی ہیں اور ہمیں کفایت کا سبق دیتی ہیں۔ مہینوں دوڑتے ہوگئے مگر نشہ بازی میں ذرا بھی کمی نظر نہیں آتی ہماری باتوں پر کوئی کان ہی نہیں دیتا۔ بہت سے آدمی تو اپنی مصیبتوں کو بھول جانے کے لیے ہی نشہ کرتے ہیں۔ وہ ہماری کیوں سُننے لگے۔ ہماری باتوں کا اثر تو جب ہی ہوگا جب ہم بھی ان ہی کی طرح زندگی بسر کریں۔"

کئی دن سے سردی چمک گئی تھی اور پوس کی ٹھنڈی ہوا مرطوب ہوکر آسمان کو کہرے کے غلاف میں ڈھکے ہوئے تھی۔ کہیں کہیں پالا بھی پڑگیا تھا۔ للّو باہر جاکر کھیلنا چاہتا تھا۔ وہ لپٹاتا ہوا چلنے لگا تھا۔ مگر نینا اُسے سردی کے خوف سے روکے ہوئے تھی۔ اس کے سر پر اونی کنٹوپ باندھتے ہوئے بولی۔"یہ تو ٹھیک ہے لیکن ان کی طرح رہنا ہمارے لیے ممکن بھی ہے۔ یہ سوچو۔ میں تو شاید ایک ہی مہینے میں مرجاؤں۔"

سکھدا نے گویا دل میں ایک فیصلہ کرکے کہا۔"میں تو سوچ رہی ہوں کسی گلی میں ایک چھوٹا سا گھر لے کر رہوں۔ اس کا کنٹوپ اُتار کر چھوڑ کیوں نہیں دیتی، بچوں کو گملوں کے پودے بنانے کی ضرورت نہیں جنھیں لو کا جھونکا بھی خشک کرسکتا ہے۔ انھیں تو جنگل کا درخت بنانا چاہیے جو دھوپ اور بارش اولے اور پالے کسی کی پروا نہیں کرتے۔"

نینا نے مسکرا کر کہا۔"شروع سے تو اس طرح رکھا نہیں۔ اب بے چارے کی اصلاح

کرنے چلی ہو۔ کہیں ٹھنڈ ونڈ لگ جائے تو لینے کے دینے پڑیں۔"

"اچھا بھئی جیسے چاہو رکھو مجھے کیا کرنا ہے۔"

"کیوں للو کو اپنے ساتھ اس چھوٹے سے گھر میں نہ رکھوگی؟"

"جس کا لڑکا ہے وہ چاہے جس طرح رکھے، میں کون ہوتی ہوں۔"

"اگر بھیّا کے سامنے تم اس طرح رہتیں تو وہ تمھارے قدموں کا بوسہ لیتے۔"

سکھدا نے متکبرانہ لہجے میں کہا۔"میں تو جو اُس وقت تھی وہی اب بھی ہوں۔ جب دادا جی سے بگڑکر انھوں نے الگ مکان لیا تھا تو کیا میں نے ان کا ساتھ نہ دیا۔ وہ مجھے نفاست پسند اور شوقین سمجھتے تھے۔ لیکن میں کبھی نفاست کی لونڈی نہیں رہی۔ ہاں میں دادا جی کو ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مجھ میں یہی عیب تھا۔ میں اب بھی رہوں گی تو ان کی مرضی سے۔ تم دیکھ لینا میں اس طرح یہ ذکر چھیڑوں گی کہ وہ ذرا بھی اعتراض نہ کریں گے۔ چلو ذرا ڈاکٹر شانتی کمار کو دیکھ آئیں مجھے تو ادھر اُدھر جانے کی فرصت ہی نہ ملی۔"

نینا ایک بار روز شانتی کمار کو دیکھ آتی تھی۔ ہاں سکھدا سے کچھ نہ کہتی۔ ڈاکٹر صاحب اب اُٹھنے بیٹھنے لگے تھے۔ پر اب بھی اتنے کمزور تھے کہ لاٹھی کے سہارے بغیر ایک قدم بھی نہ چل سکتے تھے۔ چوٹیں انھوں نے کھائیں۔ چھے مہینے سے اسپتال میں پڑے ہوئے تھے اور نام ہوا سکھدا کا۔ یہ صدمہ انھیں اور گھُلائے ڈالتا تھا۔ اگرچہ انھوں نے اپنے مخلص دوستوں سے بھی کبھی اپنا دردِ دل نہیں کہا، مگر یہ کانٹا کھٹکتا ضرور تھا۔ اگر سکھدا عورت نہ ہوتی اور وہ بھی اپنے عزیز شاگرد اور دوست کی بیوی تو شاید وہ شہر چھوڑکر بھاگ جاتے۔ سب سے بڑا ستم یہ تھا کہ ان چھے مہینوں میں سکھدا دوتین بار سے زیادہ انھیں دیکھنے نہ گئی تھی وہ بھی امرکانت کے دوست تھے اور اس اعتبار سے سکھدا کو ان سے کوئی خاص اُنس نہ تھا۔

نینا کو سکھدا کے ساتھ جانے میں کوئی عذر نہ ہوا۔ راما دیوی نے کچھ دنوں سے کار رکھ لی تھی، پر وہ رہتی تھی سکھدا ہی کی سواری میں۔ دونوں بیٹھ کر چلیں، نینا نے للّو کو بھی لے لیا۔

سکھدا نے کچھ دور جانے کے بعد کہا۔"یہ سب امیروں کے چونچلے ہیں۔ میں چاہوں تو دو تین آنے میں گزر کرسکتی ہوں۔"

نینا نے تمسخر کے انداز سے کہا۔ "پہلے کر کے دکھا دو تو مجھے یقین آئے میں تو نہیں کر سکتی۔"

"جب تک اس گھر میں رہوں گی میں بھی نہ کر سکوں گی۔ اس لیے تو میں الگ رہنا چاہتی ہوں۔"

"لیکن ساتھ تو کسی کو رکھنا ہی پڑے گا؟"

"میں کوئی ضرورت نہیں سمجھتی۔ اس شہر میں ہزاروں عورتیں تنہا رہتی ہیں پھر مجھ میں کیا سرخاب کے پر لگے ہیں۔ میں خود اپنی حفاظت کر سکتی ہوں (مسکرا کر) ہاں خود کسی پر مرنے لگوں تو دوسری بات ہے۔"

شانتی کمار سر سے پاؤں تک کمبل لپیٹے انگیٹھی جلائے کُرسی پر بیٹھے حفظِ صحت کی ایک کتاب پڑھ رہے تھے۔ کیسے جلد سے جلد اچھے ہو جائیں۔ آج کل انھیں یہی فکر رہتی تھی۔ دونوں دیویوں کے آنے کی خبر پاتے ہی کتاب رکھ دی اور کمبل اُتار پھینکا۔ انگیٹھی بھی ہٹانا چاہتے تھے پر اس کا موقع نہ ملا۔ دونوں جوں ہی کمرے میں آئیں ان کی تعظیم کی اور کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولے۔ "مجھے آپ لوگوں پر رشک ہو رہا ہے۔ آپ اس ٹھنڈ میں گھوم پھر رہی ہیں اور میں انگیٹھی جلائے پڑا ہوا ہوں۔ کروں کیا اُٹھا ہی نہیں جاتا۔ زندگی کے چھے مہینے گویا کم ہوگئے بلکہ آدھی عمر کہیے۔ میں اب اچھا ہو کر بھی آدھا ہی رہوں گا۔ کتنی شرم آتی ہے کہ دیویاں باہر نکل کر کام کریں اور میں کمرے میں بند پڑا رہوں۔"

سکھدا نے جیسے ان کے آنسو پوچھتے ہوئے کہا۔ "آپ نے اس شہر میں بیداری پھیلائی۔ اس حساب سے تو آپ کی عمر چوگنی ہوگئی مجھے تو بیٹھے بٹھائے جشن مل گیا۔"

شانتی کمار کے زرد چہرے پر روحانی مسرّت کی سُرخی دوڑ گئی۔ سکھدا کی زبان سے یہ سند پاکر گویا انھیں کونین کی دولت مل گئی بولے۔ "یہ آپ کی فیاضی ہے، آپ نے جو کچھ کر دکھایا اور کر رہی ہیں وہ آپ ہی کا حصّہ ہے۔ امرکانت آئیں گے تو انھیں معلوم ہوگا کہ اُن کی یہاں ضرورت نہیں ہے یہاں سال بھر میں جو کچھ ہوگیا اس کا شاید انھیں گمان بھی نہ ہوگا۔ یہاں سیوا آشرم میں لڑکوں کی تعداد بڑی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ اگر یہی کیفیت رہی تو کوئی دوسری عمارت تلاش کرنی پڑے گی۔ مدرس کہاں سے آئیں گے؟

یہ مسئلہ ہے۔ مہذب طبقے کی بے دِلی دیکھ کر مجھے تو کبھی کبھی بڑی فکر ہونے لگتی ہے۔ جسے دیکھیے خودپرستی میں ڈوبا ہوا ہے یورپ کی ڈیڑھ سو سال تک عبادت کرکے ہمیں یہ فیض حاصل ہوا ہے۔ لیکن یہ سب ہوتے ہوئے بھی ہمارا مستقبل بہت روشن ہے۔ مجھے اس میں مطلق شبہہ نہیں۔ ہندوستان کی روح ابھی زندہ ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ وقت جلد آنے والا ہے جب ہم خدمت اور ترک کے پُرانے معیار پر لوٹ آئیں گے۔ اس وقت کسبِ دولت ہماری زندگی کا تنہا مقصد نہ ہوگا۔ اس وقت ہماری پرکھ دولت کی کسوٹی پر نہ کی جائے گی۔"

للّو نے کرسی پر چڑھ کر میز پر سے داوات اُٹھا لی تھی اور اپنے چہرے پر سیاہی پوت کر خوش ہو رہا تھا۔ نینا نے دوڑکر اس کے ہاتھ سے داوات چھین لی اور ایک دھول جمائی۔ ڈاکٹرصاحب نے اُٹھنے کی ناکام کوشش کرکے کہا۔"کیوں مارتی ہو نینا، دیکھو تو کتنا درویش صفت آدمی ہے۔ جو اپنے منہ پر کالک پوت کر بھی خوش ہورہا ہے۔ نہیں تو ہم اپنے داغوں کو سات پردوں کے اندر چھپاتے ہیں۔"

نینا نے بچّے کو ان کی گود میں دیتے ہوئے کہا۔"تو لیجیے اس کو آپ ہی، اس کے مارے چین سے بیٹھنا مشکل ہے۔" شانتی کمار نے بچّے کو چھاتی سے لگا لیا۔ اس گرم اور گدگدے جسم میں ان کی روح نے جس لذت اور سکون کا احساس کیا وہ ان کی زندگی میں بالکل عجیب چیز تھی۔ امرکانت سے انھیں کتنی محبت تھی۔ امر کو یاد کرکے ان کی آنکھیں بھر آئیں۔ امر نے اپنے کو کتنی بے اندازہ مسرت سے محروم کر رکھا ہے۔ اس کا اندازہ کرکے جیسے وہ دب گئے۔ آج انھیں اپنی زندگی میں خود ایک خلا کا علم ہوا۔ جس کی آرزوؤں کو وہ اپنی زندگی میں بالکل دبا چکے تھے۔ وہ راکھ میں چھپی ہوئی چنگاریوں کی طرح روشن ہوگئیں۔

بچّے نے ہاتھ کی سیاہی شانتی کمار کے چہرے پر پوت کر نیچے اترنے کے لیے ضد کی۔ گویا یہی پاک فرض ادا کرنے کے لیے وہ ان کی گود میں گیا تھا۔ نینا نے ہنس کر کہا۔"ذرا اپنا منہ تو دیکھیے ڈاکٹر صاحب۔ اس درویش صفت آدمی نے آپ کے ساتھ ہولی کھیل ڈالی۔ بڑا بدمعاش ہے۔"

سکھدا بھی ہنسی نہ روک سکی، شانتی کمار نے شیشے میں اپنا منہ دیکھا تو وہ بھی زور

سے ہنسے۔ یہ کلنک کا ٹیکہ اس وقت انھیں نیک نامی کے تلک سے بھی کہیں زیادہ دل فریب معلوم ہوا۔

یکایک سکھدا نے پوچھا۔ ''آپ نے شادی کیوں نہیں کی ڈاکٹر صاحب؟''

شانتی کمار نے خدمت اور فرض کی جس بنیاد پر اپنی زندگی کی عمارت کھڑی کی تھی وہ اس معذوری کے دنوں میں کچھ نیچے کھسکتی ہوئی معلوم ہوتی تھی جسے انھوں نے زندگی کی بنیادی حقیقت سمجھا تھا۔ وہ اب اتنی مستحکم نہ رہی تھی۔ اس دوران میں ایسے کتنے ہی واقعے آئے۔ جب انھیں اپنی زندگی بار سی معلوم ہوئی۔ تیمارداروں کی کمی نہ تھی۔ آٹھوں پہر دو چار آدمی گھیرے رہتے تھے۔ شہر کے بڑے بڑے لیڈروں کی آمد و رفت ہوتی رہتی تھی۔ مگر شانتی کمار کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ دوسروں کے رحم یا شفقت پر بوجھ ہو رہے ہیں۔ ان عبادتوں میں وہ انسانیت اور وہ خلوص نہ تھا جس سے باطن کی تشفی ہوتی۔ سائل کو کیا حق ہے کہ وہ کسی کی خیرات کو حقیر سمجھے۔ زکوٰۃ میں اسے جو کچھ مل جائے وہ اسے قبول کرنا پڑے گا۔ ان دنوں کتنی ہی بار انھیں اپنی ماں کی یاد آئی تھی۔ وہ محبت اب کہاں میسّر ہو سکتی ہے؟ نینا جو ایک لمحے کے لیے ان کی خیر و عافیت پوچھنے آجاتی تھی اس سے نہ جانے انھیں کیوں ایک طرح کی تقویت ہوتی تھی۔ وہ جب تک رہتی، نہ جانے ان کا درد کہاں چھپ جاتا تھا۔ اس کے جاتے ہی پھر وہی کراہنا وہی بے چینی۔ انھیں ایسا خیال ہونے لگا تھا کہ شاید یہ نینا کی بے غرض خدمت تھی جس نے انھیں موت کے منہ سے نکال لیا۔

☆

سکھدا کا یہ سوال سُن کر مسکراتے ہوئے بولے۔ ''اسی لیے کہ شادی کر کے کسی کو سکھی نہیں دیکھا۔''

سکھدا نے سمجھا یہ مجھ پر چوٹ ہے، بولی۔ ''قصور بھی ہمیشہ عورتوں ہی کا دیکھا ہوگا کیوں؟''

شانتی کمار نے جیسے اپنا سر پتھر سے بچایا۔ ''یہ تو میں نے نہیں کہا۔ شاید معاملہ اس کے برعکس ہو۔ شاید کیوں بلکہ واقعہ ہے۔''

''خیر اتنا تو آپ نے تسلیم کیا، شکریہ۔ اس سے تو یہی ثابت ہوا کہ مرد چاہے تو

شادی کر کے سکھی ہو سکتا ہے۔"

ڈاکٹر صاحب نے کہا۔"لیکن مرد میں تھوڑی سی حیوانیت ہوتی ہے۔ جس پر وہ کوشش کر کے بھی غالب نہیں آسکتا۔ یہی حیوانیت اسے مرد بناتی ہے۔ ارتقا کے عمل میں وہ عورت سے بہت پیچھے ہے۔ جس دن اس کا ارتقائی سفر پورا ہوجائے گا غالبًا وہ بھی عورت ہوجائے گا۔ ہمدردی، رحم، قربانی اور خدمت ان ہی بنیادوں پر دنیا کا نظام قائم ہے اور یہی سب نسوانی اوصاف ہیں۔ اگر عورت اتنا سمجھ لے تو پھر دونوں کی زندگی سکھی ہوجائے۔ جب عورت حیوان کے ساتھ حیوان ہوجاتی ہے۔ جب ہی دونوں دُکھی ہوتے ہیں۔"

سکھدا نے تمسخر کے انداز سے کہا۔"اس وقت تو آپ نے بہت بڑی ایجاد کرڈالی۔ میں تو ہمیشہ سنتی آئی ہوں کہ عورت کم عقل ہے، سرزنش کے قابل ہے۔ گردن زدنی ہے۔ مردوں کے گلے کا بوجھ ہے۔ اور نہ جانے کیا کیا۔ بڑے بڑے عقل مندوں اور شاعروں نے عورتوں کی تحقیر میں اپنی عقل مندی کا خاتمہ کردیا ہے۔ اِدھر سے مردوں کی جیت اُدھر سے بھی مردوں کی جیت۔ اگر مرد نیچا ہے تو اسے عورتوں کی حکومت کیوں بُری لگے۔ امتحان تو کیا ہوتا۔ آپ تو دور ہی سے ڈر گئے۔"

شانتی کمار نے کچھ جھینپتے ہوئے کہا۔"اب اگر چاہوں بھی تو بوڑھوں کو کون پوچھتا ہے۔"

"اچھا تو آپ بوڑھے بھی ہوگئے۔ تو کسی اپنی جیسی بُڑھیا سے کرلیجیے۔"

"جب تم جیسی روشن خیال اور امر جیسے متحمل مزاج میاں بیوی میں نہ بنی تو مجھے خود امتحان کرنے کی کوئی ضرورت نہ رہی۔ امر کا سا تحمل اور ایثار مجھ میں نہیں ہے اور تم جیسی پاکیزہ صفت اور ...."

سکھدا نے بات کاٹی۔"مجھ میں یہ اوصاف نہیں ہیں۔ ہاں اپنا فرض سمجھتی ہوں۔ آپ مجھ سے بڑے ہیں اور مجھ سے کہیں عقل مند ہیں۔ آپ کو میں اپنا بڑا بھائی سمجھتی ہوں۔ آج آپ کی شرافت اور اخلاق دیکھ کر مجھے بڑی مسرت ہوئی۔ میں آپ سے بے شرم ہوکر پوچھتی ہوں کہ ایسے مرد کو جو عورت کی جانب اپنے فرض نہ سمجھے کیا حق ہے کہ وہ عورت سے عصمت دری کی امید رکھے۔ آپ حق پرور ہیں۔ میں آپ سے پوچھتی

ہوں کہ اگر میں اس سلوک کا بدلہ اسی سلوک سے دوں تو آپ مجھے قابلِ معافی سمجھیں گے؟"

شانتی کمار نے بے باک ہو کر کہا۔ "نہیں۔"

"انھیں آپ نے معاف کر دیا۔"

"نہیں۔"

"اور یہ سمجھ کر بھی آپ نے ان سے کچھ نہیں کہا؟ کبھی ایک خط بھی نہیں لکھا۔ میں پوچھتی ہوں کہ اس بے حسی کا کیا سبب ہے۔ یہی کہ اس موقع پر ایک عورت کی توہین ہوئی ہے۔ اگر یہی حرکت مجھ سے سرزد ہوتی تو کیا تب بھی آپ اتنے ہی بے حس رہ سکتے، بولیے؟"

شانتی کمار رو پڑے۔ نسوانی دل کا درد آج اس انحراف کی صورت میں ظاہر ہو کر کتنا جگر خراش ہو گیا تھا!

سکھدا اسی لہجے میں بولی۔ "کہتے ہیں انسان کی پہچان اس کی صحبت سے ہوتی ہے۔ جس کی صحبت آپ اور محمد سلیم اور سوامی آتمانند جیسے شریفوں کی ہو وہ اپنے فرائض کو اتنا بھول جائے، یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ میں یہ نہیں کہتی کہ میں بے قصور ہوں۔ کوئی عورت یہ دعوا نہیں کر سکتی۔ نہ کوئی مرد ہی یہ دعوا کر سکتا ہے۔ میں نے سکینہ سے ملاقات کی ہے ممکن ہے اس میں وہ اوصاف ہوں جو مجھ میں نہیں ہیں۔ وہ زیادہ بامروّت ہے۔ زیادہ شیریں سخن ہے۔ ممکن ہے مجھ سے زیادہ مہرپرور بھی ہو۔ لیکن اگر اسی طرح سب مرد اور عورتیں موازنہ کرنے بیٹھ جائیں تو دنیا کی کیا حالت ہو گی۔ پھر تو یہاں خون اور آنسوؤں کی ندی کے سوا اور کچھ نظر نہ آئے گا۔"

شانتی کمار نے ہار مان کر کہا۔ "میں اپنی غلطی کو مانتا ہوں سکھدا دیوی۔ میں تمھیں نہ جانتا تھا اور شاید میرا یہ گمان تھا کہ تمھاری زیادتی ہے۔ میں آج ہی امر کو خط ...."

سکھدا نے پھر بات کاٹی۔ "نہیں میں آپ سے یہ تحریک کرانے نہیں آئی اور نہ یہ چاہتی ہوں کہ آپ ان سے میری طرف سے رحم کی بھیک مانگیں۔ اگر وہ مجھ سے دور بھاگنا چاہتے ہیں تو میں بھی ان کو باندھ کر نہیں رکھنا چاہتی۔ مرد کو جو آزادی ملی ہے وہ اسے مبارک رہے۔ وہ اپنا تن من گلی گلی بیچتا پھرے۔ میں اپنی پابندیوں سے خوش ہوں اور

ایشور سے یہی دعا کرتی ہوں کہ وہ مجھے اس قید میں ڈالے رکھے۔ میں جلن یا حسد سے اپنے کو بھول جاؤں اس دن سے پہلے وہ میرا خاتمہ کردے۔ مجھے آپ سے مل کر آج جو تشفی ہوئی اس کا ثبوت یہی ہے کہ میں آپ سے وہ باتیں کہہ گئی جو اپنی ماں سے بھی نہیں کہیں۔ بی بی آپ کی جتنی تعریف کرتی تھیں اس سے زیادہ شرافت آپ میں پائی۔ مگر میں آپ کو تنہا نہ رہنے دوں گی۔ ایشور وہ دن لائے کہ میں اس گھر میں بھابی کے درشن کروں۔''

جب دونوں دیویاں یہاں سے چلیں تو ڈاکٹر صاحب لاٹھی ٹیکتے ہوئے انھیں پھاٹک تک پہنچانے آئے اور پھر کمرے میں جاکر لیٹے تو ایسا معلوم ہوا کہ ان کی پوری زندگی روشن ہوگئی ہے۔ سکھدا کے درد میں ڈوبے ہوئے الفاظ کانوں میں گونج رہے تھے اور نینا للو کو گود میں لیے گویا ان کے سامنے کھڑی تھی۔

(۷)

اسی رات کو ڈاکٹر شانتی کمار نے امرکانت کے نام خط لکھا۔ وہ ان آدمیوں میں تھے جن کو ہر کام کے لیے تو وقت ملتا ہے خط لکھنے کے لیے نہیں ملتا۔ جتنی ہی زیادہ بے تکلفی اتنی ہی بے فکری۔ ان کی دوستی خطوں سے کہیں گہری ہوتی ہے۔ شانتی کمار کو امر کے حالات سلیم سے معلوم ہوتے رہتے تھے۔ خط لکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ سکینہ سے اس امر کا جو تعلق ہوا اس کی ذمے داری انھوں نے سکھدا پر رکھی تھی۔ مگر آج سکھدا سے ملاقات ہونے پر انھوں نے تصویر کا دوسرا رُخ بھی دیکھا۔ جس نے سکھدا کو اس ذمّے داری سے آزاد کردیا۔ خط جو لکھا وہ اتنا لمبا چوڑا کہ سال بھر کی کسر نکل گئی۔ امرکانت کے جانے کے بعد شہر میں جو کچھ ہوا اس کی مفصل کیفیت بیان کی اور اپنے مستقبل کے بارے میں ان کی صلاح پوچھی۔ ابھی تک انھوں نے ملازمت سے استعفاء نہیں دیا تھا۔ مگر اس تحریک کے بعد سے انھیں یہ پابندی بارخاطر ہو رہی تھی۔ ان کے دل میں باربار یہ سوال پیدا ہوتا کہ جب تم غریبوں کے وکیل بنتے ہو تو تمھیں کیا حق ہے کہ سرکار سے ایک بیش قرار رقم ماہوار وصول کرو۔ اگر تم غریبوں کی طرح نہیں رہ سکتے تو غریبوں کی وکالت کرنا چھوڑ دو۔ جیسے اور لوگ آرام کرتے ہیں ویسے تم بھی عیش کی زندگی بسر کرو۔ لیکن سوال یہ تھا گزر کیسے ہو کسی دیہات میں جاکر کھیتی کریں یا کیا۔ یوں روٹیاں بغیر کام کیے

بھی چل سکتی تھیں۔ کیونکہ سیوا آشرم کو کافی چندا ملتا تھا۔ لیکن چندہ خوری کے خیال ہی سے ان کی خودداری کو چوٹ لگتی تھی۔

خط لکھے چار دن ہوگئے کوئی جواب نہیں۔ اب ڈاکٹر صاحب کے سر پر ایک بوجھ سا سوار ہوگیا۔ دن بھر ڈاکیے کی راہ دیکھا کرتے امر کسی دوسری جگہ تو نہیں چلا گیا۔ سلیم نے پتہ تو غلط نہیں بتا دیا۔ ہردوار سے تیسرے دن جواب آنا چاہیے تھا۔ اس کے عوض آٹھ دن ہوگئے۔ کتنی تاکید کی تھی فوراً جواب لکھنا۔ کہیں بیمار تو نہیں ہوگیا۔ دوبارہ پورا خط لکھنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ پورے دس ورق کون لکھے۔ وہ خط بھی کوئی ایسا ویسا خط نہ تھا شہر کی سال بھر کی تاریخ تھی۔ ویسا خط لکھنا مشکل تھا۔ پورے تین گھنٹے لگے تھے۔ ادھر آٹھ دن سے سلیم بھی نہیں آیا۔ وہ تو ایک دوسری دنیا میں ہے۔ آئی، سی، ایس کی دُھن سوار ہے۔ یہاں کیوں آنے لگا۔ مجھے دیکھ کر شاید آنکھیں چُرانے لگے۔ خودغرضی بھی خدا نے کیا چیز پیدا کی ہے۔ کہاں تو نوکری کے نام سے نفرت تھی۔ نوجوان سبھا کے بھی ممبر، کانگریس کے بھی ممبر۔ جہاں دیکھیے موجود۔ اور معمولی ممبر نہیں۔ بڑے سرگرم کام کرنے والے۔ کہاں اب آئی، سی، ایس کی پڑی ہوئی ہے۔ بچّہ پاس تو کیا ہوں گے، وہاں دھوکا دھڑی نہیں چلنے کی، مگر نامزد تو ہو ہی جائیں گے۔ حافظ جی پورا زور لگائیں گے۔ کبھی تو پاس نہیں ہوا۔ کہیں پرچے اُڑائے، کہیں نقل کی، کہیں رشوت دی۔ پکا شہدہ ہے۔ اور ایسے لوگ آئی، سی، ایس ہوں گے۔

دفعتاً سلیم کی موٹر آئی۔ اور سلیم نے ہاتھ ملا کر کہا۔"اب تو آپ اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ چلنے پھرنے میں تکلیف تو نہیں ہوتی؟"

شانتی کمار نے شکوے کے انداز سے کہا۔"مجھے تکلیف ہوتی ہے یا نہیں ہوتی تمھاری بلا سے۔ مہینہ بھر کے بعد آج تمھاری صورت نظر آئی۔ تمھیں کیا فکر کہ میں مرا یا جیتا ہوں۔ مصیبت میں کون ساتھ دیتا ہے۔ تم نے کوئی نئی بات نہیں کی۔"

سلیم نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔"نہیں ڈاکٹر صاحب آج کل امتحان کے جھنجھٹ میں پڑا ہوا ہوں، ورنہ ضرور حاضر ہوتا۔ خدا جانتا ہے نوکری سے میری روح کانپتی ہے لیکن کروں کیا ابا جان ہاتھ دھو کر پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں میں ایک سیدھا سا جملہ ٹھیک نہیں لکھ سکتا۔ مگر لیاقت کون دیکھتا ہے یہاں تو سند دیکھی جاتی ہے۔

جو افسروں کا رُخ دیکھ کر کام کرسکتا ہے اس کے لائق ہونے میں شبہہ نہیں۔ آج کل یہی فن سیکھ رہا ہوں۔"

شانتی کمار نے مسکرا کر کہا۔"مبارک ہو، لیکن آئی، سی، ایس کی سند آسان نہیں ہے۔"

سلیم نے کچھ اِس انداز سے کہا جس سے ٹپک رہا تھا آپ یہ باتیں کیا جانیں۔"جی ہاں لیکن سلیم بھی اس فن میں اُستاد ہے۔ بی ۔اے تک تو بچّوں کا کھیل تھا۔ آئی، سی، ایس میں ہی میرے کمال کا امتحان ہوگا سب سے نیچے میرا نام نہ نکلے تو منہ نہ دکھاؤں۔ چاہوں تو سب سے اوپر بھی آسکتا ہوں۔ مگر فائدہ کیا، روپے تو برابر ہی ملیں گے۔"

شانتی کمار نے زور سے قہقہہ مارا اور بولے۔"ڈینگ مارنا کوئی تم سے سیکھ لے۔ لیکن اتنا تو معلوم ہو ہی گیا کہ تم بھی غریبوں کا خون چوسنے پر آمادہ ہوگئے۔"

سلیم نے بے حیائی کے ساتھ کہا۔"غریبوں کے خون سے تو اپنی پرورش ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب، جس دن سے پڑھنے بیٹھے اسی دن سے مفت خوری کی دُھن سمائی۔ لیکن آپ سے سچ کہتا ہوں کہ میرا میلان اس طرف نہیں ہے۔ کچھ دنوں ملازمت کرنے کے بعد میں بھی دیہات میں جا بسوں گا۔ گائے بھینسیں پالوں گا۔ کچھ پھل وِل پیدا کروں گا اور پسینے کی کمائی کھاؤں گا۔ ابھی تو کچھ دنوں کھٹملوں کی طرح دوسروں کے خون ہی پر بسر ہوگی۔ لیکن اتنا ضرور عرض کروں گا کہ میں کتنا ہی گرجاؤں میری ہمدردی غریبوں کے ساتھ ہی رہے گی۔ میں دکھا دوں گا کہ افسری کرکے بھی رعایا کی خدمت کی جاسکتی ہے۔ ہمارا آبائی پیشہ زراعت ہے۔ ابا جان نے اپنی قوتِ بازو سے یہ ثروت پیدا کی۔ مجھے رعایا سے جتنی محبت ہوسکتی ہے اتنی ان لوگوں کو نہیں ہوسکتی جو خاندانی رئیس ہیں۔ میں تو کبھی دیہاتوں میں جاتا ہوں تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ میرے اپنے ہیں۔ ان کی سادگی اور مشقت دیکھ کر دل میں ان کی عزّت ہوتی ہے، نہ جانے کیسے لوگ ان پر ظلم کرتے ہیں۔ میرا بس چلے تو بدمعاش افسروں کو کالے پانی بھیج دوں۔"

شانتی کمار نے تحسین کی نگاہ سے سلیم کو دیکھا۔ افسری کا زہر ابھی اس کے خون میں نہیں پہنچا۔ اس کا دل ابھی تک صحیح و سالم ہے، بولے۔"جب تک رعایا کے ہاتھ میں اختیار نہ ہوگا افسروں کی یہی حالت رہے گی۔ تمھاری زبان سے یہ الفاظ سُن کر مجھے سچّی خوشی ہو

رہی ہے۔ مجھے گو ان میں ایک بھی بھلا آدمی نظر نہیں آتا۔ مگر اپنا کوئی اختیار نہیں۔ اسی خیال سے دل کو تسکین دینی پڑتی ہے کہ جب خدا کی مرضی ہوگی تو ویسے سامان خود بخود ہوجائیں گے۔ انقلاب کی ضرورت ہے، کامل انقلاب کی۔ یہ شعلے دوچار گھڑے پانی سے نہ بجھیں گے۔ اس لیے جلے، جتنا بھی چاہے۔ سب کچھ خاکستر ہوجائے۔ جب کچھ جلنے کو باقی نہ رہے گا تو خود بخود آگ ٹھنڈی ہوجائے گی۔ تب تک ہم بھی ہاتھ سینکتے ہیں، کچھ امر کی بھی خبر ہے؟ میں نے ایک خط بھیجا تھا کوئی جواب نہیں آیا۔"

سلیم نے چونک کر جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک خط نکالتا ہوا بولا۔"لاحول و لاقوۃ، اس خط کی یاد ہی نہ رہی۔ چار دن سے جیب میں پڑا ہوا ہے روز سوچتا تھا بھیج دوں اور بھول جاتا تھا۔"

شانتی کمار نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر خط لے لیا اور میٹھے غصّے کے دو چار الفاظ کہہ کر خط پڑھنے لگے۔

"بھائی صاحب میں زندہ ہوں اور آپ کا مشن حتی الامکان پورا کر رہا ہوں۔ وہاں کے حالات کچھ تو نینا کے خطوں سے ملتے ہی رہتے ہیں۔ لیکن آپ کا خط پڑھ کر تو میں حیرت میں آگیا ان تھوڑے سے دنوں میں تو وہاں انقلاب سا ہوگیا۔ میں تو اس ساری بیداری کا فخر آپ کو دیتا ہوں۔ اور سکھدا تو اب میرے لیے پرستش کی چیز ہوگئی ہے۔ میں نے اسے سمجھنے میں کتنی افسوسناک غلطی کی۔ یہ خیال کرکے میں بے چین ہوجاتا ہوں۔ میں نے اسے کیا سمجھا تھا اور وہ کیا نکلی۔ میں اپنے سارے فلسفے اور ادراک اور نفس کشی سے وہ کچھ نہ کرسکا جو اس نے ایک لمحے میں کر دکھایا۔ کبھی غرور سے سر اُٹھا لیتا ہوں۔ کبھی شرم سے سر جھکا لیتا ہوں۔ ہم اپنے قریب ترین عزیزوں سے کتنے نا آشنا رہتے ہیں اس کا احساس مجھے رُلا دیتا ہے۔ کیا میں خواب میں بھی یہ سوچ سکتا تھا کہ نفس پرور سکھدا کی زندگی اتنی پاکیزہ ہوجائے گی۔ مجھے اس کم نظری نے کہیں کا نہ رکھا۔ جی میں آتا ہے کہ آکر سکھدا سے اپنی خطائیں معاف کراؤں۔ لیکن کیا منہ لے کر آؤں۔ میرے سامنے اندھیرا ہے۔ کچھ نہیں سوجھتا۔ مجھے اپنے اوپر بالکل اعتماد نہیں رہا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کوئی غیبی طاقت مجھے کھلا کھلا کر کچل ڈالنا چاہتی ہے۔ میں مچھلی کی طرح کانٹے میں پھنسا ہوا ہوں۔ کانٹا میرے حلق میں چبھ گیا ہے۔ کوئی ہاتھ مجھے کھینچ لیتا ہے کھنچا چلا جاتا ہوں۔ پھر ڈور

ڈھیلی ہو جاتی ہے اور میں بھاگتا ہوں۔ اب معلوم ہوا کہ انسان مشیت کے ہاتھ کا ایک کھلونا ہے۔ اس لیے اب اس کی کج ادائیوں کی شکایت نہ کروں گا۔ کہاں ہوں کچھ نہیں جانتا۔ کدھر جا رہا ہوں یہ بھی نہیں جانتا۔ عجب گو مگو کی سی کیفیت ہے۔ اب زندگی میں کوئی مستقبل نہیں ہے مستقبل پر اعتبار نہیں رہا۔ ارادے جھوٹے ثابت ہوئے۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں سکھدا مجھے نچا رہی ہے۔ اس ساحرہ کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنا ہوا ہوں۔ پہلے ایک روپ دکھا کر مجھے خائف کردیا۔ اور اب دوسرا روپ دکھا کر مجھے پست کر رہی ہے۔ اس کا اصلی روپ کیا ہے نہیں جانتا۔ سکینہ کا جو روپ دیکھا تھا وہ اس کا سچّا روپ تھا۔ اس کی خبر نہیں۔ میں خود اپنے ہی سے بے خبر ہوں۔

آپ نے اپنے بارے میں مجھ سے جو صلاح پوچھی ہے اس کا میں کیا جواب دوں۔ آپ مجھ سے کہیں زیادہ عقل مند ہیں۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ خدام کو قوم سے گزارا، صرف گزارا لینے کا اختیار ہے۔ اگر وہ اس غرض کو بھی مٹا سکیں تو اور بہتر۔"

شانتی کمار نے بے دلی کے ساتھ خط کو میز پر رکھ دیا۔ جس امر کے متعلق انھوں نے خاص طور پر اس کی رائے پوچھی تھی صرف دو لفظوں میں اُڑا گیا۔

یکایک انھوں نے سلیم سے پوچھا۔"تمھارے پاس بھی کوئی خط آیا ہے؟"

"جی ہاں اس کے ساتھ ہی آیا تھا۔"

"کچھ میرے بارے میں بھی لکھا تھا؟"

"کوئی خاص تو نہ تھی۔ صرف یہی تھا کہ ملک کو سچّے خادموں کی ضرورت ہے اور خدا جانے کیا کیا۔ میں نے خط تو آخر تک پڑھا بھی نہیں۔ اس قسم کی باتوں کو میں جنوں سمجھتا ہوں۔ مشنری ہونے کا مطلب تو میں یہی سمجھتا ہوں کہ ہماری زندگی خیرات پر بسر ہو۔"

ڈاکٹر صاحب نے متانت سے کہا۔"زندگی کا خیرات پر بسر ہونا اس سے کہیں اچھا ہے کہ وہ جبر پر بسر ہو، جسے تم حکومت کہتے ہو اور جس کی کشش تمھیں اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔ وہ دراصل تھوڑے خود پرور اور حکومت پسند آدمیوں کا نظام ہے جو انھوں نے عوام کو مرغوب کرنے کے لیے قائم کیا ہے۔"

سلیم نے جواب دیا۔"اس نظام کی ضرورت اس وقت تک رہے گی جب تک دنیا میں

فرشتے نہ آباد ہوجائیں۔ لیکن تعلیم کا صیغہ تو جبر کا صیغہ نہیں ہے۔ پھر آپ کیوں شش و پنج میں پڑے ہوئے ہیں۔ اور جب آپ اپنی آمدنی کا بڑا حصہ کارِ خیر میں صرف کرتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ دوسروں کی امداد پر زندگی بسر کریں۔"

یہ دلیل ڈاکٹر صاحب کے دل میں بیٹھ گئی۔ انھیں اپنے دل کے سمجھانے کا ایک حیلہ مِل گیا۔ بے شک صیغۂ تعلیم کا حکومت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جس وقت جبر اور جور کا خاتمہ ہوجائے گا اس وقت بھی تعلیم کی ضرورت باقی رہے گی۔ بلکہ اُس وقت اس کا دائرہ اور بھی وسیع ہوجائے گا۔ اس وقت اس سیوا آشرم کی بھی کیا ضرورت رہے گی۔ منظّم طریقے سے فرض اور معیار کو سامنے رکھ کر علم کی اشاعت کسی حال میں بھی قابلِ اعتراض نہیں ہوسکتی۔ مہینوں سے جو مسئلہ ڈاکٹر صاحب کو بے چین کر رہا تھا وہ آج حل ہوگیا۔

سلیم کو رخصت کرکے وہ لالہ سمرکانت کے گھر چلے۔ سکھدا کو امرکانت کا خط دکھا کر سُرخ رو بننا چاہتے تھے۔ جو مسئلہ ابھی وہ حل کرچکے تھے اس کی تائید بھی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ سمرکانت تو کچھ کُھل کر ان سے نہ ملے ہاں سکھدا نے خبر پاتے ہی انھیں بلا لیا۔ راما دیوی بھی آئی ہوئی تھیں۔

شانتی کمار نے جاتے ہی امرکانت کا خط نکال کر سکھدا کے سامنے رکھ دیا اور بولے۔"سلیم نے چار دن سے اپنی جیب میں ڈال رکھا تھا اور میں گھبرا رہا تھا کہ بات کیا ہے۔"

سکھدا نے خط کو اچٹتی ہوئی نظروں سے دیکھ کر کہا۔"تو میں اسے لے کر کیا کروں؟"

شانتی کمار نے تعجب سے کہا۔"ذرا ایک بار اسے پڑھ تو جایئے اس سے آپ کے دل کے بہت شکوک رفع ہوجائیں گے۔"

سکھدا نے بے اعتنائی سے جواب دیا۔"میرے دل میں کسی کی طرف سے کوئی شک نہیں ہے۔ اس خط میں جو کچھ لکھا ہے وہ بھی میں جانتی ہوں۔ میری خوب تعریفیں کی گئی ہوں گی مجھے تعریفوں کی ضرورت نہیں۔ میں نے جو کچھ کیا وہ ایک نشے کی حالت میں کیا۔ وہ محض ایک عارضی جنون تھا۔ اس کے لیے میں کسی تعریف کی مستحق نہیں ہوں۔"

"یہ آپ نے کیسے سمجھ لیا کہ اس میں آپ کی تعریف ہی ہے؟"

"ممکن ہے میرے آنسو بھی پونچھے ہوں۔"

"تو پھر آپ اور چاہتی کیا ہیں؟"

"اگر آپ اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے تو میرا کچھ کہنا ہی فضول ہے۔"

راما دیوی سکھدا کا ضمیر سمجھ کر بولی۔"جب وہ اب تک گھر لوٹ کر نہیں آئے تو کیسے معلوم ہو کہ وہ اپنے کیے پر نادم ہیں۔ اچھے کام کی تعریف تو سب ہی کرتے ہیں۔ انھوں نے خاص بات کیا کی۔ مرد عورت جب مسرت اور اطمینان کی زندگی بسر کریں جبھی تو معلوم ہو کہ انھیں محبت ہے۔ محبت کو چھوڑیے۔ وہ تو ایک نایاب چیز ہے، فرض کا نباہ تو کرنا ہی چاہیے۔ شوہر ہزار کوس پر بیٹھا ہوا عورت کے گُن گائے۔ عورت ہزار کوس پر بیٹھی ہوئی میاں کو سراہے اس سے کیا ہوتا ہے۔"

سکھدا جھنجھلا کر بولی۔"آپ تو اماں بے بات کی بات کرتی ہیں۔ زندگی میں راحت جب ہی میسر آتی ہے جب دل کا آدمی ملے۔ انھیں مجھ سے اچھی چیز مل گئی۔ وہ مجھ سے دور رہ کر بھی خوش ہیں۔ مجھے ان سے اچھا ابھی تک کوئی نہ ملا اور نہ اس زندگی میں ملے گا۔ یہ میری بدنصیبی ہے اس میں کسی کا قصور نہیں۔"

راما نے ڈاکٹر صاحب کی طرف دیکھ کر کہا۔"سُنا آپ نے ڈاکٹر صاحب! یہ مجھے روز اسی طرح جلایا کرتی ہے۔ کتنی بار کہا کہ چل ہم دونوں اسے وہاں سے پکڑ لائیں دیکھیں کیسے نہیں آتا۔ جوانی کی عمر میں تھوڑی بہت نادانی سب ہی کرتے ہیں۔ مگر یہ نہ خود میرے ساتھ چلتی ہے نہ مجھے جانے دیتی ہے۔ ایسا ایک دن بھی نہیں جاتا کہ بغیر روئے اس کے منہ میں نوالا جاتا ہو۔ مگر اپنی ضد نہیں چھوڑتی۔ تمھیں کیوں نہیں چلے جاتے بھیّا۔ تم اس کے اُستاد ہو۔ تمھارا ادب کرتا ہے۔ تمھارا کہنا وہ کسی طرح نہیں ٹال سکتا۔"

سکھدا مسکرا کر بولی۔"ہاں یہ تو تمھارے کہنے سے آج ہی چلے جائیں گے۔ یہ تو اور خوش ہوتے ہوں گے کہ ان کے شاگردوں میں ایک تو ایسا نکلا جو ان کے اصولوں کی پیروی کر رہا ہے۔ شادی کو یہ لوگ انسانیت کا کلنک سمجھتے ہیں۔ ان کے پنتھ میں پہلے تو کسی کو شادی کرنی ہی نہیں چاہیے اور اگر دل نہ مانے تو کسی کو رکھ لینا چاہیے۔ ان کے دوسرے شاگرد سلیم میاں سلیم ہیں۔ ان کے پہلے شاگرد تو نہ جانے کس دباؤ میں پڑکر شادی

کر بیٹھے۔ لیکن اب اس کا کفارہ ادا کر رہے ہیں۔"

شانتی کمار نے جھینپتے ہوئے کہا۔"دیوی جی آپ مجھ پر جھوٹا الزام لگا رہی ہیں۔ اپنے بارے میں مَیں نے ضرور یہ طے کر لیا ہے کہ بن بیاہا رہوں گا لیکن میں نے اپنے شاگردوں کو کبھی یہ صلاح نہیں دی۔ میرا ارادہ شروع ہی سے خدمت کو اپنا نصب العین بنانا رہا ہے۔"

سکھدا نے پوچھا۔"کیا شادی کرلینے کے بعد خدمت کی زندگی بسر کرنی غیر ممکن ہے، یا عورت اتنی خودغرض ہوتی ہے کہ وہ آپ کے کارِخیر میں دخل دیئے بغیر رہ نہیں سکتی؟ میرا تو خیال ہے کہ گرہستی میں آدمی جتنی خدمت کرسکتا ہے۔ اتنا تجرد کی زندگی میں کبھی نہیں کرسکتا۔"

شانتی کمار نے مباحثے سے بچنے کی کوشش کرکے کہا کہ"یہ بڑا پیچیدہ مسئلہ ہے دیوی جی اور طے نہیں ہوسکتا۔ اس پر پھر کبھی غور کریں گے۔ اس وقت مجھے آپ سے ایک معاملے میں صلاح لینی ہے۔ آپ کی ماتا جی موجود ہیں یہ اور بھی اچھا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں نوکری سے کیوں نہ استعفاء دے کر اپنی زندگی خدمت کے لیے وقف کردوں۔"

سکھدا نے اس انداز سے کہا۔ گویا یہ سوال بالکل غیرضروری ہے۔"اگر آپ سوچتے ہیں کہ آپ بغیر کسی کے سامنے ہاتھ پھیلائے اپنا نباہ کرسکتے ہیں تو آپ ضرور استعفاء دے دیجیے۔"

شانتی کمار نے جس دلیل سے اپنے دل کو سمجھایا تھا وہ یہاں پھر جواب دے گئی۔ پھر اسی ادھیڑ بُن میں پڑگئے۔

دفعتاً راما نے پوچھا۔"آپ کے آشرم میں کوئی مستقل فنڈ بھی ہے؟"

آشرم میں اب تک کوئی مستقل فنڈ نہ تھا۔ چندہ اتنا نہ ملتا تھا کہ کچھ بچت ہوسکتی۔ شانتی کمار نے اس بے مائیگی کو گویا اپنے اوپر الزام سمجھ کر کہا۔"جی نہیں ابھی تک تو کوئی مستقل سرمایہ نہیں ہوسکا۔"

راما نے پوچھا۔"کتنے روپے ہوں تو آپ کا آشرم چلنے لگے۔"

شانتی کمار نے سینے میں امید کی گدگدی محسوس کرتے ہوئے کہا۔"یہ نہ پوچھیے، آشرم تو یونیورسٹی بھی بن سکتا ہے۔ لیکن مجھے تین چار لاکھ روپے مل جائیں تو میں اتنا ہی

کام کر سکتا ہوں۔ جتنا یونیورسٹی میں بیس لاکھ روپے سے بھی نہیں ہوسکتا۔"

راما دیوی نے حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا۔"اگر آپ کوئی ٹرسٹ بناسکیں تو میں آپ کی کچھ مدد کرسکتی ہوں۔ میرے پاس زیادہ تو نہیں ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ آپ کی مالی پریشانیاں کچھ کم ہوجائیں۔"

شانتی کمار نے ڈرتے ڈرتے کہا۔"لیکن میں یہ تو نہیں چاہتا کہ آپ ان لوگوں کی حق تلفی کریں جو مجھے آشرم سے کہیں زیادہ عزیز ہیں۔ جب تک امرکانت اور سکھدا خود راضی نہ ہوجائیں.........."

سکھدا نے بات کاٹ کر کہا۔"میری طرف سے استعفا ہے اور للّو کے لیے دادا کا دھن کیا تھوڑا ہے۔ اوروں کو میں نہیں کہہ سکتی۔"

راما دیوی نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔"اوروں کو شاید اس سے بھی کم پروا ہو۔ دولت کوئی چراغ تو ہے نہیں جس سے روشنی پھیلتی رہے۔ جنھیں اس کی ضرورت نہیں ان کے گلے کیوں لگائی جائے۔ روپے کا بوجھ کچھ کم گراں نہیں ہوتا۔

"میں خود اسے نہیں سنبھال سکتی۔ اس کا بہترین استعمال یہی ہے کہ کسی کارِ خیر میں لگ جائے۔ لالہ سمرکانت کی تو صلاح ہے کہ مندر اور شوالہ بنے لیکن میری طبیعت ادھر مائل نہیں ہوتی۔ مندر تو یوں ہی اتنے ہورہے ہیں کہ پوجا کرنے والے نہیں ملتے۔ میں کئی دن سے اس معاملے کو سوچ رہی تھی اور آپ سے ملنے والی تھی۔ ابھی میں دو چار مہینے اور دُبدھے میں پڑی رہتی لیکن آج آپ کے آجانے پر میری دُبدھائیں مٹ گئیں۔

یہ کہتے ہوئے اس نے مسکراکر کہا۔"اندیشہ یہی ہے کہ کہیں مجھے دھوکا نہ ہو۔"

راما دیوی کے مسکرانے پر بھی شانتی کمار کو ان الفاظ سے صدمہ ہوا بولے۔"میری نیت کیا ہوگی یہ میں خود نہیں جانتا اور نہ آپ کو مجھ پر اتنا یقین کرلینے کا کوئی خاص سبب ہے۔"

سکھدا نے بات سنبھالی۔"یہ بات نہیں ڈاکٹر صاحب، اماں نے تو ہنسی کی تھی۔"

"تو میں نے کب بُرا مانا۔ میں تو خود چاہتا ہوں کہ ابھی دو چار سال میری آزمائش ہوتی رہے۔ ابھی میں اتنے بڑے اعتبار کے قابل نہیں ہوں۔"

راما دیوی نے ناچار ہوکر کہا۔"اچھا صاحب میں اپنا سوال واپس لیتی ہوں۔ آپ کل

میرے گھر آیئے گا۔ میں کار بھیج دوں گی۔ ٹرسٹ بننا پہلا کام ہے اور آپ پر مجھے پورا بھروسہ ہے۔"

ڈاکٹر صاحب نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ "میں آپ کے اعتبار کو قائم رکھنے کی کوشش کروں گا۔"

"چاہتی ہوں کہ جلدی ہی یہ کام کرڈالوں، پھر نینا کی شادی آپڑے گی تو مہینوں فرصت نہ ملے گی۔"

شانتی کمار نے جیسے سہم کر کہا۔"اچھا نینا دیوی کی شادی ہونے والی ہے یہ تو بڑی مبارک خبر ہے۔ میں کل ہی آپ سے مل کر ساری باتیں طے کرلوں گا۔ امرکانت کو بھی اطلاع دے دوں؟"

سکھدا نے بے اعتنائی سے کہا۔"نہیں کوئی ضرورت نہیں۔"

راما بولی۔"نہیں انھیں آپ ضرور اطلاع دے دیں۔ مجھے تو امید ہے وہ ضرور آئیں گے۔"

ڈاکٹر صاحب یہاں سے چلے تو نینا بچّے کو لیے موٹر سے اُتر رہی تھی۔

شانتی کمار نے دردناک لہجے میں پوچھا۔"تم اب چلی جاؤگی نینا؟"

نینا نے سر جھکا لیا مگر اس کی آنکھیں پرنم تھیں۔

(۸)

چھے مہینے گزر گئے۔

سیوا آشرم کا ٹرسٹ بن گیا۔ صرف سوامی آتمانند نے جو آشرم کے سرگرم کارکن اور جمہوریت کے فدائیوں میں سے تھے اس انتظام سے ناخوش ہوکر استعفا دے دیا۔ ان کی منشا تھی کہ اہلِ ثروت کو آشرم میں نہ گھسنے دیا جائے انھوں نے بہت زور مارا کہ ٹرسٹ نہ بننے پائے۔ ان کا خیال تھا کہ آشرم کی آزادی کو روپے کے لیے بیچنا آشرم کے لیے قاتل ہوگا۔ ثروت ہی نے تو دنیا میں اعلا اور ادنا کی تفریق پیدا کردی ہے۔ سرمایہ ہی تو دنیا میں ہر قسم کی غلامی کو قائم رکھے ہوئے ہے۔ اسی ثروت کے سامنے وہ کیوں گھٹنے ٹیکیں۔ لیکن سوامی جی کی ایک نہ چلی اور ٹرسٹ قائم ہوگیا۔ اس کا سنگِ بنیاد رکھا سکھدا نے، جلسہ ہوا، دعوت ہوئی، گانا بجانا ہوا۔ دوسرے دن شانتی کمار نے ملازمت سے استعفا دے دیا۔

سلیم کا امتحان بھی ختم ہوگیا اور اس نے جو پیشین گوئی کی تھی وہ حرف بحرف پوری ہوئی۔ گزٹ میں اس کا نام سب سے نیچے تھا۔ شانتی کمار نے دانتوں میں انگلی دبا لی۔ سلیم کو اب قاعدے کے مطابق دوسال کے لیے انگلینڈ جانا چاہیے تھا۔ مگر سلیم کے لیے انگلینڈ کالے پانی سے کم نہ تھا۔ دوچار مہینے کے لیے تفریحاً جانا ہو تو وہ شوق سے چلا جاتا۔ دوسال کی قید اس کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ مگر اس نے کچھ ایسی دوڑ دھوپ کی، کچھ ایسے ہتھکنڈے کھیلے کہ اس قاعدے سے مستثنٰی کردیا گیا۔ جب صوبے کا سب سے مشہور ڈاکٹر کہہ رہا ہے کہ انگلینڈ کی سرد آب و ہوا میں اس نوجوان کا دو سال تک رہنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ تو اس میں قیل و قال کی گنجائش کہاں تھی۔ حافظ حلیم لڑکے کو وہاں بھیجنے پر آمادہ تھے۔ لیکن اس کی صحت زائل ہوگئی تو اس کا ذمے دار کون ہوگا۔ وہ کس کا دامن پکڑیں گے۔ آخر یہاں بھی سلیم کی فتح ہوئی۔ اسے اسی حلقے کا چارج بھی ملا جہاں اس کا دوست امرکانت پہلے ہی سے موجود تھا۔ اس علاقے کو اس نے خود پسند کیا تھا۔

ادھر سلیم کی زندگی میں ایک بڑا تغیر ہوگیا تھا۔ ہنسوڑ تو اتنا ہی تھا۔ پر اتنا شوقین، اتنا رنگین مزاج نہ رہا، شاعری سے اب اُسے زیادہ شغف نہ تھا۔ شادی سے جو اسے پُرانی عداوت تھی وہ اب بالکل غائب ہوچکی تھی۔ یہ انقلاب کیسے ہوگیا ہم نہیں جانتے۔ لیکن ادھر وہ کئی بار سکینہ کے گھر گیا تھا۔ اور دونوں میں پوشیدہ طور پر خط و کتابت بھی ہو رہی تھی۔ امرکانت کی بے اعتنائی کے باوجود سکینہ اس کی یادِ ماضی کو کتنی یک سوئی سے دل میں پالے ہوئے تھی۔ اس نے سلیم کا کفر توڑ دیا تھا۔ اس ضیا سے وہ اپنی زندگی کو منور کرنے کے لیے بے قرار ہو رہا تھا۔ اپنی ماما کی زبانی سکینہ کی اس لازوال محبت کی داستان سُن سُن کر وہ اکثر رویا کرتا۔ اس کی شاعرانہ طبیعت جو بھونرے کی طرح نئے نئے پھولوں سے رس لیا کرتی تھی اب سرفروشانہ محبت سے پُر ہوکر اس کی زندگی میں ایک عالی نفسی کی تخلیق کر رہی تھی۔

نینا کی شادی بھی ہوگئی۔ لالہ دھنی رام شہر کے سب سے مالدار آدمی تھے۔ ان کا بڑا لڑکا منی رام بڑا ہونہار نوجوان تھا۔ سمرکانت کو تو اُمید نہ تھی کہ وہاں رشتہ ہوسکے گا۔ کیونکہ دھنی رام مندر والے دن کے وقوعے ہی سے اس خاندان کے مخالف ہوگئے تھے۔ لیکن بالآخر سمرکانت کی تھیلیوں نے فتح پائی۔ بڑی بڑی تیاریاں ہوئیں۔ دور دور سے مہمانوں

کی ٹولیاں آئیں۔ اور بڑی دھوم دھام سے شادی ہوئی۔ لیکن امرکانت نہ آیا اور نہ سمرکانت نے اسے بلایا۔ دھنی رام نے کہلا دیا تھا کہ اگر امرکانت شادی میں شریک ہوا تو برات دروازے سے لوٹ آئے گی۔ یہ بات امرکانت کے کانوں تک پہنچ گئی تھی۔ نینا نہ کچھ کہہ سکتی تھی نہ بول سکتی تھی۔ منی رام کے بارے میں طرح طرح کی روائتیں سنتی تھی۔ شرابی ہے، عیاش ہے، جاہل ہے، مغرور ہے، لیکن باپ کی مرضی کے سامنے سر جھکانا اس کا فرض تھا۔ اگر سمرکانت اسے کسی دیوتا کی قربان گاہ پر چڑھا دیتے تب بھی وہ زبان نہ کھولتی۔ صرف رخصتی کے موقعے پر روئی۔ لیکن اس وقت بھی یہ دھیان رہا کہ دادا کو رنج نہ ہو۔ سمرکانت کی نظروں میں دولت ہی سب سے بیش قیمت جنس تھی۔ نینا کو زندگی کا کیا تجربہ تھا۔ ایسے معاملے میں باپ کا فیصلہ ہی اس کے لیے ناطق تھا۔ اس کے دل میں شبہے آتے تھے لیکن اس نے اپنا جو کچھ فرض سمجھ رکھا تھا اس کی پابندی میں اس کی جان بھی چلی جائے تو اُسے غم نہ ہوگا۔

ادھر سکھدا اور شانتی کمار دونوں روز بروز ہم رنگ ہوتے جاتے تھے۔ دولت کی کمی تو تھی ہی نہیں۔ ہر ایک محلے میں سیوا آشرم کی شاخیں کھل رہی تھیں۔ اور ترک منشیات کی تحریک بھی زوروں سے جاری تھی۔ سکھدا کی زندگی میں ایک فقیرانہ زہد کی سی کیفیت پیدا ہوتی جاتی تھی، وہ اب علی الصبح سندھیا کرتی۔ غذا میں بھی سادگی کا خیال رہتا۔ ضبط اور عمل ہی اب اس کی مصروفیت کے رکن تھے۔ ناولوں کے مقابلے میں اب تاریخ اور فلسفے سے زیادہ مناسبت ہوگئی تھی۔ اور اس کی قوتِ تقریر تو اتنی بڑھ گئی تھی کہ سننے والوں کو تعجب ہوتا تھا اور اس کی تقریر میں کچھ ایسی تاثیر ہوتی کہ اس کے معتقدین کا دائرہ روزبروز وسیع ہوتا جاتا تھا۔ ان اصلاحی تجاویز میں ایک امر کا اضافہ ہوگیا تھا۔ وہ تھا غریبوں کے مکان کا مسئلہ۔ اب اسے یہ تجربہ ہو رہا تھا کہ جب تک عوام کے مکانوں کا مسئلہ طے نہ ہوگا اصلاح کی کوشش بار آور نہیں ہوسکتی۔ اور یہ کام چندے سے نہ ہوسکتا تھا۔ اسے تو میونسپلٹی ہی ہاتھ میں لے سکتی تھی۔ مگر یہ محکمہ اتنی کثیر المصارف تجویز کو ہاتھ میں لیتے ہوئے گھبراتا تھا۔

حافظ حلیم صدر تھے، لالہ دھنی رام نائب صدر۔ ایسے رجعت پسند اصحاب کے دماغ میں اس مسئلے کی اہمیت اور ضرورت کو داخل کردینا مشکل تھا۔ دوچار ایسے اصحاب تو نکل

آئے تھے جو زمین مل جانے پر دوچار لاکھ روپے لگانے پر تیار تھے۔ ان میں لالہ سمرکانت بھی تھے۔ اگر آٹھ آنے سیکڑے کا سود بھی نکلتا آئے تو انھیں اطمینان تھا۔

مگر سوال یہ تھا کہ زمین کہاں سے آئے۔ سکھدا کی دلیل تھی کہ جب ملوں کے لیے، اسکولوں اور کالجوں کے لیے زمین مل سکتی ہے تو اس کام کے لیے کیوں نہ میونسپلٹی زمین مفت دے جو اسکولوں اور کالجوں سے کہیں ضروری ہے۔

شام کا وقت تھا۔ شانتی کمار نقشوں کا ایک پلندہ لیے سکھدا کے پاس آئے اور ایک ایک نقشہ کھول کر اسے دکھانے لگے۔ وہ ان مکانوں کے نقشے تھے جن کے بنوانے کی تجویز تھی۔ ایک نقشہ آٹھ آنے مہینے کا تھا۔ دوسرا ایک روپے کے کرائے کا۔ تیسرا دو روپے کا۔ آٹھ آنے والے میں ایک کمرہ تھا۔ ایک باورچی خانہ ایک برآمدہ۔ سامنے ایک بیٹھک اور ایک چھوٹا سا صحن۔ ایک روپے والے میں اندر دوکمرے تھے اور دو روپے والوں میں تین کمرے۔ کمروں میں کھڑکیا تھیں فرش اور دوفٹ اونچائی تک دیواریں پختہ۔ ٹھاٹ کھپریل کا تھا دو روپے والوں میں پاخانہ بھی تھا۔

باقی دس دس گھروں کے بیچ میں ایک ایک پائخانہ بنوایا گیا تھا۔

سکھدا نے پوچھا۔ ''آپ نے لاگت کا تخمینہ بھی کیا ہے؟''

''اور کیا یوں ہی نقشے بنوا لایا ہوں۔ آٹھ آنے والے مکان کی لاگت دوسو ہوگی۔ ایک روپے والے کی تین سو اور دو روپے والوں کی چارسو، چارآنے سیکڑہ کا سود پڑتا ہے۔''

''پہلے کتنے مکانوں کا پروگرام ہے؟''

''کم سے کم تین ہزار، دکھن کی طرف بھی قریب قریب اتنے ہی مکانوں کی ضرورت ہوگی۔ میں نے حساب لگایا ہے۔ کچھ لوگ تو زمین پر خود مکان بنوالیں گے۔ مگر کم سے کم دس لاکھ کی ضرورت اور ہوگی۔''

''مار ڈالا، دس لاکھ ایک طرف کے لیے۔''

''اگر پانچ لاکھ کے حصے دار مل جائیں تو باقی روپے لوگ خود لگالیں گے۔ مزدوری میں بھی بڑی کفایت ہوگی۔ راج، بیلدار، بڑھئی، لوہار، نصف مزدوری پر کام کرنے کو تیار ہیں۔ ٹھیلے والے، گدھے والے، گاڑی والے یہاں تک کہ یکے اور تانگے والے بھی بے گار میں کام کرنے پر راضی ہیں۔''

"دیکھیے شاید اسکیم چل جائے۔ دو تین لاکھ تو شاید دادا ہی لگا دیں۔ اماں کے پاس بھی ابھی کچھ ہو گا ہی۔ سب سے مشکل مسئلہ زمین کا ہے۔"

"مشکل کیا ہے۔ دس بنگلے خالی کردیے جائیں تو زمین ہی زمین نکل آئے گی۔"

"بنگلوں کا خالی ہونا آپ آسان سمجھتے ہیں؟"

"آسان تو نہیں سمجھتا لیکن تدبیر کیا ہے۔ شہر میں بعض مکان اتنے وسیع ہیں کہ ان میں ہزار آدمی آسانی سے رہ سکتے ہیں۔ آپ ہی کا مکان کیا چھوٹا ہے۔ اس میں دس غریب خاندانوں کے رہنے کی جگہ ہے۔"

سکھدا مسکرائی۔ "آپ کو ہم لوگوں پر ہی ہاتھ صاف کرنے لگے۔"

"جو راہ بتائے اُسے آگے چلنا پڑے گا۔"

"میں تیار ہوں، لیکن میونسپلٹی کے پاس زمین بھی تو ہو۔"

"زمین کی کیا کمی ہے۔ کتنے ہی پلاٹ ابھی خالی پڑے ہوئے ہیں۔ مگر حافظ جی فرماتے ہیں ان پلاٹوں کی بات چیت طے ہو چکی ہے۔"

سلیم نے موٹر سے اتر کر شانتی کمار کو پکارا۔ انھوں نے اسے اندر بلا لیا اور پوچھا۔ "کدھر سے آرہے ہو؟"

سلیم بہت خوش تھا بولا۔ "کل رات کو چلا جاؤں گا۔ سوچا آپ سے رخصت ہوتا چلوں۔ اسی بہانے دیوی جی سے بھی نیاز حاصل ہو گیا۔"

شانتی کمار نے پوچھا۔ "ارے یوں چلے جاؤ گے کیا بھائی۔ جلسہ دعوت کچھ نہیں واہ۔"

"جلسہ تو کل شام کو ہے۔ آپ لوگوں کی خدمت میں کارڈ بھیج دیے گئے ہیں۔ مگر آپ سے تو صرف جلسے کی ملاقات کافی نہیں۔"

"پھر چلتے چلاتے ہماری تھوڑی سی مدد کرو۔ دکھن کی طرف میونسپلٹی کے جو پلاٹ ہیں ان کے حاصل کرنے کی کوئی تدبیر بتاؤ۔"

سلیم نے متفکرانہ انداز سے کہا۔ "ان پلاٹوں کی تو شاید بات چیت ہو چکی ہے۔ کئی ممبر خود بیٹیوں اور بیویوں کے نام سے خریدنے کو منہ کھولے بیٹھے ہیں۔"

سکھدا کو تعجب ہوا۔ "اچھا اندر ہی اندر یہ حرکتیں بھی ہو رہی ہیں۔ تب تو آپ کی مدد کی اور زیادہ ضرورت ہے۔ ایسی بے عنوانیوں کے انسداد میں سرگرم ہونا آپ کا فرض

ہے۔"

سلیم نے آنکھیں چرا کر کہا۔"مگر جو معاملہ طے ہوچکا اس کے بارے میں کوئی کارروائی کی بھی تو نہیں جاسکتی۔" یہ کہتے ہوئے اس نے سکھدا اور شانتی کمار سے ہاتھ ملایا اور دونوں سے کل شام کو جلسے میں آنے کی استدعا کرکے چلا گیا۔ وہاں بیٹھنے میں اب اس کی خیریت نہ تھی۔

شانتی کمار نے کہا۔"دیکھا آپ نے ابھی اپنی جگہ کا چارج نہیں لیا مگر مزاج میں افسری کی بو آگئی۔ کچھ عجب طلسم ہے کہ اس کے اندر جو قدم رکھتا ہے اس کی عقل پھر جاتی ہے۔ یہ حضرت اس تجویز کے خاص معاون تھے مگر آج صاف نکل گئے۔"

سکھدا نے غرور کے ساتھ کہا۔"حق ہماری جانب ہے اور وہی ہماری مدد کرے گا۔ ہم اور کسی کی مدد کے محتاج نہیں ہے۔" اسی اثناء میں لالہ سمرکانت بھی آگئے۔ شانتی کمار کو بیٹھا دیکھ کر ذرا جھجکے پھر پوچھا۔"کہیے ڈاکٹر صاحب حافظ جی سے کیا بات چیت ہوئی؟"

شانتی کمار نے اب تک جو کچھ کیا تھا کہہ سُنایا۔

سمرکانت نے شکایت کے انداز سے کہا۔"آپ لوگ ولایت کے پڑھے ہوئے ہیں صاحب، میں بھلا آپ کے سامنے کیا منہ کھول سکتا ہوں۔ لیکن اگر آپ چاہیں کہ حق، انصاف اور سچائی کے نام پر زمین آپ کو مل جائے تو منہ دھو رکھیے۔ اس کام کے لیے دس بیس ہزار خرچ کرنے پڑیں گے۔ ہر ایک ممبر سے الگ الگ ملیے، دیکھیے وہ کس مزاج کا، کس خیال کا، کس قماش کا آدمی ہے۔ اسی طرح اسے قابو میں لائیے۔ خوشامد سے راضی ہو، خوشامد سے۔ چاندی سے راضی ہو، چاندی سے۔ دعا، تعویذ، جنتر منتر جس طرح کام نکلے نکالیے، حافظ جی سے میری پُرانی ملاقات ہے۔ پچیس ہزار کی تھیلی ان کی ماما کے ہاتھ گھر میں بھیج دو، پھر دیکھیں کیسے زمین نہیں ملتی۔ سردار کلیان سنگھ کو ان مکانات کا ٹھیکہ دے دو۔ وہ قابو میں آجائیں گے۔ دوبے جی کو پانچ تولے چند رودے نذر دے کر طے کرسکتے ہو۔ کھنّا سے یوگ ابھیاس کی باتیں کرو۔ رائے صاحب دھنی رام کے نام پر اس نئی بستی کا نام رکھ دو، ان سے کچھ روپے بھی مل جائیں گے۔ یہ ہیں کام کرنے کے ڈھنگ۔ روپے کی طرف سے بے فکر رہو۔ نبیوں کو چاہے بدنام کرلو لیکن رفاہِ عام کے کاموں میں بنیے ہی آگے آتے ہیں۔ دس لاکھ تک کا بیمہ تو میں لیتا ہوں۔ مجھے تو رات بھر نیند نہیں آتی۔ یہ

سوچا کرتا ہوں کہ کیسے یہ کام سدھ ہو۔ جب تک اس کی تکمیل نہ ہوگی مجھ پر نشہ سا چڑھا رہے گا۔"

شانتی کمار نے دبی آواز سے کہا۔"یہ فن تو مجھے سیکھنا پڑے گا سیٹھ جی۔ مجھے نہ تو کھانے کا تجربہ ہے اور نہ کھلانے کا۔ مجھے تو کسی بھلے آدمی سے یہ تجویز کرتے ہی شرم آتی ہے۔ یہ خوف بھی ہوتا ہے کہ کہیں وہ ڈانٹ نہ بیٹھے۔"

سمرکانت نے سر ہلا کر کہا۔"تو پھر زمین مل چکی۔ سیوا آشرم میں لڑکے پڑھانا دوسری بات ہے۔ معاملہ پٹانا دوسری بات ہے۔ میں خود پٹا لوں گا۔"

سکھدا بولی۔"نہیں ہمیں رشوت دینا منظور نہیں۔ ہم حق کے لیے کھڑے ہیں۔ ہمارے پاس حق کی طاقت ہے۔ ہم اسی طاقت سے فتح پائیں گے۔"

سمرکانت نے مایوس ہوکر کہا۔"تو تمھاری اسکیم چل چکی۔"

سکھدا نے کہا۔"اسکیم تو چلے گی، ہاں شاید دیر میں چلے، یا دھیمی چال سے چلے، مگر رُک نہیں سکتی۔"

"اچھی بات ہے میں بھی دیکھوں گا۔"

سمرکانت طیش کے عالم میں باہر چلے گئے۔ جو شخص آنکھ بند کرکے پیچھے نہ چلے اس سے وہ دور بھاگتے تھے۔

شانتی کمار نے خوش ہوکر کہا۔"سیٹھ جی بھی عجیب آدمی ہیں۔ ان کی نظر میں جو کچھ ہے وہ روپیہ ہے۔ انسانیت بھی کوئی چیز ہے۔ اسے شاید وہ تسلیم ہی نہیں کرتے۔"

سکھدا نے پُرغرور انداز میں کہا۔"ان کی باتوں پر نہ جایئے ڈاکٹر صاحب، ان کے دل میں جتنا خلوص اور جتنا جوشِ خدمت ہے وہ ہم دونوں میں مل کر بھی نہ ہوگا۔ ان کے طور و طریق میں کتنا تغیر آگیا ہے یہ آپ نہیں دیکھتے۔ ڈیڑھ سال پہلے ان کے صاحب زادے نے یہ تجویز کی ہوتی تو آگ ہوجاتے۔ اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہوجانا معمولی بات نہیں ہے اور خاص کر اس آدمی کے لیے۔ جس نے ایک ایک کوڑی کو دانتوں سے پکڑا ہو۔ اولاد کی محبت نے یہ کایا پلٹ کی ہے۔ میں اسی کو سچا بیراگ کہتی ہوں۔ آپ پہلے ممبروں سے ملیے اگر ضرورت سمجھیے تو مجھے بھی ساتھ لے لیجیے۔ مجھے تو امید ہے اکثر ہمارے ساتھ ہوں گی۔ بہتر یہ ہوگا کہ کل آپ آئیں اور ہم دونوں چلیں۔ دس بجے تک

لوٹ آئیں گے۔ اس وقت مجھے سکینہ سے ملنا ہے۔ سُنا ہے مہینوں سے بیمار ہے، مجھے تو اس سے بڑی عقیدت ہوگئی ہے۔ وقت ملا تو ادھر ہی سے نینا سے ملتی آؤں گی۔"

ڈاکٹر صاحب نے کرسی سے اُٹھتے ہوئے کہا۔"اُسے گئے تو دو مہینے ہوگئے آئے گی کب تک؟"

"یہاں سے تو کئی بار بُلاوا گیا۔ سیٹھ دھنی رام رخصت ہی نہیں کرتے۔"

"نینا خوش تو ہے؟"

"اپنے بارے میں کچھ کہتی ہی نہیں، پوچھتی ہوں تو یہی کہتی ہیں۔ بہت اچھی طرح ہوں۔ مگر مجھے قرینے سے کچھ اور ہی معلوم ہوتا ہے۔ وہ شکایت کرنے والی لڑکی نہیں ہے اگر وہ لوگ اسے زہر بھی کھلادیں تو شاید زبان نہ کھولے۔"

شانتی کمار کی آنکھیں بھر آئیں۔"میں تو قیاس ہی نہیں کرسکتا کہ کوئی اس سے ناراض ہوسکتا ہے۔"

سکھدا مسکرا کر بولی۔"اس کا بھائی آوارہ مزاج ہے۔ کیا یہ ان لوگوں کی ناراضگی کے لیے کافی نہیں ہے؟"

"میں نے تو سُنا، منی رام پکا شہدہ ہے۔"

"نینا کے سامنے آپ نے یہ بات کہی ہوتی تو آپ سے لڑ بیٹھتی۔"

"میں ایک بار ذرا منی رام کی مزاج پُرسی کرنا چاہتا ہوں۔"

"نہیں آپ کے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ آپ نے اس سے کچھ کہا تو نینا کے سر جائے گی۔"

"میں اس سے لڑنے نہ جاؤں گا۔ اس کی خوشامد کرنے جاؤں گا، اس فن سے واقف نہیں مگر نینا کی خاطر یہ بھی کروں گا۔ وہ معصوم لڑکی اِن ظالموں کے ہاتھوں حلال ہو یہ میں نہیں دیکھ سکتا۔" یہ کہتے ہوئے شانتی کمار باہر چلے گئے۔

(۹)

سکھدا موٹر سے اُتر کر گلی میں سکینہ کا مکان تلاش کرنے لگی۔ اِدھر سے اُدھر تک دو تین چکّر لگا آئی کہیں اس کے گھر کا نشان نہ ملا۔ جہاں وہ گھر ہونا چاہیے تھا وہاں اب ایک نیا کمرہ تھا۔ جس میں قلعی پُتی ہوئی تھی۔ آخر اس نے ایک آدمی سے پوچھا تب

معلوم ہوا کہ جسے وہ نیا کمرہ سمجھ رہی تھی، وہی سکینہ کے مکان کا دروازہ ہے۔ اس نے آواز دی اور دروازہ ایک لمحے میں کھل گیا۔ سکھدا نے دیکھا کہ وہ ایک صاف ستھرا چھوٹا سا کمرہ ہے جس میں ٹاٹ کا فرش ہے اور دو تین مونڈھے رکھے ہوئے ہیں۔

سکینہ نے ایک مونڈھا بڑھا کر کہا۔"آپ کو مکان تلاش کرنے میں دقت ہوئی ہو گی۔"

سکھدا نے اس کے زرد، خشک چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔"ہاں میں نے دو تین چکّر لگائے۔ اب یہ گھر کہلانے کے لائق ہوگیا۔ مگر تمھاری یہ کیا حالت ہے؟"

سکینہ نے زرد تبسم کے ساتھ کہا۔"میں تو کبھی بہت موٹی تازی نہ تھی۔"

"مگر ایسی حالت تو نہ تھی۔"

دفعتاً پٹھانی آگئی اور یہ کلمہ سن کر بولی۔"ایک مہینے سے بخار آرہا ہے بیٹی، لیکن دوا نہیں کھاتی۔ کون کہے، مجھ سے تو بول چال بھی بند ہے، میں تو اسے اب دیکھ کر جلتی ہوں۔ اس کا بُرا چاہتی ہوں۔ اللہ جانتا ہے۔ تمھاری بڑی یاد آتی تھی بہو.جی! مگر اب آؤں کیا منہ لے کر۔ ابھی تھوڑی سی دیر ہوئی لالہ جی بھی گئے ہیں۔ دودھوں نہائیں پوتوں پھلیں۔ سکینہ نے منع کردیا تھا اس لیے اپنی طلب لینے نہ گئی تھی۔ وہی دینے آئے تھے۔ دنیا میں ایسے ایسے خدا کے بندے پڑے ہوئے ہیں۔ دوسرا ہوتا تو میری صورت نہ دیکھتا ان کا بسا بسایا گھر مجھ نصیبوں جلی کے کارن اُجڑ گیا۔ مگر لالہ کا دل وہی ہے۔ وہی پرورش کی نگاہ۔ میری آنکھوں پر نہ جانے کیوں پردہ پڑگیا تھا کہ میں نے اس لڑکے کو رسوا کردیا۔ خدا کرے مجھے مرنے کے بعد کفن بھی نہ نصیب ہو۔ جس نے سُنا اس نے مجھی پر لعنت ملامت کی۔ اس لڑکی نے تو مجھ سے بولنا ہی چھوڑ دیا۔ کھڑی تو ہے پوچھو۔"

سکینہ نے ڈانٹ کر کہا۔"ارے تو چپ بھی رہوگی۔ یا اپنا دُکھڑا ہی روئے جاؤگی۔ کچھ اور بات چیت کروگی یا نہیں؟"

پٹھانی نے فریاد کی۔"اسی طرح یہ مجھے جھڑکتی رہتی ہے بہو.جی، بولنے نہیں دیتی۔ پوچھو تم سے دُکھڑا نہ روؤں تو کس سے رونے جاؤں۔"

سکھدا نے سکینہ سے پوچھا۔"یہ تو بتاؤ تم نے اپنا وثیقہ لینے سے کیوں انکار کردیا؟"

سکینہ کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ پٹھانی پھر بول اُٹھی۔"اس کے پیچھے مجھ سے برابر لڑا

کرتی ہے۔ بہو! کہتی ہے کیوں کسی سے خیرات لیں۔ یہ نہیں سوچتی کہ اسی سے ہماری پرورش ہوئی ہے۔ بس آج کل سلائی کی دُھن ہے۔ بارہ بارہ بجے رات تک بیٹھی آنکھیں پھوڑتی رہتی ہے۔ اسی سے بخار بھی آنے لگا ہے۔ کہتی ہوں جان رکھ کر کام کر، کون سا لاؤ لشکر کھانے کو بیٹھا ہوا ہے۔ لیکن یہاں تو دُھن ہے گھر بھی اچھا ہوجائے۔ سامان بھی اچھے بن جائیں۔ ان دنوں کام خوب مل رہا ہے۔ مگر سب اسی ٹیپ ٹاپ میں اُڑجاتا ہے۔ یہاں سے تھوڑی دور پر ایک عیسائن رہتی ہے وہ روز صبح کو پڑھانے آتی ہے۔ ہمارے زمانے میں تو بیٹا سیپارہ، روزہ نماز کا رواج تھا۔ کئی جگہ سے شادی کے پیغام آئے..........''

سکینہ نے تیز ہوکر کہا۔''اچھا رہنے دو یہ قصہ۔ کوئی نئی بات نہیں کہہ رہیں۔ آپ کی خاطر کیا کروں بہن! آپ نے اتنے دن بعد مجھ بدنصیب کو یاد تو کیا۔''

سکھدا نے ہمدردانہ انداز سے کہا۔''یاد تو تمھاری برابر آتی رہتی اور تم سے ملنے کو جی بھی چاہتا تھا مگر فرصت ہی نہ ملتی تھی۔ یہ تو آج میاں سلیم سے معلوم ہوا کہ تمھاری طبیعت بہت خراب ہوگئی ہے۔ آخر تم کیوں اپنی جان کھپائے ڈالتی ہو۔ ہم لوگ تو ہر طرح تمھاری خدمت کو حاضر ہیں۔''

سکینہ نے دردناک انداز سے کہا۔''بہن آپ نے میرے ساتھ جو شریفانہ برتاؤ کیا ہے اس کے لیے میں آپ کی احسان مند ہوں۔ لیکن یہ تو اچھا نہیں لگتا کہ کوئی ہمیشہ دوسروں کا دست نگر بنا رہے۔ انسان کو خود بھی ہاتھ پاؤں ہلانا چاہیے۔ اب مجھے تجربہ ہوا ہے کہ افلاس ہی تمام مصیبتوں کی جڑ ہے۔ چاہے میری جان چلی جائے لیکن میں اس افلاس کو مٹاکر چھوڑوں گی۔ میں اس حالت میں نہ ہوتی تو آج بابو جی کیوں بدنام ہوتے۔ میں کیوں رسوا ہوتی، سوچیے۔''

سکھدا مسکرائی۔''میں تو سمجھتی ہوں دولت ہی ساری برائیوں کی جڑ ہے۔ اگر وہ حضرت بھی تمھاری جیسی حالت میں ہوتے تو انھیں کیوں یہ شرارت سوجھتی۔ یہ دولت والے ہی ہیں جو دنیا میں بدکاری پھیلاتے پھرتے ہیں۔''

''لیکن اگر کوئی غریب نہ ہو تو دولت والوں کو بدکاری پھیلانے کا موقع کیسے ملے؟''

''تو میں بھی یہی کہوں گی کہ کوئی دولت مند نہ ہو تو وہ غریبوں کو اپنے نفس کا شکار کیسے بنائے۔ جب تک امیر اور غریب کا امتیاز قائم رہے گا اس قسم کے واقعے ہوتے

رہیں گے۔"

"تو آپ نیچے آیئے میں اوپر اُٹھتی ہوں۔ بیچ میں کہیں نہ کہیں میل ہو ہی جائے گا۔"

پٹھانی کو آج یہ سوجھی کہ سکھدا کی کچھ خاطر کی جائے۔ جب تک روزانہ ضرورتوں ہی کے لیے کافی نہ ملتا تھا۔ خاطرمدارات کا ذکر ہی کیا تھا۔ لیکن اب ہاتھ میں پیسے تھے۔ مہمانی کا جوش روکا نہ جاسکتا تھا۔ وہ حلوائی کی دوکان پر اچھی اچھی مٹھائیاں اور تمبولی کے دوکان سے پان لینے چلی گئی۔ تخلیہ ہوگیا تو سکینہ اندر جاکر عطر میں بسا ہوا ایک لفافہ لے آئی اور سکھدا کے ہاتھ میں دے کر بولی۔"یہ میاں محمد سلیم کا خط ہے۔ آپ پڑھ سکتی ہیں۔ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ اب وہ مجھ پر عاشق ہوگئے ہیں۔ پہلے اپنے خدمت گار کے ساتھ میرا نکاح کرانا چاہتے تھے اب خود سرفراز کرنا چاہتے ہیں۔"

سکھدا نے خط پڑھا۔ اگرچہ وہ سمجھ رہی تھی کہ سکینہ کی اس بے تکلفی سے فائدہ اُٹھانا مناسب نہیں ہے لیکن اشتیاق کو نہ روک سکی۔ اس نے اس خط کو پھر احتیاط سے لفافے میں بند کردیا اور بولی۔"سکینہ، تم خدا جانے اپنے دل میں کیا کہو۔ مگر اس خط میں مجھے ایک سچّے دل کے جذبات نظر آرہے ہیں۔ پہلے سلیم چاہے جس قماش کے آدمی رہے ہوں لیکن ایسا خط کوئی نفس پرور نوجوان نہیں لکھ سکتا۔ ایک ایک لفظ سے سچی محبت جھلک رہی ہے۔ تم میں ضرور کوئی ایسا جادو ہے جس سے تم دلوں پر فتح پاجاتی ہو۔ پہلے تم نے ایک ایسے آدمی کو اپنے قدموں پر گرایا جسے میں محبت سے عاری سمجھتی تھی۔ اب تم چھٹے ہوئے شہدے کی دیوی بنی ہوئی ہو۔ میں تم پر رشک کرتی ہوں۔ سچ میں تو تمھیں یہی مشورہ دوں گی کہ خواب دیکھنا چھوڑ دو، اور جو نعمت تمھارے سامنے آرہی ہے اسے لے لو۔ اس خط نے میرے دل سے وہ ساری بدگمانیاں دور کردیں جو مجھے سلیم کی جانب سے تھیں۔"

سکینہ نے معترضانہ انداز سے کہا۔"لیکن مجھے ان پر اعتبار نہیں آتا بہن، آدمی بہت باتیں بناوٹ سے بھی تو لکھ سکتا ہے۔ میں نے انھیں کئی بار اپنے دروازے پر تاک جھانک کرتے دیکھا ہے۔"

"تو اس سے یہ کیوں سمجھتی ہو کہ ان کی نیت خراب ہے۔ یہ کیوں نہیں سمجھتیں کہ

اضطراب کی حالت میں وہ تمھارے دروازے کی خاک چھانتے پھرتے ہیں۔"

"شاید آپ کا خیال صحیح ہو۔ لیکن محبت کی زنجیر کو کیا کروں جس نے مجھے جکڑ رکھا ہے۔ جہاں پہلے ہی ایک درخت پھل پھول رہا ہو، وہاں دوسرا پودا کیا کبھی جڑ پکڑ سکتا ہے؟ اب تو جب تک مجھے یہ نہ معلوم ہو جائے گا کہ امرکانت نے مجھے دل سے نکال دیا ہے میں ان ہی کی ہوں اور ان کے دل سے نکل جانے پر بھی ان کی محبت کو ہمیشہ یاد رکھوں گی۔ ایسی پاکیزہ محبت کا ایک لمحہ بھی انسان کو آخر تک متوالا رکھنے کے لیے کافی ہے۔ میں نے سلیم کو اسی مضمون کا خط لکھ دیا ہے۔ کل ہی تو ان کے جانے کی تاریخ ہے۔ میرا خط پڑھ کر رونے لگے۔ مگر مردوں کے آنسوؤں پر مجھے اعتبار نہیں آتا۔ ان کی دنیا دوسری ہے۔ محبت وہاں تفریح کی چیز ہے۔ اسی طرح جیسے کوئی تماشا۔ کوئی دردناک واقعہ ہوا ذرا رو لیے۔ اس کے بعد کوئی ہنسانے والی بات آئی ہنس پڑے۔ محبت ان کی طبیعت کی اوپری سطح پر رہتی ہے۔ گہرائیوں میں کیا ہوتا ہے خدا جانے۔"

بڑھیا ایک برہمن کے ہاتھوں میں مٹھائی اور پان لے کر آگئی اور صاف زمین پر ان چیزوں کو رکھوا کر لونڈے کو پانی لینے کے لیے دوڑا دیا۔ سکھدا نے تھیلی سے ایک روپیہ نکال کر بڑھیا کی طرف بڑھایا۔ بڑھیا ایک قدم پیچھے ہٹ گئی اور بولی "وہ بھی تو تمھارا ہی ہے۔ بہو.جی میں کیا کہیں اور سے لائی ہوں؟"

سکینہ نے چٹکی لی۔ "دینا ہی ہے تو کوئی اچھی رقم دیجیے۔ غریب کی نذر غرض سے خالی کیسے ہوسکتی ہے۔ اسی لیے تو غربت کو لعنت کہا گیا ہے۔"

سکھدا سچے دل سے بولی۔ "مجھے تمھاری غربت پر رشک آتا ہے سکینہ، سچ کہتی ہوں زندگی غربت میں ہے۔ تمول تو روح کو آگے قدم اُٹھانے کے لیے کوئی موقع ہی نہیں دیتا۔ وہ مبارک دن ہوگا جب مجھ میں اتنی قوت آجائے گی کہ میں دولت کی سنہری بیڑیوں سے اپنے کو آزاد کرلوں گی۔ دولت والے جائداد خریدتے ہیں۔ بڑی بڑی عمارتیں بنواتے ہیں، عیاشی اور نفس پروری کرتے ہیں، شہرت کے لیے جان دیتے ہیں۔ یہ سب کیا ہے؟ روحانی تشفی اور سکون کی ناکام کوششیں، محض ناکام۔ غریب کے لیے سارا سکون اور ساری قوت اس کی غربت میں ہے۔"

اس نے ہاتھ دھو کر دونے سے مٹھائی نکالی، سکینہ کو کھلائی، خود کھائی، پانی پیا پھر

دونوں نے پان کھایا۔ معلوم ہوتا تھا دونوں بہنیں ہیں۔

دفعتاً سکینہ نے پوچھا۔"مجھے کبھی کبھی بڑا تعجب ہوتا ہے بہوجی، کہ آپ جیسی دیوی کو چھوڑکر بابوجی میری طرف کیسے مخاطب ہوگئے۔ میں آپ سے حلف لے کر کہتی ہوں کہ میں نے کوئی جادو ٹونا نہیں کیا۔"

سکھدا مسکرائی۔"اب تک تو میں سمجھتی تھی کہ تم نے کوئی جادو ٹونا نہیں کیا، اور یہ ان کی ہوس پرستی تھی۔ آج معلوم ہوا کہ تم جادوگرنی ہو۔ میں اگر مرد ہوتی تو شاید مجھ پر بھی تمھارا جادو چل گیا ہوتا۔ اس بھولی بھالی پاکیزہ صورت پر کون نہ فدا ہوجائے گا۔ لیکن اگر ایک بہتر چیز دیکھ کر انسان اس کی طرف لپکے تو شاید زندگی میں اسے کبھی اطمینان نہ ہو۔ تم میں ہزاروں اوصاف ہوں لیکن کیا اسی طرح ایسے مرد نہیں ہیں جو ان سے ہر اعتبار سے بڑھ کر ہوں؟ اگر مرد اور عورت دونوں بہتر کی تلاش کرنے لگیں تو وہ کسی اور طرح کی زندگی ہوگی جس کا میں قیاس نہیں کرسکتی۔ انھوں نے میری جو توہین کی ہے اسے میں کبھی معاف نہیں کرسکتی۔ اگر انھیں محبت کی بھوک تھی تو کیا مجھے بھی اس کی آرزو کچھ کم تھی؟ مجھ سے جو وہ چاہتے تھے وہی میں بھی ان سے چاہتی تھی۔ جو چیز وہ مجھے نہ دے سکے وہ اگر میں انھیں نہ دے سکی تو انھیں اس قدر برہم ہونے کا کیا حق تھا۔ کیا اسی لیے کہ وہ مرد ہیں اور مرد چاہے عورت کو پاؤں کی جوتی سمجھے۔ مگر عورت کا فرض ہے کہ وہ اس کے قدموں سے لپٹی رہے؟ بہن جس طرح تم نے مجھ سے کوئی پردہ نہیں رکھا اسی طرح میں بھی تم سے صاف صاف باتیں کررہی ہوں۔ میری جگہ ایک لمحے کے لیے اپنے کو رکھ لو تب تمھیں میری محسوسات کا اندازہ ہوگا۔ اگر اس معاملے میں میری خطا ہے تو اتنی خطا ان کی بھی ہے۔ جس طرح میں اپنی تقدیر کو روکر بیٹھ گئی تھی کیا وہ بھی نہ بیٹھ سکتے تھے۔ تب شاید کبھی آپس میں صفائی ہوجاتی۔ لیکن اب تو اس کی گنجائش ہی نہیں چاہے مجھے ساری عمر اسی حالت میں رہنا پڑے۔" سکینہ اس کے جواب میں کچھ بولنے کی جرأت نہ کرسکی۔ شریف مستورات کے دل میں ایسے موقعے پر کیا جذبات پیدا ہوتے ہیں اس کا آج صحیح اندازہ ہوگیا۔

(۱۰)

سکھدا سیٹھ دھنی رام کے گھر پہنچی تو نو بج رہے تھے۔ بڑا عالی شان آسمان سے

باتیں کرنے والا محل تھا۔ دروازے پر ایک تیز برقی بلب جل رہا تھا اور دو دربان مسلح کھڑے تھے۔ سکھدا کو دیکھتے ہی اندر باہر ہل چل مچ گئی۔ لالہ منی رام باہر نکل آئے اور اسے اندر لے گئے۔ دوسری منزل پر ملاقاتی کمرہ تھا۔ نہایت تکلف سے سجا ہوا تھا۔ سکھدا وہاں بیٹھی۔ گھر کی عورتیں اسے پردے سے جھانک رہی تھیں۔ کمرے میں آنے کی ہمت نہ کر سکتی تھیں۔ سکھدا کا ان پر سایہ پڑجانے کا اندیشہ تھا۔

سکھدا نے ایک کوچ پر بیٹھ کر خیرو عافیت پوچھی اور سیٹھ دھنی رام سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔

منی رام ایک سگار جلا کر بولے۔"آپ نے شاید اخبار نہیں دیکھا، پاپا کو دو دن سے بخار آرہا ہے۔ میں نے کلکتے سے مسٹر ہاگ کو بلا لیا ہے۔ یہاں کسی ڈاکٹر پر میرا اعتبار نہیں ہے۔ پاپا اب بہت ضعیف ہوگئے ہیں اور ایک نہ ایک شکایت ہمیشہ پیدا ہوتی رہتی ہے۔ کہتا ہوں اب اطمینان سے بیٹھیے اور وہ خود آرام کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن جب کوئی بیٹھنے دے۔ گورنر صاحب الہ آباد آئے تھے۔ ان کے یہاں سے خاص ان کے پرائیوٹ سکریٹری کا دعوت نامہ آپہنچا۔ جانا لازم ہوگیا۔ اس شہر میں اور کسی رئیس کے نام دعوت نامہ نہیں آیا۔ یہ اعزاز کسے نصیب ہوتا ہے۔ عزت ہی تو انسان کی زندگی میں ایک چیز ہے۔ یوں تو اپنا پیٹ سبھی پالتے ہیں۔ وہیں سردی کھا گئے۔ اب یہ سمجھیے کہ صبح سے شام تک شہر کے رئیسوں کا تانتا لگا ہوا ہے۔ صبح ڈپٹی کمشنر اور ان کی میم صاحبہ آئی تھیں۔ گورنر نے بھی ہمدردی کا تار بھیجا ہے۔ پاپا سے ان کی خوب چھنتی ہے۔ پُرانی ملاقات ہے۔ دوچار دن کی بیماری کی کوئی بات نہیں۔ یہ تو روز کے دھندے ہیں۔ یہ اعزاز تو مل گیا۔ شہر کے رؤسا مارے حسد کے بھنے جارہے ہیں۔ لیکن بھنو اور جلو ہمارا کیا بگڑتا ہے۔"

نوکر پان اور الائچی کی طشتری رکھ گیا۔ سکھدا اندر جانے کے لیے بے قرار تھی۔ لیکن منی رام اپنا راگ الاپے جاتا تھا۔"میرے گھر میں ایسی عورت کی ضرورت تھی جو نئی معاشرت کے آداب سے واقف ہو اور لیڈیوں کی خاطر تواضع کرسکے۔ اس شادی سے تو وہ بات پوری نہ ہوئی۔ پاپا نے لالہ سمرکانت کے حکم کی تعمیل کی۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ میں ایسی شادی نہ چاہتا تھا۔ پُرانے خیالات کی مستورات کی تو ہمارے یہاں کمی نہ تھی۔ مگر وہ لیڈیوں سے ہم کلام نہیں ہوسکتیں۔ لیڈیوں کے سامنے انھیں لانا اپنی توہین کرانا ہے۔ یہ

پردے کا زمانہ نہیں رہا۔ آج تو ایسی عورت چاہیے جو جنٹلمینوں سے دوبدو گفتگو کرسکے۔''

سکھدا نے تمسخر کے انداز سے کہا۔''تو آپ نے کسی لیڈی سے کیوں نہ شادی کی۔''

منی رام بے حیائی سے بولا۔''دھوکا ہوا اور کیا۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ ایسے تعلیم یافتہ خاندان میں لڑکیاں ایسی پھوہڑ ہوں گی۔ اماں، میری بہنیں اور محلے کی عورتیں تو نئی بہو کو دیوی سمجھ رہی ہیں۔ وہ برت رکھتی ہے، پوجا کرتی ہے۔ سیندور کا ٹیکہ لگاتی ہے۔ ساس کے پاؤں چھوتی ہے۔ نندوں کے سر میں تیل ڈالتی ہے۔ مہریوں کے بچّوں کو پیار کرتی ہے۔ لیکن مجھے تو ایسی عورت چاہیے جو میرے کاروبار کو بڑھانے میں میری مدد کرسکے۔ مجھے دنیا میں رہ کر کچھ کام اور کچھ نام کرنا ہے مجھے پوجا پاٹ والی عورت کی ضرورت نہ تھی۔ اونچے درجے کے آدمیوں سے ہمارا ربط ضبط ہے۔ ایسے پُرانے خیال کی عورتوں کو تو ہم ان کے روبرو لا ہی نہیں سکتے۔ جب میں اپنے دوستوں کی عورتوں سے ملتا ہوں تو وہ بھی تو چاہتے ہیں کہ میری عورت سے ملیں۔ مجھے مجبور ہوکر دوسری شادی کرنی پڑے گی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میں اس شادی کو شادی ہی نہیں سمجھتا۔''

سکھدا کو اس اکیس سال کے نوجوان کی بے شرم دنیا پرستی سے نفرت ہورہی تھی۔ اس کی ہوسناکیوں نے اس کے نفسِ لطیف کو گویا بالکل پامال کرڈالا تھا۔

سکھدا نے نفرت آمیز لہجے میں کہا۔''اس کام کے لیے تو آپ کو تھوڑی سی تنخواہ پر ایسی عورتیں مل سکتی ہیں جو لیڈیوں ہی کی نہیں صاحبوں کی بھی خاطرمدارات کرسکیں۔''

منی رام نے چیں بہ جبیں ہوکر کہا۔''آپ کاروبار کے ان مسئلوں کو نہیں سمجھ سکتیں۔ یہاں بڑے بڑے ملوں کے ایجنٹ آتے ہیں۔ اگر میری بیوی ان کی خاطرو مدارات کرسکتی تو ان کا معاملات پر کتنا خوش گوار اثر پڑتا۔ یہ کام تو کچھ عورت ہی کرسکتی ہے۔''

سکھدا نے اسی منافرت سے ٹوکا۔''میں تو کبھی نہ کروں چاہے سارا کاروبار خاک میں مل جائے۔''

''شادی کا منشاء جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہ ہے کہ عورت ہر کام میں مرد کی معاون ہو۔ انگریزوں کے یہاں عورتوں کے ذریعے بڑے بڑے تجارتی مسئلے حل ہوجاتے ہیں۔''

منی رام منہ پھٹ تھا۔ اس کے مصاحب اسے صاف گو کہتے تھے۔ اِس کا مذاق بھی

گالی سے شروع ہوتا تھا۔ اور گالی تو گالی تھی ہی بولا۔"کم سے کم آپ کو اس معاملے میں مجھے رہنمائی کرنے کا حق نہیں ہے۔ آپ نے اس لفظ کا مطلب سمجھا ہوتا تو اس وقت امرکانت آوارہ وطن نہ ہوتے اور گلی کوچوں کی ہوا نہ کھاتے۔"

سکھدا کا چہرہ شرم اور غصّے سے سرخ ہوگیا اس نے کرسی سے اُٹھ کر تند لہجے میں کہا۔"میرے بارے میں آپ کو رائے زنی کرنے کا مجاز نہیں ہے لالہ منی رام، رتی بھر مجاز نہیں ہے۔ آپ انگریزی تہذیب کے علم بردار بنتے ہیں۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ انگریزی لباس اور سگار ہی اس تہذیب کی خاص صفت ہے؟ نہیں بلکہ عورتوں کی عزت کرنا اب تک آپ نہیں سیکھ سکے۔ کوئی شریف عورت نفع کے لیے اتنی بے غیرت بننا قبول نہ کرے گی۔"

اس کی بلند آواز سن کر سارا گھر تھرّا اُٹھا اور منی رام کی تو گویا زبان ہی بند ہوگئی۔ نینا اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی بھاوج کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کی گرج سن کر سمجھ گئی کہ کوئی بات اس کے مزاج کے خلاف ہوگئی۔ دوڑی ہوئی آکر بولی۔"میں تمھاری راہ دیکھ رہی ہوں بھابی تم یہاں کیسے بیٹھ گئیں۔"

سکھدا نے اس کی طرف دھیان نہ دے کر اسی اشتعال کے عالم میں کہا۔"دولت پیدا کرنا اچھی بات ہے مگر عزت بیچ کر نہیں۔ اور شادی کا منشاء وہ نہیں ہے جو آپ سمجھے ہوئے ہیں۔ مجھے معلوم ہوا کہ خودغرضی انسان کو کہاں تک نیچے لے جاسکتی ہے۔"

نینا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے اُٹھاتی ہوئی بولی۔"ارے تو یہاں سے اُٹھوگی بھی۔"

سکھدا اور بھی تیز ہوکر بولی۔"آپ جانتے ہیں میں کیوں اپنے شوہر کے ساتھ نہیں گئی؟ اس لیے کہ وہ جتنے تیاگی ہیں میں اتنا تیاگ نہیں کرسکتی تھی۔ آپ کو اپنا کاروبار اور دولت غالبًا اپنی بی بی کی شرم و حیا سے بھی زیادہ پیارا ہے۔ انھوں نے دولت کو بھی لات ماردی اور کاروبار کو بھی۔ آپ نے گلی کوچوں کی جو بات کہی اس کا اگر وہی مطلب ہے جو میں سمجھی ہوں تو وہ بہتان ہے۔ آپ اپنے روپے کمائے جایئے اور دولت کے ہاتھوں اپنی عزت کا خون کیے جایئے۔ آپ کا اس پاک نفس آدمی پر چھینٹے اُڑانا چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔"

سکھدا لوہار کی ایک سُنار کی سو کے برابر کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی، وہ ایک کلمہ اس کے دل میں جتنا چبھا اتنا کاری کوئی لفظ وہ منہ سے نہ نکال سکی۔

نینا کے منہ سے نکلا۔ ''بھابی تم کس سے منہ لگ رہی ہو۔''

منی رام نے غصے میں مٹھی باندھ کر کہا۔ ''میں اپنے ہی گھر میں اپنی یہ توہین نہیں برداشت کر سکتا۔''

نینا نے بھاوج کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ''بھابی مجھ پر رحم کرو، ایشور کے لیے یہاں سے چلو۔''

سکھدا نے پوچھا۔ ''کہاں ہیں سیٹھ جی ذرا ان سے دو دو باتیں کرنا چاہتی ہوں۔''

منی رام بے رُخی سے بولا۔ ''آپ اس وقت ان سے نہیں مل سکتیں۔ ان کی طبیعت اچھی نہیں ہے اور میں نہیں چاہتا کہ آپ کو ان کے دل دُکھانے کا موقع دوں۔''

''اچھی بات ہے نہ جاؤں گی، نینا دیوی، کچھ معلوم ہے تمھیں؟ تمھاری ایک انگریز سوت آنے والی ہے بہت جلد۔''

''اچھا ہی ہے ایک سے دو ہو جائیں گی۔''

منی رام اس تضحیک پر آپے سے باہر ہو گیا۔ سکھدا نینا کے ساتھ چلی تو آگے آکر بولا۔ ''آپ میرے گھر میں نہیں جا سکتیں۔''

سکھدا رُک کر بولی۔ ''اچھی بات ہے نہ جاؤں گی۔ مگر یاد رکھیے اس توہین کا نتیجہ آپ کے حق میں اچھا نہ ہوگا۔''

نینا پیروں پڑتی رہی مگر سکھدا فوراً باہر نکل گئی۔

ایک لمحے میں گھر کی ساری عورتیں اور بچے جمع ہو گئے اور سکھدا کی حرکت پر تبصرے ہونے لگے۔ کسی نے کہا اس کی آنکھ کا پانی مر گیا ہے، دوسری بولی ایسی نہ ہوتی تو خصم چھوڑ کر کیوں چلا جاتا؟

نینا سر جھکائے سنتی رہی۔ اس کا ضمیر اس پر ملامت کر رہا تھا۔ تیرے سامنے یہ ستم ہو رہا ہے اور تو بیٹھی سن رہی ہے۔ لیکن اس وقت زبان کھولنا قہر ہو جاتا۔ وہ لالہ سمرکانت کی بیٹی ہے۔ اس داغ کو اس کی بے غرض خدمت اور بے زبان تحمل بھی نہ مٹا سکا۔ بالمیکی رامائن کی کتھا کے موقع پر سمرکانت نے سیٹھ دھنی رام کا سر نیچا کر کے اس کی مخاصمت کا

بیج بویا تھا۔ اس سے پہلے دونوں سیٹھوں میں خاصا یارانہ تھا۔ اس دن سے حسد پیدا ہوا۔ شاید سمرکانت کو ذلیل کرنے ہی کے لیے دھنی رام نے یہ شادی منظور کی۔ شادی کے بعد ان کے حسد کا شعلہ ٹھنڈا ہو گیا۔

منی رام میز پر پیر رکھ کر متکبرانہ لہجے میں بولا۔"میں اس عورت کو کیا سمجھتا ہوں اس کا جواب دینا ہی فضول تھا۔ کوئی مرد ہوتا تو اسے بتلاتا۔ لالہ سمرکانت نے جُوا کھیل کھیل کر دولت جمع کی ہے۔ اسی پاپ کا پھل بھوگ رہے ہیں۔ یہ مجھ سے باتیں کرنے چلی ہیں۔ ان کی ماں ہیں انھیں اس شہدے شانتی کمار نے بے وقوف بناکر ساری جائداد لکھا لی ہے۔ اب ٹکے ٹکے کو محتاج ہو رہی ہیں۔ سمرکانت کا بھی یہی حال ہونے والا ہے اور یہ دیوی ملک کی نجات کا بیڑا اُٹھانے چلی ہیں۔ اچھوتوں کے لیے مندر کیا کھلوا دیا کہ اب کسی کو کچھ سمجھتی ہی نہیں۔ مگر زمین کے معاملے میں ایسا غچہ کھائیں گی کہ عمر بھر یاد کریں گی۔ میں نے ان دو برسوں میں اپنے کاروبار کو جتنی ترقی دی ہے لالہ سمرکانت سات جنم میں بھی نہیں کر سکتے۔"

منی رام کا سارے گھر پر رعب تھا۔ وہ دولت کماسکتا تھا اِس لیے اس کے طور طریق کو پسند نہ کرنے پر بھی سارا گھر اس کا غلام تھا۔ اسی نے تو کاغذ اور چینی کی ایجنسی کھولی تھی۔ لالہ دھنی رام جی گھی کے بیوپاری تھے۔ مگر اس بیوپار میں رقابت کے باعث نفع بہت کم ہوتا تھا۔ کاغذ اور چینی کا وہ اکیلا ایجنٹ تھا۔ نفع کا کیا ٹھکانا۔ یہ فروغ پاکر اس کا سر پھر گیا تھا۔ کسی کو گنتا ہی نہ تھا۔ اگر کسی کا لحاظ کرتا تھا تو لالہ دھنی رام کا۔ انھیں سے کچھ ڈرتا بھی تھا۔

دفعتاً لالہ دھنی رام کھانستے ہانپتے لاٹھی ٹیکتے آکر بیٹھ گئے۔

منی رام نے فوراً پنکھا بند کرتے ہوئے کہا۔"آپ نے اتنی تکلیف کیوں کی بابو جی! مجھے بلا لیتے۔ ڈاکٹر نے آپ کو چلنے پھرنے کی ممانعت کی تھی۔"

لالہ دھنی رام نے پوچھا۔"کیا آج لالہ سمرکانت کی بہو آئی تھی؟"

منی رام سہم کر بولا۔"جی ہاں آئی تھی۔"

دھنی رام نے آنکھیں نکال کر کہا۔"تو تم نے مجھے ابھی سے مُردہ سمجھ لیا۔ مجھے اطلاع تک نہ دی۔"

"میں تو انھیں روک رہا تھا مگر وہ جھلائی ہوئی چلی گئیں۔"

"تم نے اپنی بدزبانیوں سے اسے ناراض کردیا ہوگا۔ ورنہ وہ مجھ سے ملے بغیر نہ جاتی۔"

"میں نے تو صرف یہی کہا تھا ان کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔"

"تو تم سمجھتے ہو جس کی طبیعت اچھی نہ ہو اس کو تنہائی میں مرنے دینا چاہیے آدمی تنہائی میں مرنا بھی نہیں چاہتا۔ اس کی دلی خواہش ہوتی ہے کہ ایسے موقعوں پر اس کے عزیز و اقارب اسے آکر گھیر لیں۔" کھانسی کی شدّت سے وہ ایک منٹ تک بے قرار رہے پھر بولے۔"میں کہتا ہوں تم کچھ سڑی تو نہیں ہوگئے ہو، اچھی دوکانداری ہی سے کسی کی زندگی کی اصلاح نہیں ہوجاتی۔ سمجھ گئے، کامیاب آدمی وہی ہے جو دوسروں سے اپنا کام بھی نکالے اور ان پر احسان بھی رکھے۔

شیخی مارنا کامیابی کی دلیل نہیں، اوچھے پن کی دلیل ہے۔ وہ میرے پاس آتی تو یہاں سے خوش ہوکر جاتی۔ اور یہ سمجھ لو کہ اس کی خوشی بڑے کام کی چیز ہے۔ شہر میں اس کی کتنی دھاک ہے شاید تمھیں اس کی خبر نہیں، وہ اگر تمھیں نقصان پہنچانا چاہے تو ایک دن میں تمھیں تباہ کرسکتی ہے اور وہ تمھیں تباہ کرکے چھوڑے گی میری بات گرہ میں باندھ لو۔ جس نے اپنے شوہر کی پرواہ نہ کی، اپنی جان کی پرواہ نہ کی .... نہ جانے کب تمھیں عقل آئے گی۔"

کھانسی کا دوسرا دورہ ہوا۔ منی رام نے دوڑ کر انھیں لٹایا اور ان کی پیٹھ سہلانے لگا۔ ایک منٹ کے بعد لالہ جی سانس لے سکے۔

منی نے متفکر ہوکر کہا۔"اس ڈاکٹر کی دوا سے آپ کو کچھ فائدہ نہیں ہو رہا ہے کہیے تو کبیراج کو تار دے کر بلالوں۔"

دھنی رام نے لمبا سانس کھینچ کر کہا۔"اچھا تو ہوں گا بیٹا میں کسی سادھو کی چٹکی بھر راکھ سے، ہاں یہ تماشا چاہے کرلو اور یہ تماشا کچھ بُرا نہیں رہا۔ ایسے تماشوں میں تھوڑا سا روپیہ خرچ کردینے کو میں بُرا نہیں سمجھتا۔ لیکن اس وقت کے لیے اتنا بہت ہے۔ کل ڈاکٹر صاحب سے کہہ دوں گا اب آپ کی ضرورت نہیں۔ تشریف لے جائیے۔"

منی رام نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔"کہیے تو سکھدا دیوی کے پاس جاؤں؟"

دھنی رام نے پُرغرور لہجے میں کہا۔ "نہیں میں تمھیں ذلیل نہیں کرنا چاہتا۔ ذرا مجھے یہ دیکھنا ہے کہ وہ کتنی بے نفس ہے۔ میں نے کتنی بار نقصان اُٹھائے مگر ذلت نہیں اُٹھائی۔ سمرکانت کو میں نے دیکھ لیا۔ وہ لاکھ بُرا ہو، پر دل کا صاف ہے۔ اب ان کی بہو کا امتحان ہے۔"

یہ کہہ کر انھوں نے لکڑی اُٹھائی اور آہستہ آہستہ اپنے کمرے کی طرف چلے۔ منی رام انھیں دونوں ہاتھوں سے سنبھالے جارہا تھا۔

(۱۱)

ساون میں نینا میکے آئی۔ سُسرال چار قدم پر تھی لیکن چھے مہینے سے پہلے آنے کی نوبت نہ آئی۔ منی رام کا بس چلتا تو اب بھی رخنے ڈالتا۔ لیکن سارا گھر نینا کی طرف تھا۔ ساون میں سب ہی بہوئیں میکے جاتی ہیں۔ نینا پر اتنا بڑا ظلم نہیں کیا جاسکتا۔

ساون کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ کہیں کوئی مکان گرتا تھا کہیں کوئی چھت بیٹھتی تھی۔ سکھدا برآمدے میں بیٹھی ہوئی، آنگن میں اُٹھتے ہوئے بلبلوں کا تماشا دیکھ رہی تھی۔ آنگن کچھ گہرا تھا۔ پانی رک جایا کرتا تھا۔ بلبلوں کا بتاشوں کی طرح اُٹھ کر کچھ دور چلنا اور غائب ہوجانا اس کے لیے بڑی دلچسپی کا سامان تھا۔ کبھی کبھی دو بلبلے آمنے سامنے آجاتے اور کترا کر ایک دوسرے کی بغل سے نکل جاتے۔ اس محویت کے عالم میں سکھدا کو ایسا معلوم ہوا گویا یہ بلبلے جاندار ہیں، گویا ننھے ننھے بچّے گول ٹوپیاں دئے پانی میں دوڑ رہے ہیں۔

اسی وقت نینا نے پکارا۔ "بھابی آؤ ناؤ ناؤ کھیلیں۔ میں ناؤ بنا رہی ہوں۔"

سکھدا نے بلبلوں کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "تم کھیلو، میرا جی نہیں چاہتا۔"

نینا نے نہ مانا، کاغذ کی دو ناویں لیے آکر سکھدا کو اُٹھانے لگی "جس کی ناؤ کنارے تک پہنچ جائے اسی کی جیت۔ پانچ پانچ روپے کی بازی۔"

سکھدا نے بے دلی سے کہا۔ "تم میری طرف سے بھی ایک چھوڑ دو۔ جیت جانا تو روپے لے لینا مگر اس کی مٹھائی نہیں آئے گی بتائے دیتی ہوں۔"

"تو کیا دوائیں آئیں گی؟"

"واہ اس سے اچھی اور کیا بات ہوگی۔ شہر میں ہزاروں آدمی کھانسی اور بخار میں مبتلا ہیں۔"

دفعتاً للّو نے آکر دونوں ناویں چھین لیں اور انھیں پانی میں ڈال کر تالیاں بجانے لگا۔
نینا نے بچّے کا بوسہ لے کر کہا۔ ''وہاں دو ایک بار روز اسے یاد کر کے روتی تھی۔''
سکھدا نے پوچھا۔ ''میری یاد بھی کبھی آتی تھی؟''
''کبھی نہیں، ہاں بھیّا کی آتی تھی۔ مگر وہ اتنے بے درد کہ چھے مہینے میں ایک خط بھی نہ لکھا۔ میں نے بھی ٹھان لی ہے کہ جب تک ان کا خط نہ آئے گا میں بھی نہ لکھوں گی۔''
''تو سچ مچ تمھیں میری یاد نہ آتی تھی۔ اور میں سمجھ رہی تھی کہ تم میرے لیے بے قرار ہوگی۔ آخر اپنے بھائی کی بہن ہی تو ہو، آنکھ اوٹ پہاڑ اوٹ۔''
''مجھے تو تمھارے اوپر غصّہ آتا تھا۔ اتنے دنوں میں صرف تین بار گئیں اور ایک بار بھی للّو کو نہ لے گئیں۔''
''وہ جاتا تو آنے کا نام نہ لیتا۔''
''تو کیا میں اس کی دشمن تھی؟''
''ان لوگوں پر میرا اعتبار نہیں ہے میں کیا کروں۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ تم وہاں کیسے رہتی تھیں۔''
''تو کیا کرتی، بھاگ آتی تب بھی تو زمانہ مجھ ہی پر ہنستا۔''
''اچھا سچ بتانا منی رام تم سے محبت کرتے ہیں۔''
''وہ تو تمھیں معلوم ہی ہے۔''
''میں تو ایسے آدمی سے ایک بار بھی نہ بولتی۔''
''میں بھی کبھی نہیں بولی۔''
''سچ! بہت بگڑے ہوں گے۔ اچھا سارا قصہ کہو۔ سہاگ رات کو کیا ہوا؟ دیکھو تمھیں میری قسم ایک لفظ بھی جھوٹ نہ بولنا۔''
نینا نے چیں بہ جبیں ہو کر کہا۔ ''بھابی تم مجھے دق کرتی ہو۔ لے کر قسم رکھا دی، جاؤ میں کچھ نہیں بتاتی۔''
''اچھا نہ بتاؤ بھائی کوئی زبردستی ہے۔''
وہ اُٹھ کر جانے لگی کہ نینا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ''اب بھاگ کہاں جاتی ہو، قسم

تو دے چکیں۔ بیٹھ کر سنتی جاؤ۔ آج تک میرے اور ان کے درمیان ایک بار بھی بول چال نہیں ہوئی۔"

سکھدا تعجب سے بولی۔"سچ۔"

نینا نے دردناک لہجے میں کہا۔"ہاں بالکل سچ بھابی۔ جس دن میں گئی اُس دن رات کو وہ گلے میں ہار ڈالے، آنکھیں نشے میں لال، متوالوں کی طرح آپہنچے۔ اور میرا گھونگھٹ اُٹھاتے ہوئے بولے میں تمھارا گھونگھٹ دیکھنے نہیں آیا ہوں۔ اور نہ مجھے یہ ڈھکوسلا پسند ہے۔ آکر اس کرسی پر بیٹھو۔ میں اُن دقیانوسی مردوں میں نہیں ہوں جو یہ گڑیوں کا کھیل کھیلتے ہیں۔ تمھیں ہنس کر میرا خیر مقدم کرنا چاہیے تھا اور تم گھونگھٹ نکالے بیٹھی ہو گویا میرا منہ نہیں دیکھنا چاہتیں۔ ان کا ہاتھ پڑتے ہی مجھے ایسا لگا جیسے کسی سانپ نے ڈس لیا۔ میں سر سے پاؤں تک تھرّا اُٹھی۔ انھیں میرے جسم کو ہاتھ لگانے کا کیا حق ہے؟ یہ سوال ایک شعلے کی طرح میرے دل میں اُٹھا۔ میری آنکھوں سے آنسو گرنے لگے وہ سارے سنہرے خواب جو کئی دن سے میں دیکھ رہی تھی پریشان ہوگئے۔ اس میں نہ تو دیوتاپن تھا نہ آدمی پن، یہاں تو صرف بے حیائی تھی، بے ہودگی تھی اور غرور تھا۔ میں عقیدت کی تھال میں اپنے دل کا سارا خلوص، ساری مسرّت اور ساری محبت لیے اس دیوتا کے قدموں پر نثار ہونے کے لیے بیٹھی ہوئی تھی۔ ان کی یہ قطع دیکھ کر جیسے تھال میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ میرے وجود کا ایک ایک ذرہ اس حکومت کے خلاف بغاوت کرنے لگا۔ میرے جی میں آیا کہ میں بھی کہہ دوں کہ تمھارے ساتھ میری شادی کا یہ مطلب نہیں کہ میں تمھاری لونڈی ہوں۔ اگر تم میرے آقا ہو تو میں بھی تمھاری رانی ہوں۔ محبت کی حکومت کے سوا میں کوئی دوسری حکومت قبول نہیں کرسکتی اور نہ چاہتی ہوں کہ تم بھی قبول کرو۔ لیکن جی ایسا جل رہا تھا کہ ملامت بھی نہ کرسکی۔ فوراً وہاں سے اُٹھ کر برآمدے میں آکھڑی ہوئی۔ وہ کچھ دیر کمرے میں میرا انتظار کرتے رہے پھر جھلا کر اُٹھے اور میرا ہاتھ پکڑ کر اندر لے جانا چاہا۔ میں نے جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا اور غضب ناک ہوکر بولی۔"میں یہ ذلت نہیں برداشت کرتی۔"

"آپ بولے، اس صورت پر یہ نخرے۔"

"میرے جسم میں آگ لگ گئی۔ کوئی جواب نہ دیا۔ ایسے آدمی سے بولنا بھی شان

کے خلاف معلوم ہوا۔ میں نے اندر جاکر کواڑ بند کرلیے اور اس دن سے پھر ان سے نہ بولی۔ میں تو ایشور سے مناتی ہوں کہ وہ اپنی شادی کرلیں اور مجھے چھوڑ دیں۔ جو آدمی صرف روپ کا بھوکا ہے، جو صرف ناز و ادا کا غلام ہے، جس کے لیے عورت محض نفع کا ایک ذریعہ ہے اسے میں اپنا شوہر کیسے سمجھتی؟"

سکھدا نے مذاقاً پوچھا۔"لیکن تم نے ہی اپنی محبت کا کیا ثبوت دیا۔ کیا شادی کے نام میں ہی اتنی برکت ہے کہ تمھارے میاں آتے ہی تمھارے قدموں پر سر رکھ دیتے؟"

نینا نے جوش کے ساتھ کہا۔"ہاں میں تو سمجھتی ہوں کہ شادی کے نام ہی میں برکت ہے۔ جو شخص شادی کو روحانی فرض نہیں سمجھتا، محض نفس پروری کا ایک ذریعہ سمجھتا ہے وہ حیوان ہے۔"

دفعتاً شانتی کمار پانی میں لت پت آکر کھڑے ہوگئے۔

سکھدا نے پوچھا۔"بھیگ کہاں گئے، کیا چھتری نہ تھی؟"

شانتی کمار نے برساتی اُتار کر الگنی پر رکھ دی اور بولے۔"آج بورڈ کا جلسہ تھا۔ لوٹتے وقت کوئی سواری نہ ملی، وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔"

"کتنے ووٹوں سے ہارے؟"

"صرف پانچ ووٹوں سے ہارے۔"

"صرف پانچ ووٹوں سے، یہ لالہ دھنی رام کی حرکت تھی۔"

سکھدا نے مایوس ہوکر کہا۔"تو اب۔"

"اب تو اخباروں اور تقریروں سے عوام میں بیداری پیدا کرنی ہوگی۔"

سکھدا برانگیختہ ہوکر بولی۔"جی نہیں، مجھ میں اتنا تحمل نہیں ہے۔ میں لالہ دھنی رام اور ان کے پٹھوؤں کو چین کی نیند نہ لینے دوں گی۔ اتنے دنوں سب کی خوشامد کرکے دیکھ لیا۔ اب اپنی طاقت سے کام لینا پڑے گا۔"

شانتی کمار لالہ دھنی رام سے جلے ہوئے تھے بولے۔"لالہ دھنی رام نے تو مجھے دھمکی تک دی۔"

سکھدا برہم ہوکر بولی۔"دھنی رام کیوں، یہ ذمہ داری بورڈ پر ہے میں ان محلوں میں رہنے والوں کو دکھا دوں گی کہ عوام کیا کرسکتے ہیں۔ لالہ دھنی رام زمین کے ان ٹکڑوں پر

اپنے قدم نہ جما سکیں گے۔"
شانتی کمار نے دبی ہوئی آواز سے کہا۔"میرے خیال میں تو اس وقت پروپگنڈہ کرنا ہی کافی ہے۔ ورنہ معاملہ طول پکڑ جائے گا۔"
وقف بن جانے کے بعد سے شانتی کمار کسی جوکھم کے کام میں آگے قدم اُٹھاتے ہوئے گھبراتے تھے۔ اب ان کے اوپر ایک ادارے کا بوجھ تھا۔ اب انھیں بات بات میں بدنامی اور اس ادارے کے برباد ہوجانے کا خوف ہوتا تھا۔
سکھدا نے ملامت آمیز لہجے میں کہا۔"آپ کیا باتیں کررہے ہیں۔ ڈاکٹرصاحب میں نے ان لکھے پڑھے خودغرضوں کو خوب دیکھ لیا۔ مجھ پر اب روشن ہوگیا کہ یہ لوگ محض زبان کے شیریں ہیں۔ میں انھیں دکھادوں گی کہ جن غریبوں کو تم اب تک کچلتے آئے ہو وہ سانپ بن کر تمھارے پیروں میں لپٹ جائیں گے۔ اب تک ہم لوگ ان سے رعایت کے خواستگار تھے۔ مگر اب ہم جو کچھ مانگیں گے اپنا حق سمجھ کر مانگیں گے۔ رعایتوں سے وہ ہمیں محروم رکھ سکتے ہیں لیکن ہمارے حقوق سے کون انکار کرسکتا ہے۔ رعایت کے لیے کوئی جان نہیں دیتا لیکن حق کے لیے جان دینا سب ہی جانتے ہیں۔ میں بھی دیکھوں گی کہ لالہ دھنی رام اور ان کے پٹھو کتنے پانی میں ہیں۔"
یہ کہتی ہوئی سکھدا بارش میں کمرے سے نکل آئی اور باہر چلی گئی۔
ایک منٹ کے بعد شانتی کمار نے نینا سے پوچھا۔"کہاں چلی گئیں؟ بہت جلد گرم ہوجاتی ہیں۔"
نینا نے اِدھر اُدھر دیکھ کر خدمت گار سے پوچھا تو معلوم ہوا سکھدا باہر چلی گئی۔
شانتی کمار نے متعجب ہوکر کہا۔"اس بارش میں کہاں گئی ہوں گی۔ میں ڈرتا ہوں کہیں ہڑتال وڑتال نہ کرانے لگیں۔ تم تو وہاں جاکر مجھے بھول گئیں نینا۔ ایک خط بھی نہ لکھا۔"
یکایک انھیں ایسا معلوم ہوا کہ ان کے منہ سے کوئی نازیبا بات نکل گئی۔ نینا سے یہ سوال پوچھنا غیر مناسب تھا۔ اس کا وہ دل میں نہ جانے کیا مطلب سمجھے۔ انھیں ایسا محسوس ہوا کہ ان کا دم گھٹ رہا ہے۔ وہ وہاں سے نکل بھاگنے کے لیے راستہ ڈھونڈنے لگے۔ وہ وہاں لمحہ بھر نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ ان کے دل میں ہل چل ہونے لگی۔ کہیں نینا ناراض ہوکر کچھ کہہ نہ بیٹھے ایسی حماقت مجھ سے کیوں سرزد ہوگئی۔ اب تو شاید وہ یہاں کسی کو منہ نہ

دکھا سکیں۔

نینا کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ وہ کچھ جواب نہ دے کر للو کو پکارتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ شانتی کمار بت کی طرح بیٹھے رہے۔ آخر وہ سر جھکائے ہوئے اس طرح چلے گویا جوتے پڑگئے ہوں۔ نینا کا وہ سرخ چہرہ ایک شعلے کی طرح ان کے قلب کو جلائے ڈالتا تھا۔

نینا نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ "کہاں چلے ڈاکٹر صاحب بارش تو رُک جانے دیجیے۔"

شانتی کمار نے کچھ بولنا چاہا لیکن الفاظ کی جگہ حلق میں جیسے نمک کا ڈلا پڑا تھا۔ وہ تیزی سے باہر چلے گئے۔ اس طرح لڑکھڑاتے ہوئے گویا اب گرے اب گرے۔ آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔

(۱۲)

اب بھی موسلادھار بارش ہو رہی تھی شام سے پہلے شام ہوگئی تھی اور سکھدا ٹھاکردوارے میں بیٹھی ہوئی ایسی ہڑتال کا انتظام کر رہی تھی جو میونسپل بورڈ اور اس کے کارپردازوں کا سر ہمیشہ کے لیے نیچا کردے انھیں اس کا تجربہ ہوجائے کہ جن لوگوں کو وہ حقیر سمجھتے ہیں ان ہی کی خدمت اور شفقت پر ان کی زندگی قائم ہے۔ سارے شہر میں ایک سنسنی سی چھائی ہوئی تھی گویا کسی غنیم نے شہر کا محاصرہ کرلیا ہو۔ کہیں دھوبیوں کا جماؤ ہو رہا ہے، کہیں چماروں کا کہیں مہتروں کا۔ نائی، کہاروں کی پنچایت الگ ہورہی ہے۔ سکھدا دیوی کے حکم سے کون انحراف کرسکتا تھا۔ سارے شہر میں یہ خبر اتنی جلد پھیل گئی کہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ ایسے موقعوں پر خبر رسانی کے ذریعے گویا غیب سے مہیا ہوجاتے ہیں۔ خبریں اپنے آپ ہوا میں دوڑنے لگتی ہیں۔ مہینوں سے عوام کو یہ امید ہورہی تھی کہ نئے نئے گھروں میں رہیں گے۔ جہاں دھوپ ہوگی ہوا ہوگی۔ سب ہی ایک نئی زندگی کا خواب دیکھ رہے تھے۔ مگر آج شہر نے ان کی آرزوؤں پر پانی پھیر دیا۔

شہر کی مخلوق اب اس حالت میں نہ تھی کہ اس پر کتنی ہی بے رحمیاں ہوں اور وہ چپ چاپ برداشت کرتی جائے۔ اسے اپنے حقوق کا علم ہوگیا تھا کہ اسے بھی آرام سے رہنے کا اتنا حق ہے، جتنا اہلِ ثروت کو۔ ایک بار منظم تحریک کی کامیابی دیکھ چکے تھے۔ حکام کی یہ مطلق العنانی یہ خودغرضی، یہ غریب کشی اب ان سے برداشت نہ ہوتی تھی۔ اور یہ کوئی سیاسیات کی اصول جنگ نہ تھی جس کی حقیقی صورت ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ اس

تحریک کی کامیابی کا اندازہ وہ خود کرسکتے تھے۔ تخیل یا قوتِ فکر پر زور دینے کی ضرورت نہ تھی۔ شام ہوتے ہوتے ٹھاکر دوارے میں اچھا خاصا بازار لگ گیا۔

دھوبیوں کا چودھری میکو اپنے بکرے کی سی داڑھی ہلاتا، نشے سے آنکھیں لال کیے ہوئے بولا۔ ''کپڑے بنا رہا تھا کہ کھبر ملی، بھاگا آرہا ہوں۔ گھر میں کہیں کپڑے رکھنے کو جگہ نہیں ہے۔ گیلے کپڑے کہاں سوکھیں۔''

اس پر جگن ناتھ مہرا نے اس کو ڈانٹا ''جھوٹ مت بولو میکو، تم کپڑے بنا رہے تھے۔ ابھی سیدھے تاڑی خانے سے چلے آرہے ہو۔ اس کے پیچھے برباد ہوگئے مگر لت نہ چھوڑی۔''

میکو نے تیز ہوکر کہا۔ ''لے اب چپ رہو چودھری! نہیں ساری کلئی کھول دوں گا۔ گھر میں بیٹھ کر بوتل کی بوتل اُڑا جاتے ہو اور یہاں آکر پارسائی جتاتے ہو۔''

مہتروں کا جمعدار متئی کھڑا ہوکر اپنی جمعداری کی شان سے بولا۔ ''پنچو یہ بکھت یاد ہوائی باتیں کرنے کا نہیں ہے۔ جس کام کے لیے سرکار نے بلایا ہے اس کو دیکھو اور پھیسلا کرو کہ اب ہمیں کیا کرنا ہے، انھیں بلوں میں پڑ کر سڑتے رہیں یا چل کر حاکموں سے پھریاد کریں۔''

سکھدا نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ''حاکموں سے جو کچھ کہنا سننا تھا کہہ چکے۔ کسی نے کان نہ دیا۔ چھے مہینے سے یہی کہا سنی ہو رہی ہے۔ جب اب تک اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا تو اب کیا امید کی جائے۔ ہم نے آرزو منت سے کام نکالنا چاہا تھا لیکن معلوم ہوا یہ پُرانی کہاوت اب بھی اتنی ہی سچّی ہے کہ سیدھی انگلیوں گھی نہیں نکلتا۔ ہم جتنا دبیں گے یہ لوگ ہمیں اتنا ہی دبائیں گے۔ آج تمھیں یہ طے کرنا ہے کہ تم اپنے حق کے لیے لڑنے کو تیار ہو یا نہیں۔''

چماروں کا مکھیا سمیر لاٹھی ٹیکتا ہوا، موٹے چشمے لگائے، پوپلے منہ سے بولا ''ارج ماروج کرنے کے سوا اور ہم کرہی کیا سکتے ہیں اور ہمارا کیا بس ہے۔''

مرلی کھٹیک نے بڑی بڑی مونچھوں پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ ''بس کیسے نہیں ہے۔ ہم آدمی نہیں ہیں۔ کیا ہمارے بال بچّے نہیں ہیں۔ کسی کو تو محل اور بنگلہ چاہیے۔ ہمیں کچّا گھر بھی نہ ملے۔ میرے گھر میں پانچ آدمی ہیں۔ ان میں سے چار آدمی مہینے بھر سے بیمار ہیں۔

اس کال کوٹھری میں بیمار نہ ہوں تو اور کیا ہوں۔ سامنے گندہ نالہ بہتا ہے سانس لیتے ناک پھٹتی ہے۔"

عیدو کنجڑا اپنی جھکی ہوئی کمر کو سیدھا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔"اگر مقدر میں آرام کرنا لکھا ہوتا تو ہم بھی کسی بڑے آدمی کے گھر نہ پیدا ہوتے؟ حاجی حلیم آج بڑے آدمی ہوگئے۔ نہیں میرے سامنے جوتے بیچتے تھے۔ بڑی لڑائی ان کے لیے مبارک ہوگئی۔ اب رئیسوں کے سے ٹھاٹ ہیں۔ سامنے چلا جاؤں تو پہچانیں گے بھی نہیں۔ نہیں تو پیسے پیسے کی مولی ترئی اُدھار لے جاتے تھے۔ اللہ بڑا کارساز ہے۔ اب تو لڑکا بھی حاکم ہوگیا ہے کیا پوچھنا ہے۔"

جنگلی گھوسی پورا کالا دیو تھا۔ شہر کا مشہور پہلوان۔ بولا۔"میں تو پہلے ہی جانتا تھا۔ کچھ ہونا ہوانا نہیں ہے۔ امیروں کے سامنے ہمیں کون پوچھتا ہے۔"

معمار امیر بیگ پتلی گردن نکال کر بولا۔"بورڈ کے فیصلے کی اپیل تو کہیں ہوتی ہوگی۔ ہائی کورٹ میں کیوں نہ اپیل کی جائے۔ ہائی کورٹ نہ سنے تو بادشاہ سے فریاد کی جائے۔"

سکھدا نے مسکرا کر کہا۔"بورڈ کے فیصلے کی اپیل وہی ہے جو تمھارے سامنے ہور ہی ہے۔ تمھیں ہائی کورٹ ہو۔ تمھیں جج ہو۔ بورڈ امیروں کے لیے ہے۔ غریبوں کے محلے کھود کر پھینک دیے جاتے ہیں اس لیے کہ امیروں کے محل بنیں۔ غریبوں کو دس پانچ روپے معاوضہ دے کر اسی زمین کے ہزاروں روپے وصول کیے جاتے ہیں۔ اس روپے سے افسروں کو بڑی بڑی تنخواہیں دی جاتی ہیں۔ جس زمین پر ہمارا دعوا تھا وہ لالہ دھنی رام کو دے دی گئی۔ وہاں ان کے بنگلے بنیں گے۔ بورڈ کو روپے پیارے ہیں۔ تمھاری جان کی اس کی نگاہ میں کوئی قیمت نہیں۔ ان خودغرضوں سے انصاف کی امید چھوڑ دو۔ تمھارے پاس کتنی طاقت ہے اس کا انھیں خیال نہیں ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ ادنیٰ درجے کے لوگ ہمارا کر ہی کیا سکتے ہیں۔ انھیں ابھی ہماری طاقت کا تجربہ نہیں ہوا۔ ہمیں لڑائی نہیں کرنی ہے نہ فساد کرنا ہے، صرف ہڑتال کرنا ہے۔ یہ دکھانے کے لیے کہ تم نے بورڈ کے فیصلے کو منظور نہیں کیا۔ اور یہ ہڑتال ایک دور روز کی نہ ہوگی۔ یہ اس وقت تک رہے گی جب تک بورڈ وہ فیصلہ رد کرکے ہمیں وہ زمین نہ دے دے۔ میں جانتی ہوں ایسی ہڑتال کرنا آسان نہیں ہے۔ تم لوگوں میں بہت سے ایسے ہیں جن کے پاس ایک دن کو بھی کھانے کو

نہیں ہے۔ مگر یہ بھی جانتی ہوں کہ بغیر تکلیف اُٹھائے آرام نہیں ملتا۔"

سمیر کی جوتے کی دوکان تھی۔ تین چار چمار نوکر تھے۔ مزدور سے سرمایہ دار بن گیا تھا۔ گھاس والوں اور سائیسوں کو سود پر روپیہ قرض دیا کرتا تھا۔ موٹی عینکوں کے پیچھے سے بچوں کی طرح تاکتا ہوا بولا۔"ہڑتال کرنا تو ہماری برادری میں مشکل ہے۔ بہو جی، یوں آپ کا گلام ہوں، اور جانتا ہوں کہ آپ جو کچھ کریں گی ہماری بھلائی کے لیے کریں گی۔ مگر ہماری برادری میں ہڑتال ہونا مشکل ہے۔ بے چارے دن بھر گھاس کھودتے ہیں سانجھ کو بجار میں بیچتے ہیں تب چولھے پر توا چڑھتا ہے۔ کوئی کسی رئیس کا سہیس ہے، کوئی کوچوان۔ ان کی نوکری جاتی رہے گی۔ اب تو سب ہی جات والے سہیسی کوچوانی کرتے ہیں۔ ان کی نوکری دوسرے اُڑالیں تو بے چارے کہاں جائیں گے۔"

سکھدا میں اختلاف کا تحمل نہ تھا۔ ان موانعات کی اس کی نگاہ میں کوئی وقعت نہ تھی تند لہجے میں بولی۔"تو کیا تم نے سمجھا تھا کہ بغیر کچھ کیے دھرے اچھے اچھے مکان رہنے کو مل جائیں گے۔ دنیا میں جو زیادہ سے زیادہ تکلیف سہہ سکتا ہے اسی کی فتح ہوتی ہے۔"

متئی جمعدار نے کہا۔"ہڑتال سے نقصان تو سب ہی کو ہوگا۔ کیا ہم ہوئے کیا تم ہوئے۔ لیکن بغیر دھوئیں کے آگ تو نہیں جلتی۔ بہو جی کو پاکر اگر ہم کچھ نہ کرسکے تو سمجھ لو زندگی بھر ٹھوکریں کھانی پڑیں گی۔ جو یہ کہتے ہو کہ نوکری چلی جائے گی تو نوکر تو ہم سب بھی ہیں۔ کوئی سرکار کے نوکر ہیں کوئی رئیس کے نوکر ہیں۔ ہم کو یہاں کسم کھانی پڑے گی کہ جب تک ہڑتال رہے کوئی کسی کی جگہ پر نہ جائے چاہے بھوکوں بھلے مر جائے۔"

سمیر نے متئی کو جھڑک کر کہا۔"جمعدار تم بات تو سمجھتے نہیں بیچ میں کود پڑتے ہو۔ تمھاری اور بات ہے ہماری اور بات ہے۔ ہمارا کام سب ہی کرتے ہیں تمھارا کام اور کوئی نہیں کرسکتا۔"

میکو نے سمیر کی تائید کی "یہ تم نے بہت ٹھیک کہا سمیر چودھری! ہمیں کو دیکھو، اب پڑھے لکھے آدمی دھلائی کا کام کرنے لگے ہیں۔ جگہ جگہ کمپنیاں کھل گئی ہیں۔ گاہک کے گھر پہنچنے میں ہمیں ایک دن کی دیر ہوجاتی ہے تو وہ چٹ پٹ کمپنی میں کپڑے بھیج دیتا ہے۔ ہمارے ہاتھ سے گاہک نکل جاتا ہے۔ ہڑتال دس پانچ دن چلی تو ہم تو کہیں کے بھی

نہ رہیں گے۔ ابھی پیٹ کی روٹیاں تو چل جاتی ہیں۔ تب تو روٹیوں کے بھی لالے پڑجائیں گے۔"

مرلی کھٹیک نے للکار کر کہا۔"جب کچھ کرنے کا بوتا نہیں تھا تو لڑنے کس برتے پر چلے تھے۔ کیا سمجھتے تھے یہاں بھی رونے سے دودھ مل جائے گا۔ وہ زمانہ اب نہیں ہے۔ اگر اپنا اور بال بچوں کا آرام چاہتے ہو تو سب طرح کی آفتوں کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ نہیں گھر میں جاکر آرام سے بیٹھو اور مکھیوں کی طرح مرو۔"

عیدو نے عقیدت مندانہ جوش سے کہا۔"ہوگا وہی جو مکدر میں ہے۔ ہائے ہائے کرنے سے کچھ ہونے کا نہیں۔ حاجی حلیم مکدر ہی سے بڑے آدمی ہوگئے۔ اللہ کو منجور ہوگا تو مکان بنتے دیر نہ لگے گی۔"

جنگلی نے اس کی تائید کی۔"بس تم نے لاکھ روپے کی بات کہہ دی عیدو میاں، اب تو دودھ کا سودا ٹھہرا۔ ایک دن دودھ نہ پہنچے یا دیر ہوجائے تو لوگ گھڑکیاں جمانے لگتے ہیں۔ ہم ڈیری سے دودھ لیں گے۔ تم بہت دیر کرتے ہو۔ ہڑتال دس پانچ دن چلی گئی تو ہمارا تو دیوالہ پٹ جائے گا۔ دودھ تو ایسی چیز نہیں کہ آج نہ بکے کل بک جائے گا۔"

عیدو بولا۔"یہی حال تو ساگ پات کا بھی ہے۔ بھائی! پھر برسات کے دن ہیں۔ سبو کی چیز شام کو سڑ جاتی ہے۔ کوئی سینت بھی نہیں پوچھتا۔"

امیر بیگ نے اپنی سارس کی سی گردن اُٹھائی اور کہا۔"بھو جی میں تو کوئی کائدا کانون جانتا نہیں۔ بس اتنا جانتا ہوں کہ بادشاہ سے پھریاد کی جائے تو وہ جرور سُنے گا۔ بادشاہ لوگ راتوں کو بھیس بدل کر رعیت کی حالت دیکھنے نکلتے ہیں۔ اگر ایسی ارجی تیار کی جائے جس پر ہم سب کے دسکھت ہوں اور بادشاہ کے سامنے پیش کی جائے اس کا جرور لہاج رکھا جائے گا۔"

سکھدا نے جگناتھ کی طرف پُرامید نظروں سے دیکھ کر کہا۔"تم کیا کہتے ہو جگناتھ! ان لوگوں نے تو جواب دے دیا۔"

جگناتھ نے بغلیں جھانکتے ہوئے کہا۔"تو بھو جی اکیلا چنا تو بھاڑ پھوڑ نہیں سکتا۔ اگر سب بھائی ساتھ دیں تو میں تیار ہوں۔ ہماری برادری کی روجی تو نوکری سے چلتی ہے۔ کچھ لوگ کھونچے لگاتے ہیں، کوئی ڈولی ڈھوتا ہے۔ لیکن بہت کرکے ہم لوگ بڑے آدمیوں کی

ٹہل کرتے ہیں۔ دو چار دن تو بڑے گھروں کی عورتیں بھی گھر کا کام دھندا کرلیں گی۔ ہم لوگوں کا تو ستیاناس ہی ہوجائے گا۔"

سکھدا نے اس کی طرف سے بھی منہ پھیر لیا اور متئی سے بولی۔ "تم کیا کہتے ہو جمعدار! کیا تم نے بھی ہمت چھوڑدی؟"

متئی نے چھاتی ٹھونک کر کہا۔ "بات کہہ کر نکل جانا پاجیوں کا کام ہے سرکار! آپ کا جو حکم ہوگا اس کے باہر نہیں جاسکتا۔ چاہے جان رہے یا جائے۔ گھدا کے پھجل سے برادری پر اتنی دھاک ہے کہ جو بات میں کہوں گا اسے کوئی ڈلک نہیں سکتا۔"

سکھدا نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "اچھی بات ہے۔ کل سے تم برادری کی ہڑتال کروا دو۔ دوسرے چودھریوں کو میری طرف سے چھٹی ہے۔ میں خود گھر گھر گھوموں گی۔ ایک ایک کے پاؤں پڑوں گی اور ہڑتال کراکے چھوڑوں گی اور ہڑتال نہ ہوئی تو منہ میں کالکھ لگا کے ڈوب مروں گی۔ مجھے تم لوگوں سے بڑی امید تھی۔ تمھارا بڑا زور تھا۔ بڑا غرور تھا۔ تم نے میرا غرور توڑ دیا۔"

یہ کہتی ہوئی وہ ٹھاکر دوارے سے نکل کر پانی میں بھیگتی ہوئی چلی گئی۔ متئی بھی اس کے پیچھے پیچھے چلا گیا۔ دوسرے چودھری اپنی خطاوار صورتیں لیے بیٹھے رہے۔

ایک لمحے کے بعد جگناتھ بولا۔ "بہو جی نے سیر کا کلیجہ پایا ہے۔"

سمیر نے پوپلا منہ چبلا کر کہا۔ "لچھمی کا اوتار ہے۔ لیکن بھائی روجگار نہیں چھوڑا جاتا حاکموں کی کون چلاوے۔ مہینے دو مہینے نہ سنیں تو یہاں تو مر مٹیں گے۔"

عیدو کو دور کی سوجھی۔ "مر نہیں مٹیں گے پنچو، چودھریوں کو جیل میں ٹھونس دیا جائے گا۔ ہو کس پھیر میں۔ حاکموں سے لڑنا ٹھٹھا نہیں ہے۔"

جنگلی نے حامی بھری۔ "ہم کیا کھا کر رئیسوں سے لڑیں گے۔ بہو جی کے پاس دولت ہے، علم ہے۔ وہ جو چاہیں کرسکتی ہیں۔ ہماری تو بدھیا بیٹھ جائے گی۔"

مگر سب ہی دل میں شرمندہ تھے۔ جیسے میدان سے بھاگا ہوا سپاہی۔ اسے اپنی جان بچنے کی جتنی خوشی ہوتی ہے۔ اس سے کہیں زیادہ بھاگنے کی شرم ہوتی ہے۔ وہ زبان سے چاہے اس فعل کی تعریف کرے، دل سے نہیں کرسکتا۔

ذرا دیر میں پانی رُک گیا اور یہ لوگ بھی یہاں سے چلے۔ لیکن ان کے اداس چہروں

میں، ان کی دھیمی چال میں، ان کے جھکے ہوئے سروں میں اور ان کی فکر آمیز خاموشی میں ان کے دل کے جذبات جھلک رہے تھے۔

(۱۳)

سکھدا گھر پہنچی تو بہت ملول تھی۔ قومی زندگی میں شکست کا اُسے یہ پہلا تجربہ تھا اور اس کا دل کسی چابک کھائے ہوئے الھڑ بچھیڑے کی طرح سارا ساز و بم اور رسّیاں توڑ تاڑ کر کہیں بھاگ جانے کے لیے بے قرار ہو رہا تھا۔ ایسے پست ہمّت آدمیوں سے کیا امید کی جاسکتی ہے۔ جو لوگ اپنے ذاتی فائدے کے لیے تھوڑی سی تکلیف نہیں اُٹھا سکتے ان کے لیے دنیا میں ذات اور نکبت کے سوا کیا رکھا ہے۔ نینا دل میں اس کی شکست پر خوش تھی۔ اپنی سسرال میں اس کی کچھ پوچھ نہ تھی۔ سب ہی اس سے بدگمان تھے۔ تاہم اس کی زندگی اسی خاندان سے تو وابستہ تھی۔ اپنی آنکھیں دکھتی ہیں تو پھوڑ نہیں دی جاتیں۔ سیٹھ دھنی رام نے جو زمین ہزاروں میں خریدی تھی۔ تھوڑے ہی دنوں میں اس کے لاکھوں میں بکنے کی امید تھی۔ وہ سکھدا سے کچھ کہہ تو نہ سکتی تھی مگر یہ تحریک اسے بُری معلوم ہوتی تھی۔ سکھدا سے اسے اب وہ حسنِ اعتقاد نہ رہا تھا۔ اپنے حاسدانہ جذبات کو پورا کرنے ہی کے لیے تو وہ شہر میں آگ لگا رہی ہے۔

نینا نے مبصرانہ انداز سے کہا۔"اگر یہاں کے آدمیوں کو منظّم کردینا اتنا آسان ہوتا تو یہ حالت ہی کیوں ہوتی؟"

سکھدا برانگیختہ ہوکر بولی۔"ہڑتال تو ہوگی، چاہے لوگ مانیں یا نہ مانیں۔ یہ چودھری موٹے ہوگئے ہیں اور موٹے آدمی خودغرض ہوجاتے ہیں۔"

نینا نے اعتراض کیا اور بولی۔"ایسی حالت میں ڈرنا انسان کا فطری خاصا ہے۔ جس میں ہمت ہے، عقل ہے، قوت ہے وہ مشکلوں کو حقیر سمجھ سکتا ہے۔ جن کی زندگی ہمیشہ افلاس اور ذلت میں بسر ہوئی ہو، ان سے آپ میدانِ عمل میں آنے کی امید نہیں رکھ سکتیں۔"

سکھدا نے گویا یہ دلیل سُنی ہی نہیں۔ بولی۔"مندر والے جھگڑے میں ان سبھوں میں نہ جانے کیسے ہمت آگئی تھی۔ میں ایک بار پھر وہی حالت پیدا کردینی چاہتی ہوں۔"

نینا نے کانپ کر کہا۔"نہیں بھابی اتنی بڑی ذمے داری سر پر نہ لو۔ وقت آجانے پر

سب کچھ اپنے آپ ہی ہوجاتا ہے۔ دیکھو ہم لوگوں کے دیکھتے ہی دیکھتے کم سنی کی شادیاں اور چھوت چھات کی بندشیں اور دوسری رسمیں کتنی کم ہوگئیں۔ تعلیم کا شوق کتنا زیادہ ہوگیا۔ موقع آجانے پر غریبوں کے مکانات بھی بن جائیں گے۔"

"یہ تو پست ہمتوں کی دلیل ہے۔ ہمت اسے کہتے ہیں جو موقع کو اپنے موافق بنالے۔"

اس کے لیے اپنے خیالات کی اشاعت کرنی چاہیے۔"

"چھے مہینے والی راہ ہے۔"

"لیکن خطرہ تو نہیں ہے۔"

"مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کو مجھ پر اعتبار نہیں ہے۔"

ایک لمحے کے بعد اس نے پھر کہا۔"مگر میں نے ابھی خدمت ہی کون سی ایسی کی ہے کہ لوگوں کا مجھ پر اعتبار ہو۔ دوچار گھنٹے گلیوں کا چکر لگا لینا اور کبھی کبھی تقریریں کرلینا کوئی خدمت نہیں ہے۔"

نینا بولی۔"میں تو سمجھتی ہوں اس وقت ہڑتال کرانے سے لوگوں کو جو تھوڑی بہت ہمدردی ہے وہ بھی غائب ہوجائے گی۔"

سکھدا نے اپنے رانوں پر ہاتھ پٹک کر کہا۔"ہمدردی سے کام چلتا تو رونا کس بات کا تھا۔ میں صرف ہمدردی نہیں چاہتی۔ میں قوتِ عمل چاہتی ہوں جو نتائج سے بے پروا ہوکر میرے اشاروں پر چلے۔ لیکن اس گھر میں رہ کر اور امیرانہ شان سے زندگی بسر کرکے میں عوام کے دلوں پر قابو نہیں پاسکتی۔ میں اب تک اسی نتیجے پر پہنچی ہوں۔"

دوسرے دن شہر میں اچھی خاصی ہڑتال تھی۔ مہتر تو ایک بھی کام کرتا نظر نہ آتا تھا۔ یکے بانوں اور گاڑی بانوں نے بھی کام بند کردیا تھا۔ سبزی، ترکاری کی دوکانیں بھی آدھی سے زیادہ بند تھیں۔ کتنے ہی گھروں میں دودھ کے لیے ہائے ہائے مچی ہوئی تھی۔ پولیس اور حکام دوکانیں کھلوا رہے تھے اور مہتروں کو جبراً کام پر لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ شہر کے رؤسا بھی اس کوشش میں شریک تھے۔

دوپہر کا وقت تھا، گھٹا اُمڈی چلی آتی تھی۔ سڑکوں اور گلیوں میں جابجا پانی جمع تھا۔ اسی کیچڑ میں لوگ ادھر ادھر دوڑتے پھرتے تھے۔ سکھدا کے دروازے پر ایک بھیڑ لگی ہوئی

تھی کہ دفعتاً شانتی کمار گھٹنے تک کیچڑ لپیٹے برآمدے میں کھڑے ہوگئے۔ کل کی باتوں کے بعد آج انھیں یہاں آتے تامل ہو رہا تھا۔ نینا نے انھیں دیکھا مگر اندر نہ بلایا۔ سکھدا اپنی ماں سے باتیں کر رہی تھی۔ شانتی کمار پل بھر کھڑے رہے، پھر دل شکستہ ہوکر چلنے کو تیار ہوئے۔

سکھدا نے ان کی صورت دیکھی تاہم طعنہ زنی سے نہ چوکی۔ ''کسی نے آپ کو یہاں آتے دیکھ تو نہیں لیا ڈاکٹر صاحب!''

شانتی کمار نے طنز کی اس چوٹ کو خوش طبعی سے روکا۔ ''خوب دیکھ بھال کر آیا ہوں۔ کوئی یہاں دیکھ بھی لے گا تو کہہ دوں گا روپے اُدھار لینے آیا ہوں۔''

راما دیوی نے ڈاکٹر صاحب سے دیور کا رشتہ جوڑ لیا تھا۔ آج سکھدا نے کل کا واقعہ سنا کر اسے ڈاکٹر کو نشانۂ تضحیک بنانے کا سامان بہم پہنچا دیا تھا۔ حالانکہ بالواسطہ ڈاکٹر صاحب کو محتاط بنانے کا باعث وہ خود تھی۔ اسی نے وقف کا بوجھ ان کے سر پر رکھ ننانوے کے پھیر میں ڈال دیا تھا۔

اس نے ڈاکٹر صاحب کا ہاتھ پکڑ کر کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہا۔ ''چوڑیاں پہن کر بیٹھونا۔ یہ مونچھیں کیوں بڑھا لی ہیں؟'' شانتی کمار نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''میں تیار ہوں لیکن مجھ سے شادی کرنے کے لیے تیار رہیے گا۔ آپ کو مرد بننا پڑے گا۔''

راما تالی بجا کر بولی۔ ''میں تو بوڑھی ہوں لیکن تمھارا خصم ایسا ڈھونڈوں گی جو تمھیں سات پردوں کے اندر رکھے۔ اور گالیوں سے بات کرے۔ گہنے میں بنوا دوں گی۔ مانگ میں سیندور ڈال کر گھونگھٹ نکالنا پڑے گا۔ پہلے خصم کھا لے گا تو اس کا جھوٹا کھانے کو ملے گا۔ سمجھ گئے۔ اور اسے دیوتا کا تبرک سمجھ کر کھانا پڑے گا۔ ذرا بھی ناک بھوں سکوڑی تو کلچھنی کہلاؤ گے۔ اس کے پاؤں دھونے پڑیں گے۔ اور بچّے بھی جننے پڑیں گے۔ بچّے نہ ہوئے تو وہ دوسری شادی کر لے گا۔ پھر گھر میں لونڈی بن کر رہنا پڑے گا۔''

شانتی کمار پر پیہم اتنی چوٹیں پڑیں کہ ساری ہنسی بھول گئے۔ منہ ذرا سا نکل آیا۔ مارے خفت کے زبان بند ہوگئی۔ راما نے دو چار بار پہلے بھی ان سے ہنسی کی تھی مگر آج تو رُلا کر ہی چھوڑا۔ پھکڑبازی میں عورت اپنا جواب نہیں رکھتی۔ خاص کر جو بوڑھی ہو۔

انھوں نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ ''ایک بج رہا ہے۔ آج تو ہڑتال اچھی رہی۔''

راما دیوی نے پھر چٹکی لی۔"آپ تو گھر میں لیٹے تھے۔ آپ کو کیا خبر۔"

شانتی کمار نے اپنی کارگزاری دکھائی۔"میں ان آرام سے لیٹنے والوں میں نہیں ہوں دیوی جی! ہر ایک تحریک میں ایسے آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے جو خفیہ طور پر اس کی امداد کرتے رہیں۔ میں نے اپنا طرزِ عمل بدل دیا ہے اور مجھے تجربہ ہو رہا ہے کہ میں اس ڈھنگ سے قوم کی کچھ خدمت کرسکتا ہوں۔ آج نوجوان سبھا کے دس بارہ رضاکاروں کو تعینات کر آیا ہوں ورنہ اس کی چوتھائی ہڑتال بھی نہ ہوتی۔"

راما نے بیٹی کی پیٹھ پر تھپکی دے کر کہا۔"تب تو انھیں کیوں بدنام کررہی تھی سکھدا۔ بے چاروں نے اتنی جان کھپائی پھر بھی بدنام۔ یہ مصلحت میری بھی سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔ سب کا آگ میں کودنا مناسب نہیں۔"

شانتی کمار کل کا پروگرام طے کرکے اور سکھدا کو اطمینان دلا کر رخصت ہوئے۔

شام ہوگئی تھی۔ بادل کھل گئے تھے اور چاند کی سنہری ضیاء زمین کے آنسوؤں سے بھیگے ہوئے منہ پر گویا مادرانہ الفت کی بارش کر رہی تھی۔ سکھدا سندھیا کرنے بیٹھ گئی۔ اس وقت اس کے دل کی کمزوری کسی ضدی لڑکے کی طرح روتی ہوئی معلوم ہوئی۔ کیا منی رام نے اس کی وہ تحقیر نہ کی ہوتی تو وہ ہڑتال کے لیے اتنی ضد کرتی؟

اس کے غرور نے کہا۔"ہاں ہاں ضرور ہوتی یہ خیال اس کے دل میں بہت پہلے آیا تھا۔ دھنی رام کا نقصان ہوتا ہے تو ہو، وہ اس خوف سے اپنے فرض سے منہ نہ موڑے گی۔ جب وہ اپنی زندگی تک اس جہاد میں قربان کرنے کے لیے تلی ہوئی ہے تو دوسروں کے سود و زیاں کی اسے کیا فکر ہوسکتی ہے۔"اس طرح دل کو سمجھا کر اس نے سندھیا پوری کی اور نیچے اتری تھی کہ لالہ سمرکانت آکر کھڑے ہوگئے۔ ان کے چہرے پر کسی روحانی تکلیف کی جھلک تھی اور ہونٹ اس طرح پھڑک رہے تھے گویا دل کے جذبات باہر نکلنے کے لیے مضطرب ہو رہے ہیں۔

سکھدا نے پوچھا۔"آپ کچھ گھبرائے ہوئے ہیں دادا جی کیا بات ہے؟"

سمرکانت کا سارا جسم کانپ اُٹھا۔ آنسوؤں کے سیلاب کو بہ زور روکنے کی کوشش کرکے بولے۔"ایک پولیس کا افسر دوکان پر ایسی خبر دے گیا ہے کہ کیا کہوں۔"

یہ کہتے کہتے ان کی آواز جیسے گہرے پانی میں ڈبکیاں کھانے لگی۔

سکھدا نے گھبرا کر پوچھا۔"تو بتلایئے نا کیا کہہ گیا ہے؟ ہردوار میں تو سب خیریت ہے۔"

سمرکانت نے اس کی تشویش کو دوسری طرف بھٹکتے ہوئے دیکھ کر جلدی سے کہا۔"نہیں نہیں ادھر کی کوئی بات نہیں ہے۔ تمھارے بارے میں تھی۔ تمھاری گرفتاری کا وارنٹ نکل گیا ہے۔"

سکھدا نے ہنس کر کہا۔"اچھا میری گرفتاری کا وارنٹ ہے تو اس کے لیے آپ اتنے کیوں پریشان ہیں۔ لیکن آخر میرا قصور کیا ہے؟"

سمرکانت نے دل کو سنبھال کر کہا۔"قصور یہی ہڑتال ہے اور کیا۔ آج افسروں میں صلاح ہوئی ہے اور وہاں یہی طے ہوا ہے کہ تمھیں اور چودھریوں کو گرفتار کرلیا جائے۔ ہر ایک بیماری کی ان کے پاس ایک ہی دوا ہے۔ فساد کے اسباب دور نہ کریں گے بس پکڑ دھکڑ سے کام لینا چاہتے ہیں۔ جیسے کوئی ماں بھوک سے روتے ہوئے بچے کو پیٹ کر چپ کرنا چاہے۔"

سکھدا افسردہ خاطر ہوکر بولی۔"جس قوم کی بنیاد ہی بے انصافی پر ہو اس کی سرکار کے پاس سختی کے سوا اور کیا دوا ہوسکتی ہے۔ لیکن اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ تحریک فرو ہوجائے گی۔ اسی طرح جیسے کوئی گیند ٹکر کھا کر دوگنے زور سے اچھلتی ہے، اتنا ہی اس کا جواب بھی زوردار ہوگا۔" ایک لمحے کے بعد اس نے جوش میں آکر کہا۔"مجھے گرفتار کرلیں۔ ان لاکھوں غریبوں کو کہاں لے جائیں گے جن کی آہوں کا دھواں بادل بن کر آسمان پر چھایا ہوا ہے۔ یہی آہیں ایک دن کسی آتش فشاں پہاڑ کی طرح پھٹ کر ساری قوم اور قوم کے ساتھ سرکار کو بھی غارت کردیں گی۔ اگر کسی کی آنکھیں نہیں کھلتیں نہ کھلیں۔ میں نے اپنا فرض پورا کردیا۔ ایک دن آئے گا جب آج کے دیوتا کنکر پتھر کی طرح اُٹھا اُٹھا کر گلیوں میں پھینک دیئے جائیں گے اور پیروں سے ٹھکرائے جائیں گے۔ میرے گرفتار ہوجانے سے چاہے کچھ دنوں کے لیے حکام کے کانوں میں غریبوں کی آہ و زاری کی آواز نہ پہنچے لیکن وہ دن دور نہیں ہے جب یہی آنسو چنگاری بن کر اس بے انصافی کو جلاکر خاک کردیں گی۔ اسی پھونس سے وہ آگ روشن ہوگی جس کے کانپتے ہوئے شعلے آسمان تک کو ہلادیں گے۔"

سمرکانت پر اس مجنونانہ تقریر کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ اس بلا کو رد کرنے کی ترکیب سوچ رہے تھے۔ ڈرتے ڈرتے بولے۔ ''بُرا نہ مانو بہو تو ایک بات کہوں ضمانت دی جائے تو کیسا ہو؟''

سکھدا نے تیوری چڑھا کر کہا۔ ''نہیں، ہرگز نہیں۔ میں کیوں ضمانت دوں کیا اس لیے کہ میری سزا دور ہوجائے گی۔ کیا میں یہ وعدہ کرسکتی ہوں کہ کسی سرکاری معاملے میں اپنی زبان نہ کھولوں گی۔ اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ لوں گی۔ اس سے تو کہیں اچھا ہے کہ اپنی آنکھیں پھوڑ لوں اور زبان ہمیشہ کے لیے بند کرلوں۔''

سمرکانت کا تحمّل اعتدال سے متجاوز ہوچکا تھا۔ تند لہجے میں بولے۔ ''اگر تمھاری زبان تمھارے قابو میں نہیں ہے تو کٹوا لو۔ میں اپنے جیتے جی یہ ذلت گوارا نہیں کرسکتا کہ تم گرفتار ہو اور میں بیٹھا دیکھوں۔ تم نے ہڑتال کرانے سے پہلے مجھ سے پوچھا کیوں نہیں۔ تمھیں اپنے نام کی لاج نہ ہوگی مجھے تو ہے۔ جس خاندانی وقار کی حفاظت کے لیے اپنے بیٹے کو بھی ترک کردیا..........''

باہر سے موٹر کا ہارن سنائی دیا۔ سکھدا کے کان کھڑے ہوگئے۔ وہ سراسیمگی کے عالم میں دروازے کی طرف چلی۔ پھر دوڑ کر للو کو نینا کی گود سے لے لیا۔ اور اسے سینے سے لگاتے ہوئے اپنے کمرے میں جاکر اپنے زیور اُتارنے لگی۔ سمرکانت کا سارا غصہ کچے رنگ کی طرح پانی پڑتے ہی اُڑ گیا۔ لپک کر باہر گئے اور ایک لمحے میں آکر بولے۔ ''وہ ڈپٹی آگیا میں ضمانت دینے جا رہا ہوں، میری اتنی التجا قبول کرو، بہو، تھوڑے دنوں کا مہمان اور ہوں۔ مجھے مرجانے دو، پھر جو کچھ جی میں آئے کرنا۔'' سکھدا کمرے کے دروازے پر آکر مستقل انداز میں بولی۔ ''میں نے کوئی قصور نہیں کیا ہے اور نہ ضمانت دوں گی۔''

سمرکانت نے اپنی زندگی میں کبھی ہار نہ مانی تھی۔ لیکن آج اس خوددار حسینہ کے سامنے محجوب اور مغلوب کھڑے تھے۔ انھوں نے سوچا عورتوں کو دنیا صنف نازک کہتی ہے۔ کتنی بڑی جہالت ہے۔ انسان جس چیز کو جان سے بھی زیادہ عزیز سمجھتا ہے وہ اس کی مٹھی میں ہے۔ اسے نازک کیوں کہتے ہو۔

انھوں نے انکسار کے ساتھ کہا۔ ''لیکن کچھ کھانا تو کھا لو۔ کھڑی منہ کیا دیکھتی ہے نینا، کیا بھنگ کھا گئی ہے، جا بہو کو کھانا کھلادے، ارے او مہرا، مہرا، یہ نہ جانے کہاں جاکر

مر رہا۔ وقت پر ایک بھی آدمی نظر نہیں آتا۔ تو بہو کو رسوئی میں لے جا۔ کچھ مٹھائی لیتا آؤں ساتھ کچھ کھانا بھی تو لے جانا ہی پڑے گا۔"

کہار اوپر بچھاون بچھا رہا تھا۔ دوڑتا ہوا آکر کھڑا ہوگیا۔ سمرکانت نے اسے زور سے ایک لات جما کر کہا۔"کہاں تھا تو۔ اتنی دیر سے پکار رہا ہوں۔ سنتا ہی نہیں کس کے لیے بچھاون بچھا رہا ہے؟ بہو تو جا رہی ہے۔ جا دوڑ کر بازار سے اچھی اچھی مٹھائیاں لا۔"

سکھدا نے منع کرتے ہوئے کہا۔"مٹھائی کی مجھے بالکل ضرورت نہیں ہے دادا، اور نہ کچھ کھانے ہی کو جی چاہتا ہے۔ کچھ کپڑے ساتھ لیے جاتی ہوں یہی کافی ہے۔"

باہر سے آواز آئی۔"سیٹھ جی دیوی جی کو جلد بھیجیے دیر ہورہی ہے۔"

سمرکانت باہر آئے اور مجرم کی طرح کھڑے ہوگئے۔

پولیس افسر دوہرے بدن کا، رعب دار مگر خوش اخلاق آدمی تھا۔ جو شاید اور کسی سیغے میں اچھی جگہ نہ پانے کی باعث پولیس میں چلا آیا تھا۔ بلا ضرورت حکومت جتانے سے اُسے نفرت تھی۔ اور حتی الوسع رشوت نہ لیتا تھا۔ پوچھا۔"کیا رائے ہوئی؟"

سمرکانت نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔"کچھ نہیں سنتی حضور، سمجھا کر ہار گیا اور میں اسے کیا سمجھاؤں۔ مجھے وہ سمجھتی ہی کیا ہے۔ اب تو آپ لوگوں کی شفقت کا بھروسہ ہے۔ مجھ سے جو خدمت کہیے اس کے لیے حاضر ہوں۔ جیلر صاحب سے تو آپ کا ربط ضبط ہوگا ہی۔ انھیں بھی سمجھا دیجیے گا کوئی تکلیف نہ ہونے پائے۔ میں کسی طرح بھی باہر نہیں ہوں، نازک مزاج عورت ہے حضور۔"

ڈپٹی نے سیٹھ جی کو برابر کی کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہا۔"آپ تو حضرت مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔ یہ طرزِ عمل وہاں کے لیے ہے جہاں بُری نیت سے کوئی کام کیا جاتا ہے۔ دیوی جی جو کچھ کر رہی ہیں وہ غریبوں کی بہتری کے لیے۔ انھیں کسی طرح کی تکلیف نہ ہوگی اس کا اطمینان رکھیے۔ نوکری سے مجبور ہوں۔ ورنہ یہ دیویاں تو اس لائق ہیں کہ ان کے قدموں پر سر رکھے۔"

سیٹھ جی نے صندوق سے دو اشرفیاں نکالیں اور چپکے سے ڈپٹی صاحب کی جیب میں ڈالتے ہوئے بولے۔"یہ بچّوں کی مٹھائی کے لیے ہے۔"

ڈپٹی نے اشرفیاں جیب سے نکال کر میز پر رکھ دیں اور بولا۔"آپ پولیس والوں کو

بالکل جانور ہی سمجھتے ہیں کیا سیٹھ جی! کیا لال پگڑی سر پر رکھنا ہی انسانیت کا خون کرنا ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ دیوی جی کو کوئی تکلیف نہ ہونے پائے گی۔ تکلیف انھیں دی جاتی ہے جو دوسروں کو تکلیف دیتے ہیں۔ جو غریبوں کے حق کے لیے اپنی زندگی قربان کرتے ہیں انھیں اگر کوئی ستائے تو وہ انسان نہیں، حیوان بھی نہیں، شیطان ہے۔ ہمارے صیغے میں ایسے آدمی ہیں اور کثرت سے ہیں۔ میں خود فرشتہ نہیں ہوں۔ لیکن ایسے معاملوں میں پان تک کھانا حرام سمجھتا ہوں۔ مندر والے معاملے میں دیوی جی جس دلیری سے میدانِ عمل میں آکر گولیوں کے سامنے کھڑی ہوگئی تھیں وہ انھیں کا کام تھا۔"

سامنے سڑک پر عوام کا ہجوم ہر لمحہ بڑھتا جاتا تھا۔ بار بار جے کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔

اندر نینا اور سکھدا میں معرکہ چھڑا ہوا تھا۔ سکھدا نے تھالی سامنے سے ہٹا کر کہا۔"میں نے کہہ دیا میں کچھ نہ کھاؤں گی۔"

نینا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔"دو چار لقمے ہی کھا لو بھابی۔ تمھارے پیروں پڑتی ہوں۔ پھر نہ جانے یہ دن کب آئے۔"

اس کی آنکھیں پُرنم ہوگئیں۔

سکھدا بے دردی سے بولی۔"تم مجھے ناحق پریشان کر رہی ہو بی بی۔ مجھے ابھی بہت سی تیاریاں کرنی ہیں اور اُدھر ڈپٹی جلدی مچا رہا ہے۔ دیکھتی نہیں ہو۔ دروازے پر ڈولی کھڑی ہے۔ اس وقت کھانے کی کسے سوجھتی ہے۔"

نینا نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔"تم اپنا کام کرتی رہو۔ میں تمھیں لقمے بنا کر کھلاتی جاؤں گی۔"

جیسے ماں کھلنڈرے بچّے کے پیچھے دوڑ دوڑ کر اسے کھلاتی ہے اسی طرح نینا بھابی کو کھلانے لگی۔ سکھدا کبھی اس الماری کے پاس جاتی، کبھی اس الماری کے پاس۔ نینا ایک لقمہ کھلا کر پھر تھال کے پاس جاتی اور دوسرا لقمہ لے کر دوڑتی۔

پانچ چھے لقمے کھا کر سکھدا نے کہا۔"بس اب پانی پلادو۔"

نینا نے لقمہ اس کے منہ کے پاس لے جاکر کہا۔"بس یہی لقمہ اور لے لو، میری اچھی بھابی۔"

سکھدا نے منہ کھول دیا اور لقمے کے ساتھ آنسو بھی پی گئی۔

"بس ایک اور۔"

'اب ایک لقمہ بھی نہیں۔"

"میری خاطر سے۔"

"سکھدا نے لقمہ لے لیا۔"

"پانی بھی دوگی یا کھلاتی ہی جاؤگی۔"

"بس ایک لقمہ بھیّا کے نام کا اور لے لو۔"

"ہرگز نہیں۔"

دونوں ہی کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ مگر نینا کے آنسو نیچے گر رہے تھے۔ سکھدا کے آنکھوں ہی میں خشک ہوئے جاتے تھے۔ نینا ان کے سیلاب میں ڈوبی جاتی تھی۔ سکھدا ضبط سے انھیں روکے ہوئے تھی۔ دل آزار الفاظ سے اس کے دل کے چاروں طرف ایک کھائی سی بنا دینا چاہتی تھی۔ تاکہ وہ رنج و غم اور جدائی کے حملوں سے محفوظ رہے۔ لیکن نینا کی وہ چھلچھلائی ہوئی آنکھیں، وہ کانپتے ہوئے ہونٹ، وہ لجاجت آمیز بے کسی معذور کیے دیتی تھی۔

نینا نے جلدی جلدی پان کے بیڑے لگائے اور بھابی کو کھلانے لگی تو اس کے دبے ہوئے آنسو فوارے کی طرح اُبل پڑے۔ منہ پھیر کر رونے لگی۔ سسکیاں اور گہری ہوکر حلق تک جا پہنچیں۔

سکھدا نے اسے گلے لگا کر پُردرد الفاظ میں کہا۔"کیوں روتی ہو بی بی درمیان میں ملاقات تو ہوتی ہی رہے گی۔ جیل میں مجھ سے ملنے آنا تو اچھی اچھی چیزیں بناکر لانا۔ دوچار مہینے میں تو میں پھر آجاؤں گی۔"

نینا نے گویا ڈوبتی ہوئی ناؤ پر سے کہا۔"میں ایسی بدنصیب ہوں کہ آپ تو ڈوبی ہی تھی تمھیں بھی لے ڈوبی۔"

یہ الفاظ پھوڑے کی طرح اسی وقت سے اس کے دل میں تپک رہے تھے۔ جب سے اس نے سکھدا کی گرفتاری کی خبر سُنی تھی۔ یہ ٹیس اس کے صدمۂ جدائی کو اور بھی جگردوز بنا رہی تھی۔

سکھدا نے تعجب سے اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر کہا۔"یہ تم کیا کہہ رہی ہو بی بی، کیا تم نے پولیس بلائی ہے؟"

نینا نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔"یہ پتھر کی حویلی والوں کی سازش ہے۔ (سیٹھ دھنی رام شہر میں اسی نام سے مشہور تھے) میں کسی کو گالیاں نہیں دیتی۔ لیکن ان کا کیا ان کے آگے آئے گا۔ جس آدمی کے لیے ایک منہ سے دعا نہ نکلے اس کا جینا بے کار ہے۔"

سکھدا نے غمگین ہو کر کہا۔"ان لوگوں کی اس میں کوئی خطا نہیں ہے بی بی، یہ سب ہمارے سماج کا ہم سبھوں کا قصور ہے۔ اچھا آؤ اب رخصت ہوں۔ وعدہ کرو کہ میرے جانے پر روؤ گی نہیں۔"

نینا نے اس کے گلے سے لپٹ کر سوجی ہوئی لال آنکھوں سے مسکرا کر کہا "نہیں روؤں گی بھابی۔"

"اگر میں نے سُنا کہ رو رہی ہو تو میں اپنی سزا بڑھوا لوں گی۔"

"بھیا کو تو یہ ساری کیفیت لکھنی ہی ہوگی۔"

"تمھاری جیسی خوشی ہو کرنا، اماں کو سمجھاتی رہنا۔"

"ان ۔َ، پاس کوئی آدمی بھیجا گیا ہے یا نہیں؟"

"انھں بلانے سے اور دیر ہی ہوتی۔ گھنٹوں نہ چھوڑتیں۔"

"ن کر دوڑی آویں گی۔"

"ہاں آئیں گی تو مگر روئیں گی نہیں۔ ان کی محبت آنکھوں میں ہے دل تک اس کی جڑ ہیں پہنچی۔"

دونوں دروازے کی طرف چلیں۔ نینا نے للو کو ماں کی گود سے اُتار کر پیار کرنا چاہا مگر وہ نہ اُترا۔ نینا سے بہت ہلا ہوا تھا۔ مگر آج وہ اپنی نادان آنکھوں سے دیکھ رہا تھا کہ ماں کہیں جا رہی ہے۔ اس کی گود سے کیسے اُترے۔ اسے چھوڑ کر وہ چلی جائے تو وہ بے چارہ کیا کرے گا۔

نینا نے اس کا بوسہ لے کر کہا۔"بچے بڑے بے درد ہوتے ہیں۔"

سکھدا نے مسکرا کر کہا۔"لڑکا کس کا ہے۔"

دروازے پر پہنچ کر پھر دونوں گلے ملیں۔ سمرکانت بھی ڈیوڑھی پر کھڑے تھے۔

سکھدا نے ان کے قدموں پر سر جھکایا۔ انھوں نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے اُٹھاکر دعا دی۔ پھر للو کو کلیجے سے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ یہ گویا سارے گھر کو رونے کا سگنل تھا۔ آنسو تو پہلے ہی نکل رہے تھے۔ مگر وہ گریۂ خاموش گویا قید سے آزاد ہوگیا۔ صابر، شاکر، متوکل اور متین بڑھاپا جب ضبط کھو بیٹھتا ہے تو گویا پنجرے کے دروازے کھل جاتے ہیں اور چڑیوں کو روکنا غیر ممکن ہوجاتا ہے۔ جب ستر برس تک عرصۂ گیتی میں جما رہنے والا آزمودہ کار سورما ہتھیار ڈال دے تو رنگروٹوں کو کون روک سکتا ہے۔ جب موٹر چلی تو ہزاروں آدمی اس کے پیچھے دوڑ رہے تھے اور سکھدا ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر انھیں پرنام کرتی جاتی تھی۔ یہ اعزاز، یہ محبت، یہ عقیدت کیا دولت سے مل سکتی ہے۔ یا علم سے؟ نہیں اس کا صرف ایک ذریعہ ہے اور وہ ہے خدمت۔ اور سکھدا کو ابھی اس میدان میں آئے ہوئے کتنے دن ہی ہوئے تھے؟

سڑک کے دونوں طرف مرد عورتوں کی دیوار کھڑی تھی اور موٹر جیسے ان کے دلوں کو کچلتی مسلتی چلی جاتی تھی۔

سکھدا کے دل میں غرور نہ تھا، کدورت نہ تھی، صرف درد تھا۔ لوگوں کی اس بیکسی پر، اس زبوں حالی پر جو ڈوبتی ہوئی حالت میں تنکے کا سہارا پاکر پھولی نہیں سماتی۔

کچھ دیر بعد سڑک پر سناٹا تھا۔ ساون کی نیند سے کالی رات دنیا کو اپنے آنچل میں سلا رہی تھی اور موٹر اس فضائے تاریک میں خواب کی طرح اُڑی۔ چلی جارہی تھی۔ صرف جسم میں ٹھنڈی ہوا لگنے سے حرکت کا علم ہوتا تھا۔ اس تاریکی میں سکھدا کے باطن میں ایک روشنی سی نمودار ہوئی۔ کچھ ویسی ہی روشنی جو ہماری زندگی کے آخری لمحوں میں بیدار ہوجاتی ہے۔ جس میں دل کی ساری کدورتیں، ساری ناہمواریاں اپنی اصلی صورت میں نظر آنے لگتی ہیں۔ تب ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اندھیرے میں جس چیز کو ہم نے کالا دیو سمجھا تھا۔ وہ صرف خاشاک کا ایک ڈھیر تھا جسے کالا ناگ سمجھا تھا وہ رسّی کا ایک ٹکڑا تھا۔ آج اسے اپنی شکست کا علم ہوا بے انصافی کے سامنے نہیں، ظلم کے سامنے نہیں، جھوٹ کے سامنے نہیں بلکہ ایثار کے سامنے اور خدمت کے سامنے، اسی ایثار اور قربانی کی بدولت تو شوہر سے اسے اختلاف ہوا تھا۔ جو بالآخر اس صورت میں نمودار ہوا۔ زندگی کے اس معیار کو باطل سمجھ کر بھی وہ اس طرف کھنچی چلی جاتی تھی اور آج وہ اپنے شوہر کی مقلد تھی۔

اسے امر کے اس خط کی یاد آئی جو اس نے شانتی کمار کے پاس بھیجا تھا اور پہلی بار شوہر کی طرف سے اس کے دل میں عفو کا جذبہ پیدا ہوا، اس عفو میں ہمدردی تھی۔ ہمنوائی تھی، اشتراک تھا۔ اب دونوں ایک ہی راہ کے مسافر ہیں۔ ایک ہی مندر کے پجاری ہیں۔ ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ کوئی اختلاف نہیں ہے آج پہلی بار اسے اپنے شوہر سے روحانی مناسبت ہوئی۔ جس مورت کو اس نے پتھر کا ٹکڑا سمجھ رکھا تھا اسی کی آج وہ پھول مالا سے پوجا کر رہی ہے۔

دفعتاً موٹر رُکی اور ڈپٹی نے اُتر کر سکھدا سے کہا۔"دیوی جی جیل آگیا۔ اب مجھے معاف کیجیے گا۔" سکھدا ایسی خوش تھی گویا اپنے شوہر سے ملنے آئی ہے۔

چوتھا حصّہ

(۱)

امرکانت کو جیسے ہی معلوم ہوا کہ سلیم یہاں کا افسر ہوکر آیا ہے تو اس سے ملنے چلا۔ خوش تھا کہ گپ شپ ہوگی۔ یہ خیال تو آیا کہ کہیں اس میں افسری کی بو' نہ آگئی ہو۔ لیکن بچھڑے ہوئے دوست سے ملنے کی خوشی نہ روک سکا۔ بیس پچیس میل کا پہاڑی راستہ تھا۔ سردی خوب پڑنے لگی تھی۔ آسمان کہر کے دھند سے مٹیالا ہو رہا تھا اور اس دھند میں سورج جیسے ٹٹول ٹٹول کر راستہ ڈھونڈھتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ کبھی سامنے آجاتا، کبھی چھپ جاتا۔ امر تڑکے چلا تھا۔ اسے امید تھی کہ دن رہتے پہنچ جاؤں گا۔ مگر دن ڈھلتا جاتا تھا اور معلوم نہیں ابھی اور کتنا راستہ باقی ہے۔ اس کے پاس صرف ایک دیسی کمبل تھا، رات کو کسی درخت کے نیچے فروکش ہونے کا خیال ہی جاں شکن تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے آفتاب رخصت ہوگیا۔ اندھیرا گویا منہ کھولے دنیا کو نگلنے چلا آرہا تھا۔ امر نے قدم اور تیز کیے۔ شہر میں داخل ہوا تو آٹھ بج گئے تھے۔

سلیم اسی وقت کلب سے لوٹا تھا۔ خبر پاتے ہی باہر نکل آیا۔ مگر اس کی سج دھج دیکھی تو جھجکا اور گلے ملنے کے بدلے ہاتھ بڑھا دیا۔ اردلی سامنے ہی کھڑا تھا۔ اس کے سامنے اس دہقان سے کسی طرح کی بے تکلفی کا اظہار بڑی ہمت کا کام تھا۔ اسے اپنے آراستہ کمرے میں بھی نہ لے جاسکا۔ احاطے میں چھوٹا سا باغ تھا۔ اسے ایک درخت کے نیچے لے جاکر اس نے کہا۔"تم نے کیا دھج بنا رکھی ہے جی، اتنے بے ہوش کب سے ہوگئے۔ واہ رے یہ آپ کا کُرتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ڈاک کا تھیلا ہے۔ اور یہ ڈابلوس جوتا

کس دساور سے منگوایا ہے؟ مجھے خوف ہے کہیں بے گار میں نہ دھر لیے جاؤ۔"

امر وہیں زمین پر بیٹھ گیا اور بولا۔"کچھ خاطر تواضع کی نہیں اُلٹے اور پھٹکار سنانے لگے۔ دیہاتیوں میں رہتا ہوں۔ جنٹلمین بنوں تو کیسے نباہ ہو۔ تم خوب آئے بھائی۔ اب کبھی کبھی گپ شپ ہوا کرے گی۔ وہاں کی خیر و عافیت بتاؤ۔ اور مردِ خدا تم نے یہ نوکری کیا کر لی؟ شان سے کوئی روزگار کرتے۔ سوجھی بھی تو غلامی کی۔"

سلیم نے غرور سے کہا۔"غلامی نہیں ہے جناب حکومت ہے۔ دس پانچ دن میں موٹر آیا جاتا ہے۔ پھر دیکھنا کس شان سے نکلتا ہوں۔ مگر تمھاری یہ حالت دیکھ کر دل ٹوٹ گیا۔ تمھیں یہ وضع چھوڑنی پڑے گی۔"

امر نے خوددارانہ لہجے میں کہا۔"میرا خیال تھا اور ہے کہ کپڑے محض جسم کی حفاظت کے لیے ہیں۔ نمائش کے لیے نہیں۔"

سلیم نے سوچا کتنی لچر سی بات ہے۔ دیہاتیوں کے ساتھ رہ کر یہ شخص عقل بھی کھو بیٹھا۔ بولا۔"کھانا بھی تو محض جسم کی پرورش کے لیے ہی کھایا جاتا ہے تو سوکھے چنے کیوں نہیں چباتے۔ سوکھا گیہوں کیوں نہیں پھانکتے۔ کیوں لذیذ غذائیں ڈھونڈتے ہو۔"

"میں سوکھے چنے بھی چباتا ہوں۔"

"جی ہاں، یہ سوکھے چنوں ہی کی برکت ہے۔ طاقت صاف ہوا اور احتیاط میں ہے۔ حلوے پوری سے طاقت نہیں آتی۔ اس سے سینہ نہیں نکلتا پیٹ نکلتا ہے۔ پچیس میل پیدل چلا آرہا ہوں، ہے دم؟ ذرا پانچ میل ہی چلو میرے ساتھ۔"

"معاف کیجیے۔ کسی نے کہا۔ "بڑی رانی ہو تو آؤ پیسو میرے ساتھ، پسینا تم ہی کو مبارک ہو، تم یہاں کر کیا رہے ہو؟"

"اب تو آئے ہو خود ہی دیکھ لوگے۔ میں نے زندگی کا جو نقشہ دل میں کھینچا تھا، اسی پر عمل کر رہا ہوں۔ سوامی آتمانند کے آجانے سے اور بھی سہولت ہوگئی ہے۔"

ٹھنڈ زیادہ تھی۔ سلیم کو مجبور ہوکر امرکانت کو اپنے کمرے میں لانا پڑا۔

امر نے دیکھا کمرے میں گدے دار کوچ ہیں۔ پیتل کے گملے ہیں۔ زمین پر قالین ہے۔ وسط میں سنگ مرمر کی گول میز ہے۔

امر نے دروازے پر جوتے اُتار دیے اور بولا۔"کواڑ بند کردوں ورنہ شاید کوئی تمھیں

دیکھ لے تو شرمندہ ہونا پڑے۔ تم صاحب ٹھہرے۔"

سلیم پتے کی بات سن کر جھینپ گیا۔ بولا۔"کچھ نہ کچھ تو اس کا خیال ہوتا ہی ہے بھائی۔ حالانکہ میں فیشن کا غلام نہیں ہوں۔ میں بھی سادہ زندگی بسر کرنی چاہتا تھا۔ لیکن ابا جان کی فرمائش کیسے ٹالتا؟ پرنسپل تک کہتے تھے تم پاس نہیں ہوسکتے لیکن جب رزلٹ نکلا تو سب دنگ رہ گئے۔ تمھارے ہی خیال سے میں نے یہ ضلع پسند کیا۔ کل تمھیں کلکٹر سے ملاؤں گا۔ ابھی مسٹر غزنوی سے تو تمھاری ملاقات نہ ہوگی۔ بڑا شوقین آدمی ہے اور دل کا صاف پہلی ہی ملاقات میں ان سے میری خاصی بے تکلفی ہوگئی۔ چالیس کے قریب ہوں گے مگر صیدافگنی نہیں چھوڑی برابر کیمپ لگایا کرتے ہیں۔"

امر کے خیال میں افسروں کو نیک کردار ہونا چاہیے تھا۔ سلیم اس کا قائل نہ تھا۔ دونوں دوستوں میں بحث ہوگئی۔

سلیم نے کہا۔"خشک آدمی کبھی اچھا افسر نہیں ہوسکتا۔"

امر بولا۔"نیک صفت ہونے کے لیے خشک ہونا ضروری نہیں۔"

"میں نے مُلّاؤں کو ہمیشہ خشک ہی دیکھا۔ افسروں کے لیے محض قانون کی پابندی کافی نہیں۔ میرے خیال میں تو تھوڑی سی کمزوری انسان کا زیور ہے۔ میں زندگی میں تم سے زیادہ کامیاب رہا۔ مجھے دعویٰ ہے کہ مجھ سے کوئی دشمن بھی ناراض نہیں۔ تم اپنی بیوی تک کو خوش نہ رکھ سکے۔ میں اس مُلّاپن کو دور سے سلام کرتا ہوں۔ تم ضلع کے افسر بنا دیے جاؤ تو ایک دن نہ رہ سکو۔ کوئی تم سے خوش ہی نہ ہو۔"

امر نے بحث کو طول دینا مناسب نہ سمجھا۔ کیونکہ بحث میں وہ بہت گرم ہوجایا کرتا تھا۔

کھانے کا وقت آگیا تھا۔ سلیم نے ایک شال نکال کر امر کو اوڑھا دیا۔ ایک ریشمی سلیپر اسے پہننے کو دیا۔ پھر دونوں دسترخوان پر بیٹھے۔ امر کو ایک مدّت کے بعد ایسا لذیذ کھانا نصیب میں ہوا۔ گوشت تو اس نے کھایا نہیں لیکن اور چیزیں مزے سے کھائیں۔

سلیم نے کہا۔"جو چیز کھانے کی تھی وہ تو آپ نے نکال کر رکھ دی۔"

امر نے خطاوارانہ انداز سے کہا۔"مجھے کسی قسم کا اعتراض نہیں ہے۔ لیکن اندر سے رغبت نہیں ہوتی۔ اور کہو وہاں کی کیا خبریں ہے۔ کہیں شادی وادی ٹھیک ہوئی۔"

سلیم نے چٹکی لی۔"میری شادی کی فکر چھوڑو۔ پہلے یہ بتاؤ سکینہ سے تمھاری شادی کب ہو رہی ہے۔ وہ بے چاری تمھارے انتظار میں بیٹھی ہوئی ہے۔"

امر کانت کا چہرہ پھیکا پڑگیا۔ یہ ایسا سوال تھا جس کا جواب دینا اس کے لیے سب سے مشکل تھا۔ دل کی جس کیفیت میں وہ سکینہ کی طرف لپکا تھا اب وہ بات نہ رہی تھی۔ اس وقت سکھدا اس کی زندگی میں ایک سد راہ کی طرح کھڑی تھی۔ دونوں کے جذبات اور خیالات میں کوئی مناسبت نہ تھی۔ دونوں زندگی کو مختلف نقطۂ نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ایک میں بھی یہ صفت نہ تھی کہ وہ دوسرے کو ہم خیال بنا لیتا۔ لیکن اب وہ کیفیت نہ تھی۔ کسی غیبی مشیت نے ان کی زندگی میں یکسانیت پیدا کرکے ان کی روحوں کو باہم مربوط کردیا تھا۔ امر کو خبر نہیں کہ سکھدا نے اسے معاف کیا یا نہیں۔ لیکن وہ خود سکھدا کا پجاری ہوگیا تھا۔ اسے حیرت ہوتی تھی نفس پرور سکھدا ایسی بیدار مغز کیوں کر ہوگئی۔ اور حیرت اس کے اشتیاق کو روز بروز تیز کرتی جاتی تھی۔ اسے اب اپنی اس بدگمانی کا باعث اپنی ہی کم فہمی میں چھپا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اگر وہ اب تک سکھدا کو کوئی خط نہ لکھ سکا تھا تو اس کے دو اسباب تھے۔ ایک تو شرم اور دوسرا اپنی شکست کا خیال۔ فضیلت کا وہ خیال جو مردوں کے ساتھ مخصوص ہے۔ اسے اپنی شکست کا اعتراف کرنے میں مانع تھا۔ سکھدا آزادانہ طور پر اپنے لیے ایک نئی راہ نکال سکتی ہے۔ امرکانت کی اسے مطلق ضرورت نہیں ہے۔ یہ خیال اس کی محبت اور اشتیاق کی گردن کو جیسے دبائے دیتا تھا۔ وہ اب زیادہ سے زیادہ اس کا پیرو ہوسکتا ہے۔ سکھدا اس کے میدانِ جنگ میں جاتے وقت محض کیسر یا تلک لگانے پر قانع نہیں ہے۔ وہ اس سے پہلے ہی میدان میں کو دی جا رہی ہے۔ یہ جذبہ اس کی خوددار طبیعت پر ایک ضرب تھا۔

اس نے سر جھکا کر کہا۔"مجھے اب تجربہ ہو رہا ہے کہ میں عورتوں کو خوش نہیں رکھ سکتا۔ مجھ میں وہ قابلیت ہی نہیں ہے۔ میں نے طے کرلیا ہے کہ سکینہ پر یہ ظلم نہ کروں گا۔"

"تو کم از کم اپنا فیصلہ اسے لکھ تو دیتے۔"

امر نے پُرحسرت لہجے میں کہا۔"یہ کام اتنا آسان نہیں ہے سلیم جتنا تم سمجھتے ہو۔ اسے یاد کرکے میں اب بھی دیوانہ ہوجاتا ہوں۔ اس کے ساتھ میری زندگی جنت ہوجاتی۔

اس کی وفا پر مرمٹنے کو جی چاہتا ہے۔" یہ کہتے کہتے اس کی آواز بھاری ہوگئی۔

سلیم نے ایک لمحے کے بعد کہا۔"مان لو اسے میں اپنے ساتھ شادی کرلینے پر راضی کرلوں تو تمھیں ناگوار ہوگا؟"

امرکانت نے خوش ہوکر کہا۔"نہیں بھائی جان مطلق نہیں۔ اگر تم اس کو راضی کرسکو تو میں سمجھوں گا تم سے زیادہ خوش نصیب دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ لیکن تم مذاق کر رہے ہو تم کسی رئیس زادی سے شادی کرنے کے منتظر ہوگے؟"

دونوں کھانا کھاچکے اور ہاتھ دھوکر دوسرے کمرے میں لیٹے۔

سلیم نے حقے کا کش لگا کر کہا۔"کیا تم سمجھتے ہو کہ میں مذاق کر رہا ہوں۔ اس دن میں نے ضرور مذاق کیا تھا۔ لیکن اتنے دنوں میں میں نے اسے خوب پرکھ لیا۔ اس وقت تم اس کے راستے میں نہ آجاتے تو اس میں ذرا بھی شک نہیں ہے کہ وہ اس وقت کسی دوسرے گھر میں ہوتی۔ تمھیں پاکر اس کا دل بے نیاز ہوگیا۔ تم نے اسے کیچڑ سے نکال کر مندر کی دیوی بنادیا اور دیوی کے آسن پر بیٹھ کر وہ سچ مچ دیوی ہوگئی۔ اگر تم اس سے شادی کرسکتے ہو تو شوق سے کرلو۔ میں تو المست ہوں ہی۔ دل چسپی کا کوئی دوسرا سامان تلاش کرلوں گا لیکن تم نہ کرنا چاہو تو میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔"

امر نے حقہ اپنی طرف کھینچ کر کہا۔"میں بڑے شوق سے تمھارے راستے سے ہٹا جاتا ہوں۔ لیکن ایک بات بتادو۔ تم سکینہ کو بھی دلچپی کی چیز سمجھ رہے ہو یا اسے دل سے چاہتے ہو؟"

سلیم اُٹھ بیٹھا اور بولا۔"دیکھو امر، میں نے تم سے کبھی پردہ نہیں رکھا اس لیے آج بھی پردہ نہ رکھوں گا۔ سکینہ پیار کرنے کی چیز نہیں۔ پوجنے کی چیز ہے۔ کم از کم مجھے ایسے ہی معلوم ہوتی ہے۔ میں قسم تو نہیں کھاتا کہ اس سے شادی ہوجانے پر میں کنٹھی مالا پہن لوں گا۔ لیکن اتنا جانتا ہوں کہ اس کی صحبت کے فیض سے میں زندگی میں کچھ کرسکوں گا۔ اب تک میری زندگی سیلانی پن میں گزری ہے۔ وہ میری گم گشتہ کشتی کا لنگر ہوگی۔ اس لنگر کے بغیر نہیں کہہ سکتا میری ناؤ کس بھنور میں پھنس جائے گی۔ میرے لیے ایک ایسی عورت کی ضرورت ہے جو مجھ پر حکومت کرے۔ میری لگام کھینچتی رہے۔"

امرکانت کو زندگی اس لیے دوبھر تھی کہ وہ اپنی بیوی پر حکومت نہ کرسکتا تھا۔ سلیم

ایسی بیوی چاہتا تھا جو اس پر حکومت کرسکے۔ اور مزہ یہ تھا کہ ایک ہی حسینہ میں دونوں کو اپنی اپنی مطلوب خوبیاں نظر آرہی تھیں۔

امر نے کہا۔ "میں تو سمجھتا ہوں سکینہ میں وہ بات نہیں ہے جو تم چاہتے ہو۔"

سلیم جیسے گہرائی میں ڈوب کر بولا۔ "تمھارے لیے نہیں ہے مگر میرے لیے ہے۔ وہ تمھاری پوجا کرتی ہے۔ میں اس کی پوجا کرتا ہوں۔"

اس کے بعد دو ڈھائی بجے تک دونوں میں اِدھر اُدھر کی گپ شپ ہوتی رہی۔ سلیم نے اس نئی تحریک کا بھی ذکر کیا جو اس کے سامنے شروع ہوچکی تھی اور یہ خیال بھی ظاہر کیا اس کے کامیاب ہونے کی کوئی امید نہیں۔

امر نے اپنی دلی مسرّت چھپاتے ہوئے کہا۔ "سکھدا نے تو وہاں ایک نئی دنیا کھڑی کردی۔"

"تمھاری ساس نے اپنی ساری جائداد سیوا آشرم کے نام وقف کردی۔"

"اچھا"

"اور تمھارے پدر بزرگوار اب قومی کاموں میں شریک ہونے لگے ہیں۔"

"تب تو وہاں پورا انقلاب ہوگیا۔"

سلیم تو سو گیا لیکن امر دن بھر کا تھکا ہونے پر بھی نیند کو نہ بلا سکا۔ وہ جن باتوں کا گمان بھی نہ کرسکتا۔ وہ سکھدا کے ہاتھوں پوری ہوگئیں۔ مگر کچھ بھی ہو، ہے وہی امارت، مگر ذرا بدلی ہوئی صورت میں۔ شہرت کی ہوس ہے اور کچھ نہیں۔ لیکن پھر اس نے اس تعصب کو دل سے نکال ڈالا۔ جو اس کی مردانہ فضیلت نے اس کے دل میں پیدا کردیا تھا۔ تم کسی کے دل کا حال کیا جانتے ہو۔ آج ہزاروں آدمی قوم کی خدمت کر رہے ہیں کون کہہ سکتا ہے کون بندۂ غرض ہے، کون سچا خادم۔

نہ جانے کب اسے بھی نیند آگئی۔

(۲)

امرکانت کی زندگی میں ایک نیا ولولہ پیدا ہوگیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کے سفر میں وہ اب ایک نئے گھوڑے پر سوار ہوگیا ہے۔ پہلے صفت گھوڑے کو ایڑ اور چابک لگانے کی ضرورت پڑتی تھی۔ یہ نیا گھوڑا کنوتیاں کھڑی کیے سرپٹ بھاگتا چلا جاتا ہے۔

سوامی آتمانند، کاشی، پیاگ، گوڈر سب ہی سے اس کی تکرار ہوجاتی ہے۔ ان لوگوں کے پاس وہی پُرانے گھوڑے ہیں۔ دوڑ میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔ امر ان کی ست رفتاری پر بگڑتا ہے۔ تنبیہہ کرتا ہے۔ ایک دن اس نے سوامی آتمانند سے کہا۔"اس طرح تو کام نہیں چلے گا سوامی جی! آپ کام کرتے ہیں یا مذاق کرتے ہیں۔ اس سے تو کہیں اچھا تھا کہ آپ سیوا آشرم ہی میں رہتے۔"

آتمانند نے اپنا فراخ سینہ تان کر کہا۔"بابا میرے سے اب اور زیادہ دوڑا نہیں جاتا۔ جب لوگ صحت کے اصولوں کی پروا نہیں کرتے تو بیمار ہوں گے اور مریں گے بھی۔ میں صحت کے اصول بتا سکتا ہوں اس کی پابندی تو ان ہی پر منحصر ہے۔"

امرکانت نے سوچا یہ آدمی جتنا موٹا ہے اتنی ہی اس کی عقل بھی موٹی ہے۔ کھانے کو ڈیڑھ سیر چاہیے کام کرتے لرزہ آتا ہے۔ انھیں سنیاس لینے سے نہ جانے کیا فائدہ ہوا۔ ملامت آمیز لہجے میں بولا۔"آپ کا کام محض اصول بتا دینا نہیں ہے۔ ان سے اس کی پابندی بھی کرانی ہے۔ ان میں ایسا جوش پیدا کیجیے کہ وہ اصولوں کی پابندی کیے بغیر رہ ہی نہ سکیں۔ یہی ان کی فطرت ثانی ہوجائے۔ میں آج پچھرا سے نکلا گاؤں میں جابجا کوڑے کے ڈھیر دکھائی دیے۔ آپ کل اسی گاؤں سے ہوکر آئے ہیں۔ گلیوں کا کوڑا صاف نہیں کرایا گیا۔ آپ خود پھاوڑا لے کر کیوں نہیں پل پڑے۔ آپ سمجھتے ہیں گیروے کپڑے پہن لینے ہی سے لوگ آپ کے معتقد ہوجائیں گے۔

آتمانند نے صفائی پیش کی۔"میں کوڑا صاف کرنے لگتا تو سارا دن پچھرا ہی میں لگ جاتا، مجھے پانچ چھے گاؤں کا دورہ کرنا تھا۔"

"یہ آپ کا عذر لنگ ہے۔ میں نے سارا کوڑا آدھ گھنٹے میں صاف کردیا۔ میرے پھاوڑا ہاتھ میں لینے کی دیر تھی۔ سارا گاؤں جمع ہوگیا اور بات کی بات میں کوڑے کا نشان بھی نہ رہا۔"

پھر گوڈر چودھری کی طرف مخاطب ہوا۔"تم بھی دادا اب کام سے جی چُراتے ہو۔ میں نے کل ایک پنچایت میں لوگوں کو شراب پیتے پکڑا۔ سوتاڑے کی بات ہے۔ کسی کو میرے آنے کی خبر تو تھی نہیں۔ لوگ مزے سے بیٹھے ہوئے گپ شپ کر رہے تھے اور بوتلیں سرپنچ صاحب کے سامنے رکھی ہوئی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی فوراً بوتلیں اُڑا دی گئیں۔

اور لوگ ثقہ بن کر بیٹھ گئے۔ میں نمائش نہیں چاہتا ٹھوس کام چاہتا ہوں۔"

امر نے اپنی لگن، اجتہاد اور روحانی تاثیر سے اپنے سب ہی رفیقوں میں خدمت کا جوش پیدا کردیا تھا۔ اور ان پر حکومت بھی کرنے لگا تھا اور سب ہی اس کا رعب مانتے تھے۔

چودھری نے تنک کر کہا۔"تم نے کون سا گاؤں بتایا۔ سوتاڑا؟ میں آج ہی اس کے چودھری کو بلاتا ہوں۔ وہی ہرکھ لال ہے۔ پُرانا پھکّڑ ۔ دو بار سزا کاٹ کر آیا ہے۔"

امر نے زانو پر ہاتھ مار کر کہا۔"پھر وہی ڈانٹ پھٹکار کی بات۔ ارے دادا ڈانٹ پھٹکار سے کچھ نہ ہوگا۔ دلوں میں گھُسیے۔ ایسی ہوا پھیلا دیجیے کہ تاڑی شراب سے لوگوں کو نفرت ہوجائے۔ آپ دن بھر اپنا کام کریں گے اور چین سے سوئیں گے تو یہ کام ہوچکا۔ یہ سمجھ لو کہ ہماری برادری چیت جائے گی تو برہمن ٹھاکر اپنے آپ ہی چیت جائیں گے۔"

گوڈر نے ہار مان کر کہا۔"تو بھیّا اتنا بوتا تو اب مجھ میں نہیں رہا کہ دن بھر کام کروں اور رات بھر دوڑ لگاؤں۔ کام نہ کروں تو بتاؤ کیسے ہو؟"

امرکانت نے اسے ہمت ہارتے دیکھ کر خندہ پیشانی سے کہا۔"کتنا بڑا پیٹ ہے تمھارا دادا کہ اس کے لیے سارا دن کام کرنا پڑتا ہے۔ اگر اتنا بڑا پیٹ ہے تو اسے چھوٹا کرنا پڑے گا۔"

کاشی اور پیاگ نے دیکھا کہ اس وقت سب کے اوپر پھٹکار پڑ رہی ہے تو وہ کھسک گئے۔

مدرسے کا وقت آگیا تھا۔ امرکانت اپنی کوٹھری میں کتاب لینے گیا تو دیکھا منّی دودھ لیے کھڑی ہے، بولا۔"میں نے تو کہہ دیا تھا کہ میں دودھ نہ پیوں گا۔ پھر کیوں لائیں؟"

آج کئی دن سے منّی کو امر کے مزاج میں ایک بے اعتنائی کا احساس ہو رہا تھا۔ منّی کو دیکھ کر اب اس کا چہرہ انبساط سے شگفتہ نہیں ہوجاتا۔ بلا خاص ضرورت کے اس سے بولتا بھی کم ہے۔ منّی کو ایسا معلوم ہو رہا ہے۔ یہ مجھ سے پرہیز کرتے ہیں۔ اس کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی، یہ کانٹا اس کے دل میں کئی دن سے کھٹک رہا تھا۔ آج وہ اسے نکال ڈالے گی۔

اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔"کیوں نہیں پیوگے سنوں؟"

امر کتابوں کا ایک بنڈل اُٹھاتے ہوئے بولا۔"اپنی خوشی ہے۔ نہیں پیتا میں تمھیں تکلیف دینا نہیں چاہتا۔"

منّی نے ترچھی نظروں سے دیکھا۔"یہ تمھیں کب سے معلوم ہوا کہ تمھارے لیے دودھ لانے میں مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ اور کسی کو تکلیف اُٹھانے ہی میں مزا آتا ہو؟"

امر نے ہار کر کہا۔"اچھا بھائی جھگڑا نہ کرو لاؤ پی لوں۔"

ایک ہی سانس میں سارا دودھ کڑوی دوا کی طرح پی کر امر چلنے لگا تو منّی نے دروازہ چھوڑ کر کہا۔"بے خطا تو کسی کو سزا نہیں دی جاتی۔"

امر دروازے پر ٹھٹک کر بولا۔"تم جانے کیا کہہ رہی ہو مجھے دیر ہو رہی ہے۔"

منّی آزردہ خاطر ہوگئی "تمھیں میں روک تو نہیں رہی ہوں، جاتے کیوں نہیں؟"

منّی نے پھر کہا۔"کیا تم سمجھتے ہو میں اتنا بھی نہیں جانتی کہ میرا تمھارے اوپر کوئی حق نہیں ہے۔ تم آج چاہو تو کہہ سکتے ہو خبردار میرے پاس نہ آنا۔ اور زبان سے چاہے نہ کہتے ہو۔ مگر برتاؤ سے تو روز ہی کہہ رہے ہو۔ آج کتنے دنوں سے دیکھ رہی ہوں مگر بے حیائی کرکے آتی ہوں۔ بولتی ہوں، خوشامد کرتی ہوں۔ اگر اس طرح آنکھیں پھیر لینی تھیں۔ تو پہلے ہی سے اس طرح کیوں نہ رہے۔ لیکن میں کیا بکنے لگی۔ تمھیں دیر ہو رہی ہے جاؤ۔"

امرکانت نے جیسے رسّی تڑانے کے لیے زور لگا کر کہا۔"تمھاری کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آرہی ہے منّی۔ میں تو جو پہلے تھا وہی اب ہوں۔ ہاں ادھر زیادہ بات چیت کرنے کا موقع نہیں ملا۔"

منّی نے آنکھیں نیچی کرکے رازدارانہ انداز سے کہا۔"تمھارے دل کی بات سمجھ رہی ہوں۔ لیکن وہ بات نہیں ہے۔ تمھیں دھوکا ہو رہا ہے۔"

امرکانت نے تعجب سے کہا۔"تم تو پہیلی میں باتیں کرنے لگیں۔" منّی نے اسی انداز سے کہا۔"آدمی کی آنکھیں پھر جاتی ہیں تو سیدھی بات بھی پہیلی لگتی ہے۔ پھر دودھ کا خالی کٹورا اُٹھا کر جلدی سے چلی گئی۔

امر کا دل مسوسنے لگا۔ منّی روحانی کشش سے اپنی طرف کھینچنے لگی۔ تمھارے دل کی بات میں سمجھ رہی ہوں۔ تمھیں دھوکا ہو رہا ہے، یہ کلمہ کسی گہرے غار کی طرح اسے

خائف کرنے لگا۔ اس میں اترتے دل کانپتا تھا۔ لیکن راستہ اسی غار میں ہوکر جاتا تھا۔

وہ نہ جانے کتنی دیر تک ایک محویت کے عالم میں کھڑا رہا۔ دفعتاً آتمانند نے پکارا۔"آج مدرسہ بند رہے گا۔"

(۳)

اس علاقے کے زمیندار ایک مہنت جی تھے۔ کارکن اور مختار اور کارندے انھیں کے چیلے چاپڑ تھے۔ اس لیے لگان برابر وصول ہوتا جاتا تھا۔ ٹھاکردوارے میں کوئی جشن برابر ہوتا ہی رہتا تھا۔ کبھی ٹھاکر جی کا جنم ہے، کبھی بیاہ ہے۔ کبھی مونڈن ہے، کبھی جھولا ہے۔ کبھی جل بہار ہے۔ آسامیوں کو ان تقریبوں میں بے گار دینی پڑتی تھی۔ نذر و نیاز پوجا اور دکشنا وغیرہ ناموں سے طرح طرح کی دستوریاں چکانا پڑتی تھیں۔ لیکن مذہب کے معاملے میں کون زبان کھولتا پھر علاقے کے کاشتکار سب ہی نیچی ذاتوں کے لوگ تھے۔ گاؤں پیچھے دوچار گھر برہمنوں، چھتریوں کے تھے بھی تو ان کی ہمدردی آسامیوں کی طرف نہ تھی مہنت جی کی طرف ہی تھی۔ کسی نہ کسی صورت میں وہ سب ہی مہنت جی ہی کے ملازم اور معاون تھے۔ آسامیوں کو انھیں بھی خوش رکھنا پڑتا تھا۔ بے چارے ایک تو غریب، قرض کے بوجھ سے دبے ہوئے۔ دوسرے جاہل، نہ قاعدہ جانیں نہ قانون۔ مہنت جی جتنا چاہیں اضافہ کریں۔ جب چاہیں بے دخل کردیں۔ کسی میں بولنے کی ہمت نہ تھی۔ اکثر آراضیوں کا لگان اتنا بڑھ گیا تھا کہ ساری پیداوار بھی لگان کے برابر نہ پہنچتی تھی۔ لیکن تقدیر کو رو کر، بھوکے اور ننگے رہ کر، کتوں کی موت مرکر کھیتوں کو جوتتے تھے۔ کریں کیا؟ کتنوں ہی نے جاکر شہر میں ملازمت کرلی تھی۔ کتنے ہی مزدوری کرنے لگے تھے۔ پھر بھی آسامیوں کی کمی نہ تھی۔ زراعتی ملک میں زراعت محض معاش کا ذریعہ نہیں، اعزاز کی چیز بھی ہے۔ سب ہی گرہست ہونا باعثِ فخر سمجھتے ہیں۔ کسان گرہستی میں اپنا سب کچھ کھو کر پردیس جاتا ہے۔ وہاں سے دولت کما کر لاتا ہے اور پھر گرہستی کرتا ہے۔ عزت و آبرو کی ہوس اوروں کی طرح اسے بھی گھیرے رہتی ہے۔ وہ گرہست رہ کر جینا اور گرہستی ہی میں مرنا بھی چاہتا ہے۔ اس کا بال بال قرض میں بندھا ہو۔ لیکن دروازے پر دو بیل باندھ کر اپنے کو وہ خوش نصیب سمجھتا ہے۔ اسے سال میں ۳۶۰ دن آدھے پیٹ کھا کر رہنا پڑے۔ پوال میں لپٹ کر راتیں کاٹنی پڑیں مگر کوئی غم نہیں وہ کاشتکار تو ہے۔ یہ غرور اس کی ساری

مصیبتوں کی تلافی کر دیتا ہے۔

لیکن اب کی یکایک جنسوں کا بھاؤ گر گیا اور اس حد تک جا پہنچا جتنا چالیس سال پہلے تھا۔ جب بھاؤ تیز تھا کسان اپنی پیداوار بیچ باچ کر لگان دے لیتا تھا۔ لیکن جب دو اور تین کی جنس ایک میں بکے تو وہ غریب کیا کرے۔ کہاں سے لگان دے کہاں سے دستوریاں دے، کہاں سے قرض چکائے بڑا مشکل مسئلہ تھا۔ اور یہ حالت کچھ اس علاقے کی نہ تھی۔ سارے صوبے، سارے ملک یہاں تک کہ ساری دنیا میں یہی کساد بازاری تھی۔ چار سیر کا گڑ کوئی دس سیر میں بھی نہیں پوچھتا۔ آٹھ سیر کا گیہوں ڈیڑھ روپے من میں مہنگا ہے۔ تیس روپے من کی کپاس دس روپے میں جاتی ہے۔ سولہ روپے من کا سن چار روپے میں۔ کسانوں نے ایک ایک دانہ بیچ ڈالا۔ بھوسے کا ایک تنکا بھی نہ رکھا۔ لیکن یہ سب کچھ کرنے پر بھی نصف لگان سے زیادہ نہ ادا کر سکے۔ اور ٹھاکردوارے میں وہی جشن تھے۔ وہی جل بہار تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حلقے میں کہرام مچ گیا۔ ادھر کچھ دنوں سے سوامی آتمانند اور امرکانت کی کوششوں سے علاقے میں کچھ بیداری پھیلنے لگی تھی اور لوگ اپنے حقوق سے باخبر ہونے لگے تھے۔ کئی موضعوں میں لوگوں نے دستوری دینا بند کر دیا تھا۔ مہنت جی کے پیادے اور کارکن پہلے ہی سے جلے بیٹھے تھے۔ یوں تو دال نہ گلتی تھی۔ بقایا لگان نے انھیں اپنے دل کا غبار نکالنے کا موقع دے دیا۔

ایک دن گنگا کے کنارے اس مسئلے پر غور کرنے کے لیے ایک پنچایت ہوئی سارے علاقے کے مرد و زن جمع ہوئے۔ سوامی آتمانند صدر چنے گئے۔

پہلے بھولا چودھری بولنے کھڑے ہوئے۔ وہ پہلے کسی افسر کے کوچوان تھے۔ اب نئے سال سے پھر کھیتی کرنے لگے تھے۔ لمبی ناک، کالا رنگ، بڑی بڑی مونچھیں اور بڑی سی پگڑی۔ منہ پگڑی میں چھپ گیا تھا، بولے۔ ”پنچو! ہمارے اوپر جو لگان بندھا ہوا ہے وہ تیجی کے دنوں کا ہے۔ اس مندی میں وہ لگان دینا ہمارے کابو سے باہر ہے۔ اب کی اگر بیل بدھیا بیچ کر دے بھی دیں تو آگے چل کر کیا کریں گے۔ بس ہمیں اسی بات کا تسپھیا کرنا ہے۔ میری گجارس تو یہی ہے کہ سب مل کر مہنت مہاراج کے پاس چلیں اور ان سے ارج ماروج کریں۔ اگر وہ نہ سنیں تو حاکم جلا کے پاس چلنا چاہیے۔ اوروں کی نہیں کہتا میں گنگا ماتا کی کسم کھا کے کہتا ہوں کہ میرے گھر میں چھٹانک بھر بھی اَن نہیں ہے اور جب ہمارا

یہ حال ہے تو سب کا یہی حال ہوگا۔ ادھر مہنت جی کے یہاں وہی بہار ہے ابھی پرسوں ایک ہجار سادھوؤں کو آم کی پنگت دی گئی ہے۔ بنارس اور لکھنؤ سے کئی ڈبّے آموں کے آئے ہیں۔ آج سنتے ہیں پھر ملائی کی پنگت ہے ہم بھوکوں مرتے ہیں وہاں ملائی اُڑتی ہے۔ اس پر ہمارا لہو چوسا جا رہا ہے۔ بس یہی مجھے پنچوں سے کہنا ہے۔"

گوڈر نے دھنسی ہوئی آنکھیں پھاڑ کر کہا۔"مہنت جی ہمارے مالک ہیں اَن داتا ہیں، مہاتما ہیں۔ ہمارا دکھ سن کر جرور سے جرور ہمارے اوپر انھیں دَیا آوے گی۔ اس لیے ہمیں بھولا چودھری کی صلا منجور کرنی چاہیے۔ ہم اور کچھ نہیں چاہتے۔ بس ہمیں اور ہمارے بچوں کو آدھ آدھ سیر روجینا کے حساب سے دے دیا جائے۔ اپج جو کچھ ہو سب مہنت جی لے جائیں۔ ہم گھی دودھ نہیں مانگتے۔ حلوا پوری نہیں مانگتے، بس آدھ سیر موٹا ناج مانگتے ہیں۔ اتنا بھی نہ ملے گا تو ہم کھیتی نہ کریں گے۔ مجوری اور بیج کس کے گھر سے لائیں گے۔ ہم کھیتی سے استیپھا دے دیں گے۔ اس کے سوا دوسری کوئی تدبیر نہیں۔"

سلونی نے ہاتھ چمکا کر کہا۔"کھیت کیوں چھوڑیں۔ باپ دادا کی نسانی ہے اسے نہیں چھوڑ سکتے۔ کھیت کے پیچھے جان دے دوں گی۔ ایک روپیہ لگان تھا۔ تب دو ہوئے، تب چار ہوئے، اب کیا دھرتی سونا اُگلے گی۔"

الگو کوری بجّو کی سی آنکھیں نکال کر بولا۔"بھائی میں تو بات بے لاگ کہتا ہوں۔ مہنت کے پاس چلنے سے کچھ نہ ہوگا۔ راجا ٹھاکر ہیں۔ کہیں گُسّا آگیا تو پٹوانے لگیں گے۔ حاکم کے پاس چلنا چاہیے ان لوگوں میں پھر بھی دَیا ہے۔"

آتمانند نے سب سے اختلاف کیا۔"میں کہتا ہوں کسی کے پاس جانے سے کچھ نہ ہوگا۔ تمھاری تھالی کی روٹی تم سے کہے کہ مجھے نہ کھاؤ تو تم مانوگے؟"

چاروں طرف سے آوازیں آئیں۔"کبھی نہیں مان سکتے۔"

"تو تم جس کی تھالی کی روٹیاں ہو وہ کیسے مان لے گا۔"

بہت سی آوازوں نے تائید کی۔

"مہنت کو اڑانے کے لیے روپیہ چاہیے۔ حاکموں کو بڑی بڑی طلب چاہیے۔ ان کی طلب میں کمی نہیں ہوسکتی۔ تم مرو یا جیو ان کی بلا سے۔ وہ تمھیں نہیں چھوڑ سکتے۔"

بہت سی آوازوں نے تائید کی۔

امر کانت سوامی جی کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ سوامی جی کا یہ رُخ دیکھ کر گھبرایا لیکن صدر کو کیسے روکے۔ یہ تو وہ جانتا تھا کہ یہ گرم مزاج کا آدمی ہے لیکن اسے امید نہ تھی کہ وہ اتنی جلد اتنے جوش میں آجائیں گے۔ کچھ معلوم بھی تو ہو یہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔

آتمانند گرج کر بولے۔"تو تمھارے لیے اب کون سا راستہ ہے۔ اگر مجھ سے پوچھتے ہو اور تم لوگ آج وعدہ کرو کہ اسے مانوگے تو میں بتا سکتا ہوں نہیں تمھاری خوشی۔"

بہت سی آوازیں آئیں "ہاں ہاں بتائیے سوامی جی بتائیے۔"

لوگ چاروں طرف سے سمٹ کر اور قریب آگئے۔ سوامی جی کا جادو ان پر اثر کر رہا ہے۔ ان کے چہرے سے جھلک رہا ہے۔ عوام کی رائے ہمیشہ حرکت کی جانب مائل ہوتی ہے۔

آتمانند بولے۔"تو آؤ آج ہم سب چل کر مہنت جی کے مکان اور ٹھاکر دوارے گھیر لیں اور جب تک وہ لگان بالکل نہ چھوڑ دیں کوئی کام نہ ہونے دیں۔"

بہت سی آوازیں آئیں "ہم لوگ تیار ہیں۔"

"خوب سمجھ لو کہ وہاں تمھارے لیے دعوت کے سامان نہ رکھے ہوں گے۔"

"کچھ پروا نہیں، مر تو رہے ہی ہیں، سسک سسک کر کیوں مریں۔"

"تو اسی وقت چلو۔"

دفعتاً امر نے تحکمانہ انداز سے کہا۔"ٹھہرو۔"

سناٹا چھا گیا۔ جو جہاں تھا وہیں کھڑا ہوگیا۔

امر نے چھاتی ٹھونک کر کہا۔"جس راستے پر تم جارہے ہو وہ بھلائی کا راستہ نہیں۔ بربادی کا راستہ ہے۔ تمھارا بیل اگر بیمار پڑجائے تو کیا تم اسے جوتوگے؟"

کسی طرف سے کوئی آواز نہ آئی۔

"نہیں پہلے تو اس کی دوا کروگے اور جب تک وہ اچھا نہ ہوجائے گا اس سے کام نہ لوگے۔ کیونکہ تم بیل کو مارنا نہیں چاہتے۔ اس کے مرنے سے تمھارے کھیت پر پانی پڑجائے گا۔"

گوڈر بولے۔"بہت ٹھیک کہتے ہو بھیّا۔"

"گھر میں آگ لگنے پر ہمارا کیا دھرم ہے۔ کیا ہم آگ پھیلنے دیں اور گھر کی بچی

بچائی چیزیں بھی لاکر اس میں ڈال دیں؟"

گوڈر نے کہا۔"کبھی نہیں کبھی نہیں۔"

"کیوں؟ اسی لیے کہ ہم گھر جلانا نہیں بچانا چاہتے ہیں۔ ہمیں اس گھر میں رہنا ہے۔ اسی میں جینا ہے۔ اسی میں مرنا ہے۔ مصیبت کچھ ہمارے ہی اوپر نہیں پڑی ہے۔ سارے میں کہرام مچا ہوا ہے۔ ہمارے مکھیا اس سوال پر غور کر رہے ہیں ہمیں ان ہی کے ساتھ چلنا پڑے گا۔"

اس نے ایک لمبی تقریر کی۔ لیکن وہی خلقت جو اس کا خطبہ سن کر مست ہوجاتی تھی آج بے حِس بیٹھی رہی۔ اس کی عزت سب ہی کرتے تھے اس لیے شور و غل نہ ہوا مگر خلقت پر مطلق اثر نہ ہوا۔ اس وقت آتمانند اس کے لیڈر تھے۔

مجلس بغیر کچھ فیصلہ کیے برخاست ہوگئی۔ لیکن ہوا کا رُخ کدھر ہے۔ یہ کسی سے پوشیدہ نہ رہا۔

(۴)

امرکانت گھر لوٹا تو بہت شکستہ دل تھا۔ اگر اس ہیجان کے فرو کرنے کا کوئی انتظام نہ کیا گیا تو کسی ہنگامے کا اندیشہ تھا۔ اس نے مہنت جی سے ملنے کا ارادہ کیا۔ اس وقت ان معاملات سے وہ اتنا بے زار ہوگیا تھا کہ ایک بار اس کے جی میں آیا کہ یہاں سے چھوڑ چھاڑ کر چلا جائے۔ اسے ابھی تک یہ تجربہ نہ ہوا تھا کہ خلقت ہمیشہ تیز مزاجوں کے پیچھے چلتی ہے۔ وہ فرض اور انصاف، نفع اور نقصان، قربانی اور تحمل ان سب ہی مسائل سے کام لے کر بھی آتمانند کے پھونکے ہوئے جادو کو نہ اُتار سکا۔ آتمانند اس وقت یہاں مل جائے تو دونوں دوستوں میں ضرور بدمزگی پیدا ہوجاتی۔ لیکن آج وہ غائب تھے۔ انھیں آج گھوڑے کا آسن مل گیا۔ کسی گاؤں میں تنظیم کرنے چلے گئے تھے۔

آج امرکانت کو کتنی ذلت اُٹھانی پڑی۔ کتنا خفیف ہونا پڑا۔ کسی نے اس کی باتوں پر کان تک نہ دیا۔ اس کے بدلے ہوئے تیور کہہ رہے تھے تم کیا بکتے ہو۔ تمھارے ہاتھوں میں ہماری نجات نہ ہوگی۔ اس کے اس زخم پر سکون بخش الفاظ ہی مرہم کا کام دے سکتے تھے۔

منّی کلسا اور رسّی لیے ہوئے نکلی اور بغیر اس کی طرف دیکھے ہوئے کنویں کی طرف

چلی گئی۔ اس نے پکارا۔"ذرا سنتی جاؤ منّی!" مگر منّی نے سن کر بھی نہ سنا۔ ذرا دیر بعد وہ کلسا لیے ہوئے لوٹی اور پھر سر جھکائے اس کے سامنے سے چلی گئی۔ امر نے پھر پکارا "منّی سنو ایک بات کہنی ہے۔" مگر اب کی بھی وہ مخاطب نہ ہوئی۔ یقین ہوگیا کہ وہ روٹھی ہوئی ہے۔

ایک لمحے میں منّی پھر نکلی اور سلونی کے گھر جا پہنچی۔ بڑھیا مدرسے کے پیچھے ایک چھوٹی سی مڑیا ڈال کر رہتی تھی۔ چٹائی پر لیٹی ایک بھجن گارہی تھی۔ منّی نے جاکر پوچھا۔"آج کچھ پکایا نہیں کاکی، یوں ہی رہیں، سلونی نے اُٹھ کر کہا۔"کھاچکی بیٹی، دوپہر کی روٹیاں رکھی ہوئی تھیں۔"

منّی نے چوکے کی طرف دیکھا۔ چوکا صاف لپا پتا پڑا تھا۔ بولی۔"کاکی تم بہانہ کررہی ہو۔ ابھی تو آتے دیر نہیں ہوئی۔ اتنی جلدی کھا کہاں سے لیا۔"

"تو تو پتیاتی ہی نہیں بہو، بھوک لگی تھی آتے ہی آتے کھا لیا۔ برتن دھو دھا کر رکھ دیے۔ بھلا تجھ سے کیا بہانہ تھا۔ گھر میں کچھ نہ ہوتا تو مانگ لیتی۔"

"اچھا میری کسم کھاؤ۔"

کاکی نے کہا۔"ہاں اپنی کسم کھاتی ہوں کھاچکی۔"

منّی رنجیدہ ہوکر بولی۔"تم مجھے بھی غیر سمجھتی ہو کاکی؟ جیسے مجھے تمھارے مرنے جینے سے مطلب ہی نہیں۔ ابھی تو تم نے تلہن بیچا تھا۔ روپے کیا کیے؟"

سلونی سر پر ہاتھ رکھ کر بولی۔"ارے بھگوان تلہن تھا ہی کتنا۔ کل ایک روپیہ تو ملا، وہ کل پیادہ لے گیا۔ گھر میں آگ لگائے دیتا تھا۔ کیا کرتی۔ نکال کر پھینک دیا۔ اس پر امر بھیّا کہتے ہیں۔ مہنت جی سے پھریاد کرو۔ کوئی نہ سنے گا بیٹی۔ میں کہے دیتی ہوں۔"

منّی بولی۔"اچھا تو میرے گھر چلو کھالو۔"

سلونی نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔"تو آج کھلادے گی بیٹی ابھی تو پورا چوماسا پڑا ہے۔ آج کل تو کہیں گھاس بھی نہیں ملتی۔ بھگوان نہ جانے کیسے پار لگائیں گے گھر بھر میں اَن کا ایک دانا بھی نہیں ہے۔ ڈانڑی اچھی ہوتی تو باکی چکا کے بھی چار مہینے نباہ ہوجاتا۔ اس ڈانڑی میں آگ لگے۔ آدھی باکی بھی نہ نکلی۔ امر بھیّا کو تو سمجھاتی نہیں۔"

منّی نے منہ پھیر کر کہا۔"مجھ سے تو آج کل روٹھے ہوئے ہیں۔ بولتے ہی نہیں کام

دھندے سے فرصت ہی نہیں ملتی۔ گھر والوں سے بھی بات چیت کرنے کی فرصت چاہیے۔ جب پھٹے حالوں آئے تھے تب فرصت تھی۔ یہاں جب دنیا ماننے لگی، نام ہوا۔ بڑے آدمی بن گئے تو اب فرصت نہیں ہے۔"

سلونی نے استعجاب کی نظروں سے منّی کو دیکھا۔"کیا کہتی ہو بہو، وہ تجھ سے روٹھے ہوئے ہیں؟ مجھے تو بشواش نہیں آتا۔ بے چارا رات دن دوڑتا رہتا ہے۔ نہ ملی ہوگی چھٹی۔ میں نے جو دعا دی ہے وہ پوری ہوکر رہے گی دیکھ لینا۔

منّی اپنی کم ظرفی پر شرماتی ہوئی بولی۔"مجھے کسی کی پرواہ نہیں ہے کاکی۔ جسے سو بار غرض ہو بولے، نہیں نہ بولے۔ وہ سمجھے ہوں گے کہ میں ان کے گلے پڑی جا رہی ہوں۔ میں تمھارے پاؤں چھوکر کہتی ہوں کاکی۔ جو یہ بات کبھی میرے دل میں آئی ہو۔ میں تو ان کے پیروں کی دھول کے برابر بھی نہیں ہوں۔ ہاں اتنا چاہتی ہوں کہ خوش ہوکر بولیں۔ جو کچھ تھوڑی بہت سیوا کروں اسے قبول کریں۔ اس کے سوا میرے دل میں اور کوئی ارمان نہیں ہے۔"

دفعتاً امر نے سلونی کو پکارا۔ سلونی نے بلایا۔"آؤ بھیّا ابھی بہو آگئی اس سے باتیں کر رہی ہوں۔"

امر نے منّی کی طرف دیکھ کر تیکھے انداز سے کہا۔"میں نے تمھیں دو بار پکارا منّی، تم بولی کیوں نہیں؟"

منّی نے منہ پھیر کر کہا۔"تمھیں کسی سے بولنے کی فرصت نہیں ہے۔ تو کوئی کیوں جائے تمھارے پاس۔ تمھیں بڑے بڑے کام کرنے پڑتے ہیں تو اوروں کو بھی تو اپنے چھوٹے چھوٹے کام کرنے پڑتے ہیں۔"

امرکانت ادھر منّی کی طرف سے ہٹ کر سکھدا کے قریب آگیا تھا۔ پہلے وہ بلندی پر تھا سکھدا اسے نیچے کی طرف گھسیٹ رہی تھی۔ اب سکھدا ٹیلے کی چوٹی پر پہنچ گئی ہے۔ اور اس کے پاس پہنچنے کے لیے امرکانت کو ہمت اور استقلال کی ضرورت تھی۔ اس کی ایک پاکیزہ زندگی کا معیار اپنے ساتھ رکھ لیا تھا۔ مگر کوشش کرنے پر بھی وہ وفا اور خلوص کی اس دیوی کو دل سے نکال سکتا تھا۔ اسے معلوم ہو رہا تھا کہ ضبطِ نفس کی اس کوشش میں اس کی زندگی خشک اور بے رنگ ہوگئی ہے۔

اس نے کچھ بے دل ہو کر کہا۔"میں یہ مانتا ہوں منّی کہ ادھر کام کی کثرت کے باعث میں نے تم سے بے التفاتی کی۔ لیکن مجھے امید تھی کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے اتنے قریب آگئے ہیں کہ بیچ میں کسی بدگمانی کی گنجائش نہ رہی۔ میں اپنی پریشانیوں میں جھنجھلا کر تمھیں کچھ سخت سست بھی کہہ دوں تو میں سمجھتا تھا کہ تم اسے معاف کردو گی۔ لیکن اب معلوم ہوا کہ وہ میری غلطی تھی۔"

منّی نے اسے شکوہ آمیز نظروں سے دیکھ کر کہا۔"ہاں لالہ یہ تمھاری بھول تھی۔ بھکاری کو سنگھاسن پر بٹھا دو۔ تب بھی اسے اپنے راجا ہونے کا بشواش نہ آئے گا۔ وہ اسے سپنا ہی سمجھے گا۔ لیکن میں نے اپنے سپنے کو سچ سمجھ لیا اور چاہتی ہوں کہ ہمیشہ وہی سپنا دیکھتی رہوں۔ تم مجھے تھپکیاں دیتے جاؤ۔ اس کے سوا کچھ نہیں چاہتی۔ کیا اتنا بھی نہیں کرسکتے؟ ہاں، کیا ہوا۔ آج سوامی جی سے تمھارا جھگڑا کیوں ہوگیا؟"

سلونی ابھی تک آتمانند کی تعریف کر رہی تھی۔ اب امرکانت کی منہ دیکھی کہنے لگی۔"بھیّا نے تو لوگوں کو سمجھایا تھا کہ مہنت کے پاس چلو اسی پر لوگ بگڑ گئے۔ پوچھو اب تم کرہی کیا سکتے ہو۔ مہنت جی پٹوانے لگیں تو بھاگنے کو راہ نہ ملے۔"

منّی نے اس کی تائید کی۔"مہنت جی دھرماتما ہیں۔ بھلا لوگ جاکر بھگوان کے مندر کو گھیر لیتے تو کتنی بڑی بدنامی ہوتی۔ دنیا بھگوان کی پوجا کرتی ہے۔ ہم چلیں مندر کا راستہ روکنے۔ نہ جانے سوامی جی کو سوجھی کیا۔ اور لوگ ان کی مان گئے کیا اندھیر ہے۔"

امر کو ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے اس کے دل پر مرہم رکھ دیا۔ سوامی جی سے زیادہ سمجھ دار تو یہ جاہل عورتیں ہیں اور آپ عالم فاضل بنتے ہیں۔ شگفتہ ہوکر بولا۔"اس نقارخانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے کاکی۔ سوچو لوگ مندر کو گھیر لیتے تو کتنا بڑا ہنگامہ ہوجاتا۔ آج کل ذرا ذرا سی بات پر تو گولیاں چلتی ہیں۔"

سلونی نے سہم کر کہا۔"تم نے بہت اچھا کیا بھیّا کہ لوگوں کو روک دیا۔ نہیں تو خون خچر ہوجاتا۔"

منی نے ہمدردی کے جوش میں کہا۔"میں تو تمھیں اس کے ساتھ کبھی نہ جانے دیتی۔ حاکم راج کرتا ہے تو کیا رعیت کی فریاد نہ سُنے گا۔ سوامی جی آئیں گے تو پوچھوں گی۔"

امرکانت کو اپنے ضمیر میں تقویت اور سکون کا احساس ہوا۔ کل وہ ضرور مہنت جی کی خدمت میں حاضر ہوگا۔

(۵)

امرکانت گوڈر چودھری کے ساتھ مہنت آشارام کے گھر کے پاس پہنچا۔ شام کا وقت تھا۔ مہنت جی ایک نقرئی کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ جس پر کارچوبی گدی تھی۔ ان کے اِردگرد مریدوں اور معتقدوں کا ہجوم لگا ہوا تھا۔ جس میں مستورات کی تعداد زیادہ تھی۔ فرش سنگ مرمر کا تھا۔ مہنت جی پورے چھے فٹ کے بلند قامت اور ذی رعب آدمی تھے۔ عمر پینتیس کے قریب ہوگی۔ گورا رنگ، دوہرا جسم، پُرجلال چہرہ جس پر گھنی داڑھی زیب دے رہی تھی۔ گیروے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ مگر ریشمیں۔ مرید آآکر ان کے قدموں کو آنکھوں سے لگاتے تھے۔ نذریں پیش کرتے تھے اور اپنی جگہ پر جابیٹھتے تھے۔ گوڈر تو اندر نہ جاسکتے تھے۔ امر اندر گیا۔ لیکن اسے وہاں کون پوچھتا آخر جب وہاں کھڑے کھڑے آٹھ بج گئے تو اس نے مہنت جی کے قریب جاکر کہا۔ ''مہاراج مجھے آپ سے کچھ عرض کرنا ہے۔''

مہنت جی نے اس طرح اس کی طرف دیکھا گویا اس کی اس جسارت پر ناراض ہیں۔ ان کے قریب ہی ایک دوسرا سادھو کھڑا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ''کہاں سے آئے ہو۔'' امر نے موضع کا نام بتایا۔ حکم ہوا آرتی کے بعد آؤ۔

آرتی میں تین گھنٹے کی دیر تھی۔ امر یہاں کبھی نہ آیا تھا۔ سوچا یہاں کی سیر ہی کرلیں۔ اودھر اُدھر گھومنے لگا۔ پچھّم کی طرف تو عالی شان مندر تھا۔ سامنے پورب کی طرف صدر دروازہ۔ دائیں جانب دروازے اور بھی تھے۔ امر ایک دروازے کے اندر گھسا تو دیکھا چاروں طرف چوڑے برآمدے ہیں۔ جس میں سینکڑوں دیویاں بیٹھی انواع و اقسام کے کھانے پکا رہی ہیں۔ کہیں بڑی کڑھائیوں میں پوری کچوریاں بن رہی ہیں۔ کہیں دودھ اُبل رہا ہے۔ کہیں ملائی نکالی جارہی ہے۔ برآمدے کے پیچھے کمروں میں ماکولات کے ڈھیر تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پھل، میوے اور مٹھائیوں کی منڈیاں ہیں۔ کئی جھاوے تو صرف پرول کے رکھے ہوئے تھے۔ اس موسم میں پرول کتنے مہنگے ہوتے ہیں۔ یہاں بھوسے کی طرح پڑے ہوئے تھے۔ انگور کے بھی کئی ٹوکرے نظر آئے۔ امر یہ بھنڈار دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ یہاں ٹھاکر جی کے بھوگ کی چیزیں تیار ہوتی تھیں اور ان کے پرساد سے اس مندر کے

ہزاروں سادھوؤں ہی کی نہیں بے شمار مریدوں کی بھی پرورش ہوتی تھی۔

شمال کی جانب دوسرا دروازہ تھا۔ امر اس میں گیا تو ایک بازار سا لگا دیکھا۔ درزیوں کی ایک لمبی قطار دیکھی جو ٹھاکر جی کی پوشاک سی رہے تھے۔ کہیں زری کا کام ہو رہا تھا۔ کہیں کارچوب کی مسندیں اور گاؤ تکیے بنائے جا رہے تھے۔ دوسری قطار سناروں کی تھی جو ٹھاکر جی کے لیے زیور بناتے تھے۔ کہیں جڑائی کا کام ہو رہا تھا۔ کہیں زیوروں پر پالش ہو رہا تھا۔ کہیں پٹوے بیٹھے چندن رگڑ رہے ہیں، یہ چندن ٹھاکر جی کے ماتھے پر لگایا جائے گا۔ ایک پورا کمرہ عطر، تیل، اگرکی بتیوں اور دیگر خوشبوؤں سے بھرا ہوا تھا۔ ٹھاکر جی کے نام پر دولت کا کتنا بے دردانہ استعمال کیا جاتا ہے۔ یہی سوچتا ہوا امرکانت وہاں سے پھر وسط صحن میں آیا۔ اور صدر دروازے سے ہوکر باہر نکلا۔

گوڈر نے بے صبری سے پوچھا۔ ''بڑی دیر لگائی۔ کچھ بات چیت ہوئی؟''

امر نے ہنس کر کہا۔ ''ابھی تو محض درشن ہوئے ہیں، آرتی کے بعد ملاقات ہوگی۔''

یہ کہہ کر اس نے جو کچھ دیکھا تھا وہ تفصیل کے ساتھ بیان کردیا۔

گوڈر نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''بھیا یہ بھگوان کا دربار ہے وہ سنسار کو پالتا ہے۔ اسے کس بات کی کمی ہے۔ سُنا تو ہم نے بھی ہے۔ لیکن کبھی بھیتر نہیں گئے کہ کوئی پوچھنے لگے تو نکالے جائیں ہاں گھوڑشال اور گئوشالہ دیکھی ہے۔ جی چاہے تو تم بھی دیکھ لو۔''

ابھی وقت بہت باقی رہا۔ امر گئوشالہ دیکھنے چلا۔ سب سے پہلے فیل خانے میں گھسے۔ کوئی پچیس تیس ہاتھی زنجیروں میں بندھے صحن میں کھڑے تھے۔ کوئی اتنا جسیم کہ پورا پہاڑ، کوئی اتنا چھوٹا جیسے بھینس۔ کوئی جھوم رہا تھا۔ کوئی سونڈ سے گرد اُڑا رہا تھا۔ کوئی برگد کی شاخیں چبا رہا تھا۔ ان کے ہودے، جھولیں، عماریاں سب علاحدہ گودام میں رکھے ہوئے تھے۔ ہر ایک ہاتھی کا نام خدمت گار اور مکاں الگ تھا۔ ٹھاکر جی کی سواری میں جو ہاتھی تھا وہ سب سے بڑا۔ بھگت لوگ اس کی پوجا کرنے آتے تھے۔ اس وقت بھی اس کے سر پر پھولوں اور مالاؤں کا ڈھیر پڑا ہوا تھا۔

یہاں سے دونوں آدمی اصطبل میں پہنچے۔ گھوڑوں کی قطاریں بندھی ہوئی تھیں۔ گویا کوئی فوجی پڑاؤ ہو۔ سو گھوڑوں سے کم نہ تھے۔ ہر ایک نسل کے، ہر ایک گھوڑے پر دو دو سائیس نوکر تھے۔ مہنت جی کو گھوڑوں کا بڑا شوق تھا۔ ٹھاکرجی انھیں کی آنکھوں سے

گھوڑدوڑ دیکھتے تھے۔ ان گھوڑوں کو روز بادام اور ملائی دی جاتی تھی۔

گئوشالے میں بھی چار پانچ سو گائے بھینسوں سے کم نہ تھیں۔ بڑے بڑے مٹکے تازے دودھ سے بھرے رکھے تھے۔ ٹھاکر جی آرتی سے پہلے اشنان کریں گے۔ پانچ پانچ من دودھ تین بار ان کے اشنان کے لیے چاہیے۔ بھنڈار کے لیے الگ۔

ابھی یہ لوگ اِدھر اُدھر گھوم ہی رہے تھے کہ آرتی شروع ہوگئی۔ لوگ چاروں طرف سے آرتی کرنے دوڑے۔

گوڈر نے پوچھا۔ "تم سے کوئی پوچھتا کہ کون بھائی ہو تو کیا کہتے۔"

امر نے مسکراکر کہا۔ "بنیا بتاتا۔"

"تمھاری تو چل جاتی، کیونکہ یہاں تم کو لوگ کم جانتے ہیں مجھے تو لوگ روز ہی ہاٹ میں چرسے بیچتے دیکھتے ہیں۔ پہچان لیں تو جیتا نہ چھوڑیں اب دیکھو بھگوان کی آرتی ہو رہی ہے اور ہم بھیتر نہیں جاسکتے۔ یہاں کے پنڈے پجاریوں کا حال سنو تو دانتوں میں انگلی دبالو۔ مگر وہ یہاں کے مالک ہیں اور ہم بھیتر پاؤں نہیں رکھ سکتے۔ تم چاہو تو جاکر آرتی لے لو۔ تم صورت سے بھی تو برہمن معلوم ہوتے ہو۔ میری تو صورت چمار چمار پکار رہی ہے۔"

امر کے جی میں تو آیا اندر جاکر تماشا دیکھے۔ مگر گوڈر کو چھوڑ کر نہ جاسکا۔ کوئی آدھ گھنٹے میں آرتی ختم ہوگئی۔ اور معتقدین لوٹ کر اپنے اپنے گھر گئے۔ تو امر مہنت جی سے ملنے چلا۔ معلوم ہوا کوئی رانی صاحبہ درشن کر رہی ہیں۔ وہیں آنگن میں ٹہلنے لگا۔

آدھ گھنٹے کے بعد اس نے پھر سادھو دربان سے پوچھا تو معلوم ہوا اس وقت درشن نہیں ہوسکتا۔ صبح آؤ۔

امر کو غصہ تو ایسا آیا کہ اسی وقت مہنت جی کی خبر لے۔ مگر ضبط کرنا پڑا۔

گوڈر نے یہ حال سن کر کہا۔ "ایسے دربار میں بھلا ہماری کون سُنے گا۔"

"مہنت جی کے درشن تم نے کبھی کیے ہیں؟"

"میں نے؟ میں بھلا کیسے کرتا اور باہر کہیں مہنت جی نکلتے ہیں۔ سُنا ہے مہنت جی کسی سے ملنے نہیں جاتے۔ بڑے بڑے راجے مہاراجے یہیں آکر ان کے درشن کرتے ہیں۔"

نو بج رہے تھے۔ اتنی رات کو گھر لوٹنا مشکل تھا۔ پہاڑی راستے، جنگلی جانوروں کا کھٹکا۔ ندی نالوں کا اُتار۔ آخر وہیں رات کاٹنے کی صلاح ہوئی۔ دونوں ایک دھرم شالے میں پہنچے اور کھا پی کر وہیں پڑ رہنے کا ارادہ کیا کہ دفعتاً دو سادھو ٹھاکر جی کی بھوگ کی چیزیں بیچتے نظر آئے۔ دھرم شالے کے بھی جاتری لینے دوڑے۔ امر نے بھی چار آنے کا ایک پتّل لیا۔ پوریاں، حلوا، کئی قسم کی سبزیاں۔ طرح طرح کی مٹھائیاں، اچار، چٹنی، مربّے، ملائی، دودھ دہی۔ غرض اتنا سامان تھا کہ اچھے دو کھانے والے شکم سیر ہوجاتے۔ یہاں بہت کم گھروں میں چولھا جلتا تھا۔ لوگ یہی پتّل لے لیا کرتے تھے۔ دونوں نے خوب پیٹ بھر کر کھایا اور پانی پی کر سونے کی تیاری کر رہے تھے کہ ایک سادھو دودھ بیچنے آیا۔ شین (استراحت) کا دودھ لے لو۔ امر کی خواہش تو نہ تھی مگر دریافت حال کے لیے اس نے دو آنے کا دودھ لیا۔ پورا دو سیر تھا۔ گاڑھا ملائی دار۔ اس میں کیسر اور کستوری کی خوشبو اُڑ رہی تھی۔ ایسا دودھ اس نے اپنی زندگی میں کبھی نہ پیا تھا۔

امرکانت نے تعجب سے کہا۔"اس خرچ کا کہیں ٹھکانا ہے۔"

گوڈر عقیدت کے انداز سے بولا۔"بھگوان دیتے ہیں اور کیا۔ ہجار دو ہجار جاتری روز آتے ہیں۔ ایک ایک سیٹھ دس دس ہجار کی تھیلی چڑھا دیتا ہے۔ اتنا خرچ کرنے پر بھی کروڑوں روپے بنک میں جمع ہیں۔"

"دیکھو کل کیا باتیں ہوتی ہیں۔"

"مجھے تو ایسا جان پڑتا ہے کہ کل بھی درشن نہ ہوں گے۔"

دونوں آدمیوں نے کچھ رات رہے ہی اشنان کیا اور دن نکلنے سے پہلے ہی ڈیوڑھی پر جا پہنچے، معلوم ہوا مہنت جی پوجا پر ہیں۔

ایک گھنٹے بعد پھر گئے تو خبر ملی، مہنت جی ناشتہ کر رہے ہیں۔

جب وہ تیسری بار نو بجے گیا تو معلوم ہوا مہنت جی گھوڑوں کا معائنہ کر رہے ہیں۔

امرکانت نے جھنجھلا کر دربان سے کہا۔"تو آخر ہمیں کب درشن ہوں گے؟"

دربان نے پوچھا۔"تم کون ہو؟"

"میں ان کے علاقے کا آسامی ہوں، ان کے علاقے کے متعلق کچھ کہنے آیا ہوں۔"

"تو کارکن کے پاس جاؤ۔ علاقے کا کام وہی دیکھتے ہیں۔"

امر پوچھتا ہوا کارکن کے دفتر میں پہنچا تو بیسیوں منیم لمبے لمبے بہی کھاتے کھولے ہوئے لکھ رہے تھے۔ کارکن صاحب مسند لگائے حقہ پی رہے تھے۔ امر نے سلام کیا۔

کارکن صاحب نے داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا۔"عرضی کہاں ہے؟"

امر نے بغلیں جھانکتے ہوئے کہا۔"عرضی تو میں نہیں لایا۔"

"تو پھر یہاں کیا کرنے آئے؟"

"میں تو مہنت جی سے کچھ عرض کرنے آیا تھا۔"

"عرضی لکھا کر لاؤ۔"

"میں مہنت جی سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"نذرانہ لائے ہو؟"

"میں غریب آدمی نذرانہ کہاں سے لاؤں۔"

"اسی لیے کہتا ہوں، عرضی لکھا کر لاؤ۔ مہنت جی اس پر غور کریں گے۔ جو کچھ حکم ہوگا وہ تم کو سُنا دیا جائے گا۔"

"تو کب حکم سُنایا جائے گا؟"

"جب مہنت جی کی مرضی ہوگی۔"

"مہنت جی کا نذرانہ کتنا ہوگا؟"

"جیسی حیثیت ہو۔ کم سے کم ایک اشرفی۔"

"کوئی تاریخ بتا دیجیے تو میں حکم سننے آؤں۔ یہاں روز کون دوڑے گا۔"

"تم دوڑوگے اور کون دوڑے گا۔"

امر نے بستی میں جاکر عرضی لکھی اور اسے کارکن کی خدمت میں پیش کرکے باہر نکل آیا۔ دونوں گھر چلے گئے۔

ان کے آنے کی خبر پاتے ہی سینکڑوں آدمی جمع ہوگئے۔ امر بڑی مشکل میں پڑا۔ اگر ان سے ساری داستان بیان کرتا ہے تو لوگ اسی کو اُلّو بنائیں گے۔ اس لیے بات بنانی پڑی۔

"عرضی پیش کر آیا ہوں اس پر غور کیا جا رہا ہے۔"

کاشی نے بدگمانی کے انداز سے کہا۔"وہاں کہیں مہینوں میں پھیسلا ہوگا۔ تب تک کارندے ہمیں نوچ ڈالیں گے۔"

امر نے کھسیا کر کہا۔ ''مہینوں میں کیوں غور ہوگا۔ دو چار دن کافی ہیں۔''

پیاگ بولا۔ ''یہ سب ٹالنے کی باتیں ہیں۔ خوشی سے کون اپنے روپے چھوڑ سکتا ہے۔''

امر روز سویرے جاتا اور دن بھر خاک پھانک کر گھڑی بھر رات گئے لوٹ آتا۔ کارکن، ان کے محرر، یہاں تک کہ چپراسیوں کی منت سماجت کرتا۔ مگر کہیں شنوائی نہ ہوتی تھی۔ رات کو مایوس ہوکر لوٹتا تو گاؤں کے لوگ اس کا مذاق اُڑاتے۔

پیاگ کہتا۔ ''ہم نے تو سنا ہے روپے میں آٹھ آنے بھر چھوٹ ہوگئی۔''

کاشی کہتا۔ ''تم جھوٹے ہو۔ میں نے تو سُنا ہے مہنت جی نے اس سال پوری لگان معاف کردی۔''

ادھر آتمانند حلقے میں فتنے کی آگ مشتعل کر رہے تھے۔ روز بڑے بڑے جلسوں کی خبریں آتی تھیں۔ جابجا کسان سبھاؤں کی تنظیم ہو رہی تھی۔ امر کی پاٹھ شالہ بھی بند پڑی تھی۔ اسے فرصت ہی نہ ملتی تھی پڑھاتا کون؟ رات کو منّی اپنی تشفی آمیز باتوں سے اس کے آنسو پوچھتی تھی۔

آخر ساتویں دن اس کی عرضی پر حکم ہوا کہ سائل پیش کیا جائے۔

امر مہنت کے سامنے لایا گیا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ مہنت جی خسخانے میں تخت پر مسند لگائے لیٹے ہوئے تھے۔ چاروں طرف خس کی ٹٹیاں تھیں جن پر گلاب کا چھڑکاؤ ہو رہا تھا۔ بجلی کے پنکھے چل رہے تھے، اندر اس جیٹھ کے مہینے میں بھی اتنی سردی تھی کہ امر کانپنے لگا۔

مہنت جی نے عارفانہ متانت سے امر کی طرف دیکھا۔ امر کو معلوم ہوا ان نظروں میں انتہا کا تکبر ہے۔ تب آپ نے گویا استغراق کے عالم میں آنکھیں بند کرلیں اور بہت آہستہ سے بولے۔

''یہ سب مایا ہے بیٹا۔ میرا اور تیرا۔ اپنا اور پرایا۔ سب مایا ہے۔ زمیندار بھی وہی ہے، کاشتکار بھی وہی ہے۔ یہ سب اگیان ہے بالکل اگیان، اسی اگیان کے کارن نیشا سوار تھ میں پڑکر اپنا سرب ناش کرتا ہے۔ میرے رام نے تو چار آنے کی چھوٹ کا حکم دے دیا۔''

امر نے عرض کی چار آنے کی چھوٹ سے کسانوں کا بیڑا نہ پار ہوگا۔ مہاراج! آٹھ

آنے کی پیداوار نہیں ہوئی۔ بارہ آنے کہاں سے آئیں گے۔

مہنت جی عارفانہ انداز سے ہنسے۔"اچھا اچھا۔ ہم اپنے رام سے پوچھیں گے۔ اس کا جیسا حکم ہوگا ہم بجا لائیں گے۔ میں کچھ نہیں کرسکتا کرنے والا وہی پرماتما ہے۔ ہم تو کاٹھ کے پتلے ہیں۔ رعایا سے جاکر کہہ دو صبر کریں۔ اور پرماتما کو نہ بھولیں وہی سب کا مالک ہے۔ اس کی اِچھا ہوئی تو اور بھی چھوٹ ہوجائے گی۔"

امر نے جُھک کر مہنت جی کی تعظیم کی اور وہاں سے باہر نکلا تو اس کی باچھیں کھلی جاتی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا اس کے پیر آپ ہی آپ اٹھے جارہے ہیں۔ وہ جلد سے جلد علاقے میں پہنچ کر یہ خبر سُنا دینا چاہتا تھا۔ ایسا تیز جا رہا تھا گویا دوڑ رہا ہے۔ کبھی کبھی دوڑ بھی لگا لیتا تھا۔ لیکن پھر ہوش میں آکر رُک جاتا تھا۔ لو' تو نہ مگر دھوپ بہت تیز تھی۔ جسم پھنکا جا رہا تھا۔ پھر بھی وہ بھاگا جاتا تھا۔ اب وہ سوامی آتما نند سے پوچھے گا۔ جناب اب تو آپ کو یقین آیا کہ دنیا میں سب ہی خودغرض نہیں ہیں، کچھ رحم دل بھی ہیں جو دوسروں کا دُکھ درد سمجھتے ہیں۔ اب وہ ان کے ساتھ بے فکروں کی بھی خبر لے گا۔ اگر اس کے پَر ہوتے تو اُڑجاتا۔

شام کو جب وہ گاؤں میں پہنچا تو کتنی منتظر، مگر کج بیں، آنکھوں نے اس کا خیر مقدم کیا۔ کاشی بولا۔"آج تو بہت خوش ہو بھیا پالا مار لائے کیا؟"

امر نے کھاٹ پر بیٹھتے ہوئے اکڑ کر کہا۔"جو دل سے کام کرے گا وہ پالا مارے گا ہی۔"

بہت سے لوگ پوچھنے لگے۔"کیا حکم ہوا؟"

امر نے ڈاکٹر کی طرح مریضوں کو تسلی دی۔"تم لوگ ناحق مہنت جی کو بدنام کر رہے تھے۔ ایسی شرافت سے پیش آئے کہ کیا کہوں۔ مجھ سے کہنے لگے ہمیں پہلے ہی کیوں نہ خبر دی۔ نہیں ہم نے وصولی بند کردی ہوتی۔ اب وہ سرکار سے خط و کتاب کر رہے ہیں۔ یہاں کے کارندے کو بھی پروانہ بھیج دیا جائے گا کہ وصولی ملتوی کردو۔"

کاشی نے خفیف ہوکر کہا۔"دیکھو کچھ ہوجائے تو جانیں۔"

امر نے ذمے دارانہ لہجے میں کہا۔"اگر ضبط سے کام لوگے تو سب کچھ ہوجائے گا ہلڑ مچاؤگے تو کچھ نہ ہوگا۔ اُلٹے اور ڈنڈے پڑیں گے۔"

سلونی نے کہا۔ ”جب موئے سوامی مانیں۔“

گوڈر نے اپنا چودھری پن دکھایا۔ ”مانیں گے کیسے نہیں ان کو ماننا پڑے گا۔“

ایک سیہ فام نوجوان نے جو سوامی جی کے تندمزاج معتقدوں میں سے تھا، شرمندہ ہوکر بولا۔ ”بھیا جس لگن سے تم کام کرتے ہو کون کرے گا۔“

دوسرے دن پیادوں نے اسی سختی سے لگان وصول کی لیکن تیسرے دن سے وہ کچھ نرم پڑگئے۔ سارے علاقے میں خبر پھیل گئی کہ مہنت جی نے سرکار سے نصف لگان معاف کردینے کی اجازت مانگی ہے۔ سوامی جی جس گاؤں سے نکل جاتے وہاں کے لوگ ان پر آوازے کستے۔ سوامی جی اب بھی اپنی ضد پر قائم تھے۔ یہ سب فریب ہے۔ گندم نمائی ہے۔ کچھ ہونا ہوانا نہیں۔ انھیں آسامیوں کی اتنی فکر نہ تھی جتنی اپنی بات رکھنے کی۔ اگر نصف معافی کا حکم آجاتا تو وہ شاید اس علاقے سے روپوش ہوجاتے۔ جب تک ایسا کوئی حکم نہ آجائے انھیں اپنے خیالات کے اظہار کی پوری آزادی تھی۔ اور اگرچہ عوام پر ان کا اثر باقی نہ رہا تھا لیکن کچھ نہ کچھ لوگ ان کی تقریریں سننے کے لیے جمع ہو ہی جاتے تھے۔ ہاں اس کان سُن کر اُس کان اُڑا دیتے تھے۔

دن گزرنے لگے مگر کوئی حکم نہ آیا۔ پھر لوگوں کے دلوں میں شبہے پیدا ہونے لگے۔ جب دو ہفتے گزر گئے اور رعایا پھر قابو سے باہر ہونے لگی تو امرکانت صدر گیا اور سلیم کے ساتھ مسٹر غزنوی سے ملا۔ مسٹر غزنوی لمبے، دُبلے، گورے اور شوقین آدمی تھے۔ اور تھے بھی بڑے خوش مزاج۔ کام اتنا ہی کرتے تھے جتنا ضروری ہوتا تھا اور جس کے نہ کرنے سے جواب طلب ہونے کا اندیشہ تھا۔ لیکن دل کے صاف، بے غرض اور فیاض آدمی تھے۔ جب امر نے دیہاتیوں کی حالت بیان کی تو ہنس کر بولے۔ ”آپ کے مہنت جی نے فرمایا ہے سرکار جتنی مال گزاری معاف کردے میں اتنا ہی لگان معاف کردوں گا۔ کتنا منصف مزاج آدمی ہے۔“

امر نے پوچھا۔ ”مجھے تو اس میں کوئی بے انصافی نظر نہیں آتی۔“

”بے انصافی یہی ہے کہ اس کے کروڑوں روپے بنک میں جمع ہیں۔ سرکار پر اربوں قرض ہے۔

”تو آپ نے ان کی تجویز پر کوئی حکم دیا؟“

"اتنی جلد، بھلا چھ مہینے تو گزرنے دیجیے۔ ابھی ہم کاشتکاروں کی حالت کا معائنہ کریں گے۔ تب اطمینان سے اس کی رپورٹ لکھیں گے۔ سرکار اطمینان سے رپورٹ پر غور کرے گی تب کوئی حکم نکلے گا۔"

"تب تک تو آسامیوں کے وارے نیارے ہوجائیں گے۔ عجب نہیں کہ فساد شروع ہوجائے۔"

"تو کیا آپ چاہتے ہیں کہ سرکار اپنی وضع چھوڑ دے۔ یہ دفتری حکومت ہے جناب۔ یہاں سب ہی کام ضابطے کے ساتھ ہوتے ہیں۔ آپ ہمیں گالیاں دیں۔ ہم آپ کا کچھ نہیں کرسکتے۔ پولیس میں رپورٹ ہوگی۔ پولیس تحقیقات کرے گی۔ تب آپ کا چالان ہوگا۔ کوئی ڈپٹی مجسٹریٹ آپ کو سزا دے گا۔ ہوگا وہی جو میں چاہوں گا۔ مگر ضابطے کے ساتھ۔ خیر یہ تو مذاق تھا آپ کے دوست مسٹر سلیم بہت جلد اس علاقے کی تحقیقات کریں گے۔ مگر دیکھیے جھوٹی شہادتیں نہ پیش کیجیے گا۔ کہ بے چارے وہاں سے نکالے جائیں۔ وہ تو آپ کے مداح ہیں۔ مگر بھائی میں تم لوگوں سے ڈرتا ہوں۔ خاص کر تمھارے اس سوامی سے، بڑا مفسد آدمی ہے۔ اس کی رپورٹ کیوں نہیں کرتے۔ میں نے سُنا ہے وہ تم کو بدنام کرتا پھرتا ہے۔"

اتنا بالادست افسر امرکانت سے اتنی بے تکلفی سے باتیں کر رہا تھا۔ پھر اسے کیوں نہ نشہ ہوجاتا۔ یہ واقعہ تھا کہ سوامی آتمانند علاقے میں شورش پیدا کررہے تھے۔ اگر یہ شخص گرفتار ہوجائے تو علاقے میں سکون ہوجائے۔ سوامی دلیر ہے۔ صاف گو ہے۔ قوم کا سچّا خادم ہے۔ لیکن اس وقت اس کا گرفتار ہونا ہی مصلحت ہے۔

اس نے کچھ اس انداز سے جواب دیا کہ اس کے دلی جذبات ظاہر نہ ہوں لیکن سوامی پر وار چل جائے۔ "مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں ہے ہاں انھیں اختیار ہے مجھے چاہے جتنا بدنام کریں۔"

غزنوی نے سلیم سے کہا۔ "یہ نوٹ کرلو مسٹر سلیم۔ کل اس علاقے کے تھانے دار کو لکھ دو کہ اس سوامی کی خبر لے۔ بس اب سرکاری کام ختم۔ میں نے سنا ہے مسٹر امرکانت! کہ آپ حسینوں کی تسخیر کا کوئی منتر جانتے ہیں۔"

امر نے سلیم کی گردن پکڑ کر کہا۔ "یہ تمھاری شرارت ہوگی سلیم مجھے بدنام کرتے

پھرتے ہو۔"

سلیم بولا۔ "تمھیں تمھاری حرکتیں بدنام کررہی ہیں۔ میں کیوں بدنام کرنے لگا۔"

غزنوی نے بانکپن کے ساتھ کہا۔ "تمھاری بیوی غضب کی دلیر عورت ہے۔ بھائی آج کل میونسپلٹی سے اس کی زور آزمائی ہے اور مجھے یقین ہے کہ بورڈ کو جھکنا پڑے گا۔ مگر بھائی میری بیوی ایسی ہوتی تو میں فقیر ہوجاتا۔ واللہ۔"

امر نے ہنس کر کہا۔ "آپ کو تو خوش ہوجانا چاہیے تھا۔"

"جی ہاں، وہ تو جناب کا دل ہی جانتا ہوگا۔"

سلیم نے شگوفہ چھوڑا "انھیں کے خوف سے تو یہ بھاگے ہوئے ہیں۔"

غزنوی نے رنگ آمیزی کی "یہاں کوئی جلسہ کرکے انھیں بلانا چاہیے۔"

سلیم بولا۔ "کیوں بیٹھے بٹھائے زحمت مول لیجیے گا۔ وہ یہاں آئیں اور شہر میں آگ لگی۔ ہمیں بنگلوں سے نکلنا پڑا۔"

غزنوی نے منہ بناکر کہا۔ "اجی وہ تو ایک دن ہونا ہی ہے۔ یہ بغیر سوراج لیے ہرگز نہ مانیں گے۔"

تینوں دوستوں میں بڑی رات تک بے تکلفانہ گفتگو ہوتی رہی۔ سلیم نے امر کی پہلے ہی خوب تعریف کردی تھی۔ اس لیے اس کی دہقانی وضع کے باوجود غزنوی اس سے دوستانہ برتاؤ کرتے رہے۔ سلیم کے لیے حکومت نئی چیز تھی اپنے نئے جوتے کو کیچڑ اور پانی سے بچاتا تھا۔ غزنوی حکومت کا عادی ہوچکا تھا۔ جانتا تھا کہ پاؤں نئے جوتے سے کہیں اچھی چیز ہے۔ حسینوں کا ذکر اس کے لیے دل چسپی، مسرت، اور تفریح کا خاص مشغلہ تھا۔ رندوں کی رنگین مزاجی بہت دیر پا شے ہے۔ ان کی ناکام آرزوئیں اظہار سے اپنے کو خوش کرلیا کرتی تھیں۔

امرکانت نے ہنس کر غزنوی سے پوچھا۔ "آپ نے شادی کیوں نہیں کی؟ میرے ایک پروفیسر شانتی کمار ڈاکٹر ہیں۔ وہ بھی شادی نہیں کرتے۔ شاید آپ لوگ عورتوں سے ڈرتے ہوگے۔"

غزنوی نے حافظے پر زور ڈال کر کہا۔ "شانتی کمار وہی تو ہیں خوب صورت سے، گورے چٹے، گٹھے ہوئے بدن کے آدمی۔ اجی وہ تو میرے ساتھ پڑھتا تھا۔ ہم دونوں

آکسفورڈ میں تھے۔ میں نے لٹریچر لیا تھا۔ اس نے پولٹیکل فلاسفی لی تھی۔ میں اسے خوب بنایا کرتا تھا۔ یونیورسٹی میں ہے نا، اس کی اکثر یاد آتی رہتی ہے۔"

سلیم نے اس کے استعفا اور سیاسی مشاغل کا ذکر کیا۔

غزنوی نے گردن ہلائی گویا کوئی راز سمجھ میں آگیا ہو۔ "تو یہ کہیے آپ لوگ ان کے شاگرد ہیں۔ ہم لوگوں میں اکثر شادی کے مسئلے پر باتیں ہوتی تھیں۔ مجھے تو ڈاکٹروں نے شادی کی ممانعت کی تھی۔ کیونکہ اس وقت مجھ میں ٹی۔ بی۔ کی کچھ علامتیں نظر آرہی تھیں۔ جوان بیوہ چھوڑ جانے کے خیال سے میری روح کانپتی تھی۔ شانتی کمار کو تو قومی خدمت اور نہ جانے کیا کیا خبط تھا۔ مگر تعجب یہ ہے کہ اب تک اس خبط نے ان کا گلا نہیں چھوڑا، اب ان کی ہمّت نہ پڑتی ہوگی۔ میرے ہی ہم سن تو تھے۔ ذرا ان کا پتا تو بتانا۔ میں یہاں آنے کی دعوت دوں گا۔"

سلیم نے سرہلایا۔"انھیں کہاں فرصت، میں بلایا تھا نہیں آئے۔"

غزنوی نے مسکراکر کہا۔"تم نے نج کے طور پر بلایا ہوگا۔ کسی انسٹی ٹیوشن کی طرف سے بلاؤ اور کچھ چندہ کرا دینے کا وعدہ کرو۔ پھر دیکھو سر کے بل دوڑے آتے ہیں یا نہیں۔ ان قومی خادموں کی جان چندہ ہے۔ ایمان چندہ ہے اور شاید خدا بھی چندہ ہے جسے دیکھو چندے کی ہائے ہائے۔ میں نے کئی بار ان قومی خادموکو خوب چرکا دیا ہے اس وقت ان کی صورت دیکھنے ہی سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ ہیں کہ گالیاں دے رہے ہیں۔ پینترے بدل رہے ہیں۔ زبان سے تو توپ کے گولے چھوڑ رہے ہیں اور آپ ان کی بوکھلاہٹ کا مزہ اُٹھا رہے ہیں۔ میں نے تو ایک بار ایک لیڈر صاحب کو پاگل خانے میں بند کردیا تھا۔ کہتے ہیں اپنے کو قوم کا خادم اور سمجھتے ہیں آقا۔"

سویرے مسٹر غزنوی نے امرکانت کو اپنے موٹر پر گاؤں پہنچا دیا۔ امر کے غرور اور خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ افسروں کی صحبت نے افسری کی کچھ شان بھی پیدا کردی تھی۔ سب سے کہنے لگا۔"حاکم پرگنہ تمھاری حالت کی جانچ کرنے آرہے ہیں۔ خبردار کوئی ان کے سامنے جھوٹا بیان نہ دے۔ جو کچھ وہ پوچھیں اس کا ٹھیک ٹھیک جواب دو۔ نہ اپنی حالت چھپاؤ۔ نہ مبالغے کے ساتھ کہو۔ تحقیقات سچی ہونی چاہیے۔ مسٹر سلیم بڑے نیک اور غریب دوست آدمی ہیں۔ تحقیقات میں دیر لگے گی۔ لیکن حکومت کے انتظام میں دیر لگتی ہے۔ اتنا

بڑا علاقہ ہے۔ کئی مہینے دورے میں لگ جائیں گے۔ تب تک تم لوگ خریف کا کام شروع کردو۔ روپے میں آٹھ آنے تخفیف کا میں ذمہ لیتا ہوں۔ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے اتنا سمجھ لو۔"

سوامی آتمانند کو بھی کچھ کچھ یقین آگیا۔ انھوں نے دیکھا کہ امر اکیلا ہی ساری نیک نامی لوٹے لیے جاتا ہے۔ اور میرے ہاتھ اپجس کے سوا اور کچھ نہیں پڑتا۔ انھوں نے پہلو بدلا۔ ایک جلسے میں دونوں ایک ہی پلیٹ فارم سے بولے۔ کچھ سوامی جی جھکے۔ کچھ امر نے ہاتھ بڑھایا۔ پھر دونوں میں دوستی ہوگئی۔

ادھر اساڑھ کی بارش شروع ہوگئی۔ ادھر سلیم تحقیقات کرنے آپہنچا۔ دوچار گاؤں میں آسامیوں کے بیان لیے بھی۔ لیکن ایک ہی ہفتے میں اکتا گیا، پہاڑی ڈاک بنگلے میں بھوت کی طرح اکیلے پڑے رہنا اس کے لیے جہنم سے کم نہ تھا۔ ایک دن بیماری کا بہانہ کرکے بھاگ کھڑا ہوا اور ایک مہینے تک ٹال مٹول کرتا رہا۔ آخر جب اوپر سے تنبیہ ہوئی اور مسٹر غزنوی نے تاکید کی تو پھر چلا۔ اس وقت ساون کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ ندی نالے بھر گئے تھے اور کچھ خنکی ہوگئی تھی۔ پہاڑوں پر ہریالی چھائی ہوئی تھی اور موروں کی دلکش آوازیں سُنائی دینے لگیں تھیں۔ ان قدرتی دل فریبوں نے دیہاتوں کو سنوار دیا تھا۔

کئی دن بعد آج بادل کھلے تھے۔ مہنت جی نے سرکاری فیصلے کے آنے تک روپے میں چار آنے کی تخفیف کردی تھی اور کارندے بقایا وصول کرنے کی پھر کوشش کرنے لگے تھے۔ دوچار آدمیوں کے ساتھ انھوں نے سختی بھی کی تھی۔ اس نئے مسئلے پر غور کرنے کے لیے آج گنگا کنارے ایک عظیم الشان جلسہ ہو رہا تھا۔ بھولا چودھری صدر جلسہ تھے اور سوامی آتمانند حاضرین سے کہہ رہے تھے۔

"بھائیوں تم لوگوں میں ایسے کم ہیں جنھوں نے آدھا لگان ادا کردیا ہو، ابھی تک تو آدھے کی فکر تھی اب آدھے کے آدھے کی فکر ہے۔ تم لوگ خوشی سے دو آنے اور دو۔ اب کی ہمیں چھے آنے ہی پر قناعت کرنی چاہیے۔ آگے کی فصل میں اگر غلے کا بھاؤ یہی رہا تو ہمیں یہ امید ہے کہ آٹھ آنے کی چھوٹ مل جائے گی۔ یہی میری تجویز ہے اور میرے دوست امرکانت کی بھی یہی رائے ہے۔ اگر آپ لوگ اس کے سوا کوئی دوسری تجویز پیش کرنا چاہتے ہوں تو ہم اس پر غور کرنے کو تیار ہیں۔"

اسی وقت ڈاکیے نے جلسے میں آکر امرکانت کے ہاتھ میں ایک لفافہ رکھ دیا۔ پتے کی تحریر نے بتا دیا کہ نینا کا خط ہے۔ پڑھتے ہی گویا اس پر نشہ چھا گیا۔ چہرے پر کچھ ایسا جلال پیدا ہوگیا گویا آگ میں گھی پڑگیا ہو پُرغرور نظروں سے ادھر اُدھر دیکھا۔ دل کے جذبات گویا چھلانگیں مارنے لگے۔ سکھدا کی گرفتاری اور حراست کا واقعہ تھا۔ اوہو! سکھدا جیل گئی اور وہ یہاں پڑا ہوا ہے۔ اب اسے جیل سے باہر رہنے کا کیا حق ہے۔ وہ نازک بدن عورت اس وقت جیل میں ہے۔ جو کسی کی تیز نگاہ بھی نہ سہہ سکتی تھی۔ جسے ریشمی کپڑے بھی چبھتے تھے۔ مخملی گدّے بھی گڑتے تھے۔ وہ آج جیل کی سختیاں جھیل رہی ہے۔ امر کے دل کا سارا خون سکھدا کے قدموں پر گر کر بہہ جانے کے لیے مچل اُٹھا۔ سکھدا! سکھدا! جدھر دیکھیے اسی کا جلوہ تھا۔ شام کی شفق میں زرنگار گنگا کی لہروں پر وہ بیٹھی ہوئی کون چلی جا رہی ہے سکھدا۔ اوپر ناپید کنارا آسمان میں کیسریا ساڑی پہنے ہوئے کون چلی جا رہی ہے؟ سکھدا۔ امر پاگلوں کی طرح کئی قدم آگے دوڑا۔ گویا اس کے قدموں کی خاک اپنی پیشانی پر لگا لینا چاہتا ہو۔

جلسے میں کون کیا بولا اس کی اسے خبر نہیں۔ جب لوگ اپنے اپنے گاوں کو لوٹے تو سنہری چادر پھیل گئی تھی۔ امرکانت کا دل تشکر سے پُر تھا۔ اسے اپنے اوپر کسی دیوی کا سایۂ حمایت اسی چاندنی کی طرح پھیلا ہوا معلوم ہوا۔ اسے ایسا محسوس ہوا گویا اس کی زندگی میں کوئی مشیت ہے۔ کوئی تقدیر ہے، کوئی حقیقت ہے اور وہ قدم قدم پر اسے سنبھالتی ہے، بچاتی ہے۔ اس کی رہنمائی کرتی ہے۔

دفعتاً منّی نے پکارا۔ ”لالہ آج تو تم نے آگ ہی لگا دی۔“

امر نے چونک کر کہا۔ ”میں نے؟“

تب اسے اپنی تقریر کا ایک ایک لفظ یاد آگیا۔ اس نے منّی کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ”ہاں منّی اب ہمیں وہی کرنا پڑے گا جس کی تفصیل میں نے بیان کی۔“

منّی نے سہم کر کہا۔ ”آگ میں کود رہے ہو اور کیا؟“

امر نے قہقہہ مار کر کہا۔ ”آگ میں کودنے ہی سے جنت ملے گی دوسرا راستہ نہیں ہے۔“

منّی حیرت سے اس کا منہ دیکھنے لگی۔ اس بات پر ہنسنے کی کیا ضرورت تھی، وہ یہ نہ سمجھ سکی۔

(۲)

سلیم یہاں سے کوئی سات آٹھ میل پر ڈاک بنگلے میں پڑا ہوا تھا۔ حلقے کے تھانے دار نے رات ہی اسے اس جلسے کی خبر دی اور امرکانت کی تقریر بھی پڑھ کر سُنائی۔ اسے ان جلسوں کی رپورٹ کرنے کی تاکید کردی گئی تھی۔

سلیم کو بڑا تعجب ہوا۔ ابھی ایک دن پہلے امرکانت اس سے ملا تھا اور اگرچہ اس نے مہنت کی اس نئی بے عنوانی سے ناراضگی ظاہر کی تھی۔ مگر اس میں محض افسوس تھا۔ غصّے کا نام بھی نہ تھا۔ آج یکایک یہ تغیر کیسے ہوگیا۔

اس نے تھانے دار سے پوچھا۔"مہنت جی کی طرف سے کوئی خاص زیادتی تو نہیں ہوئی؟"

تھانے دار نے گویا اس شبہے کو جڑ سے کاٹ دینے پر آمادہ ہوکر کہا۔"بالکل نہیں حضور، انھوں نے سخت تاکید کردی تھی کہ آسامیوں پر کسی قسم کا ظلم نہ کیا جائے۔"

"جلسے پر اس تقریر کا کیا اثر ہوا؟"

"حضور یہی سمجھ لیجیے جیسے پوال میں آگ لگ جائے۔ اب اس علاقے میں مہنت جی کو مشکل سے لگان وصول ہوگا۔"

سلیم نے آسمان کی طرف دیکھ کر پوچھا۔"آپ اس وقت میرے ساتھ صدر چلنے کو تیار ہیں؟"

تھانیدار کو کیا عذر ہوسکتا تھا۔ سلیم کے جی میں ایک بار آیا کہ ذرا امر سے مل لیں۔ لیکن پھر سوچا اگر وہ میرے سمجھانے سے ماننے والا ہوتا تو یہ آگ ہی کیوں لگاتا۔

دفعتاً تھانے دار نے پوچھا۔"حضور سے تو ان کی جان پہچان ہے۔"

سلیم نے چڑ کر کہا۔"یہ آپ سے کس نے کہا۔ میری سینکڑوں سے جان پہچان ہے تو پھر؟ میرا لڑکا بھی اگر قانون کی خلاف ورزی کرے تو مجھے اس کی تنبیہ کرنی پڑے گی۔"

تھانے دار نے اپنی غلطی سمجھ کر معذرت آمیز انداز سے کہا۔"میرا یہ مطلب نہیں تھا حضور۔ حضور سے جان پہچان ہونے پر بھی انھیں حضور کو بدنام کرنے میں تامل نہ ہوا میرا یہ منشاء تھا۔"

سلیم نے کچھ جواب تو نہیں دیا مگر یہ اس معاملے کا نیا پہلو تھا بیشک امرکانت کو اس

کے علاقے میں ایسا طوفان نہ اُٹھانا چاہیے تھا۔ آخر افسروں کو بھی خیال تو ہوگا کہ یہ نیا آدمی ہے۔ علاقے پر اس کا رعب نہیں ہے۔

بادل پھر گھرتے آتے تھے۔ راستہ بھی خراب تھا۔ اس پر اندھیر رات اور ندیوں کا اُتار۔ مگر سلیم کا غزنوی سے ملنا ضروری تھا۔ کوئی تجربہ کار افسر اس ذرا سی بات سے بدحواس نہ ہوتا۔ مگر سلیم نیا آدمی تھا۔

دونوں آدمی رات بھر کی حیرانی کے بعد صبح کو صدر پہنچے۔ آج میاں سلیم کو معلوم ہوا کہ یہاں محض حکومت نہیں ہے۔ پریشانی اور خطرہ بھی ہے۔ جب پانی کا کوئی جھکولا آتا یا کوئی نالہ سامنے آپڑتا تو اس کے جی میں آتا کیوں نہ اس ملازمت سے استعفا دے دوں یہ نوکری ہے یا بلائے جان۔ مزے سے زندگی گزرتی تھی۔ یہاں اس خلجان میں آپھنسا۔ لعنت ہے ایسی ملازمت پر۔ کہیں کھڈ میں جا پڑے تو ہڈیوں کا بھی پتہ نہ چلے۔ نئی موٹر چوپٹ ہوگئی۔

بنگلے پر پہنچ کر اس نے کپڑے بدلے۔ ناشتہ کیا اور آٹھ بجے غزنوی کے پاس جا پہنچا۔ تھانے دار کوتوالی میں ٹھیرا تھا۔ اس وقت وہ بھی حاضر ہوا۔

غزنوی نے یہ واقعہ سُن کر کہا۔"یہ شخص کچھ دیوانہ تو نہیں ہوگیا ہے۔ بات چیت سے تو بڑا سلیم الطبع معلوم ہوتا تھا۔ مگر لیڈری کا خبط بھی بُرا ہے۔ بے چارا کیسے نام پیدا کرے۔ شاید حضرت سمجھتے ہوں گے۔ حکّام سے بے تکلفی ہو ہی گئی اب کیا غم"سیّاں بھئے کوتوال اب ڈر کاہے کا۔" اور ضلعوں میں ابھی شورش ہے ہی۔ ممکن ہے وہاں سے تاکید آئی ہو۔ سوجھی ہے ان سبھوں کو دور کی۔ اور حق یہ ہے کہ کسانوں کی حالت نازک ہے۔ یوں بھی بے چاروں کو پیٹ بھر دانہ میسر نہ ہوتا تھا اب تو جنسیں اور بھی ارزاں ہوگئیں۔ پورا لگان کہاں آدھے کی بھی گنجائش نہیں۔ مگر اپنی شکایتوں کو پیش کرنے کے اور بھی طریقے تھے۔ یہ ہنگامہ خیزی تو کوئی حکومت برداشت نہیں کرسکتی۔ کسانوں کو آج یقین ہوجائے کہ آدھا لگان دے کر ان کی جان بچ سکتی ہے تو کل وہ چوتھائی کے لیے شور مچائیں گے اور پرسوں پوری معافی کا مطالبہ کریں گے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ آپ جاکر لالہ امرکانت کو گرفتار کرلیں۔ ایک بار تو شورش ہوگی۔ ممکن ہے کہ دو چار گاؤں میں فساد بھی ہو۔ مگر کھلے ہوئے فساد کو روکنا اتنا مشکل نہیں ہے۔ جتنا اس ہوا کو۔ مواد جب پھوڑے کی

شکل میں آجاتا ہے تو نشتر دے کر اسے آسانی سے نکالا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ دل یا دماغ کی طرف چلا جائے تو زندگی کا خاتمہ ہوجائے گا۔ اس سوامی کو بھی گرفتار کیجیے۔ داروغہ جی آپ سپرنٹنڈنٹ سے جاکر کہیے آپ کے ساتھ جانے کے لیے تیار رہیں۔"

سلیم نے دردمند لہجے میں کہا۔"میں جانتا کہ یہاں آتے ہی آتے اس عذاب میں جان پھنسے گی تو کسی دوسرے ضلع کے لیے کوشش کرتا، کیا میرا تبادلہ نہیں ہوسکتا؟"

غزنوی نے ستم ظریفانہ لہجے میں کہا۔"ہاں ضرور ہوجائے گا میں سفارش کردوں گا۔"

تھانے دار نے پوچھا۔"حضور کوئی خط دیں گے۔"

غزنوی نے گھڑک کر کہا۔"خط کی کیا ضرورت ہے۔ کیا تم اتنا بھی یاد نہیں رکھ سکتے؟"

تھانے دار سلام کرکے چلا گیا تو سلیم نے کہا۔"آپ نے اسے ناحق ڈانٹا بے چارا شرمندہ ہوگیا، اچھا آدمی ہے۔"

غزنوی نے سر ہلا کر کہا۔"جی ہاں بہت اچھا آدمی ہے۔ رسد خوب پہنچاتا ہوگا۔ مگر رعایا سے اس کی دس گنی وصول کرتا ہوگا۔ جہاں کسی ماتحت نے بلا ضرورت خوشامد کی میں سمجھتا ہوں چھٹا ہوا گرگا ہے۔ حضرت کی لیاقت کا یہ حال ہے کہ علاقے میں صدہا وارداتیں ہوتی ہیں ایک کا بھی پتہ نہیں چلتا۔ اسے جھوٹی شہادتیں بنانا بھی نہیں آتا بس خوشامد کی روٹیاں کھاتا ہے۔ اگر سرکار پولیس کا سدھار کرسکے تو سوراج کا مطالبہ پچاس سال کے لیے ٹل سکتا ہے۔ آج کوئی شریف آدمی پولیس سے سروکار نہیں رکھنا چاہتا۔ تھانے کو بدمعاشوں کا اڈّا سمجھ کر ادھر سے منہ پھیر لیتا ہے۔ اگر آپ کو اپنے دوست کے گرفتار کرنے میں تکلیف ہو تو میں ڈی، ایس، پی کو بھیج دوں۔ اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ ان کی ذلت نہ ہو تو میں استدعا کروں گا کہ آپ خود جائیے۔ اپنی دوستی کا حق ادا کرنے کے لیے تو جائیے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کو صدمہ ہو رہا ہے مجھے خود رنج ہے۔ اس تھوڑی دیر کی ملاقات ہی میں میں ان سے متاثر ہوگیا۔ میں ان کے نیک ارادوں کی قدر کرتا ہوں۔ لیکن ہم اور وہ مخالف جماعتوں میں ہیں۔ سوراج ہم بھی چاہتے ہیں مگر انقلاب کی صورت میں نہیں۔ حالانکہ کبھی کبھی مجھے بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انقلاب کے سوا ہمارے لیے دوسرا راستہ نہیں ہے۔ سرکار کو اتنی کثیر التعداد فوج رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر ان کی

تعداد نصف کردی جائے تو زمین کے محاصل میں بھی تخفیف کی جاسکتی ہے۔ مجھے اگر سوراج سے کوئی خوف ہے تو یہ کہ مسلمانوں کی حالت کہیں اور خراب نہ ہوجائے۔ غلط تاریخیں پڑھ پڑھ کر دونوں ہی فرقے ایک دوسرے کے دشمن ہوگئے ہیں۔ مسلمان فاتح تھے اور قیاس کیا جاتا ہے کہ انھوں نے ہندوؤں پر زیادتیاں بھی کی ہوں گی۔ ہندو فاتح ہوتے تو غالبًا وہ بھی مسلمانوں پر یہی زیادتیاں کرتے۔ ممکن نہیں کہ ہندو موقع پاکر مسلمانوں سے فرضی عداوتوں کا بدلا نہ چکائے، لیکن اس خیال سے تسلی ہوتی ہے کہ اس بیسویں صدی میں ہندو جیسی پڑھی لکھی قوم مذہبی گروہ بندی کی پناہ نہیں لے سکتی۔ مذہب کا دور ختم ہو رہا ہے بلکہ یوں کہو کہ ختم ہوگیا۔ صرف ہندوستان میں اس کی کچھ جان باقی ہے یہ معاشیات کا دور ہے۔ اب قوم میں دار و نادار، مالک و مزدور اپنی اپنی جماعتیں بنائیں گے۔ ان میں اس سے کہیں زیادہ خونریزی ہوگی۔ یہ لوگ ان سے کہیں زیادہ تنگ دل ہوں گے۔ مگر وہ جو کچھ کریں گے جماعت کے نام پر۔ ذاتی اغراض کے لیے نہیں۔ آج بھی شاید ہی کوئی تعلیم یافتہ آدمی ملے جو مساوات کا حامی نہ ہو۔ آخر ایک دو صدی کے بعد دنیا میں ایک سلطنت قائم ہوجائے گی ساری دنیا کے لیے ایک قانون ہوگا۔ ایک نظام ہوگا۔ ایک معیار ہوگا۔ قوم کے خادم قوم پر حکومت کریں گے۔ مذہب محض ایک شخصی چیز رہ جائے گی۔ حاکم اور محکوم کی تمیز اُٹھ جائے گی۔

فون کی گھنٹی بجی۔ غزنوی نے رسیور کان سے لگایا، ''مسٹر سلیم کب چلیں گے۔''

''میں تیار ہوں۔''

''تو ایک گھنٹے میں آجائیے۔''

سلیم نے لمبی سانس کھینچ کر کہا۔ ''تو مجھے جانا ہی پڑے گا۔''

''بے شک میں آپ کے اور اپنے دوست کو پولیس کے ہاتھ میں نہیں دینا چاہتا۔''

''کسی حیلے سے امر کو یہاں بلا کیوں نہ لیا جائے۔''

''وہ اس وقت نہ آئیں گے۔''

سلیم نے سوچا اپنے شہر میں جب یہ خبر پہنچے گی کہ میں نے امر کو گرفتار کیا تو مجھ پر کتنی پھٹکاریں پڑیں گی۔ شانتی کمار تو نوچ ہی کھائیں گے۔ سکینہ تو شاید میرا منہ دیکھنا پسند نہ کرے۔ اس خیال سے وہ کانپ اُٹھا، سونے کا ہنسیا نہ اُگلتے بنتی تھی نہ نگلتے۔

اس نے کرسی سے اُٹھ کر کہا۔"آپ ڈی، ایس، پی کو بھیج دیں۔ میں نہیں جانا چاہتا۔"

غزنوی نے متفکرانہ لہجے میں کہا۔"آپ چاہتے ہیں کہ انھیں وہیں سے ہتھکڑیاں پہنا کر اور کمر میں رسّی ڈال کر چار کانسٹبلوں کے ساتھ لایا جائے۔ اور جب پولیس انھیں لے کر چلے تو اسے مجمعے کو بھگانے کے لیے گولیاں چلانی پڑیں۔"

سلیم نے گھبرا کر کہا۔"کیا ڈی، ایس، پی کو یہ ہدایت نہیں دی جاسکتی کہ وہ ان کی پوزیشن کا خیال رکھیں؟"

"امرکانت آپ کے دوست ہیں ڈی، ایس، پی کے دوست نہیں۔"

"تو پھر آپ ڈی، ایس، پی کو میرے ساتھ نہ بھیجیں۔"

"آپ امر کو یہاں لاسکتے ہیں؟"

"ہاں لا تو سکتا ہوں۔ مگر دغا کرنی پڑے گی۔"

"اچھی بات ہے، آپ جائیے میں ڈی، ایس، پی کو منع کیے دیتا ہوں۔"

سلیم نے اپنے مکان پر لوٹا تو بے حد رنجیدہ تھا۔ آتے ہی آتے اس نے سکینہ، شانتی کمار، لالہ سمرکانت، نینا ہر ایک کے نام ایک ایک خط لکھ کر اپنی مجبوری اور بے بسی کا اظہار کیا۔ سکینہ کو اس نے لکھا۔"میرے دل پر جو اس وقت گزر رہی ہے۔ وہ تم سے بیان نہیں کرسکتا۔ شاید اپنے جگر پر خنجر چلاتے ہوئے بھی مجھے اس سے زیادہ درد نہ ہوتا۔ جس کی محبت مجھے یہاں کھینچ لائی اسی کو میں آج ان ظالم ہاتھوں سے گرفتار کرنے جا رہا ہوں۔ سکینہ خدا کے لیے تم مجھے کمینہ، بے درد اور خودغرض نہ سمجھنا۔ میں خون کے آنسو رو رہا ہوں اسے اپنے آنچل سے پونچھ دو۔ مجھ پر امرکانت نے اتنے احسان کیے ہیں کہ مجھے ان کے پسینے کی جگہ اپنا خون بہانا چاہیے تھا مگر میں ان کے خون کا مزا لے رہا ہوں۔ میری گردن میں شکاری کا طوق ہے۔ اور اس کے اشارے پر میں وہ سب کرنے پر مجبور ہوں جو مجھے نہ کرنا لازم تھا۔ مجھ پر رحم کرو سکینہ میں بدنصیب ہوں۔"

خانساماں نے آکر پوچھا۔"حضور کھانا لاؤں۔"

سلیم نے سر جھکائے ہوئے اسے جواب دیا۔"مجھے بھوک نہیں ہے۔"

خانساماں پوچھنا چاہتا تھا۔ حضور کی طبیعت کیسی ہے؟ میز پر کئی لکھے خط دیکھ کر ڈر

رہا تھا کہ کہیں گھر سے کوئی بری خبر تو نہیں آئی۔

سلیم نے سر اُٹھایا اور پُر حسرت لہجے میں بولا۔"اس دن میرے وہ ایک دوست نہیں آئے تھے۔ وہی دیہاتیوں کی سی صورت بنائے ہوئے وہ میرے بچپن کے ساتھی ہیں۔ ہم دونوں نے ایک ہی کالج میں پڑھا۔ گھر کے لکھ پتی آدمی ہیں۔ باپ ہیں، بال بچے ہیں، اتنے لائق ہیں کہ مجھے انھوں نے پڑھایا۔ چاہتے تو کسی اچھے عہدے پر ہوتے۔ ان کے گھر پر بھی کسی بات کی کمی نہیں۔ مگر غریبوں کا اتنا درد ہے کہ گھر بار چھوڑ کر یہیں ایک گاؤں میں پڑے ہوئے ہیں۔ انھیں کو گرفتار کرنے کا مجھے حکم ہوا ہے۔"

خانساماں اور قریب آکر زمین پر بیٹھ گیا۔"کیا قصور کیا تھا حضور؟"

"قصور .... کوئی قصور نہیں یہی کہ کسانوں کی مصیبت ان سے نہیں دیکھی جاتی۔"

"حضور نے بڑے صاحب کو سمجھایا نہیں۔"

"میرے دل پر اس وقت جو کچھ گزر رہی ہے وہ میں جانتا ہوں حنیف۔ وہ آدمی نہیں فرشتہ ہے۔ یہ ہے سرکاری نوکری۔"

"تو حضور کو جانا پڑے گا۔"

"ہاں اسی وقت۔ یہاں اسی طرح دوستی کا حق ادا کیا جاتا ہے۔"

"تو ان بابو صاحب کو نظر بند کیا جائے گا حضور۔"

"خدا جانے کیا کیا جائے گا۔ ڈرائیور سے کہہ دو موٹر لے آئے۔ شام تک لوٹ آنا ضروری ہے۔"

ذرا دیر میں کار آگئی۔ سلیم اگر اس میں بیٹھا تو اس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔

آج کئی دن کے بعد تیسرے پہر سورج دیوتا نے زمین کی فریاد سنی ہے اور گویا مراقبے سے نکل کر اسے دعائیں دے رہے ہیں۔ زمین گویا آنچل پھیلائے ان کی دعاؤں کو بٹور رہی ہے۔

اسی وقت سوامی آتمانند اور امرکانت دونوں مخالف سمتوں سے آکر مدرسے میں کھڑے ہوگئے۔

امرکانت نے پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔"ہم لوگوں نے کتنا اچھا پروگرام بنایا

تھا کہ ایک ساتھ ہی لوٹے۔ ایک لمحے کا بھی فرق نہ پڑا۔ آؤ کچھ پی لیں اور پھر نکلیں۔"

آتمانند نے زمین پر لیٹ کر کہا۔"بھیّا اس وقت مجھ سے ایک قدم بھی نہ چلا جائے گا۔ ہاں جان لینا چاہتے ہو تو لے لو۔ بھاگتے بھاگتے کچومر نکل گیا۔ پہلے شربت بنواؤ، ٹھنڈے ہوں، تب تو آنکھیں کھلیں۔"

"تو پھر آج کا کام ختم ہو چکا۔"

"ختم ہو یا بھاڑ میں جائے۔ کیا جان دے دیں۔ تم سے ہوسکتا ہے تو کرو مجھ سے تو نہیں ہوسکتا۔"

امر نے مسکرا کر کہا۔"یار مجھ سے دونے تو ہو۔ پھر بھی چیں بول گئے۔ مجھے اپنی طاقت اور اپنا جسم دے دو۔ پھر دیکھو میں کیا کرتا ہوں۔"

آتمانند نے سوچا تھا آج کی کارگزاری پر ان کی پیٹھ ٹھونکی جائے گی۔ یہاں یہ بے قدری ہوئی، بولے۔"تم مرجانا چاہتے ہو۔ میں جینا چاہتا ہوں۔"

"جینے کا حاصل عمل کے سوا اور کیا ہے؟"

"ہاں میری زندگی کا حاصل عمل ہی ہے۔ تمھاری زندگی کا حاصل تو جوان موت ہے۔"

"اچھا شربت پلواتا ہوں اس میں دہی بھی ڈلوا دوں۔"

"ہاں دہی کی مقدار کافی ہو اور دو لوٹے سے کم نہ ہو۔ اس کے دو گھنٹے بعد کھانا کھاؤں گا۔"

"مار ڈالا۔ تب تک تو دن ہی غائب ہوجائے گا۔"

امر نے منّی کو بلا کر شربت بنانے کو کہا اور سوامی جی کے برابر ہی زمین پر لیٹ کر پوچھا۔"علاقے کی کیا حالت ہے؟"

"مجھے تو خوف ہو رہا ہے لوگ دھوکا دیں گے۔ بے دخلی شروع ہوتے ہی سب کے آسن ڈول جائیں گے۔"

"ایسا کام ہی کیوں کیا جائے جس کا انجام شرمندگی اور رسوائی ہو۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اس تحریک کے رہنما بننے کے قابل نہیں۔"

منّی شربت بنا کر لائی آتمانند نے کمنڈل بھر لیا اور ایک سانس میں چڑھا گئے۔ امر کانت ایک کٹورے سے زیادہ نہ پی سکے۔

آتمانند نے منہ چڑا کر کہا۔ "پھر بھی آپ اپنے آپ کو آدمی کہتے ہیں؟"

امر نے جواب دیا۔ "بہت کھانا جانوروں کا کام ہے۔"

"جو کھا نہیں سکتا وہ کام کیا کرے گا۔"

"نہیں جو کم کھاتا ہے وہی کام کرسکتا ہے۔ پیٹو کے لیے سب سے بڑا کام کھانے کو ہضم کرنا ہے۔"

سلونی کل سے بیمار تھی۔ امر اسے دیکھنے چلا ہی تھا کہ مدرسے کے سامنے کار آتے دیکھ کر رُک گیا۔ شاید اس گاؤں میں یہ کار پہلی ہی بار آئی ہو۔ وہ سوچ رہا تھا کس کی کار ہے کہ سلیم اس میں سے اُتر پڑا۔ امر نے لپک کر ہاتھ ملایا اور بولا۔ "کوئی ضروری کام تھا؟ مجھے کیوں نہ بلا لیا؟"

دونوں آدمی مدرسے میں آئے۔ امر نے ایک کھاٹ لاکر ڈال دی اور بولا۔ "تمھاری کیا خاطر کروں۔" یہ تو فقیروں کی جھونپڑی ہے۔ شربت بنواؤں؟"

سلیم نے سگار جلاتے ہوئے کہا۔ "نہیں، کوئی تکلف نہیں۔ میں نے ابھی ڈاک بنگلے پر ناشتہ کیا ہے۔ مسٹر غزنوی تم سے کسی معاملے پر صلاح کرنا چاہتے ہیں۔ میں آج جا رہا ہوں سوچا کہ تمھیں بھی لیتا چلوں۔ تم نے تو کل آگ ہی لگا دی۔ اب تو تحقیقات بے کار ہوگئی۔"

امر نے کچھ جھجکتے ہوئے کہا۔ "مہنت نے مجبور کردیا۔ کیا کرتے؟"

سلیم نے دوستی کی آڑ لی۔ "مگر اتنا تو سوچتے کہ میرا علاقہ ہے۔ یہ یہاں کی ساری ذمّے داری مجھ پر ہے۔ میں نے سڑک کے کنارے اکثر لوگوں کو جمع دیکھا۔ کہیں کہیں تو میری کار پر پتھّر بھی پھینکے گئے۔ یہ تو اچھے آثار نہیں ہیں۔ مجھے خوف ہے کوئی ہنگامہ نہ ہوجائے اپنے حق کے لیے یا بے جا ظلم کے خلاف رعایا میں جوش ہو تو میں اسے بُرا نہیں کہتا۔ لیکن جہلا قانونی دائرے کے اندر رہیں گے، مجھے شک ہے۔ تم نے لوگوں کو آواز دی، مُردوں میں جان ڈالی۔ لیکن اس کے لیے جس ضبط اور تحمل کی ضرورت ہے اس کا عشر عشیر بھی میں لوگوں میں نہیں پاتا۔"

امر کو اس تقریر میں حاکمانہ پہلو نظر آیا۔ بولا۔ "تمھیں یقین ہے کہ تم بھی وہی غلطی نہیں کر رہے ہو جو حکّام عموماً کیا کرتے ہیں؟ جن کی آرام اور فراغت سے گزر رہی ہے ان کے لیے ضبط اور تحمل کی ہانک لگانا آسان ہے۔ لیکن جن کی زندگی کا ہر ایک دن ایک نئی مصیبت ہے وہ نجات کے لیے اپنی جنواسی چال سے آنے کا انتظار نہیں کرسکتے۔ وہ اسے جلد کھینچ لانا چاہتے ہیں اور جلد سے جلد۔"

"مگر نجات سے پہلے قیامت آئے گی۔ یہ بھی یاد رہے۔"

"ہمارے لیے یہ اندھیر ہی قیامت ہے۔ جب پیداوار لاگت سے بھی کم ہو تو لگان کی گنجائش کہاں۔ اس پر بھی ہم آٹھ آنے پر راضی تھے۔ مگر بارہ آنے تو خواب و خیال ہے۔ آخر سرکار کفایت کیوں نہیں کرتی؟ پولیس اور فوج اور انتظام پر کیوں اتنی بے دردی سے روپے اُڑائے جاتے ہیں۔ کسان گونگے، بے بس ہیں، کمزور ہیں۔ کیا اسی لیے سارا نزلہ انھیں پر گرنا چاہیے؟"

سلیم نے حاکمانہ غرور کے ساتھ کہا۔"اس کا نتیجہ کیا ہے۔ جانتے ہو گاؤں کے گاؤں برباد ہوجائیں گے۔ فوجی قانون نافذ ہوجائے گا۔ زائد پولیس تعینات کردی جائے گی۔ فصلیں نیلام کردی جائیں گی۔ زمینیں ضبط ہوجائیں گی۔ مذاق نہیں ہے۔"

امرکانت نے لاپروائی سے کہا۔"جو کچھ بھی ہو۔ مرٹنا ظلم کے سامنے سر جھکانے سے اچھا ہے۔"

مدرسے کے سامنے ہجوم بڑھتا جاتا تھا۔ سلیم نے بحث ختم کرنے کے ارادے سے کہا۔"چلو اس مسئلے پر راستے میں باتیں ہوں گی۔ دیر ہو رہی ہے۔"

امر نے جھٹ پٹ کُرتا گلے میں ڈالا، اور آتمانند سے دو چار ضروری باتیں کرکے چلنے کو لیے تیار ہوگیا۔ دونوں کار پر بیٹھے۔ جب کار چلی تو سلیم کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔

امر نے پوچھا۔"میرے ساتھ دغا تو نہیں کر رہے ہو؟"

سلیم نے اس کو گلے لگا کر بولا۔"اس کے سوا اور دوسرا علاج نہ تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ تمھیں پولیس کے ہاتھوں ذلیل کیا جائے۔"

"تو ذرا ٹھہرو، میں اپنی ضروری چیزیں تو لے لوں۔"

"ہاں ہاں لے لو، لیکن راز کُھل گیا تو یہاں میری لاش نظر آئے گی۔"

"تو چلو کوئی مضائقہ نہیں۔ اس کا مجھے بھی اندیشہ ہے۔"

گاؤں کے باہر نکلے ہی تھے کہ منّی آتے دکھائی دی۔ امر نے کار ٹھہرا کر پوچھا۔"تم کہاں گئی تھیں منّی؟ دھوبی سے میرے کپڑے لے کر رکھ لینا۔ سلونی کاکی کے لیے میری کوٹھری میں دوا رکھی ہے پلا دینا۔"

منّی نے سہمی ہوئی آنکھوں سے دیکھ کر پوچھا۔"تم کہاں جاتے ہو؟"

"ایک دوست کے یہاں دعوت کھانے جارہا ہوں۔"

کار چلی، منّی نے پوچھا۔"کب تک آؤگے؟"

امر نے سر نکال کر اسے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔"جب تقدیر لائے۔"

(۸)

ساتھ کے پڑھے، ساتھ کے کھیلے دو دلی دوست، جن میں دھول دھپا ہنسی مذاق سب کچھ ہوتا رہتا تھا، حالاتِ زمانہ کی گردش میں پڑکر دو متضاد راستوں پر چلے جا رہے تھے، مقصد دونوں کا ایک تھا نصب العین ایک، دونوں ایک ہی قوم کا درد رکھنے والے۔ دونوں ہی کسانوں کے بہی خواہ، مگر ایک افسر تھا دوسرا قیدی۔ دونوں پہلو بہ پہلو بیٹھے ہوئے تھے۔ مگر اس طرح گویا بیچ میں کوئی دیوار حائل ہو۔ امر خوش تھا، گویا شہادت کے زینے پر چڑھ رہا ہو۔ سلیم افسردہ تھا جیسے بھری مجلس میں اپنی جگہ سے اُٹھا دیا گیا ہو۔

یکایک سلیم نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔"کیوں امر مجھ سے خفا ہو؟"

امر نے خندہ پیشانی سے کہا۔"بالکل نہیں، میں تمھیں اپنا وہی پُرانا دوست سمجھ رہا ہوں۔ اصولوں کی لڑائی ہمیشہ ہوتی رہی ہے اور ہوتی رہے گی۔ اس سے دوستی میں فرق نہیں آتا۔"

سلیم نے اپنی صفائی پیش کی۔"بھائی انسان انسان ہے۔ دو مخالف گروہوں میں آکر دل میں اگر کینہ یا ملال پیدا ہوجائے تو تعجب نہیں۔ لیکن مجھے امید ہے تمھیں حالات کا صحیح اندازہ ہوگیا ہوگا۔ پہلے ڈی۔ ایس۔ پی کو بھیجنے کی صلاح تھی۔ مگر میں نے خود آنا مناسب سمجھا۔"

"اس کے لیے میں تمھارا بڑا احسان مند ہوں۔ مجھ پر کوئی مقدمہ دائر ہوگا؟"

"ہاں تمھاری تقریروں کی رپورٹ پر گورنمنٹ نے تمھارے اوپر مقدمہ چلائے جانے کا حکم دیا ہے۔ تمھارا کیا خیال ہے۔ تمھاری گرفتاری سے یہ شورش فرو ہوجائے گی؟"

"کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اگر میری گرفتاری یا سزا سے لوگوں میں سکون پیدا ہوجائے تو اس کا فرو ہوجانا ہی اچھا ہے۔"

اس نے ایک لمحے کے بعد پھر کہا۔"عوام کو اب اپنے حقوق کی خبر ہوگئی ہے انھیں یہ بھی معلوم ہے کہ حقوق کی حفاظت کے لیے قربانیاں کرنی پڑتی ہیں۔ میرا فرض یہیں تک ختم ہوگیا۔ اب وہ جانیں اور ان کا کام جانے۔ ممکن ہے سختیوں سے دب جائیں۔ ممکن ہے نہ دبیں۔ لیکن کچھ بھی ہو۔ اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ ان کے جگر پر کاری زخم لگا ہے۔ رعایا کا دب جانا کسی طرزِ عمل کی کامیابی کی دلیل نہیں ہے۔"

برسات میں کسانوں کو ہار میں بہت کام نہیں ہوتا۔ زیادہ تر لوگ گھروں پر رہتے ہیں۔ منّی کی آواز گویا خطرے کی بگل تھی۔ طرفۃ العین میں سارے گاؤں میں یہ آواز گونج اُٹھی۔"بھیّا پکڑے گئے۔" عورتیں گھروں میں سے نکل پڑیں۔ "کیا ہوا؟ بھیّا پکڑے گئے۔"

ایک لحظے میں سارا گاؤں چوکنا ہوگیا۔ اور سب کے سب سڑک کی طرف دوڑے۔ کار چکّر لگاتی ہوئی سڑک سے جارہی تھی۔

لوگوں نے قیاس کیا ابھی پگڈنڈیوں کے راستے سے کار پکڑی جاسکتی ہے، سب اسی طرف دوڑے۔

کاشی بولا۔"مرنا تو ایک دن ہے ہی۔"

منّی بولی۔"پکڑنا تو سب کو پکڑے، لے چلو سب کو۔"

پیاگ بولا۔"سرکار کا کام ہے چوروں، بدمعاشوں کو پکڑنا یا ایسوں کو جو دوسروں کے لیے جان لڑا رہے ہیں۔ وہ دیکھو موٹر آرہی ہے۔ بس سب کے سب راستے میں کھڑے ہوجاؤ۔ کوئی نہ ہٹنا، اسے چلانے دو۔"

سلیم کار روکتا ہوا بولا۔"کیا مجھے پستول نکالنا پڑے گا؟"

امر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔"نہیں، نہیں میں انھیں سمجھائے دیتا ہوں۔"

"مجھے پولیس کے دو چار آدمیوں کو ساتھ لے لینا تھا۔"

"گھبراؤ مت پہلے میں مروں گا تب تمھارے اوپر آنچ آئے گی۔"

امر نے کار سے سر نکال کر کہا۔ "بہنو اور بھائیو! اب مجھے بدا کیجیے۔ آپ لوگوں نے میرے ساتھ جس محبت اور فیاضی کا برتاؤ کیا۔ وہ میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ میں پردیسی مسافر تھا آپ نے مجھے جگہ دی، عزت دی، مجھ سے جو کچھ خدمت ہو سکی میں نے کی، اگر مجھ سے کچھ بھول چوک ہوئی ہو تو معاف کرنا۔ تم سے میرا یہی سوال ہے کہ جس کام کا بیڑا اُٹھایا ہے، اُسے چھوڑنا مت، یہ کام جوں کا توں ہوتا رہے۔ یہی سب سے بڑا حوصلہ ہے۔ جو آپ مجھے دے سکتے ہیں۔"

آواز آئی ہم بھی ساتھ جائیں گے۔

امر نے مسکرا کر کہا۔ "نیوتا تو مجھے ملا ہے۔ تم لوگ کیسے جاؤ گے۔"

کسی کے پاس اس کا جواب نہ تھا۔ "بھیّا بات ہی ایسی کہتے ہیں کہ کسی سے اس کا جواب بن نہیں پڑتا۔"

منّی سب سے پیچھے کھڑی رو رہی تھی۔ اس حالت میں امر کے سامنے کیسے جائے۔ جس شمع کو دل میں جلائے وہ اپنی تاریک زندگی میں اُجالے کا خواب دیکھ رہی تھی وہ شمع کوئی اب اس کے دل سے نکالے لیے جاتا ہے وہ خاموش تاریکی کیسے جھیل سکے گی۔

دفعتاً اس نے وحشت کے عالم میں کہا۔ "اتنے آدمی کھڑے دیکھتے کیا ہو، اُتار لو انھیں گاڑی سے۔"

مجمعے میں ایک ہل چل مچ گئی۔ ایک نے دوسرے کی طرف قیدیوں کی طرح دیکھا، کوئی بولا نہیں۔

منّی نے پھر للکارا۔ "کھڑے دیکھتے کیا ہو۔ تم لوگوں میں کچھ غیرت ہے یا نہیں؟"

امر نے کار سے نکل کر کہا۔ "منّی تم سمجھ دار ہو کر ایسی باتیں کر رہی ہو۔ میرے منہ میں کالک مت لگاؤ۔"

منّی اسی وحشت کے عالم میں بولی۔ "میں سمجھ دار نہیں ہوں۔ میں تو مورکھ ہوں۔ گنوارن ہوں۔ آدمی ایک ایک پتّی کے لیے سر کٹا دیتا ہے۔ ایک ایک بات پر جان دیتا ہے۔ تمھیں کوئی پکڑ لے جائے اور ہم کھڑے دیکھتے رہیں، کوئی چوری کی ہے۔ ڈاکہ مارا ہے؟"

کئی آدمی اشتعال کے عالم میں موٹر کی طرف بڑھے۔ لیکن امر کانت کی تند آواز سُن

کر ٹھٹک گئے۔ "بس خبردار اگر کسی نے آگے قدم رکھا۔ پیچھے ہٹ جاؤ۔ اگر میری اتنے دنوں کی خدمت اور تعلیم کا یہی نتیجہ ہے تو میں کہوں گا کہ میری جانفشانی خاک میں مل گئی۔"

جادو کا سا اثر ہوا۔ لوگ راستے سے ہٹ گئے۔ امر کار میں بیٹھ گیا اور کار چل دی۔ منّی نے آنکھوں میں غصّے اور رنج کے آنسو بھر کر امرکانت کو پرنام کیا۔ کار کے ساتھ جیسے اس کا دل بھی اُڑا جاتا ہے۔

پانچواں حصّہ

(۱)

لکھنؤ کا سنٹرل جیل شہر سے باہر کھلی ہوئی جگہ میں ہے۔ سکھدا اسی جیل کے زنانے وارڈ میں ایک درخت کے نیچے کھڑی بادلوں کی گھوڑدوڑ دیکھ رہی ہے۔ برسات گزر چکی ہے۔ آسمان میں بڑی دھوم سے گھیر گھار ہوتا ہے۔ مگر چھینٹے پڑکر رہ جاتے ہیں۔ سخی کے دل میں اب بھی رحم ہے لیکن ہاتھ خالی ہیں۔ جو کچھ تھا لُٹا چکا۔

جب کوئی اندر آتا ہے اور صدر دروازہ کھلتا ہے۔ تو سکھدا دروازے کے سامنے آکر کھڑی ہوجاتی ہے۔ دروازہ ایک ہی لمحے میں بند ہوجاتا ہے مگر باہر کی دنیا کی اسی ایک جھلک کے لیے وہ کئی کئی گھنٹے اسی درخت کے نیچے کھڑی رہتی ہے۔ اسے یہاں آئے ابھی پورے دو مہینے بھی نہیں ہوئے مگر اسے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں نہ جانے کیا کیا انقلاب ہوگئے۔ راہ گیروں کو چلتے دیکھنے میں بھی اب اسے خاص لطف آتا ہے۔ یہ باہر کی دنیا کبھی اتنی دلفریب نہ تھی۔

وہ کبھی کبھی سوچتی ہے۔ میں نے صفائی پیش کی ہوتی تو بری ہوجاتی۔ لیکن یہ کیا معلوم تھا کہ دل کی کیا حالت ہوگی۔ وہ جذبات جو کبھی بھول کر بھی دل میں نہ آتے تھے، کسی مریض کی ہوسناکیوں کی طرح دل کو بے قرار کرنے رہتے تھے۔ جھولا جھولنے کو کبھی اس کا جی نہ مچلتا تھا۔ لیکن آج بار بار یہی جی میں آتا ہے کہ رسّی ہو تو اسی درخت میں جھولا ڈال کر جھولے۔ احاطے میں گوالن لڑکیاں بھینسیں چراتی ہوئی آم کی اُبالی ہوئی گٹھلیاں توڑ توڑ کر کھا رہی ہیں۔ سکھدا نے بچپن میں ایک بار یہ گٹھلی چکھی تھی۔ وہ اس وقت کسیلی

لگی تھی۔ اس نے دوبارہ گٹھلی زبان پر نہ رکھی۔ مگر آج ان گٹھلیوں پر اس کا جی للچا رہا ہے۔ ان کی سختی، ان کا سوندھاپن، ان کی خوشبو اسے کبھی اتنی دل آویز نہ معلوم ہوتی تھی۔ اس کا دل کچھ زیادہ نازک ہوگیا ہے۔ جیسے پال میں پڑکر کوئی پھل زیادہ رسیلا میٹھا اور لذیذ ہوجاتا ہے۔ للّو کو اب وہ ایک لمحے کے لیے بھی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتی۔ وہ اس کی زندگی کا سہارا ہے۔ دن میں کئی کئی بار اس کے لیے دودھ گرم کرتی ہے۔ حلوا پکاتی ہے۔ اب اسے باربار امر کی یاد آتی ہے۔ اس کی گرفتاری اور سزا کی خبر پاکر انھوں نے جو خط لکھا ہوگا۔ اسے پڑھنے کے لیے دل تڑپ تڑپ کر رہ جاتا ہے۔

لیڈی میٹرن نے آکر کہا۔"سکھدا دیوی! تمھارے سُسر تم سے ملنے آئے ہیں۔ تیار ہوجاؤ، بیس منٹ کا وقت ہے۔"

سکھدا نے جھٹ پٹ للّو کا منہ دھویا، نئے کپڑے پہنائے جو کئی دن پہلے جیل ہی میں سئے تھے اور اسے گود میں لیے میٹرن کے ساتھ باہر نکلی۔

ملاقات کا کمرہ جیل کے وسط میں تھا۔ اور راستہ باہر ہی سے تھا۔ دو مہینے کے بعد جیل سے باہر نکل کر سکھدا کو ایسی مسرت ہو رہی تھی گویا کوئی مریض بستر سے اُٹھا ہو۔ جی چاہتا تھا سامنے کے میدان میں خوب اُچھلے اور للّو تو چڑیوں کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔

لالہ سمرکانت وہاں پہلے ہی سے بیٹھے ہوئے تھے۔ للّو کو دیکھتے ہی باغ باغ ہوگئے اور گود میں اُٹھا کر بار بار اس کا منہ چومنے لگے۔ اس کے لیے مٹھائیاں، کھلونے، پھل، کپڑے پورا ایک گٹھر لائے تھے۔ سکھدا بھی عقیدت اور احترام سے آب گوں ہوگئی۔ ان کے قدموں پر گر پڑی اور رونے لگی۔ اس لیے نہیں کہ اس پر کوئی مصیبت آئی ہے۔ بلکہ اس لیے کہ رونے میں مزہ آرہا ہے۔

سمرکانت نے دعا دیتے ہوئے پوچھا۔"یہاں تمھیں جس بات کی تکلیف ہو میٹرن صاحب سے کہنا۔ مجھ پر یہ بہت مہربان ہیں۔ للّو اب شام کو روز باہر کھیلا کرے گا۔ اور کسی بات کی تکلیف تو نہیں ہے؟"

سکھدا نے دیکھا سمرکانت دُبلے ہوگئے ہیں۔ محبت سے اس کا دل جیسے چھلک اُٹھا۔ بولی۔"میں تو یہاں بڑے آرام سے ہوں لیکن آپ کیوں اتنے دُبلے ہو رہے ہیں۔"

"یہ نہ پوچھو، یہ پوچھو آپ زندہ کیسے ہیں؟ نینا بھی چلی گئی۔ اب گھر بھوتوں کا ڈیرا

ہو گیا ہے۔ سنتا ہوں لالہ منی رام اپنے باپ سے الگ ہو کر دوسری شادی کرنے والے ہیں، تمھاری اماں تیرتھ کرنے چلی گئیں۔ شہر میں تحریک بدستور جاری ہے۔ اس زمین پر سارے دن لوگوں کا ہجوم رہتا ہے۔ کچھ لوگ رات کو وہیں سوتے ہیں۔ ایک دن تو راتوں رات وہاں سینکڑوں جھونپڑے کھڑے ہوگئے۔ لیکن دوسرے دن پولیس نے ان میں آگ لگا دی، اور کئی چودھریوں کو گرفتار کرلیا۔"

سکھدا نے دل میں خوش ہوکر کہا۔"ان لوگوں نے کیا نادانی کی۔ مگر وہاں تو اب کوٹھیاں بننے لگی ہوں گی۔"

سمرکانت بولے۔"ہاں اینٹیں، چونا، سرخی تو جمع کی گئی تھی۔ لیکن ایک دن راتوں رات سارا سامان اُڑگیا۔ تب سے وہاں کسی کو مزدور ہی نہیں ملتے۔ نہ کوئی بیل دار جاتا ہے نہ کاری گر۔ رات کو پولیس کا پہرہ رہتا ہے۔ وہی بُڑھیا پٹھانی آج کل اس تحریک کی روحِ رواں ہے۔ ایسی تنظیم کر لی ہے کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔"

جس کا میں .ہ ناکام ہوئی اسے وہ کھوسٹ بُڑھیا اتنی خوش اسلوبی سے چلا رہی ہے۔ اس خیال سے سکھدا کی خودداری کو چوٹ لگی۔ بولی۔"وہ بُڑھیا تو چل پھر بھی نہیں سکتی تھی۔"

سمرکانت نے سر ہلاکر کہا۔"ہاں وہی بُڑھیا اچھے اچھوں کے دانت کھٹے کر رہی ہے۔ عوام کو اس نے ایسا مٹھی میں کر لیا ہے کہ کیا کہوں۔ اندر سے بیٹھے بیٹھے شانتی کمار کل گھماتے رہتے ہیں۔"

سکھدا نے آج تک ان سے یا کسی سے امرکانت کے متعلق کچھ نہ پوچھا تھا۔ لیکن اس وقت وہ ضبط نہ کرسکی۔ پوچھا۔"ہردوار سے کوئی خط آیا تھا؟"

لالہ سمرکانت کا چہرہ افسردہ ہوگیا، بولے۔"ہاں آیا تھا۔ اسی شہدے سلیم کا خط تھا۔ وہی اس علاقے کا حاکم ہے۔ اس نے پکڑ دھکڑ شروع کردی ہے۔ ان حضرت کو اس نے خود گرفتار کیا ہے۔ یہ آپ کے دوستوں کا حال ہے۔ اب آنکھیں کھلی ہوں گی۔ میرا کیا بگڑا ہے۔ اب ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ اب جیل میں چکی پیس رہے ہوں گے۔ گئے تھے غریبوں کی خدمت کرنے یہ اسی کا انعام ہے۔ میں تو ایسے دوست کو گولی مار دیتا۔ اور وہ گرفتار تک ہوگیا پر مجھے خط نہ لکھا۔ اس کے حساب سے میں تو مر گیا۔ مگر میں بے حیا

ابھی مرنے کا نام نہیں لیتا۔ چین سے کھاتا ہوں اور سوتا ہوں۔ کسی کے مارنے سے کیوں مروں۔ ذرا اس کی مثردی تو دیکھو۔ گھر میں کسی کو خبر تک نہ دی۔ میں دشمن تھا۔ نینا تو دشمن نہ تھی۔ شانتی کمار تو دشمن نہ تھے۔ یہاں سے جاکر کوئی مقدمے کی پیروی کرتا تو اے، بی کوئی درجہ تو مل جاتا۔ نہیں معمولی قیدیوں کی طرح پڑے ہوئے ہیں۔ آپ روئیں گے میرا کیا بگڑتا ہے۔"

سکھدا نے حجاب کے ساتھ کہا۔"اب آپ کیوں نہیں چلے جاتے؟"

سمرکانت ناک سکوڑ کر بولے۔"میں کیوں جاؤں، مجھ سے کیا مطلب؟ جیسا کیا ہے ویسا بھوگے۔ وہ لڑکی جو تھی سکینہ، اس کی شادی اسی شہدے سلیم سے ہو رہی ہے۔ جس نے بچا جی کو گرفتار کیا ہے۔ اب آنکھیں کھلی ہوں گی۔"

سکھدا نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔"آپ انھیں ناحق کوس رہے ہیں دادا، دراصل ان کا کوئی قصور نہ تھا۔ سراسر میرا قصور تھا۔ ان کا سا غریب دوست آدمی مجھ جیسی نفاست پسند عورت کے ساتھ کیسے خوش رہ سکتا تھا۔ بلکہ یوں کہیے کہ قصور نہ آپ کا تھا، نہ میرا نہ ان کا۔ یہ ساری آگ لکشمی نے لگائی۔ آپ کے گھر میں ان کے لیے جگہ نہ تھی۔ آپ ان سے کھنچے رہتے تھے۔ میں نے بھی اسی آب و ہوا میں پرورش پائی تھی انھیں نہ پہچان سکی۔ وہ اچھا یا بُرا جو کچھ کرتے تھے گھر میں اس کی مخالفت ہی ہوتی تھی۔ ایسی حالت میں گھر سے کیا الفت ہوسکتی تھی۔ میں نے یہاں تنہائی میں اس سوال پر غور کیا اور مجھے اپنی غلطی تسلیم کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں ہے۔ آپ آج ہی وہاں جاکر افسروں سے ملیں۔ سلیم کی خوشامد کریں اور ان کی جو کچھ مدد ہوسکے کریں۔ ہم نے آسمان پر اُڑنے والی چڑیا کو پنجرے میں بند کرنا چاہا تھا۔ جب چڑیا پنجرے کو توڑ کر اُڑ گئی تو میں نے سمجھا میں بدنصیب ہوں۔ آج مجھے معلوم ہو رہا ہے چڑیا نے وہی کیا جو اسے کرنا چاہیے تھا۔"

سمرکانت ایک لمحے تک تعجب کی آنکھوں سے سکھدا کی طرف تکتے رہے۔ گویا اپنے کانوں پر اعتبار نہ آرہا ہو۔ ہمدردی کی اس حرکت نے ان کے منجمد جذبۂ پدری کو پگھلا دیا، بولے۔"اس کی تو میں نے خوب جانچ کی۔ بات کچھ بھی نہیں تھی۔ اسے غصہ تھا۔ اسی غصے میں جو کچھ آیا بک دیا۔ یہ عیب اس میں کبھی نہ تھا لیکن اس وقت میں بھی اندھا ہو رہا تھا۔ میں پھر کہتا ہوں یہ بات صحیح بھی ہو۔ سولے آنے سچ ہو تو کیا دنیا میں جتنے آدمی

ایسے ہیں ان کی گردن مار دی جاتی ہے۔ میں بڑے بڑے لچّوں کے سامنے گردن جھکاتا ہوں تو پھر اپنے ہی گھر میں اور انھیں کے اوپر جن سے کسی طرح کے انتقام کا خوف نہیں دھرم اور اخلاق کی ساری ذمے داری کیوں ڈال دی جائے۔ انسان کی گردن میں جب محبت کی بندش نہیں ہوتی تو وہ بے راہ ہوجاتا ہے۔ آوارگی اختیار کرتا ہے۔ بھکاری دربدر اسی لیے پھرتا ہے کہ ایک دروازے سے اس کی بھوک نہیں بجھتی۔ اگر اسے گناہ بھی مان لو تو ایشور نے کیوں گناہ سے پاک دنیا نہیں بنائی۔ اگر کہو ایشور کی مرضی ایسی نہیں ہے تو میں پوچھوں گا کہ ایشور قادر ہے تو وہ دل کو کیوں ایسا بناتا ہے کہ اسے کسی خستہ حال جھونپڑی کی طرح بہت سے تھونیوں سے سنبھالنا پڑے۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کسی مریض سے کہا جائے کہ تو اچھا ہوجا۔ اگر مریض میں اتنی طاقت ہوتی تو وہ بیمار ہی کیوں پڑتا۔"

ایک سانس میں اپنے دل کی ساری کدورت انڈیل دینے کے بعد لالہ سمرکانت دم لینے کے لیے رُک گئے۔ جو کچھ ادھر اُدھر لگا لپٹا رہ گیا تھا۔ شاید اسے بھی کھرچ کر نکال دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ سکھدا نے پوچھا۔ "تو آپ وہاں کب جا رہے ہیں؟"

لالہ جی نے سرگرمی سے کہا۔ "آج ہی اِدھر ہی سے چلا جاؤں گا۔ سُنا ہے وہاں خوب سختیاں ہو رہی ہیں۔ اب تو وہاں کا حال اخباروں میں بھی چھپنے لگا ہے۔ کئی دن ہوئے منّی نام کی عورت بھی کئی آدمیوں کے ساتھ گرفتار ہوئی ہے۔ کچھ اسی طرح کی ہل چل سارے صوبے بلکہ سارے ملک میں مچی ہوئی ہے۔"

بچّہ کمرے کے باہر نکل گیا تھا۔ لالہ جی نے اسے پکارا تو وہ سڑک کی طرف بھاگا۔ سمرکانت بھی اس کے پیچھے دوڑے۔ بچے نے سمجھا کھیل ہو رہا ہے اور تیز دوڑا۔ ڈھائی تین سال کے بچے کی تیزی ہی کیا۔ مگر سمرکانت جیسے تھل تھل آدمی کے لیے پوری ورزش ہوگئی۔ بڑی مشکل سے اسے پکڑا۔

اندر آکر ایک منٹ کے بعد کچھ اس انداز سے بولے گویا کوئی بہت اہم بات کہہ رہے ہوں۔ "میں تو سوچتا ہوں کہ جو لوگ قوم کے لیے اپنی جان قربان کرنے کو ہردم تیار رہتے ہیں ان کی برائیوں پر نگاہ ہی نہ ڈالنی چاہیے۔"

سکھدا نے اختلاف کیا۔ "یہ نہ کہیے دادا بلکہ ایسے آدمیوں کو بے داغ رہنا چاہیے۔ ورنہ ان کی خدمت میں بھی غرض اور حرص کی بو آنے لگے گی۔"

سمرکانت نے فلسفیانہ انداز سے کہا۔"غرض میں اسی کو کہتا ہوں جس کے ملنے سے دل کو خوشی اور نہ ملنے سے رنج ہو۔ ایسا آدمی جسے نہ خوشی ہوتی ہے نہ رنج۔ انسان نہیں ہے۔ دیوتا بھی نہیں ہے۔ پتھر ہے۔"

سکھدا مسکرائی۔"تو دنیا میں کوئی بے غرض ہو ہی نہیں سکتا۔"

"غیر ممکن، غرض چھوٹی ہو تو غرض ہے۔ بڑی ہو تو خدمت ہے۔ میرا تو خیال ہے ایشور بھکتی بھی غرض ہی ہے۔"

ملاقات کا وقت کب کا گزر چکا تھا۔ میٹرن اب اور رعایت نہ کر سکتی تھی۔ سمرکانت نے بچّے کو پیار کیا۔ بہو کو دعا دی اور باہر نکلے۔

بہت دنوں کے بعد آج انھیں اپنے دل میں مسرّت اور روشنی کا احساس ہوا، گویا چاند کے چہرے سے بادلوں کا پردہ ہٹ گیا ہو۔

(۲)

سکھدا اپنے کمرے میں پہنچی تو دیکھا ایک حسین عورت قیدیوں کے کپڑے پہنے اس کے کمرے کی صفائی کر رہی ہے۔ ایک چوکیدارن بیچ بیچ میں اسے ڈانٹتی جاتی ہے۔

چوکیدارن نے قیدن کی پیٹھ پر لات مار کر کہا۔"رانڈ تجھے جھاڑو لگانا بھی نہیں آتا۔ گرد اُڑاتی ہے۔ ہاتھ دبا کر دے نا۔"

قیدن نے جھاڑو پھینک دی اور تمتماتے ہوئے چہرے سے بولی۔"میں یہاں کسی کی ٹہل کرنے نہیں آئی ہوں۔"

"تب کیا رانی بن کر آئی ہے؟"

"ہاں رانی بن کر آئی ہوں، کسی کی چاکری کرنا میرا کام نہیں۔"

"تو جھاڑو لگائے گی یا نہیں؟"

"بھلمنسی سے کہو تو میں تمھارے بھنگی کے گھر میں بھی جھاڑو لگا دوں گی۔ لیکن مار کا ڈر دکھا کر تم بڑے راجا کے گھر میں بھی جھاڑو نہیں لگواسکتیں۔ اتنا سمجھ لو۔"

"تو جھاڑو نہ لگائے گی؟"

چوکیدارن نے قیدن کے بال پکڑ لیے اور کھینچتی ہوئی کمرے کے باہر لے چلی۔ رہ رہ کر اس کے گالوں پر طمانچے بھی لگاتی جاتی تھی۔

"چل جیلر صاحب کے پاس۔"

"ہاں لے چلو، میں یہی ان سے بھی کہوں گی۔ یہاں مار گالی کھانے نہیں آئی ہوں۔"

سکھدا کے متواتر خط و کتابت کرنے پر اسے یہ نوکرانی دی گئی تھی۔ مگر یہ نظارہ دیکھ کر سکھدا کو روحانی صدمہ ہوا۔ اس کمرے میں قدم رکھنا بھی اسے بُرا معلوم ہورہا تھا۔

قیدن نے اس کی طرف پُرنم آنکھوں سے دیکھ کر کہا۔"تم گواہ رہنا اس چوکیدارن نے مجھے کتنا مارا ہے۔"

سکھدا نے قریب جاکر چوکیدارن کو ہٹایا۔ اور قیدن کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے کمرے میں لے گئی۔

چوکیدارن نے دھمکاکر کہا۔ "روز سویرے یہاں آجایا کر۔ جو کام یہ کہیں کیا کر۔ نہیں تو ڈنڈے پڑیں گے۔"

قیدن غصّے سے کانپ رہی تھی۔"میں کسی کی لونڈی نہیں ہوں۔ اور نہ یہ کام کروں گی۔ کسی مہارانی کی ٹہل کرنے نہیں آئی۔ جیل میں سب برابر ہیں۔"

سکھدا نے دیکھا حسینہ میں خودداری کی کمی نہیں ہے۔ شرمندہ ہوکر بولی۔"یہاں کوئی رانی مہارانی نہیں ہے بہن۔ میرا جی اکیلے گھبرایا کرتا تھا۔ اسی لیے تمھیں یہاں بلالیا۔ ہم دونوں یہاں بہنوں کی طرح رہیں گے۔ کیا نام ہے تمھارا؟"

حسینہ کا غضب ناک چہرہ نرم پڑگیا۔ بولی۔"میرا نام منّی ہے۔ ہردوار سے آئی ہوں۔"

سکھدا چونک پڑی۔ لالہ سمرکانت نے یہی تو نام لیا تھا۔ پوچھا ۔"وہاں کس جُرم میں سزا ہوئی تھی؟"

"جُرم کیا تھا، سرکار جمین کا لگان نہیں کم کرتی تھی۔ کُل چار آنے کی چھوٹ ہوئی۔ جنس کو بجار میں کوئی پوچھتا ہی نہیں۔ ہم کس کے گھر سے لاکر دیتے۔ اسی بات پر ہم نے پھریاد کی۔ بس سرکار نے سجا دینا شروع کردیا۔"

"تمھارے یہاں وہ بھی تو اسی معاملے میں گرفتار ہوئے ہیں۔ جو تھوڑے دنوں سے وہاں جاکر ٹھہرے تھے۔"

"کیا امر بھیّا کو پوچھتی ہو؟"

"ہاں ہاں وہی، انھیں جانتی ہو؟"

منّی خوش ہوگئی۔ بولی۔"جانتی کیوں نہیں۔ وہ تو ہمارے ہی گھر میں رہتے تھے۔ تم انھیں کیسے جانتی ہو؟"

سکھدا نے کہا۔"میں بھی دہلی کی رہنے والی ہوں۔ اسی محلے میں ان کا بھی گھر ہے۔ کیا تم برہمنی ہو؟"

"ہوں تو ٹھکرانی، پر اب کچھ نہیں ہوں۔ بیٹا بھی تھا۔ آدمی بھی تھا۔ اب کوئی نہ رہا۔ سب کے نام کو رو بیٹھی۔"

"وہ بابو کبھی اپنے گھر کی بات چیت نہیں کرتے تھے؟"

"کبھی نہیں، نہ کبھی آنا جانا، نہ چٹھّی نہ پتر۔"

سکھدا نے اسے کنکھیوں سے دیکھ کر کہا۔"مگر وہ تو بڑے رسیا آدمی ہیں۔ وہاں گاؤں میں کسی پر ڈورے نہیں ڈالے؟"

منّی نے زبان دانتوں تلے دبائی۔"کبھی نہیں بہوجی کبھی نہیں۔ میں نے تو کبھی ان کو کسی کی طرف تکتے اور ہنستے نہیں دیکھا۔ نہ جانے کس بات پر گھر والی سے روٹھ گئے۔ تم تو جانتی ہوگی؟"

سکھدا نے مسکراتے ہوئے کہا۔"روٹھ کیا گئے۔ عورت کو چھوڑ دیا۔ چُھپ کر گھر سے بھاگ گئے۔ بے چاری عورت گھر میں بیٹھی ہوئی ہے۔ تم کو معلوم نہ ہوگا انھوں نے ضرور کہیں نہ کہیں جال پھینکا ہوگا۔"

منّی نے سر ہلا کر کہا۔"ایسی بات ہوتی تو گاؤں میں چُھپی نہ رہتی بہو۔ میں تو بہت ہی دوچار بار ان کے پاس جاتی تھی۔ کبھی سر اوپر نہ اُٹھاتے تھے۔ پھر اس دیہات میں ایسی ہے کون جس پر ان کا مَن چلتا۔ نہ کوئی پڑھی لکھی، نہ بات چیت کرنے کا ڈھنگ۔"

سکھدا نے پھر نبض ٹٹولی۔"مرد گُن، شعور، پڑھنا، لکھنا نہیں دیکھتے۔ وہ تو رنگ روپ دیکھتے ہیں۔ وہ تمھیں بھگوان نے دیا ہی ہے۔ جوان بھی ہو۔"

منّی نے منہ پھیر کر کہا۔"تم تو گالی دیتی ہو بہوجی۔ میری طرف بھلا وہ کیا دیکھتے، جو ان کی جوتیوں کے برابر بھی نہیں۔ تم یہاں کیسے آئیں؟"

"جیسے تم آئیں ویسے میں بھی آئی۔"

"تو یہاں بھی وہی ہل چل ہے۔"

"ہاں کچھ اسی طرح کا ہے۔"

منّی کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ ایسے اونچے گھرانوں کی عورتیں بھی جیل آئی ہیں۔ بھلا انھیں کس بات کی تکلیف ہوگی۔

اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ "تمھارے آدمی بھی سجا پاگئے ہوں گے؟"

"ہاں تب ہی تو میں آئی۔"

منّی نے چھت کی طرف دیکھ کر دعا دی۔ "بھگوان تمھاری مراد پوری کریں۔ بہو جی گدّی مسند لگانے والی رانیاں جب گریبوں کا درد سمجھنے لگیں تو ان کے اچھے دن آنے میں دیر نہیں ہے۔ کتنے دنوں کی سجا ہوئی ہے تمھاری؟"

"میں تو چھے مہینے کو آئی ہوں۔"

سکھدا نے اپنی سزا کی میعاد بتاکر کہا۔ "تمھارے ضلع میں بڑی سختیاں ہو رہی ہوں گی۔"

منّی نے کہا۔ "کچھ نہ پوچھو بہو جی۔ بے چاروں کو بیل بدھئے بیچ بیچ کر لگان بھرنا پڑا، آدمی کہاں تک سہتا مجھے پکڑنے کے لیے پوری پلٹن گئی۔ پچاس آدمی سے کم نہ ہوں گے۔ گولی چلتے چلتے بچی۔ ہزاروں آدمی جمع ہوگئے۔ کتنا سمجھاتی تھی۔ بھائیو اپنے اپنے گھر جاؤ مجھے جانے دو۔ مگر کون سنتا ہے؟ جب میں نے ڈانٹا تب لوٹے۔ نہیں اس دن دس پانچ کی جانیں جاتیں۔ نہ جانے بھگوان کہاں سوئے ہوئے ہیں کہ اتنی بے انصافی دیکھتے ہیں اور نہیں بولتے۔ سال میں چھے مہینے ایک جون کھاکر بے چارے دن کاٹتے ہیں۔ چیتھڑے پہنتے ہیں۔ لیکن سرکار کو دیکھو تو ان ہی کی گردن پر سوار۔ بڑوں کو تو اپنے لیے بنگلہ چاہیے۔ موٹر چاہیے۔ ہر نعمت کھانے کو چاہیے۔ سیر تماشا دیکھنے کو چاہیے۔ لیکن گریبوں کا اتنا سکھ بھی نہیں دیکھا جاتا۔ وہ جمع کو نہیں مانگتے لیکن پیٹ کی روٹی اور تن ڈھانکنے کو کپڑا تو چاہیے ہی۔"

سکھدا نے دیکھا اس گنوارنی کے دل میں کتنا درد ہے۔ امرکانت کی خدمت اور قومی کارگزاریوں کی اس نے جن لفظوں میں تعریف کی۔ انھوں نے گویا اس کے دل کی ساری کدورتوں کو صاف کردیا۔ گویا اس کے اندر روشنی کا ظہور ہوگیا ہو۔ اس کے سارے شبہے

اور توہمات تاریکی کی طرح مٹ گئے ہوں۔ امرکانت کی خیالی تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ قیدیوں کا جانگیا اور کنٹوپ پہنے، بڑے بڑے بال بڑھائے، چہرہ زرد بال بکھرے ہوئے۔ قیدیوں کے بیچ میں چکی پیستے ہوئے۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

میٹرن نے آکر کہا۔"اب تو آپ کو پیش خدمت مل گئی۔ اس سے خوب کام لو۔"

سکھدا نے دھیمی آواز سے کہا۔"مجھے کسی پیش خدمت کی ضرورت نہیں ہے میم صاحب۔ میں یہاں رہنا بھی نہیں چاہتی۔ آپ مجھے معمولی قیدیوں کے ساتھ ہی رکھیں۔"

میٹرن پستہ قد، اینگلوانڈین لیڈی تھی۔ چوڑا منہ، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، ترشے ہوئے بال، گھٹنوں سے اوپر تک کا اسکرٹ پہنے ہوئے، آنکھیں پھاڑکر بولی۔"یہ کیا کہتی ہو سکھدا دیوی۔ یہ عورت آہی گئی اور جس چیز کی تکلیف ہو ہم سے کہو۔ ہم جیلر صاحب سے بولے گا۔"

سکھدا نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔"میں اب آپ سے کسی طرح کی رعایت نہیں چاہتی۔ معمولی قیدیوں کی طرح رہنا چاہتی ہوں۔"

"ادنیٰ درجے کی عورتوں کے ساتھ رہنا پڑے گا۔ کھانا بھی وہی ملے گا۔"

"یہی تو میں چاہتی ہوں۔"

"شاید چکّی پیسنا پڑے۔"

"کوئی ہرج نہیں۔"

"گھر کے آدمیوں سے چھٹے مہینے ملاقات ہوسکے گی۔"

"جانتی ہوں۔"

لالہ سمرکانت نے میٹرن کو نذرانے اور شکرانے سے مالا مال کردیا تھا۔ اس سونے کی چڑیا سے وہ اور بھی بہت کچھ کماسکتی تھی۔ جب بہت سمجھانے پر بھی سکھدا اپنے فیصلے پر قائم رہی تو بادلِ ناخواستہ چلی گئی۔

منّی نے پوچھا۔"میم صاحب کیا کہتی تھیں؟"

سکھدا نے منّی کو پُرمحبت نظروں سے دیکھ کر کہا۔"اب میں تمھارے ہی ساتھ رہوں گی منّی۔"

منّی نے چھاتی پر ہاتھ رکھ کر کہا۔"یہ کیا کرتی ہو بہو۔ تم سے نہ رہا جائے گا۔"

"جہاں تم رہ سکتی ہو، وہاں میں بھی رہ سکتی ہوں۔"

ایک گھنٹے کے بعد جب سکھدا منّی کے ساتھ یہاں سے چلی تو اس کا دل امید و بیم سے کانپ رہا تھا۔ جیسے کوئی بچّہ امتحان میں کامیاب ہوکر اونچی جماعت میں آگیا ہو۔

(۳)

پولیس نے اس پہاڑی علاقے کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ پیدل اور سوار ہمیشہ گھومتے رہتے تھے۔ پانچ آدمیوں سے زیادہ ایک جگہ جمع نہ ہوسکتے تھے۔ شام کو آٹھ بجے کے بعد کوئی گھر سے نہ نکل سکتا تھا۔ پولیس کی اجازت کے بغیر گھر میں کسی مہمان کو بھی ٹھہرانے کی اجازت نہ تھی۔ فوجی قانون نافذ کردیا تھا۔ کتنے ہی مکانات جلا دیے گئے تھے۔ اور ان کی مکیں کنجروں کی طرح درختوں کے نیچے بال بچّوں کو لیے پڑے ہوئے تھے۔ مدرسے میں بھی آگ لگا دی گئی تھی اور اس کی آدھی آدھی سیاہ دیواریں جیسے بال کھولے ماتم کر رہی تھیں۔ سوامی آتمانند بھی بانس کی چھتری لگائے وہاں ڈٹے ہوئے تھے۔ ذرا سا موقع پاتے ہی دس بیس آدمی اِدھر اُدھر سے آکر جمع ہوجاتے تھے لیکن سواروں کو دیکھا اور غائب۔

یکایک لالہ سمرکانت ایک گٹھر پیٹھ پر لادے آکر مدرسے کے سامنے کھڑے ہوگئے۔ سوامی جی نے دوڑ کر ان کا بستر لے لیا اور کھاٹ کی فکر میں دوڑے۔ سارے گاؤں میں بجلی کی طرح خبر دوڑ گئی۔ امرکانت کے باپ آئے ہیں۔ ہیں تو بوڑھے مگر ابھی ٹانٹھے ہیں۔ سیٹھ ساہوکار جیسے لگتے ہیں۔ ایک ہی لمحے میں بہت سے آدمیوں نے ان کو آگھیر لیا۔ کسی کے سر میں پٹّی بندھی ہوئے ہے، کسی کے ہاتھ میں، کئی آدمی لنگڑا رہے تھے۔ شام ہوگئی تھی اور آج کوئی خاص خطرہ نہ دیکھ کر اور سارے علاقے میں ڈنڈے کے زور سے امن قائم کرکے پولیس آرام کر رہی تھی۔ بے چارے کانسٹبل رات دن دوڑتے دوڑتے اَدھ مرے ہورہے تھے۔

گوڈر نے لاٹھی ٹیکتے ہوئے آکر سمرکانت کو سلام کیا اور بولا۔"امر بھیّا کا حال تو آپ کو معلوم ہوا ہوگا۔ آج کل تو پولیس کا دھاوا ہے۔ حاکم کہتا ہے بارہ آنے لیں گے۔ ہم کہتے ہیں ہمارے پاس ایک آنہ بھی نہیں ہے، دیں کہاں سے۔ بہت سے لوگ تو گاؤں چھوڑ کر بھاگ گئے۔ وہ جو رہ گئے ہیں ان کی حالت آپ دیکھ ہی رہے ہیں۔ منّی بہو کو پکڑ کر جیل میں ڈال دیا۔ آپ ایسے سمے آئے کہ آپ کی کچھ کھاطر بھی نہیں کرسکتا۔"

سمرکانت مدرسے کے چبوترے پر بیٹھ گئے اور سر پر ہاتھ رکھ کر سوچنے لگے۔ ان غریبوں کی کیا مدد کریں۔ پوچھا۔"یہاں کوئی افسر بھی تو ہوگا؟"

گوڈر نے کہا۔"ہاں افسر تو ایک نہیں پچیس ہیں جی۔ سب سے بڑے افسر تو وہی میاں جی ہیں جو امر بھیا کے بڑے دوست ہیں۔"

"تم لوگوں نے اس لفنگے سے پوچھا نہیں کہ مارپیٹ کیوں کرتے ہو؟ کیا یہ بھی کوئی قانون ہے۔"

گوڈر نے سلونی کی مڑیا کی طرف دیکھ کر کہا۔"مالک کہتے تو سب کچھ ہیں۔ جب کوئی سُنے۔ سلیم میاں نے خود اپنے ہاتھوں سے ہنٹر مارے۔ اس کی بے دردی دیکھ کر پولیس والے بھی دانتوں تلے اُنگلی دباتے۔ سلونی میری بھاوج لگتی ہے۔ اس نے اس کے منہ پر تھوک دیا تھا۔ یہ اسے نہ کرنا چاہیے تھا پاگل پن تھا اور کیا۔ مگر اس پر میاں صاحب آگ ہوگئے۔ اور بُوھیا کے اتنے ہنٹر مارے کہ بھگوان ہی بچائیں تو بچے۔ مگر ہے وہ بھی اپنی دُھن کی پکّی۔ ہر ایک ہنٹر پر گالی دیتی تھی۔ جب بے دم ہوکر گر پڑی تب اس کی جبان بند ہوئی۔ امر بھیّا اسے کاکی کہا کرتے تھے۔ کہیں سے بھی آئیں۔ سب سے پہلے کاکی کے پاس جاتے تھے۔"

آتمانند نے چڑکر کہا۔"ارے تو اب رہنے بھی دو، کیا سب آج ہی کہہ ڈالو گے۔ پانی منگاؤ، آپ ہاتھ منہ دھوئیں۔ تھکے ماندے آرہے ہیں۔ ذرا آرام کرلینے دو۔ دیکھو سلونی کو بھی خبر مل گئی۔ لاٹھی ٹیکتی چلی آرہی ہے۔"

سلونی نے قریب آکر کہا۔"کہاں ہیں دیور جی۔ ساون آتے تو تمھارے ساتھ جھولا جھولتی۔ چلے بھی تو کاتک میں۔ جس کا ایسا سردار اور ایسا بیٹا۔ اسے کس کا ڈر۔ تمھیں دیکھ کر سارا دُکھ بھول گئی دیور جی۔"

سمرکانت نے دیکھا سلونی کا سارا جسم سوجا ہوا ہے۔ اور ساڑی پر خون کے داغ سوکھ کر کتھئی ہوگئے ہیں منہ بالکل سوجا ہوا ہے۔ اس مردے پر اتنا غصہ۔ اس پر عالم فاضل بنتا ہے۔ ان کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ غصہ اور چاہے کچھ نہ کرسکے خدا کی خبر تو لے ہی سکتا ہے۔ تم عالم الغیب ہو۔ قادر مطلق ہو، غریبوں کے دستگیر ہو۔ اور تمھاری آنکھوں کے سامنے یہ اندھیر۔ اس دنیا کا کوئی خالق نہیں ہے۔ اگر کوئی رحم دل ایشور اس کا خالق ہوتا تو

یہ ظلم نہ ہوتا۔ اچھے قادر مطلق ہو، کیوں ان بے رحموں کے دل میں نہیں گھس جاتے؟ یا وہاں تمھاری بھی پہنچ نہیں ہے۔ کہتے ہیں یہ سب بھگوان کا کھیل ہے۔ اچھا کھیل ہے۔ اگر تمھیں بھی ایسے کھیل میں مزا آتا ہے تو تم جانوروں سے بھی گئے گزرے ہو۔ اگر تمھیں دنیا کی کچھ خبر نہیں تو علیم اور بصیر کیوں کہلاتے ہو؟

سمر کانت راسخ الاعتقاد آدمی تھے۔ مذہبی کتابوں کا خوب مطالعہ کیا تھا۔ بھگوت گیتا کا روز ورد کیا کرتے تھے۔ مگر اس وقت سارا دھرم شاستر انھیں گورکھ دھندا معلوم ہوا۔

وہ اسی وقت اُٹھ کھڑے ہوئے اور پوچھا۔"سلیم تو صدر ہوگا؟"

آتمانند نے کہا۔"آج کل تو یہیں پڑاؤ ہے۔ ڈاک بنگلے میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔"

"میں ذرا ان سے ملوں گا۔"

"ابھی غصّے میں ہیں۔ ان سے مل کر کیا کیجیے گا۔ آپ کو بھی سخت سست کہہ بیٹھیں گے۔"

"یہی تو دیکھنے جانا ہے کہ آدمی کہاں تک حیوان ہو سکتا ہے۔"

"تو چلیے میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔"

"نہیں نہیں تم نہ چلو سوامی جی۔" "مالک، یہ تو سنیاسی اور دیا کے پُتلے ہیں مگر غُصے میں بھی دریا سامتی سے کم نہیں ہیں۔ جب حاکم صاحب سلونی کو مار رہے تھے تو چار آدمی انھیں پکڑے ہوئے تھے۔ نہیں تو اسی دم میاں کا خون چوس لیتے۔ پیچھے چاہے پھانسی ہو جاتی۔ سارے گاؤں کی مرہم پٹی انھیں کے سپرد ہے۔"

سلونی نے سمر کانت کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔"میں تمھارے ساتھ چلوں گی دیور جی۔ اسے دکھا دوں گی کہ بُڑھیا تیری چھاتی پر مونگ دلنے کو بیٹھی ہوئی ہے۔ تو مارن ہار ہے تو کوئی تجھ سے بڑا راکھن ہار بھی ہے۔ جب تک اس کا حکم نہ ہوگا تو کیا مار سکے گا۔"

خدا کی ذات میں اس کا یہ زندہ اعتقاد دیکھ کر سمر کانت کی آنکھیں بھر آئیں۔ سوچا مجھ سے تو یہ جاہل ہی اچھے جو اتنی سختیاں اور تکلیفیں جھیل کر بھی تمھارا نام رٹتے ہیں، بولے۔"نہیں بھابی مجھے اکیلے جانے دو۔ میں ابھی ان سے دو دو باتیں کرکے لوٹا آتا ہوں۔"

سلونی لاٹھی سنبھال ہی رہی تھی کہ سمر کانت چل پڑے۔ تیجا اور درجن ڈاک بنگلے کا

راستہ دکھاتے ہوئے آگے آگے چلے۔

تیجا نے پوچھا۔"دادا جب امر بھیا چھوٹے تھے تو بڑے سیتان تھے نہ؟"

سمرکانت نے اس سوال کا مطلب نہ سمجھ کر کہا۔"نہیں تو وہ بچپن ہی سے بڑے سیدھے تھے۔"

درجن تالی بجاکر بولا۔"اب کہو تم ہارے کہ نہیں۔ دادا ہمارا ان کا جھگڑا ہے کہ یہ کہتے ہیں کہ جو لڑکے بچپن میں بڑے سیتان ہوتے ہیں وہ بڑے ہوکر دھرماتما ہوجاتے ہیں۔ اور میں کہتا ہوں کہ جو لڑکپن میں سیدھے ہوتے ہیں وہی بڑے ہوکر بھی سیدھے ہوتے ہیں۔ جو بات آدمی میں ہے ہی نہیں وہ بیچ میں کہاں سے آجائے گی۔"

تیجا نے اعتراض کیا۔"لڑکے میں تو اکل بھی نہیں ہوتی۔ جوان ہونے پر کہاں سے آجاتی ہے۔ ننھے سے بیج میں ڈال پات کہاں آجاتے ہیں۔"

"یہ کوئی بات نہیں، میں ایسے کتنے ہی نامی آدمیوں کی مثال دے سکتا ہوں جو بچپن میں بڑے پاجی تھے۔ مگر آگے چل کر بڑے مہاتما ہوگئے۔"

سمرکانت کو بچّوں کے اس مباحثے میں بڑا مزا آیا۔ ثالث بن کر دونوں کو کچھ کچھ سہارا دیتے جاتے تھے۔ راستے میں ایک جگہ کیچڑ بھرا ہوا تھا۔ سمرکانت کے جوتے کیچڑ میں پھنس کر پاؤں سے نکل گئے۔ اس پر بڑی ہنسی ہوئی۔

سامنے سے پانچ سوار آتے نظر آئے۔ تیجا نے ایک بڑا پتھر اُٹھاکر ایک سوار پر نشانہ مارا۔ اس کی پگڑی زمین پر گری۔ وہ تو گھوڑے سے اُتر کر پگڑی اُٹھانے لگا۔ باقی چاروں گھوڑے دوڑاتے ہوئے سمرکانت کے قریب آپہنچے۔

تیجا دوڑ کر ایک درخت پر چڑھ گیا۔ دو سوار اس کے پیچھے دوڑے اور نیچے سے گالیاں دینے لگے۔ باقی تین سواروں نے سمرکانت کو گھیر لیا اور ایک نے ہنٹر نکال کر اوپر اُٹھایا ہی تھا کہ یکایک چونک پڑا اور بولا۔"آپ ہیں سیٹھ جی! آپ یہاں کہاں؟"

سیٹھ جی نے سلیم کو پہچان کر کہا۔"ہاں ہاں چلا دو ہنٹر رُک کیوں گئے۔ اپنی کارگزاری دکھانے کا پھر ایسا موقع کہاں ملے گا۔ امیروں پر تو ہنٹر چلا ہی نہیں سکتے۔ غریبوں پر بھی نہ چلاؤ تو چلاؤ کس پر؟"

سلیم نے شرمندہ ہوکر کہا۔"آپ لونڈوں کی شرارت دیکھ رہے ہیں پھر مجھ ہی کو

قصوروار ٹھہراتے ہیں۔ شیطان نے ایسا پتھر مارا کہ ان داروغہ جی کی پگڑی گر گئی۔ خیریت یہ ہوئی کہ آنکھ بچ گئی۔"

سمرکانت اشتعال سے متجاوز ہوکر بولے۔"ٹھیک تو ہے جب اس لونڈے نے پتھر چلایا جو ابھی نادان ہے تو پھر ہمارے حاکم صاحب جو عالم ہیں کیا ہنٹر بھی نہ چلائیں۔ کہہ دو، دونوں سوار درخت پر چڑھ جائیں اور لونڈے کو نیچے ڈھکیل دیں۔ مرجائے گا تو کیا ہوا۔ حاکم سے بے ادبی کرنے کی سزا تو پاجائے گا۔"

سلیم نے اپنی صفائی پیش کی۔"آپ تو ابھی آئے ہیں۔ آپ کو کیا معلوم کہ یہاں کے لوگ کتنے مفسد ہیں۔ ایک بُڑھیا نے میرے منہ پر تھوک دیا میں نے ضبط کیا ورنہ سارا گاؤں جیل میں ہوتا۔"

سمرکانت نے چوٹ کھاکر بھی ہار نہ مانی۔ بولے۔"تمھارے ضبط کی بانگی دیکھے آرہا ہوں بیٹا! اب منہ نہ کھلواؤ۔ اگر وہ جاہل بے سمجھ عورت تھی۔ تو تم ہی نے عالم فاضل ہوکر کون سی شرافت کی۔ اس کا سارا جسم لہو لہان ہو رہا ہے۔ شاید بچے گی بھی نہیں۔ کچھ یاد ہے کتنے آدمیوں کے ہاتھ پاؤں ٹوٹ گئے۔ یہ سب تمھارے نام کو دعائیں دے رہے ہیں۔ اگر ان سے روپے نہ وصول ہوتے تھے تو بے دخلی جاری کراتے۔ فصل قرق کرالیتے۔ مارپیٹ کا قانون کہاں سے لائے۔"

"بے دخلی سے کیا نتیجہ۔ زمین کا یہاں کون خریدار ہے۔ آخر سرکاری رقم کیسے وصول کی جائے؟"

"تو مار ڈالو سارے گاؤں کو۔ دیکھو کتنے روپے وصول ہوتے ہیں۔ تم سے مجھے ایسی امید نہ تھی۔ مگر شاید حکومت میں کچھ نشہ ہوتا ہے۔"

آپ نے ابھی ان لوگوں کی بدمعاشی نہیں دیکھی۔ میرے ساتھ آیئے میں ساری داستان سُناؤں، اس وقت کہاں سے آرہے ہیں؟"

سمرکانت نے اپنے لکھنؤ آنے اور سکھدا سے ملنے کا حال کہا۔ پھر مطلب کی بات چھیڑی۔ "امرکانت تو یہیں ہوگا۔ سُنا ہے سی(C) کلاس میں رکھا گیا ہے؟"

اندھیرا زیادہ ہوگیا تھا۔ کچھ سردی بھی پڑنے لگی تھی۔ چار سوار تو گاؤں کی طرف چلے گئے۔ سلیم گھوڑے کی راس تھامے ہوئے پاؤں پاؤں سمرکانت کے ساتھ ڈاک بنگلے

چلا۔"

کچھ دور چلنے کے بعد سمرکانت نے کہا۔"تم نے دوستی کا حق خوب ادا کیا امر کو جیل بھیج دیا اچھا کیا۔ مگر کم سے کم اسے اچھا درجہ تو دلا دیتے۔ لیکن حاکم ٹھہرے۔ دوست کی سفارش کیسے کرتے۔"

سلیم نے رنجیدہ ہوکر کہا۔"آپ تو سیٹھ جی مجھ ہی پر سارا غصہ اُتار رہے ہیں۔ میں نے کوشش کرکے درجہ دلایا تھا۔ مگر وہ خود معمولی قیدیوں کے ساتھ رہنے پر ضد کرنے لگے تو میں کیا کرتا۔ یہ میری بدنصیبی ہے کہ یہاں آتے ہی آتے مجھے وہ سب کچھ کرنا پڑا جس سے نفرت تھی۔"

ڈاک بنگلے پر پہنچ کر سیٹھ جی ایک آرام کرسی پر لیٹ گئے اور بولے۔"تو میرا آنا بے کار ہوا۔ ان سے ملاقات تو ہو ہی جائے گی؟"

سلیم نے جواب دیا۔"میں آپ کے ساتھ چلوں گا۔ ملاقات کی تاریخ ابھی نہیں آئی ہے۔ مگر جیل والے شاید مان جائیں۔ ہاں اندیشہ امرکانت کی طرف سے ہے۔ وہ کسی قسم کی رعایت نہیں چاہتے۔"

پھر اس نے ذرا مسکرا کر کہا۔"اب آپ کو بھی ان کاموں میں دلچسپی پیدا ہوگئی۔"

سیٹھ جی نے انکسار کے ساتھ کہا۔"اب میں اس عمر میں کیا کروں گا۔ بوڑھے دل میں جوانی کا جوش کہاں سے آئے۔ بہو جیل میں ہے۔ لڑکا جیل میں ہے۔ شاید لڑکی بھی جیل کی تیاری کررہی ہے اور میں چین سے کھاتا پیتا ہوں اور آرام سے سوتا ہوں۔ میری اولاد میرے گناہوں کا کفارہ کر رہی ہے۔ میں نے غریبوں کا کتنا خون چوسا ہے، کتنے گھر تباہ کیے ہیں۔ اس کی یاد کرکے خود شرمندہ ہوجاتا ہوں۔ اگر جوانی میں سمجھ آگئی ہوتی تو اپنی اصلاح کرتا۔ اب کیا کروں گا۔ باپ اپنی اولاد کا رہنما ہوتا ہے اسی کے پیچھے اس کے لڑکے چلتے ہیں مجھے اپنے لڑکوں کے پیچھے چلنا پڑا۔ میں مذہب کی اصلیت کو نہ سمجھ کر مذہب کے سوانگ کو مذہب سمجھے ہوئے تھا۔ وہی زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کا کینڈا ہی بگڑا ہوا ہے۔ جب تک ہمیں جائداد پیدا کرنے کی دھن رہے گی ہم مذہب سے کوسوں دور رہیں گے۔ ایشور نے دنیا کو کیوں اس ڈھنگ پر لگایا۔ یہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔"

سلیم ایسے مسئلوں پر سر نہ کھپا چاہتا تھا۔ جب وہ ان کی طرح زندگی سے سیر ہوجائے گا تو مرتے وقت مذہب اور خدا کی یاد میں محو ہوجائے گا۔ دونوں آدمی کئی منٹ تک خاموش بیٹھے رہے۔ تب لالہ جی محبت آمیز لہجے میں بولے۔"نوکر ہوجانے پر آدمی کو مالک کا حکم ماننا ہی پڑتا ہے۔ اس کی میں بُرائی نہیں کرتا۔ ہاں ایک بات میں کہوں گا جن پر تم نے ظلم کیا ہے چل کر ان کے آنسو پونچھ دو۔ تم ان غریب آدمیوں کو تھوڑی سی شرافت سے اپنا غلام بناسکتے ہو۔ سرکار کا آئینِ حکومت تو تم نہیں بدل سکتے لیکن اتنا تو کرہی سکتے ہو کہ کسی پر بے جا سختی نہ کرو۔"

سلیم نے شرماتے ہوئے کہا۔"لوگوں کی گستاخی پر غصّہ آجاتا ہے ورنہ میں خود نہیں چاہتا کہ کسی پر سختی کروں۔ پھر بھی میرے سر پر کتنی بڑی ذمّے داری ہے۔ لگان وصول نہ ہوا تو میں کتنا بڑا نالائق سمجھا جاؤں گا۔"

سمرکانت نے مایوسانہ انداز سے کہا۔"تو بیٹا لگان وصول نہ ہوگا۔ ہاں آدمیوں کے خون سے ہاتھ رنگ سکتے ہو۔"

"یہی تو دیکھنا ہے۔"

"دیکھ لینا میں نے بھی اسی دنیا میں بال سفید کیے ہیں۔ کسان افسروں کی صورت سے کانپتے تھے۔ لیکن زمانہ بدل رہا ہے۔ اب انھیں اپنی عزّت و آبرو کا خیال ہوتا ہے۔ تم مفت میں بدنامی اُٹھا رہے ہو۔"

"اپنا فرض ادا کرنا بدنامی ہے تو مجھے اس کی پروا نہیں۔"

سمرکانت نے اس حاکمانہ غرور پر دل میں ہنس کر کہا۔"فرض میں تھوڑی سی مٹھاس ملادینے سے کسی کا کچھ نہیں بگڑتا۔ ہاں بن بہت کچھ جاتا ہے۔ یہ بے چارے کسان اتنے غریب ہیں کہ تھوڑی سی ہمدردی کرکے انھیں اپنا غلام بناسکتے ہو۔ حکومت تو بہت جھیل چکے اب انسانیت کا برتاؤ چاہتے ہیں۔ جس عورت کو تم نے ہنٹروں سے مارا ہے اسے ایک بار ماتا کہہ کر تم اس کی گردن کاٹ سکتے تھے، یہ سمجھتے ہی کیوں ہو کہ ان پر حکومت کرنے آئے ہو۔ یہ سمجھو کہ تمھیں ان کی خدمت کرنے کا موقع ملا ہے۔ مان لیا تمھیں تنخواہ سرکار سے ملتی ہے۔ لیکن آتی تو ہے ان ہی کی گرہ سے۔ کوئی جاہل ہو تو اسے سمجھاؤں۔ تم خدا کے فضل سے خود ہی پڑھے لکھے آدمی ہو۔ تمھیں کیا سمجھاؤں۔ تم پولیس والوں کی

باتوں میں آگئے۔ یہی بات ہے نا؟"

سلیم بھلا یہ کیسے تسلیم کرتا۔

لیکن سمرکانت اڑے رہے۔"میں یہ مانتا ہوں، تم کسی سے نذر و نیاز نہیں لینا چاہتے۔ تم نے جو کچھ کیا ضرورت سے مجبور ہو کر کیا۔ لیکن جن لوگوں کی روٹیاں نوچ کھسوٹ پر چلتی ہیں۔ انھوں نے ضرور تمھیں بھرا ہوگا۔ تمھارا چہرہ کہے دیتا ہے کہ تمھیں اپنے طرزِ عمل پر افسوس ہورہا ہے۔ جو بھوکوں مرتے ہیں۔ چیتھڑے پہن کر اور پوال پر سوکر دن کاٹتے ہیں۔ ان پر تمھیں غصّہ آیا ہی کیوں کر۔ جب ہم اور تم دوچار گھنٹے آرام سے کام کرکے عیش کی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں تو کیا یہ ظلم نہیں ہے کہ جو لوگ بال بچّوں سمیت اٹھارہ گھنٹے کام کریں وہ کپڑے کو ترسیں۔ بے چارے غریب ہیں۔ بے زبان ہیں۔ غیر منظّم ہیں۔ اسی لیے چھوٹے بڑے سب ہی ان پر رعب جماتے ہیں۔ مگر تم جیسے روشن خیال اور تعلیم یافتہ لوگ بھی وہی کرنے لگیں جو معمولی عملے کرتے ہیں تو افسوس ہوتا ہے۔ اپنے ساتھ کسی کو مت لو میرے ساتھ چلو۔ میں ذمہ لیتا ہوں کہ کوئی تمھارے ساتھ گستاخی نہ کرے گا۔ میں تمھیں دکھادوں گا کہ وہ کتنے حلیم اور فرماں بردار ہیں۔ میں اتنا ہی چاہتا ہوں کہ تم ان کے زخم پر مرہم رکھ دو۔"

سلیم کا دل ابھی اتنا سیاہ نہ ہوا تھا کہ اس پر دوسرا کوئی رنگ ہی نہ چڑھتا، خفت آمیز لہجے میں بولا۔"لیکن میری وکالت آپ ہی کو کرنی پڑے گی۔"

"ہاں ہاں یہ سب میں کردوں گا۔ لیکن ایسا نہ ہو میں یہاں سے ادھر چلوں ادھر تم ہنٹر بازی شروع کردو۔"

"اب زیادہ شرمندہ نہ کیجیے۔"

"تم یہ تجویز کیوں نہیں کرتے کہ علاقے کی حالت کی جانچ کی جائے۔ آنکھیں بند کرکے حکم ماننا تمھارا کام نہیں ہے۔ پہلے اپنا اطمینان تو کرلو کہ تم سے جو کچھ کرنے کو کہا جاتا ہے وہ اخلاقاً مناسب بھی ہے یا نہیں تم خود ایسی رپورٹ کیوں نہیں کرتے۔ ممکن ہے حکام اسے پسند نہ کریں۔ لیکن حق کے لیے کچھ نقصان بھی اُٹھانا پڑے تو کیا غم۔"

سلیم کا دل ان الفاظ سے بالکل غیر متاثر نہ رہ سکا۔ کھونٹے کی پتلی نوک زمین کے اندر پہنچ چکی تھی بولا۔"اس بزرگانہ فہمائش کے لیے میں آپ کا احسان مند ہوں اور اس پر

عمل کرنے کی کوشش کروں گا۔"

کھانے کا وقت آگیا تھا سلیم نے پوچھا۔"آپ کے لیے کیا بنواؤں؟"

"جو چاہے بنواؤ۔ مگر اتنا یاد رکھو کہ میں ہندو ہوں اور پُرانے زمانے کا آدمی ہوں۔ ابھی تک چھوت چھات مانے جاتا ہوں۔"

"آپ چھوت کو اچھا سمجھتے ہیں؟"

"اچھا تو نہیں سمجھتا۔ مگر مانتا ہوں۔"

"کیوں مانتے ہیں؟"

"اسی لیے کہ اس میں میری پرورش ہوئی ہے۔ اگر ضرورت پڑے تو میں تمھارا پاخانہ اُٹھا کر پھینک دوں گا۔ لیکن تمھاری تھالی میں کھا نہیں سکتا۔"

"میں تو آپ کو اپنے ساتھ بٹھاکر کھلاؤں گا۔"

"تم پیاز، گوشت اور انڈے کھاتے ہو، مجھے ان کی بو سے نفرت ہے۔"

"آپ یہ سب کچھ نہ کھائیے گا۔ لیکن میرے ساتھ بیٹھنا پڑے گا۔"

"روز اشنان کرتے ہو یا نہیں؟"

"روز صابن لگا کر نہاتا ہوں۔"

"برتنوں کو خوب صاف کرالینا۔"

"ہاں ہاں برتنوں کو صاف کرالوں گا۔ برہمن سے پکوا بھی دوں گا۔ بس ایک میز پر بیٹھ کر کھانا ہوگا۔"

"اچھا کھالوں گا بھائی۔ تمھاری خاطر سہی۔"

سیٹھ جی تو سندھیا کرنے بیٹھے۔ ادھر ایک کانسٹبل نے سیٹھ جی کے لیے پوری، کچوری، حلوا کھیر پکائی۔ دہی پہلے ہی سے رکھا ہوا تھا۔ سلیم آج خود یہی کھانا کھائے گا۔

سیٹھ جی سندھیا کرکے لوٹے تو دیکھا دو کمبل بچھے ہوئے ہیں اور دو تھالیاں رکھی ہوئی ہیں۔ خوش ہوکر بولے۔"یہ تم نے بہت اچھا انتظام کیا۔"

سلیم نے ہنس کر کہا۔"میں نے سوچا کہ آپ کا دھرم کیوں لوں۔ نہیں ایک ہی کمبل رکھتا۔"

"اگر یہ خیال ہے تو میرے کمبل پر آجاؤ، نہیں، میں ہی آتا ہوں۔"

وہ تھالی اُٹھا کر سلیم کے کمبل پر آبیٹھے۔ اپنے خیال میں انھوں نے آج اپنی زندگی کا سب سے بڑا معرکہ جیتا۔ اپنی ساری دولت خیرات کر کے بھی انھیں اتنی پُرغرور مسرت نہ حاصل ہوتی۔

سلیم نے چٹکی لی۔ "اب تو آپ مسلمان ہوگئے۔"

سیٹھ جی۔ "میں مسلمان نہیں ہوا۔ تم ہندو ہوگئے۔"

(۴)

علی الصباح۔ سمر کانت اور سلیم ڈاگ بنگلے سے گاؤں کی طرف چلے۔ پہاڑیوں سے نیلی بھاپ اُٹھ رہی تھی۔ اور سلیم کا دل گویا کسی موہوم درد سے بھاری ہو رہا تھا۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ زمین کسی مریض کی طرح کہر کے نیچے پڑی ہوئی سسک رہی تھی۔ کچھ لوگ بندروں کی طرح چھپّروں پر بیٹھے اُن کی مرمت کر رہے تھے اور کچھ دروازوں پر بیٹھے دھوپ کھا رہے تھے دونوں آدمی پہلے سلونی کے گھر گئے۔

سلونی کو بخار چڑھا ہوا تھا۔ اور سارا جسم پھوڑے کی طرح درد کر رہا تھا۔ مگر اسے گانے کی دُھن سوار تھی۔

سنتو دیکھت جگ بوارنا

سانچ کہو تو مارن دھاوے، جھوٹ جگت پتیانا

سنتو دیکھت من بوارنا

درد دل جب ناقابل برداشت ہوجاتا ہے۔ جب وہ نالہ و فغاں کی گود میں بھی پناہ نہیں پاتا، تب وہ نغمے کی گود میں جا بیٹھتا ہے۔

سمر کانت نے پکارا۔ "بھابی ذرا باہر تو آؤ۔"

سلونی چٹ پٹ اُٹھ کر پکے بالوں کو گھونگھٹ میں چھپاتی دوشیزہ کی طرح شرماتی آکر کھڑی ہوگئی اور پوچھا۔ "تم کہاں چلے گئے تھے دیور جی؟"

دفعتاً سلیم کو دیکھ ایک قدم پیچھے ہٹ گئی، اور جیسے اسے گالی دی "یہ تو حاکم ہے۔"

پھر شیرنی کی طرح جھپٹ کر اس نے سلیم کو ایسا دھکّا دیا کہ وہ گرتے گرتے بچا۔ اور جب تک سمر کانت اسے ہٹائیں۔ سلیم کی گردن پکڑ کر اتنی زور سے دبائی گویا گلا گھونٹ دے گی۔

سیٹھ جی نے پوری طاقت سے ہٹا کر کہا۔"پاگل ہوگئی ہے کیا بھابی۔ الگ ہٹ جا۔ سنتی نہیں۔"

سلونی نے پھٹی پھٹی انگارے کی سی آنکھوں سے سلیم کو گھورتے ہوئے کہا۔"مار تو دکھا دوں، آج میرا سردار آگیا ہے۔ سر کچل کر رکھ دے گا۔"

سمرکانت نے ملامت آمیز لہجے میں کہا۔"سردار کے منہ میں کالکھ لگا رہی ہو اور کیا، بوڑھی ہوگئی مرنے کے دن آگئے اور عقل نہ آئی۔ یہی تمھارا کام ہے کہ کوئی حاکم دروازے پر آئے تو اس کی گردن پر چڑھ بیٹھو۔"

سلونی نے دل میں کہا یہ لابھی ٹھکر سہانی کہتے ہیں۔ لڑکا پکڑ گیا ہے نا اسی سے۔ کھسیا کر بولی۔"پوچھو اس نے سب کو پیٹا ہے نہیں؟"

سیٹھ جی بگڑ کر بولے۔"تم حاکم ہوتیں اور گاؤں والے تمھیں دیکھتے ہی لاٹھیاں لے کر نکل آتے تو تم کیا کرتیں؟ جب رعیت لڑنے پر تیار ہوجائے تو حاکم کیا اس کی پوجا کرے۔ امر ہوتا تو وہ لاٹھی لے نہ دوڑتا۔ گاؤں والوں کو لازم تھا کہ حاکم کے پاس جاکر اپنا اپنا حال کہتے۔ ادب کے ساتھ عرض و معروض کرتے۔ یہ نہیں کہ حاکم کو دیکھا اور مارنے دوڑے۔ گویا وہ تمھارا دشمن ہے۔ میں انھیں سمجھا بجھا کر لایا تھا کہ میل کرادوں۔ دلوں کی صفائی ہوجائے اور تم ان سے لڑنے مرنے پر تیار ہوگئیں۔"

یہاں کی ہل چل سُن کر گاؤں کے اور کتنے ہی آدمی جمع ہوگئے مگر کسی نے سلیم کو سلام نہیں کیا۔ سبھوں کی تیوریاں چڑھی ہوئی تھیں۔

سمرکانت نے انھیں مخاطب کرکے کہا۔"میں تم ہی لوگوں سے پوچھتا ہوں۔ یہ صاحب تمھارے حاکم ہیں کہ نہیں؟ جب رعایا حاکم کے ساتھ گستاخی کرتی ہے تو حاکم کو بھی غصہ آجائے تو کوئی تعجب ہے؟ یہ بے چارے تو اپنے کو حاکم سمجھتے ہی نہیں۔ لیکن عزّت تو سب ہی رکھتے ہیں۔ حاکم ہو یا نہ ہو۔ کوئی بھلا آدمی اپنی بے عزّتی نہیں دیکھ سکتا۔ بولو گوڈر میں کچھ غلط کہتا ہوں۔"

گوڈر نے سر جھکا کر کہا۔"نہیں مالک سچ کہتے ہو۔ مگر وہ تو باؤلی ہے۔ اس کی کسی بات کا بُرا نہ مانو۔ سب کے منہ میں کالکھ لگا رہی ہے اور کیا۔"

سمرکانت نے پھر کہا۔"یہ ہمارے لڑکے کے برابر ہیں۔ امر کے ساتھ پڑھے، انھیں

کے ساتھ کھیلے۔ تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ امر کو گرفتار کرنے یہ اکیلے ہی آئے تھے۔ کیا پولیس کو بھیج کر نہ پکڑوا سکتے تھے؟ سپاہی حکم پاتے ہی آتے اور اسے دھکّے دے کر پکڑ لے جاتے۔ ان کی شرافت تھی، خود آئے۔ اور کسی پولیس کو ساتھ نہ لائے۔ امر نے بھی وہ کیا جو واجب تھا۔ اکیلے آدمی کو بے عزّت کرنا مشکل تھا۔ اب تک جو کچھ ہوا اس کا انھیں رنج ہے۔ حالانکہ قصور تم لوگوں کا زیادہ تھا۔ خیر اب ان پچھلی باتوں کو بھول جاؤ۔ ان کی طرف سے اب کسی قسم کی سختی نہ ہوگی۔ انھیں اگر تمھاری جائداد نیلام کرنے کا حکم ملے گا نیلام کریں گے۔ گرفتار کرنے کا حکم ملے گا گرفتار کریں گے۔ تمھیں بُرا نہ لگنا چاہیے۔ تم دھرم کی لڑائی لڑ رہے ہو۔ لڑائی نہیں یہ تپسّیا ہے۔ تپسّیاں میں غصّہ اور نفرت آجائے تو تپسّیا ٹوٹ جاتی ہے۔"

سوامی آتمانند بولے۔"دھرم کی حفاظت ایک طرف سے نہیں ہوتی۔ سرکار قانون بناتی ہے۔ قانون کی حفاظت کرنا اس کا کام ہے جب اس کے اہل کار ہی قانون کو پیروں سے کچلتے ہیں تو پھر رعایا کیسے ان کے قانون کی پابندی کر سکتی ہے۔"

سمرکانت نے پھٹکا بتلائی۔"آپ سنیاسی ہوکر ایسا کہتے ہیں۔ سوامی جی آپ کو اپنی روحانیت سے اپنے حاکموں کو راہ راست پر لانا ہے اگر وہ حق پر ہوتے تو آپ کو یہ تپسّیا کیوں کرنی پڑتی۔ آپ ظلم پر ظلم سے نہیں پریم سے فتح پا سکتے ہیں۔"

سوامی جی کا منہ ذرا سا نکل آیا۔ زبان بند ہوگئی۔

سلونی کا مجروح دل کسی چڑیا کے پنجرے سے نکل کر بھی کوئی مامن تلاش کر رہا تھا۔ یہ شرافت اور درد سے بھری ہوئی تقریر گویا اس کے روبرو دانہ بکھیرنے لگی۔ طائر نے دوچار بار گردن جُھکا کر دانوں کو چوکنی آنکھوں سے دیکھا۔ پھر اپنے محافظ کو آآ کہتے سُنا اور پڑ پھیلا کر دانوں پر اُتر آیا۔ وہ آنکھوں میں آنسو بھرے دونوں ہاتھ جوڑے بولی۔"سرکار مجھ سے بڑی کھتا ہوگئی مجھے جو سجا چاہے دے دیجیے۔"

سیٹھ جی نے ٹوکا۔"سرکار نہیں بیٹا کہو۔"

"بیٹا مجھ سے بڑی کھتا ہوئی۔ مورکھ ہوں، باؤلی ہوں، جو سجا چاہے دو۔"

سلیم کی نوجوان آنکھیں بھی پُرآب ہوگئیں۔ اختیار کا غرور اور حکومت کا نشہ اُتر گیا بولا۔"ماتاجی مجھے شرمندہ نہ کرو۔ یہاں جتنے لوگ کھڑے ہیں ان سے سے اور جو یہاں

نہیں ہیں ان سے بھی اپنی خطاؤں کی معافی چاہتا ہوں۔"

گوڈر ہاتھ باندھ کر بولے۔"ہم تمھارے گلام ہیں بھیا۔ آدمی پہچانتے تو یہ نوبت ہی کیوں آتی۔"

سوامی نے سمرکانت کے کان میں کہا۔"مجھے تو ایسا جان پڑتا ہے کہ دغا کرے گا۔"

سیٹھ جی نے کہا۔"کبھی نہیں۔ نوکری چاہے چلی جائے مگر تمھیں ستائے گا نہیں۔ شریف آدمی ہے۔"

سوامی ہٹے تو سلیم نے آکر سیٹھ جی کے کان میں کچھ کہا۔

سیٹھ جی گاؤں والوں سے مسکرا کر بولے۔"جنٹ صاحب تم لوگوں کی دوا دارو کے لیے سو روپے دان دے رہے ہیں۔ میں اپنی طرف سے نو سو اور ملائے دیتا ہوں۔ اس سے لوگوں کی مرہم پٹّی کیجیے۔" گوڈر نے شکریہ ادا کرنا چاہا مگر الفاظ نہ ملے۔

سمرکانت نے کہا۔"یہ نہ سمجھو یہ روپے میرے ہیں۔ میں اپنے باپ کے گھر سے نہیں لایا۔ تمھیں سے تمھارا گلا دبا کر لیے تھے وہ تمھیں لوٹا رہا ہوں۔"

گاؤں میں جہاں سنّاٹا سا چھایا ہوا تھا۔ وہاں رونق نظر آنے لگی۔ جیسے مسرّت ہوا میں گھل گئی ہو۔

(۵)

امرکانت کو جیل میں کسی نہ کسی طرح روزانہ خبریں مل جایا کرتی تھیں۔ جس دن مارپیٹ اور آتش زنی کی خبر ملی اسے روحانی صدمہ ہوا۔ لوگوں کے رونے پیٹنے کی پُردرد ہائے ہائے جیسے مجسم ہوکر اس کے سامنے سر پیٹ رہی تھی۔ جلتے ہوئے گھروں کی لپٹیں گویا اسے جُھلسائے ڈالتی تھیں۔ تخیل نے اس حادثے کو اور بھی خوفناک صورت میں پیش کرکے اسے اور بھی متوحش کردیا تھا۔ اور اس کی ذمّے داری کس پر تھی؟ روپے تو یوں بھی وصول کیے جاتے مگر اتنا ظلم نہ ہوتا۔ کچھ رعایت تو کی جاتی۔ اب اس فساد کے بعد سرکار سے کسی نرمی یا رعایت کی توقع رکھنا عبث ہے۔

ان خیالات سے تنگ آکر اس نے بالآخر توکل کی پناہ لی۔ ظلم ہو رہا ہے ہونے دو۔ میں کیا کرسکتا ہوں، میں کون ہوں۔ کمزوروں کی تقدیر میں مار کھانا لکھا ہے مار کھائیں گے۔ میں ہی یہاں کیا پھولوں کی سیج پر سویا ہوا ہوں۔ جو کچھ ہوگا ہوگا۔ یہ بھی ایشور کی لیلا

ہے۔ واہ رے تیری لیلا۔ اگر تمھیں ایسی ہی لیلاؤں میں مزا آتا ہے تو تم رحیم کیوں بنتے ہو زبردست کا ٹھینگا سر پر، یہ بھی کوئی خدائی قانون ہے۔

وہ منکر نہ تھا لیکن یہاں اس کی عقل کام نہ کرتی تھی۔ اسے ساری کائنات درہم برہم نظر آتی تھی۔ جس میں کسی نظام کا پتہ نہ تھا۔ ایسے نظام کو وہ خدا سے منسوب نہ کرسکتا تھا۔

اس نے بان بٹنا شروع کیا لیکن آنکھوں کے سامنے وہی تماشا ہو رہا ہے۔ وہی سلونی ہے۔ سر کے بال کھلے ہوئے، نیم برہنہ مار پڑرہی ہے۔ اس کے رونے کی دردناک صدا کانوں میں آنے لگی۔ پھر منّی سامنے آکھڑی ہوئی۔ اسے سپاہیوں نے گرفتار کرلیا ہے۔ اور کھینچے لیے جا رہے ہیں۔ امر کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔"ہیں ہیں کیا کرتے ہو۔" پھر وہ چونک پڑا اور بان بٹنے لگا۔

رات کو بھی وہ نظارے آنکھوں میں پھرا کرتے۔ وہی صدائیں کانوں میں گونجا کرتیں۔ ساری تباہی کا بار اپنے سر پر لے کر وہ اس کے نیچے دبا جارہا تھا۔ اس بوجھ سے سبک دوش ہونے کے لیے اس کے پاس کوئی تدبیر نہ تھی۔ ایشور سے منحرف ہوکر اس نے گویا کشتی کو ترک کردیا تھا اور اتھاہ پانی میں ڈوبا جا رہا تھا۔ امر و نہی اُسے کسی تنکے کا سہارا نہ لینے دیتی تھی۔ وہ کدھر جا رہا ہے اور اپنے ساتھ لاکھوں مظلوموں کو کدھر لیے جارہا ہے اور اس کا انجام کیا ہوگا؟ اس ابر سیاہ میں کہیں چاندی کی جھالر بھی ہے؟ وہ چاہتا تھا کہیں سے آواز آئے۔"بڑھے آؤ، بڑھے آؤ یہی سیدھا راستہ ہے۔" مگر چاروں طرف بے جان خاموشی طاری تھی۔ کہیں سے کوئی آواز نہیں آئی، کوئی روشنی کی جھلک نہیں ملتی۔ جب وہ خود اندھیرے میں پڑا ہوا ہے۔ خود نہیں جانتا کہ آگے جنت کا ٹھنڈا سایہ ہے یا جہنّم کے خوفناک شعلے۔ تو اسے کیا حق ہے کہ اتنے آدمیوں کی جان آفت میں ڈالے۔ اسی روحانی خلجان کی حالت میں اس کے دل سے نکلا "ایشور مجھے روشنی دو مجھے اپنے قدموں میں جگہ دو" اور وہ رونے لگا۔

صبح کا وقت تھا۔ قیدیوں کی حاضری ہوگئی تھی۔ امر کو کچھ سکون ہوگیا تھا۔ وہ طوفان فرو ہوگیا تھا۔ اور آسمان میں چھائی ہوئی گرد بیٹھ گئی تھی۔ چیزیں صاف صاف نظر آنے لگی تھیں۔ امر بیٹھا ہوا دل میں پچھلے واقعات پر تبصرہ کر رہا تھا۔ جب تک نینا کا خط اسے نہ ملا

تھا اس کا طرزِ عمل کچھ اور ہی تھا۔ سکھدا کی گرفتاری کی خبر پاتے ہی جیسے اس کی کایا پلٹ ہوگئی۔ اب اسے معلوم ہوا کہ اس کا وہ فعل حرصِ شہرت کا، ذاتی رقابت کا، خدمت کے پردے میں چھپی ہوئی خودی کا جلوہ تھا۔ یہ بات ایک نئی حقیقت کی طرح اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

امر کے قریب ایک قیدی بیٹھا ہوا بان بٹ رہا تھا۔ امر نے پوچھا "تم کیسے آئے بھائی؟"

اس نے تعجب سے دیکھ کر پوچھا "پہلے تم بتاؤ۔"

"مجھے تو نام کی دُھن تھی۔"

"مجھے دولت کی دُھن تھی۔"

اسی وقت جیلر نے آکر امر سے کہا۔"تمھارا تبادلہ لکھنؤ ہوگیا ہے۔ تمھارے باپ آئے تھے۔ تم سے ملنا چاہتے تھے۔ تمھاری ملاقات کی تاریخ نہ تھی۔ صاحب نے انکار کردیا۔"

امر کو حیرت ہوئی۔"میرے باپ یہاں آئے تھے؟"

"ہاں ہاں اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ مسٹر سلیم بھی ان کے ساتھ تھے۔"

"علاقے کی کچھ نئی خبر؟"

"تمھارے باپ نے شاید سلیم صاحب کو سمجھا کر گاؤں والوں سے ان کا میل کرا دیا ہے۔ بڈھا شریف آدمی ہے۔ گاؤں والوں کے علاج معالجے کے لیے اپنے پاس سے ایک ہزار روپے دے دیے۔"

امر مسکرایا۔

"ان ہی کی کوشش سے تمھارا تبادلہ لکھنؤ ہو رہا ہے۔ لکھنؤ میں تمھاری بیوی بھی آگئی ہے۔ شاید انھیں چھ مہینے کی سزا ہوگئی ہے۔"

امر کھڑا ہوگیا۔"سکھدا بھی لکھنؤ میں ہے!"

"اسی لیے تو وہاں تمھارا تبادلہ ہو رہا ہے۔"

امر کو اپنا دل ایک روحانی فضا میں اُڑتا ہوا معلوم ہوا۔ وہ مایوسی کہاں گئی وہ کمزوری کہاں ہے۔

وہ پھر بیٹھ کر بان بٹنے لگا۔ اس کے ہاتھوں میں آج غضب کی پھرتی ہے ایسی کایا پلٹ۔ کیا اب بھی ایشور کے رحیم ہونے میں کوئی شک ہو سکتا ہے اس نے کانٹے ہی تو بوئے تھے وہ سب پھول ہو گئے۔

سکھدا آج جیل میں ہے جو تکلفات اور نمائش پر جان دیتی تھی۔ وہ آج بیکسوں کی خدمت میں اپنی زندگی قربان کر رہی ہے۔ دادا جو پیسوں کو دانت سے پکڑتے تھے وہ آج دوسروں کی خدمت کر رہے ہیں۔ کوئی غیبی طاقت نہیں ہے تو یہ سب کچھ کس کی تحریک سے ہو رہا ہے۔

اس نے اپنے دل کی ساری عقیدت سے ایشور کے قدموں میں سر جھکایا۔ وہ بوجھ جس سے وہ دبا جا رہا تھا۔ اس کے سر سے اُتر گیا۔ اس کا جسم ہلکا تھا۔ دل ہلکا تھا اور آگے آنے والی اوپر کی چڑھائی گویا اس کا خیر مقدم کر رہی تھی۔

(۶)

امرکانت کو لکھنؤ جیل میں آئے آج تیسرا دن ہے۔ یہاں اسے چکّی کا کام دیا گیا ہے۔ جیل کے اہل کاروں کو معلوم ہے وہ ایک متمول آدمی کا لڑکا ہے۔ اس لیے اسے سخت محنت دے کر بھی اس کے ساتھ کچھ رعایت کی جاتی ہے۔

ایک چھپّر کے نیچے چکیّوں کی قطاریں لگی ہوئی ہیں۔ دو دو قیدی ہر ایک چکّی کے پاس کھڑے آٹا پیس رہے ہیں شام کو. آٹے کی تول ہوگی جس کا آٹا معینہ مقدار سے کم ہوگا اسے سزا دی جائے گی۔

امرکانت نے اپنے رفیق سے کہا۔''ذرا ٹھہر جاؤ بھائی۔ دم لے لوں میرے ہاتھ نہیں چلتے۔ کیا نام ہے تمھارا۔ میں نے شاید تمھیں کہیں دیکھا ہے۔'' یہ رفیق گٹھلا، سیاہ، تندرو، سرخ چشم آدمی تھا جو محنت سے تھکنا نہ جانتا تھا۔ مسکرا کر بولا۔''میں وہی کالے خاں ہوں جو ایک چوری کے کڑے لے کر تمھارے پاس بیچنے گیا تھا۔ یاد کرو شام کو تم اپنی دوکان پر بیٹھے تھے اور لالہ جی کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ لیکن تم یہاں کیسے آپھنسے۔ تعجب ہو رہا ہے۔ پرسوں ہی سے پوچھنا چاہتا تھا۔ مگر ڈر تھا کہ کہیں دھوکا نہ ہو رہا ہو۔''

امرکانت نے مختصراً اپنی داستان کہہ سنائی اور پوچھا۔''تم کیسے آئے؟''

کالے خاں ہنس کر بولا۔''میرا حال کیا پوچھتے ہو بھیّا۔ یہاں تو چھے مہینے باہر رہتے

ہیں تو چھے سال اندر۔ اب تو یہی آرزو ہے کہ اللہ یہیں سے بلا لے۔ میرے لیے باہر رہنا ہی مصیبت ہے۔ سب کو اچھا اچھا کھاتے اچھا اچھا پہنتے دیکھتا ہوں تو جلن ہوتی ہے۔ مگر ملے کہاں سے۔ کوئی ہنر آتا نہیں نہ علم ہے۔ چوری نہ کروں، ڈاکہ نہ ماروں تو کھاؤں کیا۔ یہاں نہ کسی کو اچھا کھاتے دیکھتا ہوں۔ نہ اچھا پہنتے۔ اس لیے جلن بھی نہیں ہوتی۔ سب اپنے ہی جیسے پھر حسد اور ڈاہ کیوں۔ اسی لیے اللہ تعالےٰ سے دعا کرتا ہوں کہ یہیں سے بلا لے، چھوٹنے کی تمنا نہیں ہے۔ تمھارے ہاتھ دُکھ گئے ہوں تو رہنے دو میں اکیلا ہی پیس ڈالوں گا۔ تمھیں ان لوگوں نے یہ کام دیا ہی کیوں، تمھارے بھائی بند تو ہم لوگوں سے الگ آرام سے رکھے جاتے ہیں۔ تمھیں یہاں کیوں ڈال دیا۔ چھوڑ دو میں ابھی بات کی بات میں اُڑائے دیتا ہوں۔"

امر نے چکّی کی مٹھیا زور سے پکڑتے ہوئے کہا۔ "نہیں، نہیں میں تھکا نہیں ہوں۔ دو چار دن میں عادت ہوجائے گی تو تمھارے برابر کام کرکے دکھا دوں گا۔"

کالے خاں نے اسے پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا۔ "مگر یہ تو اچھا نہیں لگتا کہ تم میرے ساتھ چکّی پیسو۔ تم نے کوئی جُرم نہیں کیا ہے رعایا کے پیچھے سرکار سے لڑے ہو۔ میں تمھیں نہ پیسنے دوں گا۔ معلوم ہوتا ہے تمھاری خدمت کے لیے ہی اللہ نے مجھے یہاں بھیجا ہے۔ وہ تو بڑا کارساز ہے۔ اس کی قدرت کون سمجھ سکتا ہے۔ آپ ہی آدمی سے بُرائی کرواتا ہے، آپ ہی سزا دیتا ہے۔ آپ ہی اسے معاف بھی کردیتا ہے۔"

امرکانت نے اعتراض کیا۔ "بُرائی خدا نہیں کرتا۔ ہم خود کرتے ہیں۔"

کالے خاں نے ایسی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا جو کہہ رہی تھیں تم ان رموز کو ابھی نہیں سمجھ سکتے، اور بولا۔ "نا میں یہ نہ مانوں گا۔ تم نے تو پڑھا ہوگا اس کے حکم کے بغیر پتّا بھی نہیں ہل سکتا۔ بُرائی کون کرے گا سب وہی کرواتا ہے اور پھر معاف بھی کردیتا ہے۔ ابھی میں یہ بات منہ سے کہہ رہا ہوں۔ جس دن میرے ایمان میں یہ بات جم جائے گی اسی دن بُرائی بند ہوجائے گی۔ تم نے اس دن مجھے نصیحت دی تھی۔ میں تمھیں اپنا پیر سمجھتا ہوں۔ دو سو کی چیز تم نے بیس میں نہ لی۔ اسی دن مجھے معلوم ہوا بدی کیا چیز ہے اب سوچتا ہوں اللہ کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ زندگی میں اتنے گناہ کیے ہیں کہ جب ان کی یاد آتی ہے تو رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ اب تو اسی کی رحیمی کا بھروسہ ہے۔ کیوں بھیّا

تمھارے مذہب میں کیا لکھا ہے اللہ گنہ گاروں کو بخش دیتا ہے۔ یا نہیں۔"

کالے خاں کا تند چہرہ اس گہری نورانی ہمہ گیر عقیدت سے منوّر ہوگیا، آنکھوں میں روحانیت کا جلوہ چمک اُٹھا اور لہجہ اتنا معرفت خیز، اتنا معصوم اور پاکیزہ تھا کہ امر کانت کا دل مسرّت سے شگفتہ ہوگیا بولا۔"سنتا تو ہوں خاں صاحب کہ وہ بڑا رحیم ہے۔"

کالے خاں دوگنے جوش سے چکّی گھماتا ہوا بولا۔"ہاں بھیّا بڑا رحیم ہے۔ ماں کے پیٹ میں بچّے کو رزق پہنچاتا ہے۔ یہ دنیا ہی اس کی رحیمی کا آئینہ ہے۔ جدھر نظر اُٹھاؤ اس کی رحیمی کے جلوے ہیں۔ اتنے خونی ڈاکوں، زناکار یہاں پڑے ہوئے ہیں ان کے لیے بھی رزق کا سامان مہیّا کردیتا ہے۔ موقعہ دیتا ہے۔ بار بار موقعہ دیتا ہے کہ اب بھی سنبھل جاؤ مگر آدمی کی آنکھیں نہیں کھلتیں۔ جس دن اسے غصّہ آئے گا یہ دُنیا جہنّم میں چلی جائے گی۔ ہمارے تمھارے اوپر وہ کیا غصّہ کرے گا۔ ہم چیونٹی کو پیروں تلے پڑتے دیکھ کر کنارے سے نکل جاتے ہیں، اسے کچلتے رحم آتا ہے۔ پھر جس اللہ نے ہم کو پیدا کیا۔ جو ہم کو پالتا ہے وہ ہمارے اوپر کبھی اپنا قہر نازل کرسکتا ہے۔ کبھی نہیں۔ غصّہ برابر والوں پر کیا جاتا ہے۔ ضعیفوں پر نہیں۔"

امر کو اپنے دل میں معرفت کا ایک نغمہ سا گونجتا ہوا معلوم ہوا، اتنے کامل یقین اور طفلانہ عقیدت کے ساتھ اس موضوع پر گفتگو کرتے اس نے کسی کو نہ سنا تھا۔ بات وہی تھی جو وہ ہمیشہ چھوٹے بڑوں کے منہ سے سُنا کرتا تھا۔ پر روحانی خلوص نے ان الفاظ میں ایک نئی جان ڈال دی تھی۔

ذرا دیر کے بعد کالے خاں نے پھر کہا۔"بھیّا تم سے چکّی چلوانا ویسا ہی ہے جیسے کوئی تلوار سے چڑیا کو حلال کرے۔ تمھیں اسپتال میں رکھنا چاہیے تھا جہاں تم مریضوں کو تشفی دیتے۔ بیماری میں دوا سے اتنا فائدہ نہیں ہوتا جتنا ہمدردی سے ہوتا ہے۔ میرے سامنے کتنے ہی قیدی بیمار ہوکر وہاں گئے، پر ایک بھی اچھا نہ ہوا؟ بات کیا ہے؟ دوا قیدی کے سر پر پٹک دی جاتی ہے جیسے کتّے کے سامنے ہڈّی کا ٹکڑا پھینک دیا جائے۔ مریض دوا کھاکر اچھا ہونے سے مرجانا بہتر سمجھتا ہے۔ میں آج سپرنٹنڈنٹ سے کہوں گا کہ انھیں اسپتال میں رکھیے۔ اگر وہ کہیں گے کہ تمھیں پورا آٹا دینا پڑے گا تو میں منظور کرلوں گا۔ اتنا آٹا تو میں بائیں ہاتھ سے پیس سکتا ہوں۔ بھیّا سچ کہتا ہوں۔"

وہی اچھّا جسے امرکانت نے ایک دن سیہ کاریوں کی کیچڑ میں لوٹتے دیکھا تھا آج تقدس کے رُتبے پر پہنچ گیا تھا۔ اس کی روح سے گویا ایک بجلی نکل کر امر کے باطن کو روشن کرنے لگی۔

اس نے کہا۔ "لیکن یہ تو بُرا معلوم ہوتا ہے کہ تم بوڑھے ہوکر محنت سے کام کرو اور میں جوان ہوکر اسپتال میں بیٹھوں۔"

کالے خاں ہنسا۔ "اسپتال کا کام تم آسان سمجھتے ہو؟ وہ اس چکّی سے کہیں جان لیوا ہے۔ میں راتوں کو مزے سے ٹانگ پھیلا کر سوؤں گا۔ تمھیں جاگ کر راتیں کاٹنی پڑیں گی۔ پتّے کو اتنا مارنا پڑے گا کہ کوئی اللہ کا بندہ ہی مار سکتا ہے۔ میں تو کسی مریض کی تیمارداری کرنے کے لائق ہی نہیں ہوں، جہاں اس نے دو ایک بار میری بات نہ مانی اور میں بگڑا۔ پھر اسپتال میں کبھی کبھی جان کا خطرہ بھی ہوجاتا ہے۔ اس چکّی میں کیا رکھا ہے۔ یہ کام تو گدھا بھی کرسکتا ہے، کل بھی کرسکتی ہے۔ لیکن تم جو کام کروگے وہ فرشتے ہی کرسکتے ہیں۔"

سورج ڈوب رہا تھا۔ کالے خاں نے اپنے پورے گیہوں پیس ڈالے تھے۔ اور دوسرے قیدیوں کے پاس جاجاکر دیکھ رہا تھا کس کا کتنا کام باقی ہے۔ کئی قیدیوں کے گیہوں ابھی ختم نہ ہوئے تھے۔ جیل کا ملازم آٹا تولنے آرہا ہوگا۔ ان بے چاروں پر آفت آجائے گی۔ مار پڑنے لگے گی۔ کالے خاں نے قیدیوں کی مدد کرنی شروع کی۔ اس کی محنت اور پھرتی پر لوگوں کو حیرت ہو رہی تھی۔ آدھ گھنٹے میں اس نے سارے پھسڈیوں کی کمی پوری کردی۔ امرکانت اپنی چکّی کے پاس کھڑا خدمت کے اس پُتلے کو عقیدت مندانہ نظروں سے دیکھ رہا تھا گویا کسی دیوتا کے درشن کر رہا ہو۔

کالے خاں ادھر سے فرصت پاکر نماز پڑھنے لگا۔ وہیں کل کے نیچے اس نے وضو کیا۔ اور چھپّر کے نیچے کمبل بچھا کر نماز شروع کی۔ اسی وقت نائب داروغہ چار وارڈروں کے ساتھ آٹا تلوانے آپہنچا۔ قیدیوں نے اپنا اپنا آٹا بوریوں میں بھرا اور ترازو کے پاس لاکر تلوانے لگے۔

نائب نے امر سے پوچھا۔ "تمھارا جوڑیدار کہاں گیا؟"

امر نے بتلایا نماز پڑھ رہا ہے۔

"اسے بلاؤ، پہلے آٹا تلوا لے، پھر نماز پڑھے۔ بڑا نمازی کی دُم بنا ہے کہاں گیا ہے نماز پڑھنے؟"

امر نے شیڈ کے پیچھے کی طرف اشارہ کرکے کہا۔"آپ انھیں نماز پڑھنے دیں۔ میں تو آٹا تلوانے کے لیے حاضر ہوں۔"

نائب جیلر کو یہ کب گوارا ہوسکتا تھا کہ کوئی قیدی اس وقت نماز پڑھے۔ جب جیل کا خدا وارد ہوا ہو۔ شیڈ کے پیچھے جاکر۔ بولے "ابے او نمازی کے بچے۔ آٹا کیوں نہیں تلواتا۔ بچّا گیہوں چبا گئے ہو تو نماز کا بہانہ کرنے لگے۔ چل جھٹ پٹ ورنہ مارے ہنٹروں کے کھال ادھیڑ دوں گا۔"

کالے خاں دوسری ہی دنیا میں تھا۔

نائب نے قریب جاکر اپنی چھڑی اس کی پیٹھ میں کھونچتے ہوئے کہا۔"بہرا ہوگیا ہے کیا بے، شامت تو نہیں آئی ہے۔"

کالے خاں نماز پڑھنے میں محو تھا۔ پیچھے پھر کر بھی نہ دیکھا۔

نائب نے جھلاّ کر لات جمائی۔ کالے خاں سجدے کے لیے، جُھکا ہوا تھا۔ لات کھا کر اوندھے منہ گر پڑا۔ مگر فوراً سنبھل کر پھر سجدے میں جُھک گیا۔ نائب کو اب ضد پڑگئی کہ نماز بند کرکے چھوڑوں گا۔ شاید کالے خاں کو بھی ضد پڑگئی کہ نماز ختم کرکے ہی اٹھوں گا وہ تو سجدے میں تھا نائب صاحب نے اسے بوٹ دار ٹھوکریں جمانی شروع کیں۔ ایک وارڈر نے لپک کر گارڈ کے سپاہی بلا لیے۔ دوسرا نائب صاحب کی کمک کو دوڑا کالے خاں پر ایک طرف سے ٹھوکریں پڑ رہی تھیں دوسری طرف لکڑیاں۔ پر وہ سجدے سے سر نہ اُٹھاتا تھا۔ ہاں ہر ایک وار پر اس کے منہ سے اللہ اکبر کی دل ہلانے دینے والی صدا نکل جاتی تھی۔ ادھر ان جلاّدوں کی آتشِ غضب بھی تیز ہوتی جاتی تھی۔ جیل کا قیدی جیل کے خدا کو سجدہ نہ کرکے اپنے خدا کو سجدہ کرے۔ اس سے زیادہ نائب صاحب کی اور کیا توہین ہوسکتی تھی۔ کالے خاں پر اتنی ضربیں پڑیں کہ اس کے خون بہنے لگا۔ امرکانت اس کی حمایت کرنے دوڑا کہ ایک وارڈر نے اسے زور سے دھکا دے کر پیچھے ہٹا دیا۔ ادھر برابر چوٹیں پڑتی جاتی تھیں۔ اور کالے خاں برابر اللہ اکبر کے نعرے لگائے جاتا تھا۔ آخر وہ صدا نحیف ہوتے ہوتے بالکل بند ہوگئی۔ اور کالے خاں بے حس و حرکت ہوگیا۔ مگر چاہے کسی کے

کانوں میں اس کی آواز نہ جاتی ہو اس کے ہونٹ اب بھی ہل رہے تھے اور اللہ اکبر کی غیر مسموع صدا اب بھی نکل رہی تھی۔

نائب نے خفیف ہو کر کہا۔"پڑا رہنے دو بدمعاش کو یہیں۔ کل سے اسے کھڑی بیڑی دوں گا اور تنہائی بھی۔ اگر تب بھی سیدھا نہ ہوا تو اُلٹی دی جائے گی۔ اس کا نمازی پن نکال نہ دوں تو نام نہیں۔"

ایک لمحے میں نائب، وارڈر اور سپاہی سب چلے گئے۔ قیدیوں کے کھانے کا وقت آگیا تھا۔ سب کے سب کھانے پر جا بیٹھے۔ مگر کالے خاں ابھی اوندھا پڑا ہوا تھا۔ سر اور ناک کان سے خون جاری تھا۔ امرکانت بیٹھا اس کے زخموں کو پانی سے دھو رہا تھا اور خون بند کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ روحانی قوت کے اس بعید از قیاس جلوے نے اس کی مادیت کو مغلوب کردیا تھا۔ ایسی حالت میں کیا وہ بھی اسی طرح ثابت و ساکن رہ سکتا تھا۔ شاید پہلے ہی وار میں یا تو اس نے مدافعت کی ہوتی، یا نماز چھوڑ کر الگ ہو جاتا۔

قیدی کھانا کھا کر لوٹے۔ کالے خاں ابھی وہیں پڑا ہوا تھا۔ سبھوں نے اسے اُٹھا کر بارک میں پہنچایا اور ڈاکٹر کو اطلاع دی۔ مگر ڈاکٹر صاحب نے رات کو اپنی نیند میں خلل ڈالنا آئینِ صحت کے خلاف سمجھا۔ وہاں اور کیا دوا مل سکتی تھی۔ گرم پانی بھی نہ میسّر ہو سکا۔

اس بارک کے قیدیوں نے ساری رات بیٹھ کر کاٹی۔ کئی آدمی اس بات پر آمادہ تھے کہ صبح ہوتے ہی نائب صاحب کی مرمت کی جائے یہی تو ہوگا کہ سال دو سال کی میعاد اور بڑھ جائے گی۔ کیا غم، امرکانت بہت ہی سلامت پسند آدمی تھا۔ مگر اس وقت وہ بھی ان ہی لوگوں میں ملا ہوا تھا۔ رات بھر اس کے اندر حیوان اور انسان میں زور آزمائیاں ہوتی رہیں۔ وہ جانتا تھا کہ آگ آگ سے نہیں بلکہ پانی سے فرو ہوتی ہے۔ تنہا ہوتا تو شاید اب بھی اسے اشتعال نہ ہوتا۔ لیکن اس اجتماعی ہیجان نے اسے ڈگا دیا۔ مجمع کے ساتھ ہم کتنے ہی ایسے اچھے یا برے کام کرجاتے ہیں جو تنہا نہ کرسکتے اور کالے خاں کی حالت جتنی نازک ہوتی جاتی تھی اتنا ہی انتقام کا جذبہ اور بھی بے تاب ہوجاتا تھا۔

ایک ڈاکے کے قیدی نے کہا۔"خون پی جاؤں گا۔ یہی تو ہوگا کہ پھانسی ہوجائے گی۔ پھانسی تو ایک دن ہونی ہی ہے۔"

امرکانت نے افسوس ناک لہجے میں کہا۔"اس وقت کیا سمجھتے تھے کہ مار ہی ڈالے گا۔"

چپکے چپکے سازش کی گئی۔ قاتلوں کا انتخاب ہوا۔ طرزِ عمل کا فیصلہ کیا گیا اور صفائی کی دلیلیں بھی نکالی گئیں۔ یکایک ایک ٹھگنے قیدی نے کہا۔"تم لوگ سمجھتے ہو سویرے تک اسے پتہ نہ لگ جائے گا۔"

امر نے پوچھا۔"پتہ کیسے لگے گا یہاں ایسا کون ہے جو اسے خبر دے دے گا؟"

ٹھگنے قیدی نے دائیں بائیں نظر ڈال کر کہا۔"کھبر دینے والے نہ جانے کہاں سے نکل آتے ہیں بھیا۔ کسی کے ماتھے پر تو کچھ لکھا نہیں ہوتا۔ کون جانے ہمیں میں سے جاکر اِتّلا کردے۔ آئے دن تو لوگوں کو سرکاری گواہ بنتے دیکھتے ہو۔ وہی لوگ جو سرگنہ ہوتے ہیں۔ بکھت پر سرکاری گواہ بن جاتے ہیں۔ اگر کچھ کرنا ہی ہے تو ابھی کرڈالو۔ دن کو کوئی واردات کروگے سب کے سب کالے پانی بھیج دیے جاؤگے۔"

امر نے اعتراض کیا۔"لیکن اس وقت وہ اپنے کوارٹر میں سو رہا ہوگا۔"

ٹھگنے قیدی نے جواب دیا۔"یہ ہمارا کام ہے۔ تم کیا جانو۔"

سرگوشیاں ہوئیں اور پانچ آدمی تیار ہوگئے۔

ٹھگنے قیدی نے کہا۔"ہم میں جو چھوٹے اسے گئوہتیا۔"

یہ کہہ کر اس نے ہائے ہائے کی چیخ مارنی شروع کی۔ اور بھی کوئی آدمی شور مچانے لگے گویا آپس میں فساد ہوگیا ہو۔

ایک وارڈر نے آکر پوچھا۔"کیوں شور مچاتے ہو تم سب؟ کیا بات ہے؟ ان سسروں کے مارے رات بھر سونا نصیب نہیں ہوتا۔"

ٹھگنے قیدی نے کہا۔"بات کیا ہے۔ کالے خاں اب تب ہو رہے ہیں جاکر نائب صاحب کو بلا لاؤ جھٹ پٹ۔"

وارڈر بولا۔"واہ بے! کیسا حکم لگاتا ہے، جیسے نائب صاحب تیرے باپ کے نوکر ہی تو ہیں۔ بڑا نواب کا بچّہ بنا ہے۔"

"ہم کہتے ہیں جاکر انھیں بھیج دو۔ کچھ بیان سیان لکھنا ہو تو لکھ لیں۔"

کالے خاں نے آنکھیں کھولیں اور ضعیف آواز میں بولا۔"کیوں چلّاتے ہو یارو، میں

ابھی مرا نہیں ہوں۔ جیسے پیٹھ کی ہڈی میں چوٹ ہے۔"

ٹھگنے قیدی نے قریب آکر آہستہ سے کہا۔"اسی کا بدلہ چکانے کی تیاری ہے پٹھان۔"

کالے خاں کی لاش میں گویا جان آگئی۔ جاں کنی کی آواز میں بولا۔"کس سے بدلہ چکاؤ گے بھائی۔ اللہ سے، اللہ کی یہی مرضی ہے تو اس میں دوسرا کون دخل دے سکتا ہے؟ اس کے حکم کے بغیر کہیں ایک پتی بھی ہل سکتی ہے۔ ذرا مجھے پانی پلا دو اور جب میں مر جاؤں تو یہاں جتنے بھائی ہیں سب میری نجات کے لیے خدا سے دعا کرنا۔ دنیا میں اور میرا کون ہے۔"

امر نے اُسے گود میں لے کر پانی پلانا چاہا۔ مگر گھونٹ حلق کے نیچے نہ اُترا۔ وہ زور سے کراہ کر پھر لیٹ گیا۔

ٹھگنے قیدی نے دانت پیس کر کہا۔"ایسے جالم کی گردن تو اُلٹی چھُری سے کاٹنی چاہیے۔"

کالے خاں ملامت آمیز لہجے میں بولا۔"کیوں میری نجات کا دروازہ بند کرتے ہو بھائی۔ دنیا تو بگڑ گئی۔ کیا عاقبت بھی بگاڑنا چاہتے ہو؟ اللہ سے دعا کرو، سب پر رحم کرے۔ زندگی میں کیا کم گناہ کیے ہیں کہ مرنے کے بعد پاؤں میں بیڑیاں پڑی رہیں۔ یا خدا رحم کرے!"

ان الفاظ میں گویا مرنے والے کی روح پاک جلوہ پذیر ہوگئی تھی۔ باتیں وہی تھیں جو ہم روز سنتے ہیں۔ لیکن ان میں اس وقت کچھ ایسی تاثیر، کچھ ایسا معجزہ تھا کہ سبھی سر بہ زانو ہوگئے۔ اس چٹکی بھر راکھ نے جیسے خلط فاسد کی اصلاح کردی۔

طلوعِ سحر کے وقت جب کالے خاں کی شمعِ حیات بُجھی تو ایسا کوئی قیدی نہ تھا جس کی آنکھوں سے آنسو نہ نکل رہے ہوں۔ لیکن اور لوگ غم سے رو رہے تھے امر کانت روحانی مسرت سے رو رہا تھا۔ اوروں کو ایک عزیز دوست کی جدائی کا صدمہ تھا۔ امر کانت کو ایسا معلوم ہو رہا تھا وہ اس سے قریب تر ہوگیا ہے۔ اپنی زندگی میں اسے یہی ایک ایسا پاک نفس انسان ملا تھا۔ جس کے سامنے اس کا غرور عقیدت سے جھک جاتا۔

اس روشنی کے مینار نے آج اس کی کشتی کا رُخ پلٹ دیا۔ جہاں شک کی جگہ اور باطل کی جگہ حق کی آواز سنائی دیتی تھی۔

(۷)

لالہ سمرکانت کے چلے جانے کے بعد سلیم نے ایک موضع کا دورہ کرکے آسامیوں کی حقیقی حالت کی تحقیقات شروع کی۔ اب اُسے معلوم ہوا کہ ان کی حالت اس سے کہیں ابتر ہے۔ جتنا وہ سمجھے ہوئے تھا۔ پیداوار کی قیمت، لاگت اور لگان سے بھی کم تھی۔ کھانے کپڑے کی بھی گنجائش نہ تھی۔ دوسرے مصارف کا ذِکر ہی کیا۔ ایسا شاذ ہی کوئی کسان تھا جس کا سر قرض کے بوجھ سے نہ دبا ہوا ہو۔ کالج میں اس نے مالیات کا مطالعہ کیا تھا اور جانتا تھا کہ یہاں کے مزارعین کی حالت بہت افسوس ناک ہے۔ اب اس پر روشن ہوا کہ کتابی علم اور واقعاتی صورت میں اتنا ہی فرق ہے جتنا انسان اور اس کی شبیہہ میں جوں جوں اس پر اصلیت کھلتی جاتی تھی کسانوں سے اس کی ہمدردی بڑھتی جاتی تھی۔ کتنا ظلم ہے کہ جو بے چارے روٹیوں کے محتاج ہوں۔ جن کے پاس تن ڈھانکنے کو چیتھڑے بھی نہ ہوں۔ جو بیماری میں ایک پیسے کی دوا نہ خرید سکتے ہوں۔ جن کے گھروں میں چراغ بھی نہ جلتے ہوں ان سے پورا لگان وصول کیا جائے۔ جب زراعتی پیداواریں گراں تھی لشٹم پشٹم ایک وقت روکھا سوکھا کھانا مل جاتا تھا۔ اس سردبازاری میں تو ان کی حالت ناقابل بیان ہوگئی ہے۔ جن کے لڑکے پانچ چھ سال کی عمر سے ہی محنت مزدوری کرنے لگیں، جو ایندھن کے لے چراگاہوں میں گوبر بٹورتے پھرتے ہوں ان سے پورا مطالبہ وصول کرنا گویا ان کے منہ سے روٹی کا ٹکڑا چھین لینا، ان کے تنِ خشک سے خون چوسنا ہے۔

اصلی حالت کا علم ہوتے ہی سلیم نے اپنے طرزِ عمل کا فیصلہ کرلیا۔ اس نے کئی دن تک یکسو ہوکر مفصل رپورٹ لکھی اور مسٹر غزنوی کے پاس بھیج دی۔ مسٹر غزنوی نے فوراً لکھا کہ آکر مجھ سے مل جاؤ۔ سلیم ان سے ملنا نہ چاہتا تھا۔ ڈرتا تھا کہیں وہ میری رپورٹ کو دبا رکھنے کی تجویز نہ کریں۔ لیکن پھر سوچا چلنے میں ہرج ہی کیا ہے۔ اگر وہ مجھے قائل کردیں تب تو کوئی بات ہی نہیں لیکن حکام کی ناراضگی کے خوف سے میں اپنی رپورٹ کو ہرگز داخلِ دفتر نہ ہونے دوں گا۔

اسی دن شام کو وہ صدر جا پہنچا۔

مسٹر غزنوی نے تپاک سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔"مسٹر امرکانت کے ساتھ تم نے دوستی کا خوب حق ادا کیا۔ وہ خود شاید اتنی مفصل رپورٹ نہ لکھ سکتے لیکن کیا تم سمجھتے

ہو، سرکار کو ان حالات کا علم نہیں ہے؟"

سلیم نے جواب دیا۔"میرا تو ایسا ہی خیال ہے، سرکار کو جو رپورٹیں ملتی ہیں وہ حکام پرست اہلکاروں سے ملتی ہیں۔ جو رعایا کا خون کرکے بھی اظہارِ حق سے گریز کرتے ہیں۔ میری رپورٹ واقعات پر مبنی ہے۔"

دونوں افسروں میں بحث ہونے لگی۔ مسٹر غزنوی کی دلیل تھی۔ ہمارا فرض صرف احکام کی تعمیل ہے۔ سرکار نے لگان وصول کرنے کا حکم دیا، ہمیں وصول کرنا چاہیے۔ رعایا کو تکلیف ہوتی ہے تو ہو۔ ہمیں اس سے غرض نہیں ہمیں خود اپنی آمدنی کا ٹیکس ادا کرنے میں روحانی تکلیف ہوتی۔ لیکن مجبور ہوکر دیتے ہیں کوئی آدمی خوشی سے ٹیکس نہیں دیتا۔ مسٹر غزنوی اس حکم کی مخالفت کرنا اخلاق کی بناء پر نہیں، فرض کی بناء پر بھی قابل تعزیر سمجھتے تھے۔ اور محض ضابطے کی پابندی ان کے اطمینان کے لیے کافی نہ تھی۔ وہ دل سے اس حکم کی تعمیل کرنا چاہتے تھے۔

سلیم کہتا تھا۔"ہم نے سرکار کی ملازمت محض اس لیے کی ہے کہ اس کے ذریعے رعایا کی کچھ خدمت کرسکیں۔ ان کی حالت میں اصلاح کرسکیں۔ اگر سرکار کی کسی تجویز سے اس مقصد کے، پورا ہونے میں رکاوٹ پڑتی ہو تو ہمیں اس کی تعمیل سے انکار کردینا چاہیے۔"

غزنوی نے منہ لمبا کرکے کہا۔"مجھے خوف ہے کہ گورنمنٹ یہاں سے تمھارا تبادلہ کردے گی۔"

"تبادلے کی مجھے فکر نہیں۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ اصلی حالت اس پر روشن ہوجائے۔"

غزنوی نے سرکار کی وکالت کی۔"آپ گورنمنٹ کی دقتوں کا مطلق اندازہ نہیں کر رہے ہیں۔ اگر وہ اتنی آسانیاں دینے لگے تو آپ قیاس کرسکتے ہیں۔ رعایا کتنی شیر ہوجائے گی، ذرا ذرا سی بات پر طوفان کھڑے ہوجائیں گے اور یہ مطالبہ محض اس علاقے کا نہیں، سارے ملک میں اس قسم کی شورش جاری ہے۔ آپ بتا سکتے ہیں۔ سرکار کے پاس اس کمی کو پورا کرنے کے لیے اور کیا ذرائع ہیں؟"

سلیم نے جواب دیا۔"میرا دعویٰ تو یہ ہے کہ سرکار رعایا کے لیے ہے، رعایا سرکار

کے لیے نہیں۔ کاشتکاروں پر ظلم کرکے، انھیں بھوکوں مار کر اگر گورنمنٹ زندہ رہنا چاہتی ہے تو کم سے کم میں اس سے الگ ہوجاؤں گا۔ اگر مالیات میں کمی کا اندیشہ ہے تو سرکار کو اپنے مصارف کم کرنے چاہیے، نہ کہ رعایا پر سختیاں کی جائیں۔ میں جانتا ہوں میری علاحدگی کا سرکار پر کوئی اثر نہ پڑے گا۔ لیکن میرے ضمیر کو اطمینان ہوجائے گا۔"

غزنوی نے بہت کچھ اونچ نیچ سمجھائی۔ لیکن سلیم پر کوی اثر نہیں ہوا وہ ڈنڈوں سے لگان وصول کرنے کے لیے اپنے ضمیر کو کسی طرح مجبور نہ کرسکتا تھا۔ آخر غزنوی نے لاچار ہوکر اس کی رپورٹ اوپر بھیج دی۔ اور ایک ہی ہفتے کے اندر گورنمنٹ نے اسے علاحدہ کردیا۔ ایسے خطرناک آدمی پر وہ کیسے اعتبار کرتی۔

جس دن اس نے نئے افسر کو چارج دیا۔ اور علاقے سے رخصت ہونے لگا۔ اس کے قیام گاہ پر مردوں عورتوں کا ایک میلا لگ گیا۔ سب اس سے منتیں کرنے لگے ہمیں اس حالت میں چھوڑ کر آپ نہ جائیے۔ سلیم کی خواہش بھی یہی تھی۔ حافظ جی کے خوف سے وہ گھر نہ جاسکتا تھا۔ اس کے علاوہ اِن بیکسوں سے اسے کچھ ہمدردی ہوگئی تھی۔ کچھ تو اس کی ہمدردی اور کچھ اپنی ذلت کے احساس نے اسے عوام کا رہبر بنایا۔ وہی شخص جو کچھ دن پہلے افسری کے نشے سے مخمور آیا تھا عوام کا خادم بن بیٹھا۔ مظلوم ہونا ظالم ہونے سے کہیں زیادہ فخر کی بات تھی۔

تحریک کی لگام سلیم کے ہاتھوں میں آتے ہی لوگوں کے حوصلے بندھ گئے۔ جیسے پہلے امرکانت آتمانند کے ساتھ گاؤں گاؤں دوڑا کرتا تھا۔ اسی طرح سلیم دوڑنے لگا۔ وہ سلیم جس کے خون کے لوگ پیاسے ہو رہے تھے اب علاقے کا شاہ بے تاج ہے۔

شام ہوگئی تھی، سلیم اور آتمانند دن بھر کی دوادوش کے بعد لوٹے تھے کہ یکایک نئے بنگالی سویلین مسٹر گھوش نے پولیس اہلکاروں کے ساتھ آکر گاؤں بھر کے مویشیوں کو قرق کرنے کا حکم جاری کردیا۔ کچھ قصاب پہلے ہی بلا لیے گئے تھے۔ سستا سودا خریدنا کون نہیں چاہتا۔ دم کے دم میں کانسٹبلوں نے مویشیوں کو کھول کھال کر مدرسے کے دروازے پر جمع کردیا۔ گوڈر، بھولا، رگھو چودھری سب ہی گرفتار ہوچکے تھے۔ فصل کی قرقی پہلے ہی ہوچکی تھی مگر ابھی فصل میں کیا رکھا تھا۔ اس لیے اب حکام نے مویشیوں کو قرق کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ انھیں یقین تھا کسان مویشیوں کی قربانی سے مرعوب ہوجائیں گے۔ اور چاہے

انھیں قرضہ لینا پڑے، یا عورتوں کے گہنے بیچنے پڑیں۔ وہ جانوروں کو بچانے کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہوجائیں گے۔ جانور ہی تو کسان کے داہنے ہاتھ ہیں۔

کسانوں نے یہ اعلان سُنا تو چھکے چھوٹ گئے۔ سمجھے بیٹھے تھے کہ سرکار اور چاہے جو کچھ کرے مویشیوں سے نہ بولے گی۔ کیا وہ کسانوں کی جڑ کھود کر پھینک دینا چاہتی ہے۔ دراصل انھیں اس کا یقین نہ آتا تھا۔ یہ اعلان سن کر وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ محض دھمکی ہے۔ لیکن جب مویشی مدرسے کے سامنے جمع کردیے گئے اور قصابوں نے ان کی دیکھ بھال شروع کردی تو ان پر جیسے بجلی ٹوٹ پڑی۔

چراغ جلتے جلتے مویشیوں کا بازار لگ گیا۔ حکام نے فیصلہ کیا کہ ساری رقم یکجا وصول کرلیں۔ گاؤں کے لوگ آپس میں لڑبھڑ کر اپنے اپنے حصے کا فیصلہ کرلیں گے۔ حکام کو اس کی کوئی فکر نہیں۔"

سلیم نے آکر مسٹر گھوش سے کہا۔"آپ کو معلوم ہے۔ مویشیوں کے قرق کرنے کا مجاز آپ کو نہیں ہے؟"

مسٹر گھوش نے بے اعتنائی سے جواب دیا۔"یہ قانون ایسے موقعوں کے لیے نہیں ہے۔ خاص ضرورتوں پر خاص قانون کا برتاؤ کیا جاتا ہے امن اور بدامنی کے قوانین یکساں نہیں ہوسکتے۔"

ابھی سلیم نے کوئی جواب نہ دیا تھا کہ معلوم ہوا اہیروں کے محال میں لاٹھی چل گئی۔ کاشی، پیاگ، آتمانند سب اس طرف دوڑے۔ مسٹر گھوش بھی ادھر چلے۔ سپاہیوں نے بھی سنگینیں چڑھالیں اور موقعے پر جا پہنچے۔ صرف سلیم یہاں کھڑا رہا۔ جب میدان خالی ہوگیا تو اس نے قصابوں کے سرغنہ کے پاس جاکر السلام علیک کہا اور بولا۔"کیوں بھائی صاحب آپ کو معلوم ہے آپ لوگ ان مویشیوں کو خرید کر یہاں کی مظلوم رعایا کے ساتھ کتنی بڑی بے انصافی کر رہے ہیں۔"

سرغنہ کا نام تیغ محمد تھا۔ ناٹے قد کا گٹھیلا آدمی تھا۔ پورا پہلوان۔ ڈھیلا کُرتا، چارخانے کی تہمد، گلے میں چاندی کا تعویذ، ہاتھ میں موٹا سونٹا۔ ملائمت سے بولا۔"صاحب ہم تو مال خریدنے آئے ہیں۔ ہمیں اس سے کیا مطلب مال کس کا ہے اور کیسا ہے۔ چار پیسے کی نکاسی جہاں ہوتی ہے وہاں آدمی جاتا ہے۔"

"لیکن یہ تو سوچیے مویشیوں کی قرقی کس سبب سے ہو رہی ہے رعایا کے ساتھ آپ کو ہمدردی ہونا چاہیے۔"

تیغ محمد پر کوئی اثر نہ ہوا، بولا۔"سرکار سے جس کی لڑائی ہوگی اس کی ہوگی۔ ہماری کوئی لڑائی نہیں ہے۔"

"تم مسلمان ہوکر ایسی باتیں کرتے ہو۔ اس کا مجھے افسوس ہے۔ اسلام نے ہمیشہ مظلوموں کی مدد کی ہے اور تم مظلوموں کی گردن پر چُھری پھیر رہے ہو۔"

"جب سرکار ہماری پرورش کر رہی ہے تو ہم اس کی بدخواہی نہیں کرسکتے۔"

"اگر سرکار تمھاری جائداد چھین کر کسی دوسرے کو دے دے تو تمھیں بُرا لگے گا یا نہیں۔"

"سرکار سے لڑنا ہمارے مذہب کے خلاف ہے۔"

"یہ کیوں نہیں کہتے کہ تم میں غیرت نہیں ہے۔"

"آپ تو مسلمان ہیں، کیا آپ کا فرض نہیں کہ آپ سرکار کی مدد کریں۔ آپ اہل کتاب کے مقابلے میں کافروں کی مدد کر رہے ہیں۔ یہ اچھی بات ہے؟"

"اگر مسلمان ہونے کا یہی مطلب ہے کہ غریبوں کا خون کیا جائے تو میں کافر ہوں۔"

تیغ محمد پڑھا لکھا نہ تھا۔ بحث کرنے کو تیار ہوگیا۔ سلیم نے اس کی کٹھ حجتی کی ہنسی اُڑانے کی کوشش کی۔ مذہب کو وہ دنیا کا کلنک سمجھتا تھا۔ جس نے انسان کو مختلف گروہوں میں بانٹ کر ایک دوسرے کا دُشمن بنا دیا۔ زر، زمین، زن نے پہلے ہی دنیا کو خون میں ڈبو رکھا تھا۔ مذہب بھی اس تگڈم کی کمک پر آپہنچا اور اس میدان میں سب سے بازی لے گیا۔ ایسے مذہب پر سلیم کو مطلق اعتقاد نہ تھا۔ تیغ محمد روزہ نماز کا پابند، دین دار مسلمان تھا۔ مذہب کی یہ توہین کیوں کر برداشت کرتا۔ ادھر تو اہیرانے میں اہیروں اور پولیس میں لاٹھیاں چل رہی تھیں اِدھر ان دونوں میں ہاتھا پائی کی نوبت آگئی۔ تیغ محمد پہلوان تھا۔ سلیم بھی ٹھوکر چلانے اور گھونسے بازی میں منجھا ہوا، پھرتیلا، چُست۔ پہلوان اسے اپنی گرفت میں لاکر دبوچ بیٹھنا چاہتا تھا۔ سلیم اچھل کود کر ٹھوکریں جماتا تھا۔ اور اس کی گرفت سے بچ کر نکل جاتا تھا۔ تابڑ توڑ ٹھوکریں پڑیں تو پہلوان نے زمین بوسی شروع کی اور مغلظات بکنے

لگا۔ اس کے دونوں ساتھیوں نے پہلے دور ہی سے تماشا دیکھنا مناسب سمجھا تھا۔ تیغ محمد کی فتح ان کے خیال میں یقینی تھی۔ لیکن جب تیغ محمد گر پڑا تو دونوں کمر کس کر پل پڑے۔ یہ دونوں ابھی جوان پٹھے تھے۔ تیزی اور چستی میں سلیم کے برابر۔ سلیم پیچھے ہٹتا جاتا تھا اور یہ دونوں اسے رگیدتے جاتے تھے۔ اسی وقت سلونی لاٹھی ٹیکتی ہوئی اپنی گائے کو تلاش کرنے آ رہی تھی۔ پولیس اس کی غیر حاضری میں گائے اس کے دروازے سے کھول لائی تھی۔ یہاں یہ جنگ دیکھ کر اس نے آنچل اُتار کر کمر سے باندھا اور لاٹھی سنبھال کر پیچھے سے دونوں قصابوں کو پیٹنے لگی۔ ان میں سے ایک نے پیچھے پھر کر بُڑھیا کو اتنے زور سے دھکا دیا کہ وہ تین چار ہاتھ پر جا گری۔ اتنے میں سلیم نے گھات پاکر اپنے مقابل کو ایسا گھونسا دیا کہ اس کی ناک سے خون جاری ہوگیا۔ اور وہ سر پکڑ کر وہیں بیٹھ گیا۔ اب صرف ایک حریف اور رہ گیا تھا اس نے تنہا سلیم کا مقابلہ کرنا مصلحت کے خلاف سمجھا اور پولیس سے فریاد کرنے بھاگا۔ تیغ محمد کے دونوں گھٹنے بے کار ہوگئے تھے۔ اُٹھ نہ سکتا تھا۔ سلیم نے موقعہ دیکھ کر مویشیوں کی رسیاں کھول دیں اور تالیا بجابجا کر انھیں بھڑکا دیا۔ بے چارے جانور سہمے کھڑے تھے۔ آنے والی مصیبت کا انھیں کچھ کچھ الہام ہو رہا تھا۔ رسی کھلتے ہی سب کے سب دُمیں اُٹھا اُٹھا کر بھاگے اور پہاڑیوں کی طرف نکل گئے۔

اسی وقت آتمانند بدحواس دوڑے ہوئے آئے اور بولے۔ ''آپ ذرا اپنا ریوالور تو مجھے دے دیجیے۔''

سلیم نے ہکا بکا ہوکر پوچھا۔ ''کیا ماجرا ہے کچھ کہو تو۔''

''پولیس نے کئی آدمیوں کو مار ڈالا۔ اب نہیں رہا جاتا۔ میں مسٹر گھوش کو مزا چکھا دینا چاہتا ہوں۔''

''آپ کچھ بھنگ تو نہیں کھا گئے۔ بھلا یہ ریوالور چلانے کا موقع ہے۔''

''اگر یوں نہ دوگے تو میں چھین لوں گا۔ اس شیطان نے گولیاں چلا کر چار پانچ آدمیوں کی جان لی۔ دس بارہ آدمی بری طرح زخمی ہوگئے ہیں۔ کچھ انھیں بھی تو مزا چکھنا چاہیے۔ ہمیں تو مرنا ہی ہے۔''

''میرا ریوالور اس کام کے لیے نہیں ہے۔''

آتمانند بھی تندمزاج آدمی تھے۔ اس قتلِ عام نے انھیں اور بھی برانگیختہ کردیا۔

بولے۔ ”ظالم بے گناہوں کا خون بہائے چلا جا رہا ہے، اور تم کہتے ہو میرا ریوالور اس کام کے لیے نہیں آخر وہ اور کس کام کے لیے ہے؟ میں تمھارے پیروں پڑتا ہوں بھیا۔ ایک لمحے کے لیے دے دو۔ دل کی آرزو پوری کرلوں۔“

سلیم بغیر کچھ جواب دیے تیزی سے ابیرانے کی طرف چلا۔ راستے میں سب ہی دروازے بند تھے۔ کتے بھی کہیں بھاگ کر جا چھپے تھے۔

یکایک ایک مکان کا دروازہ جھونکے کے ساتھ کھلا اور ایک عورت سر کے بال کھولے پریشان، کپڑے خون سے تر، خوف زدہ ہرنی سی آکر اس کے پیروں سے چمٹ گئی اور سہمی آنکھوں سے دروازے کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔ ”مالک سپاہی لوگ مجھے مارے ڈالتے ہیں۔“

سلیم نے تسلی دی۔ ”گھبراؤ نہیں، گھبراؤ نہیں، ماجرا کیا ہے؟“

عورت نے ڈرتے ڈرتے بتایا کہ ”گھر میں کئی سپاہی گھس گئے ہیں۔“ اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکی۔

”گھر میں کوئی آدمی نہیں ہے؟“ سلیم نے پوچھا۔

”وہ تو بھینسیں چرانے گئے ہیں۔“

”تمھیں کہاں چوٹ آئی ہے؟“

”مجھے چوٹ نہیں آئی۔ میں نے دو آدمیوں کو مارا ہے۔“

اسی وقت دو کانسٹبل بندوقیں لیے گھر سے نکل آئے اور حسینہ کو سلیم کے پاس کھڑا دیکھ کر اس کے بال پکڑ لیے اور اسے دروازے کی طرف کھینچ لے جانے کی کوشش کرنے لگے۔

سلیم نے راستہ روک کر کہا۔ ”چھوڑ دو اس کے بال، ورنہ اچھا نہ ہوگا۔ میں تم دونوں کو بھون کر رکھ دوں گا۔“

یکایک کانسٹبل نے غضب ناک ہوکر کہا۔ ”چھوڑ کیسے دیں۔ اسے لے جائیں گے صاحب کے پاس۔ اس نے ہمارے دو آدمیوں کو گنڈاسے سے زخمی کردیا، دونوں تڑپ رہے ہیں۔“

”تم اس کے گھر میں کیوں آگئے تھے؟“

"گئے تھے مویشیوں کو کھولنے، یہ گنڈاسا لے کر ٹوٹ پڑی۔"

حسینہ نے ٹوکا۔ "جھوٹ بولتے ہو، تم نے میری بانہہ نہیں پکڑی تھی؟"

سلیم نے سرخ آنکھوں سے سپاہی کو دیکھا اور دھکا دے کر کہا۔ "اس کے بال چھوڑ دو۔"

"ہم اسے صاحب کے پاس لے جائیں گے۔"

"ہرگز نہیں، تم اسے نہیں لے جاسکتے۔"

کانسٹبلوں نے سلیم کو تھوڑے دن پہلے ایک حاکم کی صورت میں دیکھا تھا۔ اس کی ماتحتی کر چکے تھے۔ اس کے رعب کا کچھ اثر ان کے دل پر باقی تھا۔ حسینہ کے ساتھ اور کسی قسم کی زیادتی کرنے کا انھیں حوصلہ نہ ہوا۔ جاکر مسٹر گھوش سے فریاد کی۔ مسٹر گھوش سلیم سے جلتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ سلیم ہی اس تحریک کی روح ہے اور اگر اسے کسی ترکیب سے زیر کردیا جائے تو یہ ہنگامہ آپ ہی آپ فرو ہوجائے گا۔ سپاہیوں کی فریاد سنتے ہی فوراً گھوڑا بڑھا کر سلیم کے پاس آپہنچے اور انگریزی زبان میں قانون بگھارنے لگے۔ سلیم کو بھی انگریزی بولنے کا بہت اچھا ملکہ تھا۔ دونوں میں پہلے قانونی مباحثہ ہوا۔ پھر مذہبی موتراشیوں کا نمبر آیا۔ اس سے اُتر کر دونوں فلسفیانہ استدلال کے میدان میں کود پڑے۔ یہاں تک کہ بالآخر ذاتیات پر حملوں کی بوچھار ہونے لگی۔ اس کے ایک ہی لمحے کے بعد قول نے عمل کی صورت اختیار کرلی۔ مسٹر گھوش نے پیش قدمی کی اور ہنٹر چلایا۔ جس نے سلیم کے چہرے پر ایک سرخی مائل، نیلی چوڑی ابھری ہوئی لکیر چھوڑ دی بالکل اپنی صورت سے ملتی ہوئی۔ آنکھیں بال بال بچ گئیں۔ سلیم بھی جامے سے باہر ہوگیا۔ مسٹر گھوش کی ٹانگ پکڑ کر زور سے کھینچ لیا۔ صاحب گھوڑے سے نیچے گر پڑے۔ سلیم ان کی چھاتی پر چڑھ بیٹھا اور ناک پر گھونسا مارا۔ گھوش بابو کو غش آگیا۔ کانسٹبلوں نے دوسرا گھونسا نہ پڑنے دیا۔ چار آدمیوں نے دوڑ کر انھیں سنبھالا اور ہوش میں لانے کی فکر کرنے لگے۔ سلیم پکڑ لیا گیا۔

اندھیرا ہوگیا تھا۔ سارے گاؤں پر ہیبت چھائی ہوئی تھی۔ لوگ فرطِ غم سے مفلوج، روحانی انتشار کے عالم میں۔ کانپتے ہوئے دل اور تھراتے ہوئے ہاتھوں سے مرنے والوں کی لاشیں اُٹھا رہے تھے۔ کسی کے منہ سے رونے کی آواز نہ نکلتی تھی۔ زخم تازہ تھا اس لیے

اس میں ٹیس نہ تھی۔ یہ خیال بھی تھا۔ رو کر اپنی شکست کا اعتراف کیوں کریں۔ اس شکست میں بھی انھیں اپنی فتح کا غرور تھا۔ شکست اور فتح دل کی کیفیتیں ہیں۔ ظاہری اسباب سے بے نیاز۔ بچّے بھی رونا بھول گئے تھے۔

مسٹر گھوش کو لوگ اُٹھا کر ڈاک بنگلے لے گئے۔ سلیم ایک سب انسپکٹر اور کئی کانسٹبلوں کے ساتھ صدر بھیجا گیا۔ وہ اہیرن بھی اسی لاری پر بھیجی گئی۔

پہر رات جاتے جاتے لاشیں ندی کی طرف چلیں۔ سلونی لاٹھی ٹیکتی ہوئی آگے آگے گاتی جاتی تھی۔

سیّاں مورا روٹھا جائے سکھی ری

(۸)

کالے خاں کی قربانی امرکانت کی زندگی کا شیرازہ بن گئی۔ اس میں ترتیب نہ تھی، ہمواری تھی۔ استحکام نہ تھا، نوری تغیرات کے جھونکے، اس کے ورقوں کو پریشان کرتے رہتے تھے۔ اس شیرازے نے اس میں توازن اور مطابقت پیدا کردی۔ کالے خاں کی یاد اسے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں بھولتی اور کسی غیبی طاقت کی طرح اسے تقویت اور اہمیت دیتی رہتی ہے وہ اس کی وصیت کو اس طرح پورا کرنا چاہتا ہے کہ اس کی روح کو جنّت میں سکون ملے۔ گھڑی رات رہے اُٹھ کر قیدیوں کا حال پوچھنا، مقررہ تاریخوں پر ان کے گھروں کو خط لکھنا۔ مریضوں کے لیے دوا دارو کا انتظام کرنا، ان کی شکایتیں سننا اور اہل کاروں سے مل کر انھیں دور کرانا۔ یہ سب اس کے فرائض میں داخل ہوگئے اور خدمت کو وہ اتنے انکسار اور اتنی ہمدردی سے ادا کرتا کہ اہل کاروں کو بھی اس پر شبہہ کی جگہ یقین ہوتا ہے۔ وہ قیدیوں کا محترم بھی ہے اور اہل کاروں کا معتمد بھی۔

اب تک وہ ایک طرح سے افادیت کا پجاری تھا۔ اسی اصول کو اضطراری طور پر ذہن میں رکھ کر وہ اپنے طرزِ عمل کا فیصلہ کرتا تھا۔ تلاشِ حقیقت کے لیے اس کی زندگی میں کوئی جگہ نہ تھی۔ ظاہر کی تہ میں جو اتھاہ گہرائی ہے اس کی نظروں میں التفات کے قابل نہ تھی۔ اس نے سمجھ رکھا تھا۔ وہاں صفر کے سوا اور کچھ نہیں۔ کالے خاں کی موت نے گویا بزور اس کا ہاتھ پکڑ کر اس گہرائی میں ڈُبا دیا۔ اور اس میں ڈوب کر اسے اپنی ساری زندگی کسی تنکے کی طرح سطح پر تیرتی ہوئی نظر آئی۔ کبھی لہروں کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتی

ہوئی، کبھی ہوا کے جھونکوں سے پیچھے ہٹتی ہوئی، اور کبھی بھنور میں پڑکر چکّر کھاتی ہوئی۔ اس کی خدمتوں میں بھی غرور تھا، انانیت تھی، کم ظرفی تھی۔ اسی کے زیر نظر اس نے سکھدا سے تغافل جتایا۔ اس گل اندام کی زندگی میں جو حقیقت تھی وہاں تک پہنچنے کی کوشش نہ کرکے اس سے کنارہ کش ہو بیٹھا۔ کوشش بھی کیا کرتا۔ اس کوشش کا اسے علم بھی نہ تھا۔ ظاہر نے اس کے اندر کی آنکھوں پر پردہ ڈال رکھا تھا۔ اسی دھن میں اس نے سکینہ کا سودائے خام پالا۔ اس وقت معلوم ہوتا تھا وہ اس کی محبت میں دیوانہ ہوگیا۔ اب سب کچھ اس پر نثار کیے دیتا ہے۔ پر آج اس محبت میں ہوس پروری کے سوا اور کچھ نہ نظر آتا تھا۔ ہوس پروری نہ تھی، سفلہ پن بھی تھا۔ اس نے اس بھولی بھالی حسینہ کی بے نوائی کو اپنے نفس کا نشانہ بنانا چاہا تھا۔ پھر منّی اس کے پردۂ زندگی پر آئی۔ مایوسیوں سے پامال، آرزوؤں سے گراں بار، اس دیوی سے اس نے کتنی روباہ بازیاں کی تھیں۔ وہ اس خیال سے اپنے دل کو سمجھا لیا کرتا تھا کہ سکینہ کے ساتھ اس کے تعلقات میں نفس کا شائبہ تک نہ تھا۔ لیکن اب نظر ڈالنے پر اسے صاف نظر آتا تھا کہ اس ہمدردی میں بھی، اس پریم میں بھی اس کی بوالہوسی شامل تھی۔ تو کیا وہ فی الحقیقت بندۂ ہوس ہے؟ اس سوال کا اس نے اپنے باطن سے جو جواب پایا وہ بہت ہی دل شکن تھا۔ اس نے سکھدا کو عیش پرور سمجھا تھا، پر وہ خود اس سے کہیں زیادہ شرمناک، کہیں زیادہ نفسانی عیش پروری میں ملوث تھا۔ اس کے دل میں ایک ولولہ سا اُٹھا کہ دونوں دیویوں کے قدموں پر سر رکھ کر روئے اور کہے۔ "دیویو! میں نے تمھارے ساتھ دغا کی ہے۔ میں کمینہ ہوں، بے حیا، کور باطن ہوں، مجھے جو سزا چاہے دو۔ یہ سر تمھارے آگے خم ہے۔

اپنے والد سے بھی اس کے دل میں عقیدت، پیدا ہوگئی۔ جسے اس نے دولت کا غلام اور خزانے کا سانپ سمجھ رکھا تھا۔ وہ اسے کسی قسم کی قربانی کے ناقابل سمجھتا تھا۔ جس نے اپنی ریاکاری سے دین کو بھی دنیا کے مطیع کردیا تھا۔ وہ آج عالی نفسی کے اونچے سنگھاسن پر بیٹھا نظر آتا تھا۔ دہریت کے نشے میں وہ کسی منصف اور رحیم ذات برحق کے وجود سے بھی منکر ہو بیٹھا تھا۔ پر ان معجزوں کو دیکھ دیکھ کر اس کے اندر اعتقاد اور ایمان کا ایک دریا سا اُمڈ پڑا۔ اسے مشیت غیب کی جھلک نظر آتی تھی۔ زندگی میں اب نیا جوش، ایک نئی مسرت اور ایک نئی بیداری بھی۔ مستقبل اب اس کے لیے تاریک نہ تھا۔ رضا الٰہی میں

تاریکی کہاں۔

شام کا وقت تھا۔ امرکانت پریڈ میں کھڑا تھا کہ اس نے سلیم کو آتے دیکھا۔ سلیم کی فطرت میں جو انقلاب ہوا تھا اس کی اسے خبر مل چکی تھی۔ مگر یہاں تک نوبت پہنچ چکی ہے اس کا اسے گمان نہ تھا۔ وہ دوڑ کر سلیم کے گلے لپٹ گیا اور بولا۔ "تم خوب آئے دوست! اب مجھے یقین ہو گیا کہ خدا ہمارے ساتھ ہے۔ سکھدا بھی یہیں ہے۔ زنانہ جیل میں منّی بھی آ پہنچی۔ تمھاری کسر تھی وہ پوری ہو گئی۔ اس کا تو مجھے یقین تھا کہ تم ایک نہ ایک دن آؤ گے۔ پر اتنی جلدی آؤ گے یہ امید نہ تھی۔ وہاں کی تازہ خبریں سناؤ۔ کوئی ہنگامہ تو نہیں ہوا؟"

سلیم نے ظرافت سے کہا۔"جی نہیں ذرا بھی نہیں، ہنگامے کی کوئی بات بھی ہو۔ لوگ مزے سے کھا رہے ہیں اور پھاگ گا رہے ہیں۔ آپ یہاں آرام سے بیٹھے ہوئے ہیں نا؟"

اس نے تھوڑے سے لفظوں میں وہاں کی ساری کیفیت بیان کر دی۔ مویشیوں کا قرق کیا جانا، قصابوں کا آنا، اہیروں کے محال میں گولیوں کا چلنا۔ گھوش کو پٹک کر مارنے کا واقعہ اس نے بڑی تفصیل اور تشریح سے بیان کیا۔

امرکانت کا منہ لٹک گیا بولا۔"تم نے سراسر نادانی کی۔"

"اور کیا آپ سمجھتے تھے کوئی پنچایت ہے جہاں حقے اور شراب کے ساتھ سارا فیصلہ ہو جائے گا۔"

"مگر فریاد تو اس طرح نہیں کی جاتی۔"

"ہم تو کسی رعایت کے خواستگار نہ تھے۔"

"رعایت تو تھی ہی، جب تم نے ایک شرط پر زمین لی تو انصاف یہ کہتا ہے کہ وہ شرط پوری کرو۔ پیداوار یا خرچ اجناس کی شرط پر آسامیوں نے زمین نہیں لی تھی۔ بلکہ سالانہ لگان کی شرط پر۔ زمیندار یا سرکار کو بازار کی تیزی مندی سے کوئی سروکار نہیں۔"

"جب بازار تیز ہو جانے پر لگان پر اضافہ ہو جاتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ مندے ہو جانے پر تخفیف نہ ہو جائے۔ مندے میں تیزی کا لگان وصول کرنا سراسر بے انصافی ہے۔"

"مگر اضافہ لاٹھی کے زور سے تو نہیں کیا جاتا۔ اس کے لیے بھی تو قانون ہے۔"

سلیم کو حیرت ہو رہی تھی کہ ایسی نازک صورتِ حال میں امرکانت اتنا مطمئن کیسے بیٹھا ہوا ہے۔ اس کے خون میں اُبال آجاتا۔ یقیناً جیل کی سختیوں نے حضرت کے حوصلے پست کردیے ہیں۔ ایسی حالت میں اس نے ان تیاریوں کا ذکر کرنا ہی فضول سمجھا جو اس وقت تشدد کا مقابلہ کرنے کے لیے کی جارہی تھیں۔

امر اس کے جواب کا انتظار کر رہا تھا۔ جب سلیم نے کوئی جواب نہ دیا تو اس نے پوچھا۔"تو آج کل وہاں کون ہے، سوامی جی؟"

سلیم نے شرماتے ہوئے کہا۔"سوامی جی تو گرفتار ہوگئے میرے بعد ہی وہاں سکینہ پہنچ گئی۔"

امرکانت چونک کر بولا۔"اچھا سکینہ بھی آگئی!"

"تو کیا تم نے سوچ رکھا تھا کہ آگ لگا کر تم اسے ایک دائرے کے اندر باندھ لوگے۔"

"میں جس راستے پر اسے لے چلنا چاہا تھا اسے اسی لیے چھوڑ دیا ہے۔"

"آپ اصلاح چاہتے ہیں مگر اس کی قیمت نہیں دینا چاہتے ہیں۔"

"آپ نے جس چیز کو قیمت سمجھ رکھا ہے وہ اس کی قیمت نہیں ہے۔ اس کی قیمت ہے زیادہ سے زیادہ قربانیاں کرنے کی طاقت۔"

سلیم نے گرم ہوکر کہا۔"کیا فضول بکتے ہو، جس چیز کی بنیاد جبر پر ہے اس پر قربانیوں کا کوئی اثر نہیں پڑسکتا۔"

امر نے پوچھا۔"کیا تم اسے تسلیم نہیں کرتے کہ دنیا کا نظام حق اور انصاف پر قائم ہے اور ہر ایک انسان کے دل کی گہرائیوں میں وہ تار موجود ہے جس میں قربانیوں سے جھنکار پیدا ہوتی ہے؟"

سلیم بولا۔"نہیں میں اسے باور نہیں کرتا۔ دنیا کا نظام خودغرضی اور جبر پر قائم ہے۔ اور ایسے بہت کم انسان ہیں جن کی گہرائیوں میں وہ تار موجود ہو۔"

امر نے مسکرا کر کہا۔"تم تو سرکار کے نوکر تھے جیل میں کیسے آگئے"

سلیم ہنسا۔"تمھارے عشق میں۔"

"دادا کو کس کا عشق تھا؟"

"اپنے بیٹے کا۔"

"اور سکھدا کو؟"

"اپنے شوہر کا۔"

"اور سکینہ کو؟ اور منّی کو؟ اور سیکڑوں آدمیوں کو جو یہاں پڑے سڑ رہے ہیں۔ مگر جن کے پاس ایک انگل بھر زمین بھی نہیں ہے؟"

"اچھا مان بھی لیا کہ کچھ لوگوں کے دل کی گہرائیوں کے اندر وہ تار ہے مگر ایسے آدمی کتنے ہیں؟"

"میں کہتا ہوں ایسا کوئی آدمی نہیں جس کے اندر وہ تار نہ ہو۔ ہاں کسی پر جلد اثر ہوتا ہے، کسی پر دیر میں۔ کچھ ایسے غرض کے بھی ہوسکتے ہیں جن پر شاید کبھی اثر نہ ہو۔ اگر ہم اس تار میں جنبش پیدا نہیں کرسکتے تو یہ ہمارا اور ہماری کمزوریوں کا قصور ہے۔"

"یہ کہنا تو ویسا ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ سارے انسان فرشتے ہوجائیں گے تو دنیا خود بخود جنت ہوجائے گی۔ لگان ہم دے نہیں سکتے۔ وہ لوگ کہتے ہیں ہم لے کر چھوڑیں گے۔ تو ہم کیا کریں؟ اپنا سب کچھ قرق ہوجانے دیں؟ مرنے والے بے شک دلوں میں رحم پیدا کرسکتے ہیں۔ لیکن مارنے والا خوف پیدا کرسکتا ہے جو رحم سے کہیں زیادہ اثر ڈالنے والی چیز ہے۔"

امرکانت نے اس مسئلے پر مہینوں غور کیا تھا۔ وہ مانتا تھا دنیا میں استبداد کا راج ہے۔ لیکن استبداد کو بھی حق اور انصاف پر دہائی دینی پڑتی ہے۔ آج طاقت اور جبر کے پجاریوں میں بھی یہ ہمت نہیں ہے کہ وہ کسی کمزور قوم پر اس اعلان کے ساتھ حملہ کرسکے کہ ہم تمھارے اوپر حکومت کرنا چاہتے ہیں اس لیے تم ہمارے مطیع ہوجاؤ ورنہ ہم تمھارا نشان مٹا دیں گے۔ اسے بھی اپنے دعوے کی حمایت کے لیے صداقت یا تہذیب یا تنظیم کا پردہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔

اس نے جواب دیا۔"اگر تمھارا خیال ہے کہ آگ سے آگ بجھ سکتی ہے تو تم سخت غلطی پر ہو۔ جب طاقت ور بھی حق کی حمایت کے بغیر ہاتھ نہیں اُٹھاتا تو کمزور کے لیے تو آخر تک اس کے سہارے اور آڑ کی ضرورت ہے۔ اس کا سہارا چھوڑ کر تو وہ کہیں کا نہ

رہے گا۔"

سلیم نے منہ بنا کر کہا۔ "حضور کو معلوم رہے کہ دنیا میں فرشتے نہیں بستے آدمی بستے ہیں۔"

امر بولا۔ "مگر آدمیوں نے ہمیشہ فرشتہ بننے کی کوشش کی ہے اور شاید انسانی وجود کا مقصد بھی یہی ہے کہ کم سے کم ان لوگوں کو تو فرشتہ ہونا ہی چاہیے جو قوم کے رہنما بنتے ہیں۔"

"فرشتے کی تعریف؟"

"وہ انسان جو دوسروں کے لیے جیے اور دوسروں کے لیے مرے جس میں ذاتی ثروت یا شہرت کی ہوس نہ ہو۔"

"ایسے انسان شاید ابھی تک خدا نے پیدا نہیں کیے۔ آپ کے مشورے کا منتظر ہے۔"

"خدا انسان نہیں پیدا کرتا۔ انسان ارتقا کی ایک منزل کا نام ہے۔"

"اور آپ موحد بنتے ہیں۔"

"میری توحید معاملات پر مبنی نہیں ہے۔"

"اگر آپ نے دو ایک ماہ پہلے اس فلسفے اور آئین سے کام لیا ہوتا تو علاقے پر یہ تباہی نہ آئی ہوتی۔ پھوس میں آگ لگا کر آپ چاہتے ہیں کہ شمع کی طرح جلتی رہے۔"

امر کے دل پر چوٹ لگی تلملا اُٹھا۔ اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

باہر ٹھنڈ پڑنے لگی تھی۔ دونوں اندر گئے۔ سلیم تو تھکا تھا لیٹتے ہی لیٹتے سو گیا۔ امرکانت ایک نئی روحانی کشمکش سے مضطرب تھا۔ سلیم نے وحشیانہ صاف گوئی سے کام لے کر اس تحریک کا دوسرا پہلو اس کے پیش نظر کردیا تھا۔ انسان کی تکمیل اس کی خودی کی تکمیل ہے۔ جب وہ اپنے آپ کو بے عیب، سہو و خطا سے بالاتر سمجھنے لگتا ہے اس وقت وہ جو کچھ کرتا ہے اسے منجانب خدا سمجھتا ہے۔ اس میں غلطی کا امکان کہاں، امرکانت کو اپنی ذمے داری کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے چشمِ فریاد سے آسمان کی طرف دیکھا، اس کی خود اطمینانی محروم طائر کی طرح تڑپ رہی تھی۔ وہ اپنے فعل کی الہامی تصدیق چاہتا تھا۔ طرح طرح کے شکوک پیدا ہو رہے تھے۔ ان بے گناہوں کے خون کی ذمّے داری کیا اس کے سر

ہے؟ اس نے کیوں اتنی عجلت سے کام لیا؟ کیا رعایت کی یہی ایک صورت تھی؟ کیا اصلاح کی یہ کوشش نتائج کے اعتبار سے جاری رکھنے کے قابل ہے؟ امرکانت کو چکر آگیا اندھیرے میں بھولے ہوئے مسافر کی طرح اس کا ضمیر سر جھکا کر دعا کرنے لگا۔ ''بھگوان مجھے کچھ نہیں سوجھتا، سیدھا راستہ دکھا۔'' کالے خاں کی صورت کسی فرشتے کی طرح آنکھوں کے سامنے کھڑی ہوگئی۔

(۹)

پٹھانی کی گرفتاری نے شہر میں ایسی ہل چل مچادی جس کا گمان بھی نہ تھا۔ اس ضعیفہ کے شوقِ شہادت نے مُردوں میں بھی جان ڈال دی مطلب کے بندوں اور بے حیاؤں کو بھی میدانِ عمل میں لا کھڑا کیا۔ مگر ایسے لوگوں کی اب بھی کمی نہ تھی جو کہتے تھے اس کے لیے اب جینا اور مرنا دونوں برابر ہیں۔ باہر نہ مری جیل میں مری، ہم کو تو ابھی بہت دنوں جینا ہے۔ بہت کچھ کرنا ہے۔ ہم آگ میں کیسے کودیں۔

شام کا وقت ہے۔ مزدور اپنے اپنے کام چھوڑ کر، چھوٹے دُکان دار اپنی اپنی دُکانیں بند کر کے موقعۂ واردات کی طرف بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ پٹھانی اب وہاں نہیں ہے جیل پہنچ گئی، مسلح پولیس کا پہرہ ہے۔ کوئی جلسہ نہیں ہوسکتا۔ کوئی تقریر نہیں ہوسکتی۔ بہت سے آدمیوں کا جمع ہونا خطرناک ہے۔ مگر اس وقت کوئی کچھ نہیں سوچتا۔ کسی کو کچھ نظر نہیں آتا۔ سب کے سب ایک سیلابی رو میں بہے جا رہے ہیں۔ ایک لمحے میں سارا میدان مکھیّوں کا چھتہ بن گیا۔

دفعتاً لوگوں نے دیکھا ایک آدمی اینٹوں کے ڈھیر پر کھڑا لوگوں سے کچھ کہہ رہا ہے۔ چاروں طرف سے دوڑ دوڑ کر لوگ وہاں جمع ہوگئے۔ یہ کون آدمی ہے؟ لالہ سمرکانت! جس کی بہو جیل میں ہے جس کا لڑکا جیل میں ہے۔

''اچھا! یہ لالہ سمرکانت ہیں۔ خدا عقل دے تو اس طرح، پاپ سے جو کچھ کمایا وہ پُن میں لُٹا رہے ہیں۔''

''ہے ناخوش نصیب؟''

''خوش نصیب نہ ہوتا تو بڑھاپے میں اتنا جس کیسے کماتا۔''

''سُنو! سُنو۔''

"وہ دن آئے گا جب اسی جگہ غریبوں کے گھر بنیں گے اور جہاں ہماری ماتا گرفتار ہوئی ہیں وہیں ایک چوک بنے گا اور چوک کے بیچوں بیچ ماتا کی مورت کھڑی کی جائے گی۔ بولو ماتا پٹھانی کی جے۔"

دس ہزار گلوں سے۔ "ماتا کی جے" کی آواز نکلتی ہے۔ مجروح، مشتعل اور رقت خیز۔ گویا بیکسوں کی آہ دنیا میں کوئی آسرا نہ پاکر آسمان والوں سے فریاد کر رہی ہو۔"

"سُنو، سُنو۔"

"ماتا نے اپنے بچّوں کے لیے اپنے کو قربان کردیا۔ ہمارے اور آپ کے بھی بچے ہیں۔ ہم اور آپ اپنے بچّوں کے لیے، اپنے پیارے جگر کے ٹکڑوں کے لیے کیا کرنا چاہتے ہیں۔ اس کا فیصلہ کرنا ہوگا۔"

شور مچتا ہے "ہڑتال، ہڑتال۔"

"ہاں ہڑتال کرنا ہوگی۔ دوسرا کوئی علاج نہیں ہے اور وہ ہڑتال ایک دو دن کی نہ ہوگی۔ وہ اس وقت تک رہے گی جب تک ہمارے شہر کے دیوتا ہماری آواز نہ سُنیں گے۔ ہم غریب ہیں بیکس ہیں بے زبان ہیں لیکن جو لوگ بڑے آدمی کہلاتے ہیں وہ اگر ٹھنڈے دل سے غور کریں گے تو انھیں معلوم ہوگا کہ انھیں غریب، بیکس اور بے زبان آدمیوں نے بڑا آدمی بنایا ہے۔ یہ بڑے بڑے محل کون جان ہتیلی پر رکھ کر بناتا ہے ان کپڑوں کے ملوں میں کون اپنا پسینہ بہاتا ہے؟ منہ اندھیرے دروازے پر دودھ اور مکھّن لاکر کون پکارتا ہے؟ مٹھائیاں اور پھل لے کر کون ناشتے کے وقت حاضر ہوتا ہے؟ صفائی کون کرتا ہے؟ کپڑے کون دھوتا ہے؟ سویرے اخبار اور چٹھیاں لے کر کون پہنچتا ہے؟ شہر کے نوے فی صدی آدمی ان دس فی صدی آدمیوں کے لیے اپنا خون جلا رہے ہیں۔ اپنی جان کھپا رہے ہیں۔ ان کا انعام یہ ہے کہ دس فی صدی کے لیے سارا شہر چاہیے اور نوے فی صدی کے لیے ایک گوشہ بھی نہیں! ایک ایک بنگلے کے لیے کئی کئی ایکڑ زمین چاہیے۔ اس میں فوارے ہوں، باغیچے ہوں، لان ہوں۔ ان بھلے آدمیوں کو خبر نہیں ہے کہ جہاں بے شمار مخلوق تعفن اور تاریکی اور غلاظت میں پڑی مرمر کر امراض کے کیڑے پھیلا رہی ہو۔ وہاں کھلے ہوئے بنگلوں میں رہ کر بھی وہ محفوظ نہیں ہیں۔ یہ کس کی ذمے داری ہے کہ شہر کے چھوٹے بڑے امیر و غریب سب ہی آدمی تندرست رہ سکیں اگر ہماری میونسپلٹی اس مقدم

فرض کو پورا نہیں کر سکتی تو اسے توڑ دینا چاہیے۔ رئیسوں اور امیروں کی کوٹھیوں کے لیے، باغیچوں کے لیے کیوں اتنی فیاضی سے زمین دی جاتی ہے۔ اسی لیے کہ میونسپلٹی کی نظر میں ہماری جان کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ وہ شہر کو بڑے بڑے خوب صورت اور شان دار محلوں سے سجا دینا چاہتی ہے۔ اسے بہشت کا نمونہ بنا دینا چاہتی ہے۔ مگر جہاں اندھیری اور بدبودار گلیوں میں پڑے لوگ کراہ رہے ہوں۔ وہاں ان شان دار محلوں سے کیا ہوگا؟ یہ تو وہی بات ہے کہ کوئی جسم کے کوڑھ کو ریشمی کپڑوں میں چھپا کر اٹھلاتا پھرے۔ دوستو، ظلم کرنا جتنا بڑا گنا ہے اتنا ہی بڑا گناہ ظلم سہنا بھی ہے۔ آج طے کرلو کہ یہ ظلم نہ سہوگے۔ سب ایک دل ہوکر ارادہ کرلو کہ اس ظلم کا خاتمہ کردوگے۔ جس زمین پر ہم کھڑے ہیں یہاں کم سے کم دوہزار چھوٹے چھوٹے مکان بن سکتے ہیں، جن میں دس ہزار آدمی آرام سے رہ سکتے ہیں۔ مگر یہ ساری زمین چار پانچ بنگلوں کے لیے دی جا رہی ہے۔ میونسپلٹی کو دو لاکھ روپے مل رہے ہیں۔ شہر کے دس ہزار مزدوروں کی جان کی قیمت دو لاکھ کے برابر بھی نہیں۔"

یکایک پیچھے کے آدمیوں نے شور مچایا "پولیس آگئی، پولیس۔"

کچھ لوگ تو نو دو گیارہ ہوئے۔ کچھ لوگ سمٹ کر اور آگے بڑھ آئے۔

لالہ سمرکانت بولے۔"بھاگو مت، پولیس مجھے گرفتار کرے گی۔ اس کا مجرم میں ہوں۔ اور میں ہی کیا۔ میرا سارا گھر اس کا مجرم ہے۔ میرا لڑکا جیل میں۔ میری بہو جیل میں اور پوتا جیل میں ہے۔ میرے لیے اب جیل کے سوا اور کہاں ٹھکانا ہے۔ میں تو جاتا ہوں (پولیس سے) وہیں ٹھہریے میں خود آرہا ہوں۔ میں تو جاتا ہوں، مگر یہ کہے جاتا ہوں کہ اگر لوٹ کر میں نے یہاں اپنے غریب بھائیوں کے جھونپڑوں کی قطاریں، پھولوں کی کیاریوں کی طرح لہلہاتی نہ دیکھیں تو یہیں میری چتا بنے گی۔"

لالہ سمرکانت کود کر اینٹوں کے نیچے آئے اور بھیڑ کو چیرتے ہوئے جاکر پولیس کپتان کے پاس کھڑے ہوگئے۔ لاری تیار ہوگئی، کپتان نے انھیں لاری میں بٹھایا، لاری چل دی۔

"لالہ سمرکانت کی جے!" کی گہری، درد دل میں ڈوبی ہوئی آواز کسی بندھوے جانور کی طرح تڑپتی، چھپٹ پٹاتی اُٹھی۔ گویا بے چارگی کی قید توڑ کر نکل جانا چاہتی ہو۔

ایک مجمع لاری کے پیچھے دوڑا۔ لالہ سمرکانت کو چھڑانے کے لیے نہیں محض عقیدت کے جوش میں۔ گویا تبرک، کوئی دعا، کوئی پیغام پانے کی دیوانہ امنگ میں۔ جب لاری گرد میں غائب ہوگئی تو لوگ لوٹ پڑے۔

"یہ کون بول رہا ہے؟"

"کوئی عورت معلوم ہوتی ہے۔"

"کوئی بھلے گھر کی عورت ہے۔"

"ارے یہ تو وہی ہے لالہ سمرکانت کی سمدھن۔ راما بائی، سچ۔"

"اچھا جس نے اپنی ساری ملکیت پاٹ شالہ کے نام لکھ دی۔"

"سنو! سنو۔

"پیارے بھائیو! لالہ سمرکانت جیسا یوگی جس سکھ کے لیے للچا اٹھا وہ کوئی بڑا سکھ ہوگا۔ پھر میں تو عورت ہوں اور عورت چنچل ہوتی ہی ہے۔ آپ کے شاستر پوران سب یہی کہتے ہیں۔ پھر میں اس لالچ کو کیسے روکوں۔ میں ایک دھنی باپ کی بیٹی، دھنی سسر کی بہو اور دھنی شوہر کی بیوی عیش و آرام میں زندگی بسر کرنے والی۔ میں کیا جانوں غریبوں پر کیا گزرتی ہے۔ لیکن آپ کے اس شہر نے میری لڑکی چھین لی۔ میری جمع جتھا بھی چھین لی۔ اور اب میں بھی تم لوگوں کی طرح غریب ہوں۔ اگر کوئی آرزو ہے تو یہی کہ جہاں میرا سب کچھ گیا وہیں میری جان بھی جائے۔ یہیں ایک جھونپڑا بنا کر زندگی کے باقی دن بھی کاٹ دینا چاہتی ہوں اور آپ سے سوال کرتی ہوں کہ مجھے ایک کھاٹ بھر زمین دیجیے۔ تمھیں چھوڑ کر اور کس کے پاس مانگنے جاؤں۔ یہ تمھارا شہر ہے۔ اس کی ایک ایک انگل زمین تمھاری ہے۔ تمھیں اس کے راجا ہو۔ مگر سچے راجاؤں کی طرح تم بھی تیاگی ہو۔ راجا ہریش چندر کی طرح اپنا سب کچھ دوسروں کو دے کر، بھکاریوں کو امیر بنا کر تم آپ بھکاری ہوگئے۔ جانتے ہو وہ کھویا ہوا راج تمھیں کیسے ملے گا؟ تم ڈوم کے ہاتھ جب ہی بک چکے اب تمھیں اپنے شیویا اور اپنے رہتاس کو ترک کردینا پڑے گا۔ جب ہی دیوتا تم سے خوش ہوں گے۔ میرا دل کہہ رہا ہے دیوتاؤں میں تمھارے کھوئے راج کو واپس دلانے کی بات چیت ہو رہی ہے۔ آج نہیں تو کل تمھارا راج تمھارے قبضے میں آجائے گا۔ اس وقت بھول نہ جانا۔ میں تمھارے دربار میں اپنی عرضی پیش کیے جا رہی ہوں۔"

دفعتاً پیچھے سے شور مچا "پھر پولیس آ گئی۔"

"آنے دو، ان کا کام ہے مجرموں کو پکڑنا، ہم مجرم ہیں۔ گرفتار نہ کر لیے گئے تو آج شہر میں ڈاکہ ڈالیں گے، چوری کریں گے یا کوئی فتنہ کھڑا کریں گے۔ میں کہتی ہوں کہ کوئی طاقت جو رعایا کی طاقت سے نہیں، جبر کی طاقت سے حکومت کرتی ہے وہ لٹیروں کی جماعت ہے۔ جو لوگ غریبوں کے حقوق پامال کر کے خود صاحبِ زر ہو رہے ہیں، دوسروں کے اختیار چھین کر خود صاحبِ اختیار بنے ہوئے ہیں، وہ دراصل لٹیرے ہیں۔ چاہے وہ قانون اور انتظام ظاہرداری کا کیسا ہی سوانگ کیوں نہ بھریں۔ مگر میری عرضی تمھارے سامنے ہے۔ اس لٹیری میونسپلٹی کو ایسا سبق دو کہ پھر اسے غریبوں کے حقوق پامال کرنے کی جرأت نہ ہو۔ جو تمھیں کچلیں، ان کے پاؤں میں کانٹے بن کر چبھ جاؤ۔ کل سے ایسی ہڑتال کرو کہ امیروں اور اختیار والوں کو تمھاری طاقت کا احساس ہو جائے۔ ان پر روشن ہو جائے کہ تمھاری مدد کے بغیر وہ نہ اپنی دولت کا لطف اُٹھا سکتے ہیں، نہ اپنے اختیار کا۔ انھیں دکھا دو کہ تم ہی ان کے ہاتھ ہو، تم ہی ان کے پاؤں ہو، تمھارے بغیر وہ بے دست و پا ہیں۔"

وہ ٹیلے سے نیچے اتر کر پولیس کے ٹملوں کی طرف چلی تو ساری خلقت دل میں اٹد کر آنکھوں میں رُک جانے والے آنسوؤں کی طرح اس کی طرف تکتی رہ گئی۔ باہر نکل کر آئیں، ادب کو کیسے توڑ دیں؟ دلیروں کے آنسو باہر نکل کر سوکھتے نہیں، درختوں کے رس کی طرح اندر رہ کر درخت کو سرسبز اور بارآور کرتے ہیں۔ اتنے بڑے مجمعے میں ایک منہ سے بھی جے جے کی آواز نہ نکلی۔ مگر جب راما بائی موٹر میں بیٹھ گئیں اور موٹر چلی تو عقیدت کی وہ لہر آئی کہ بندشوں کو توڑ کر ایک پتلی، تیزرو، گہری دھار میں نکل پڑی۔

ایک بوڑھے آدمی نے ڈانٹ کر کہا۔ "جے جے بہت کر چکے، اب گھر جا کر آٹا دال جمع کر لو، کل سے لمبی ہڑتال کرنی ہے۔"

ایک دوسرے آدمی نے اس کی تائید کی اور کہا۔ "یہ نہیں کہ یہاں تو گلا پھاڑ پھاڑ چلّائے اور سورج نکلتے ہی اپنے اپنے دھندے میں لگ گئے۔"

"اچھا، یہ کون کھڑا ہو گیا؟"

"واہ اتنا بھی نہیں پہچانتے ڈاکٹر صاحب ہیں۔"

"ڈاکٹر صاحب بھی آگئے، تب تو فتح ہے۔"

"کیسے کیسے شریف آدمی ہماری طرف سے کھڑے ہیں، پوچھو ان بے چاروں کو کیا لینا ہے جو اپنا عیش و آرام چھوڑ اپنے برابر والوں سے دشمنی مول کرجان ہتھیلی پر لیے تیار ہیں۔"

"ہمارے اوپر اللہ کا رحم ہے، ان ڈاکٹر صاحب نے پچھلے دنوں جب پلیگ پھیلا تھا غریبوں کی کیسی خدمت کی ہے کہ واہ! جن کے پاس اپنے بھائی بند تک نہ کھڑے ہوتے تھے ان کے سرہانے رات کی رات بیٹھے رہنا کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ ہمارے حافظ جی تو کہتے تھے کہ یہ اللہ کا فرشتہ ہے۔"

"سنو، سنو! بکواس کرنے کو ساری رات پڑی ہے۔"

"بھائیوں! آپ نے پچھلی بار جو ہڑتال کی تھی اس کا کیا نتیجہ ہوا؟ اگر پھر ویسی ہی ہڑتال ہوئی تو اس سے کہیں بہتر ہے کہ آپ ہڑتال نہ کریں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم میں سے کچھ لوگ گرفتار ہوجائیں گے باقی آپس میں اختلاف ہونے کے باعث ایک دوسرے کو بدنام کریں گے۔ اور اصل منشا فوت ہوجائے گی۔ پرانی کدورتیں نکالی جانے لگیں گی۔ گڑے مردے اُکھاڑے جانے لگیں گے۔ نہ کوئی تنظیم رہے گی نہ ذمے داری۔ اس لیے میں آپ سے کہتا ہوں کہ پہلے اپنا دل ٹٹول کر دیکھ لیجیے۔ اگر اس میں خامی ہو تو ہڑتال کا خیال دل سے نکال دیجیے۔ اگر یقین ہوجائے کہ وہ اندر سے مضبوط ہے اس میں نقصان اُٹھانے کی، بھوکوں مرنے کی، تکلیفیں جھیلنے کی طاقت ہے تو ہڑتال کیجیے اور عہد کرلیجیے کہ جب تک ہڑتال رہے گی تم اپنی عداوتیں بھول جاؤگے۔ نفع نقصان کی پروا نہ کروگے۔ تم نے کبڈی تو کھیلی ہی ہوگی۔ کبڈی میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ ایک کھلاڑی بھی اسی طرح قاعدے قانوں کی پابندی کرتا ہے۔ گویا اس کے سب ہی رفیق زندہ ہیں۔ اسے آخر تک یہ امید رہتی ہے کہ وہ اپنے مرے ہوئے رفیقوں کو جلا لے گا اور سب کے سب پھر پوری طاقت سے بازی جیتنے کی کوشش کریں گے۔ وہاں ہر ایک کھلاڑی کا صرف ایک مقصد ہوتا ہے پالا جیتنا۔ کس گوئیاں نے اسے کب گالی دی تھی، کب اس کا کنکوا پھاڑ ڈالا تھا، یا کب اسے چانٹا مار کر بھاگا تھا، اس کی اسے ذرا بھی یاد نہیں آتی۔ تمھیں بھی اس وقت اسی طرح اپنا کھیل کھیلنا پڑے گا۔ میں یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ تمھاری فتح ہی ہوگی۔

جیت بھی ہوسکتی ہے ہار بھی ہوسکتی ہے جیت یا ہار سے ہمیں غرض نہیں۔ بھوکا بچّہ بھوک سے بے قرار ہوکر روتا ہے۔ مٹھائیاں ملیں یا مار، اس کی اسے پروا نہیں ہوتی۔ ممکن ہے ماں کے پاس پیسے نہ ہوں، یا اس کی طبیعت اچھی نہ ہو۔ بچے کی تو عادت ہے کہ بھوک لگنے پر روئے۔ اسی طرح ہم بھی رو رہے ہیں ہم روتے روتے سوجائیں گے یا ماں مامتا سے بے تاب ہوکر ہمیں کچھ کھانے کو دے گی یہ کون جانتا ہے ....''

اور پولیس کپتان تھانیدار کو ڈانٹ رہا تھا۔''جلدی لاری منگواؤ تم بولتا تھا اب کوئی آدمی نہیں ہے، یہ کہاں سے نکل آیا؟''

تھانے دار صاحب نے منہ لٹکا کر کہا۔''حضور یہ ڈاکٹر صاحب تو آج پہلی بار پلیٹ فارم پر آئے ہیں۔ ان کی طرف تو ہمارا گمان بھی نہ تھا، لاری تو ابھی دیر میں آئے گی۔ حکم ہو تو تانگہ منگوالوں۔''

''نہیں سب آدمی تانگے کو گھیر لے گا۔ دوڑ کر کوئی ٹیکسی لاؤ۔''

ڈاکٹر صاحب کی تقریر جاری تھی۔

''ہماری کسی سے دشمنی نہیں ہے۔ جس سماج میں غریبوں کے لیے جگہ نہیں۔ وہ اس مکان کی طرح ہے جس کی بنیاد نہ ہو۔ کوئی ہلکا جھونکا بھی اسے زمین پر گراسکتا ہے۔ میں اپنے صاحبِ دولت اور صاحبِ اختیار بھائیوں سے پوچھتا ہوں کہ کیا یہی انصاف ہے کہ ایک آدمی تو بنگلے میں رہے دوسرے کو جھونپڑی نصیب نہ ہو۔ کیا تمھیں اپنے ہی جیسے آدمیوں کو اس حالت میں دیکھ کر شرم نہیں آتی؟ تم کہو گے ہم نے عقل کے زور سے ثروت پیدا کی ہے۔ کیوں نہ اس کا لطف اُٹھائیں۔ مگر کیا آپ نے دنیا کی تاریخ نہیں پڑھی؟ جب عقل پر انصاف کی جگہ خودغرضی کا غلبہ ہوجاتا ہے۔ تو سمجھ لیجیے کہ سماج میں زبردست انقلاب آنے والا ہے۔ گرمی بڑھ جاتی ہے اس کے بعد طوفان آتا ہے۔''

داروغہ نے کہا۔''ڈاکٹر صاحب آپ کی تقریر تو ختم ہوگئی اب نیچے آجایئے۔ ہمیں کیوں وہاں آنا پڑے۔''

شانتی کمار نے ٹیلے پر کھڑے کہا۔''میں اپنی خوشی سے گرفتار ہونے نہ آؤں گا، آپ زبردستی گرفتار کرسکتے ہیں۔'' اور پھر تقریر کا سلسلہ جاری کردیا۔

''مال داروں کو کس کی حمایت کا غرّہ ہے؟ پولیس کا، ہم پولیس ہی سے پوچھتے ہیں۔

اپنے کانسٹبل بھائیوں ہی سے ہمارا سوال ہے۔ کیا تم بھی غریب نہیں ہو؟ کیا تم اور تمھارے بچے سڑے ہوئے اندھیرے گندے بلوں میں نہیں رہتے؟ لیکن یہ زمانے کی خوبی ہے کہ تم بے انصافی اور ظلم کی حمایت میں اپنے ہی بال بچّوں کا گلا گھونٹنے کے لیے تیار کھڑے ہو۔"

کپتان نے مجمع کے اندر جاکر شانتی کمار کا ہاتھ پکڑ لیا اور ٹیلے سے گھسیٹ لیا۔ ڈاکٹر صاحب گرتے گرتے بچے۔

دفعتاً نینا سامنے سے آپہنچی۔

شانتی کمار نے گھبرا کر پوچھا۔"تم کدھر سے آگئیں نینا؟ سیٹھ جی اور راما دیوی تو چل دیں، اب میری باری ہے۔"

نینا مسکرا کر بولی۔"اور آپ کے بعد میری۔"

شانتی کمار نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔"کہیں ایسا غضب نہ کرنا۔ اب تمھارا ہی بھروسہ ہے۔"

نینا نے کچھ جواب نہ دیا۔ کپتان ڈاکٹر صاحب کو لیے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ ادھر مجمعے میں شور مچ رہا تھا۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا اب ان کا فرض کیا ہے۔ ان کی حالت پگھلی ہوئی دھات کی سی تھی جسے کسی سانچے میں ڈھال سکتے ہو۔ کوئی بھی چلتا ہوا آدمی انھیں جس طرف چاہے لے جا سکتا تھا۔ تشدد کی طرف بھی آسانی سے۔ اسی وقت نینا جاکر ٹیلے پر کھڑی ہوگئی۔

آج بہت دنوں کے بعد نینا سیر کرنے نکلی تھی۔ راستے میں اسے لالہ سمرکانت اور راما دیوی کی گرفتاری کی خبر ملی۔ اس نے ڈرائیور کو اس میدان کی طرف چلنے کا حکم دیا۔ اب وہ زیادہ تحمل نہیں کرسکتی۔ اتنے دنوں اس نے شوہر اور سسر کی مرضی کو مقدم سمجھا تھا۔ اپنی طرف سے کوئی ایسا کام نہ کرنا چاہتی تھی کہ سسرال والوں کا دل دُکھے۔ لیکن اس خبر نے اس کے ضبط کا بند توڑ دیا۔ منی رام جامے سے باہر ہوجائیں گے۔ لالہ دھنی رام چھاتی پیٹنے لگیں گے۔ اسے غم نہیں۔ اگر اس وقت کوئی روک لیتا تو وہ شاید موٹر سے کود پڑتی۔ وہ فطرتاً شرمیلی عورت تھی۔ روز جلسے ہوتے تھے لیکن اسے کبھی اس میں شریک ہونے یا کچھ بولنے کی ہمت نہ ہوئی۔ یہ نہیں کہ اس کے دل میں خیالات نہ تھے یا ان کے

اظہار پر قادر نہ تھی۔ اس کا صرف یہ سبب تھا کہ اسے مجمع کے رو برو کھڑے ہوتے شرم آتی تھی۔ یا یوں کہو کہ اندر کی پکار کبھی اتنی زوردار نہ ہوئی کہ شرم اور حجاب کی قیدوں کو توڑ دیتی۔ بعض ایسے جانور بھی ہوتے ہیں جن میں ایک خاص آسن ہوتا ہے۔ یوں آپ انھیں مار ڈالیے آگے قدم نہ اُٹھائیں گے۔ لیکن آسن پر انگلی رکھتے ہی ان میں ایک نئی قوتِ عمل، ایک نئی زندگی پیدا ہوجاتی ہے۔ لالہ سمرکانت کی گرفتاری نے نینا کے دل میں اسی عضو لطیف پر ضرب لگائی اور وہ پہلی بار مجمع کے روبرو آکھڑی ہوئی۔ بے خوف، مستقل، ایک نئی بیداری اور عزم سے منوّر۔

"بھائیو! میں لالہ سمرکانت کی بیٹی اور لالہ دھنی رام کی بہو ہوں میرا پیارا بھائی جیل میں ہے۔ پیاری بھاوج جیل میں ہے۔ آج میرے پتا جی بھی وہیں پہنچ گئے۔"

ایک آواز آئی۔"راما بائی بھی۔"

"ہاں راما بائی بھی جنھیں میں اپنی ماں سمجھتی تھی۔ لڑکی کے لیے وہی میکہ ہے جہاں اس کے ماں باپ، بھائی بھاوج رہیں اور لڑکی کو میکہ کتنا پیارا ہوتا ہے، یہ آپ خوب جانتے ہیں۔ اس زمین کے کئی قطعے میرے سسر جی نے خریدے ہیں۔ مجھے یقین ہے اگر میں ضد کروں تو وہاں امیروں کے بنگلے نہ بنوا کر غریبوں کے جھونپڑے بنوا دیں گے۔ لیکن ہمارا مقصد صرف اتنا ہی نہیں ہے۔ ہماری لڑائی تو صرف اس اصول پر ہے۔ جس شہر کی تین چھوتھائی آبادی گندے بلوں میں مر رہی ہو اسے کوئی مجاز نہیں ہے کہ محلوں اور بنگلوں کے لیے زمین بیچے۔ آپ نے دیکھا تھا یہاں کئی ہرے بھرے گاؤں تھے۔ میونسپلٹی نے ایک اصلاحی کمیٹی بنائی۔ کسانوں کی زمین کوڑیوں کے مول چھین لی گئی اور آج وہی زمین اشرفیوں کے مول بک رہی ہے اس لیے کہ بڑے آدمیوں کے بنگلے بنیں۔ ہم بزرگانِ شہر سے پوچھتے ہیں کہ کیا امیروں ہی کو صاف ہوا اور روشنی کی ضرورت ہے؟ غریبوں کی جان نہیں ہوتی۔ امیروں ہی کو تندرست رہنا چاہیے۔ غریبوں کو تندرستی کی ضرورت نہیں؟ امیر دو چار مہینے بیماری کا مزہ اُٹھا سکتا ہے۔ اس کے لیے صحت بخش مقامات ہیں جہاں وہ تفریح کے لیے جاسکتا ہے اور جاتا ہے۔ اس کے لیے بڑے بڑے ڈاکٹر ہیں جو ایک بار اسے موت کے پنجے سے بھی چھڑا سکتے ہیں۔ غریب تو ایک دن بھی بیمار نہیں رہ سکتا۔ اس کی بیماری اس کی موت ہے۔ مگر اب وہ اس طرح مرنے کو تیار نہیں ہے۔ اگر مرنا ہی ہے تو اس

میدان میں کھلے ہوئے آسمان کے نیچے، چاند کی سنہری روشنی میں مرنا اندھیرے بلوں میں مرنے سے کہیں اچھا ہے۔ لیکن پہلے ہمیں ان بزرگوں سے ایک بار اور پوچھ لینا ہے کہ وہ اب بھی ہماری درخواست منظور کریں گے یا نہیں؟ اب بھی اس اصول کے سامنے سر جھکائیں گے یا نہیں؟ اگر انھیں گھمنڈ ہو کہ وہ ہتھیار کے زور سے غریبوں کو کچل کر ان کی زبان بندی کرسکتے ہیں تو یہ ان کی غلطی ہے۔ غریب کو کچل کر امیر، امیر نہیں رہ سکتا فقیر بھی نہیں رہ سکتا۔ دولت کا انبار ہوکر رہ جائے گا۔ امیروں کی ہستی غریبوں سے قائم ہے۔ غریب ہی اس کی نمائش اور عیش اور تکلف کے سامان پیدا کرتا ہے اور غریب ہی اسے زندہ قائم رکھتا ہے۔ اگر اس خبط میں نہ پڑکر ہمارے بزرگ اس وقت غریبوں کی آواز سُن لیں۔ ان کے مطالبے مان لیں تو انھیں مفت کا احسان ملے گا، بالکل مفت، کیونکہ غریب بہت دن غریب نہ رہیں گے۔ اور وہ زمانہ دور نہیں ہے جب غریبوں کے ہاتھ میں طاقت ہوگی اور ان کے ہاتھ میں امیروں کی قسمت کا فیصلہ۔ اس لیے میں لکشمی کے بیٹوں سے کہتا ہوں۔ انقلاب کے درندے کو چھیڑ چھیڑ کر نہ جگائیے۔ اسے جتنا ہی چھیڑو گے اتنا ہی جھلائے گا اور جب وہ بالآخر اُٹھ کر جمائی لے گا اور زور سے دہاڑے گا تو پھر آپ کو بھاگنے کی راہ نہ ملے گی۔ ہمیں بورڈ کے ممبروں کو بھی چتاونی دینی ہے اور اس کے لیے اس سے بڑھ کر دوسرا موقع نہ ملے گا۔ ممبروں کا جلسہ ہو رہا ہے غالباً اسی زمین کا مسئلہ درپیش ہوگا۔ ہم کو اسی وقت بورڈ کے سامنے حاضر ہوکر اپنی فریاد سنانی چاہیے۔ دیر کرنے کی ضرورت نہیں ورنہ ممبر صاحبان اپنے اپنے گھر کی راہ لیں گے۔ ہڑتال میں فساد کا اندیشہ ہے اس لیے ہڑتال اسی حالت میں کرنی چاہیے جب اور کسی طرح کام نہ نکل سکے۔"

نینا نے جھنڈا اُٹھا لیا اور میونسپل آفس کی طرف چلی۔ اس کے پیچھے بیس پچیس ہزار کا مجمع ندی سا امنڈتا ہوا چلا۔ اور یہ جماعت میلوں کی بھیڑ کی طرح غیر منظم بھیڑچال نہ تھی بلکہ فوجی قطاروں کی طرح منظم اور صف بستہ اور ہم قدم، چار چار آدمیوں کی بے شمار قطاریں، متین انداز سے، ایک خیال، ایک مقصد، ایک تحریک کی متحدہ قوت کا احساس کرتی ہوئی چلی جارہی تھی اور ان کا تانتا نہ ٹوٹتا تھا۔ گویا زمین سے نکلتی چلی آتی ہوں۔ سڑک کے دونوں طرف چھجوں اور چھتوں پر تماشائیوں کی دیوار کھڑی تھیں۔ سب ہی متحیر تھے۔ افوہ! کتنے آدمی ہیں۔ ابھی چلے ہی آرہے ہیں۔ کبھی ختم بھی ہوں گے یا نہیں؟

ادھر میونسپل بورڈ میں تہلکہ مچا ہوا تھا۔

حافظ حلیم نے ٹیلیفون کا چونگا میز پر رکھتے ہوئے کہا۔"ڈاکٹر شانتی کمار بھی گرفتار ہوگئے۔"

مسٹر سین نے خوش ہوکر کہا۔"اب اس موومنٹ کا جڑ کٹ گیا۔ ڈاکٹر اس کا سول (روح) تھا۔"

پنڈت اُنکار ناتھ نے چٹکی لی۔"اس بلاک پر اب بنگلے نہ بنیں گے جھونپڑے بنیں یا نہ بنیں۔ یہ طے ہے۔"

سین بابو اپنے لڑکے کے نام سے ایک بلاک کے خریدار تھے۔ جل اُٹھے بولے۔"اگر بورڈ میں اپنے پاس کیے ہوئے رزولیوشنوں پر کام کرنے کی طاقت نہیں تو اسے ریزائن کرکے الگ ہوجانا چاہیے۔"

مسٹر شفیع نے جو یونیورسٹی کے پروفیسر اور ڈاکٹر شانتی کمار کے دوست تھے سین کو آڑے ہاتھوں لیا۔"بورڈ کے فیصلے خدا کے فیصلے نہیں ہیں مسٹر سین بلکہ خدائی فیصلوں میں بھی کبھی ترمیم ہوجاتی ہے۔ اس میدان میں ایک ہزار آدمی رات کو سوتے ہیں انھیں کیا آپ گولی ماردیں گے؟ اور وہاں کون مزدور کام کرنے جائے گا؟ مزدوروں میں ابھی تنظیم باقی ہے۔ میں بورڈ کو آگاہ کیے دیتا ہوں کہ اگر اس نے اس قرارداد کو منسوخ نہ کردیا تو شہر پر بہت بڑی آفت آجائے گی۔ سیٹھ سمرکانت اور ڈاکٹر شانتی کمار کا شریک ہونا بتا رہا ہے کہ یہ تحریک بچّوں کا کھیل نہیں ہے۔ اس کی جڑ بہت گہری پہنچ گئی ہے اور اسے اُکھاڑ پھینکنا اب غیر ممکن ہوگیا ہے۔ بورڈ کو اپنا فیصلہ تبدیل کرنا پڑے گا۔ خواہ آج کرے یا سو دو سو جانوں کی نذر لے کر کرے۔ اب تک کا تجربہ یہی کہہ رہا ہے کہ بورڈ کی سختیوں کا بالکل اثر نہیں ہوا۔ بلکہ اُلٹا اثر ہوا۔ اب جو ہڑتال ہوگی وہ اتنی خوفناک ہوگی کہ اس کے خیال سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ بورڈ اپنے سر بہت بڑی ذمے داری لے رہا ہے۔"

مسٹر حامد علی کلاتھ مل کے منیجر تھے۔ ان کا مِل گھاٹے پر چل رہا تھا۔ ڈرتے تھے کہیں لمبی ہڑتال ہوگئی تو بدھیا ہی بیٹھ جائے گی، تھے تو بے حد موٹے مگر بے حد محنت پسند۔ بولے۔"حق کو تسلیم کرنے میں بورڈ کو کیوں اتنا پس و پیش ہو رہا ہے یہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ شاید اس لیے کہ اس کے غرور کو جھکنا پڑے گا۔ لیکن حق کے سامنے جھکنا

کمزوری نہیں مضبوطی ہے۔ اگر آج اس مسئلے پر بورڈ کا نیا انتخاب ہو تو میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ بورڈ کی یہ قرارداد عرفِ عطف کی طرح مٹ جائے گی۔ بیس پچیس ہزار آدمیوں کی بہتری کے لیے اگر بورڈ کو دو چار لاکھ کا نقصان اُٹھانا اور دس پانچ ممبروں کی دل شکنی بھی کرنی پڑے تو اسے تامل نہ کرنا چاہیے ...."

پھر ٹیلیفون کی گھنٹی بجی، حافظ حلیم نے رسیور کان سے لگایا، اور سن کر بولے۔ "پچیس ہزار بلوائیوں کی فوج ہمارے اوپر دھاوا کرنے آرہی ہے، لالہ سمرکانت کی صاحبزادی اور دھنی رام کی بہو اس کی سرغنہ ہے۔ ڈی، ایس، پی نے ہماری رائے پوچھی ہے اور خیال ظاہر کیا ہے کہ فائرنگ کیے بغیر مجمع کو پیچھے ہٹانا غیر ممکن ہے۔"

بورڈ کے ممبروں کے چہرے فق ہوگئے۔ فوری عمل کی ضرورت تھی۔ ضابطے کی پابندیوں کا موقع نہ تھا۔ فوراً رائے لے لی گئی۔ بارہ ہاتھ فائرنگ کے موافق تھے اور آٹھ مخالف۔ لالہ دھنی رام غیر جانبدار رہے۔

حافظ حلیم نے تشویش کے انداز سے کہا۔ "تو بورڈ کی رائے ہے کہ جلوس کو روکا جائے چاہے فائر ہی کرنا پڑے؟"

مسٹر سین نے فرمایا۔ "کیا اب بھی کوئی شک ہے؟"

پھر ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ ڈی، ایس، پی نے کہا۔ "بڑا غضب ہوگیا حافظ جی!"

حافظ نے پوچھا۔ "کیا بات ہوئی کہیے تو؟"

"ابھی کچھ معلوم نہیں۔ شاید مسٹر منی رام غصے سے بھرے ہوئے جلوس کے سامنے آئے اور اپنی بیوی کو وہاں سے ہٹ جانے کو کہا۔ لیڈی نے انکار کیا۔ اس پر کچھ تکرار ہوئی۔ مسٹر منی رام کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ فوراً لیڈی کو شوٹ کردیا اگر وہ خود بھاگ نہ جاتے تو دھجیاں اُڑجاتیں۔ جلوس دیوی کی لاش اُٹھائے پھر میونسپل بلڈنگ کی طرف جا رہا ہے۔"

حافظ جی نے ممبروں کو یہ خبر سُنائی تو بورڈ میں سنسنی پھیل گئی گویا کسی جادو سے ساری مجلس نقشِ دیوار ہوگئی ہو۔

یکایک لالہ دھنی رام کھڑے ہوکر بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔ "دوستو! آج پچاس سال سے ایک ایک کنکر چُن چُن کر جو محل بنا رہا تھا وہ آج آن کی آن میں ڈھے گیا ایسا

ڈھے گیا کہ اس کی بنیاد کا بھی پتہ نہیں۔ اچھے سے اچھے مسالے دیے، اچھے سے اچھے کاریگر لگائے۔ اچھے سے اچھے نقشے بنوائے۔ محل تیار ہوگیا تھا صرف اوپر کا کنگرہ رہ گیا تھا۔ اسی وقت ایک طوفان آتا ہے اور اس عالی شان محل کو اس طرح اُڑا لے جاتا ہے گویا پھوس کا ڈھیر ہو۔ معلوم ہوگیا کہ محل میری زندگی کا محض ایک خواب تھا۔ سنہرا خواب کہیے، تھا خواب ہی۔ وہ خواب آج پریشان ہوگیا، پریشان ہوگیا۔"

یہ کہتے ہوئے وہ دروازے کی طرف چلے۔

حافظ حلیم نے غمناک لہجے میں کہا۔"سیٹھ جی .... میں امید کرتا ہوں کہ بورڈ کو بھی آپ سے کمال ہمدردی ہے۔ ہم سب آپ کے ماتم میں شریک ہیں۔"

سیٹھ جی پیچھے پھر کر بولے۔"اگر بورڈ کو میرے ساتھ ہمدردی ہے تو اسی وقت مجھے اختیار دیجیے کہ جاکر لوگوں سے کہہ دوں بورڈ نے وہ قطعہ زمین تمھاری نذر کردیا۔ ورنہ یہ آگ کتنے ہی گھروں کو بھسم کردے گی۔ کتنوں ہی کے خواب پریشان کردے گی۔"

بورڈ کے کئی ممبر بولے۔"چلیے ہم لوگ بھی آپ کے ساتھ چلتے ہیں۔"

بیس آدمی ان کے ساتھ چلنے کو اُٹھ کھڑے ہوئے۔ مسٹر سین نے دیکھا کہ وہاں کُل چار آدمی رہے جاتے ہیں تو وہ بھی اُٹھ کھڑے ہوئے اور ان کے تینوں دوست بھی اُٹھے۔ آخر میں حافظ حلیم کا نمبر آیا۔

جلوس ادھر سے نینا کی لاش لیے ہوئے چلا آرہا ہے۔ میلوں کی لمبی قطار ہے۔ منضبط، خاموش، متین۔ نینا کی شہادت نے انھیں دیوارِ آہن کی طرح مستحکم اور اٹل بنا دیا ہے۔

اسی وقت بورڈ کے پچیسوں ممبروں نے سامنے سے آکر احترام سے جنازے کے سامنے سر جھکایا اور حافظ حلیم نے آگے بڑھ کر بلند مگر کانپتی ہوئی آواز سے کہا۔"بھائیو! آپ میونسپلٹی کے ممبروں کے پاس جا رہے ہیں۔ ممبر خود آپ کا استقبال کرنے کو حاضر ہیں اور اپنی عقیدت کے خراج کے طور پر اتفاقِ رائے سے وہ پورا پلاٹ آپ کی نذر کرتے ہیں۔ اس فیصلے پر بورڈ کو مبارک باد دیتا ہوں اور آپ کو بھی، آج بورڈ نے تسلیم کرلیا کہ وہ غریبوں کی صحت، آرام اور ضروریات کو امیروں کے شوق، تکلف اور ہوس سے زیادہ لحاظ کے قابل سمجھتا ہے۔ آج اس نے تسلیم کرلیا کہ اس قطعہ پر غریبوں کا اس سے کہیں

زیادہ حق ہے جتنا امیروں کا، اس نے تسلیم کرلیا کہ وہ اپنے غریب بھائیوں کی جان کو روپے سے زیادہ عزیز سمجھتا ہے۔ اس نے تسلیم کرلیا کہ شہر کی زینت بڑی بڑی کوٹھیوں اور بنگلوں سے نہیں۔ چھوٹے چھوٹے آرام دہ مکانوں سے ہے۔ جن میں مزدور اور تھوڑی آمدنی کے لوگ آرام سے رہ سکیں۔ اس نے تسلیم کرلیا کہ مہذب شہریت عوام کی صحت اور زندگی پر قائم ہے۔ میں خود ان آدمیوں میں سے ہوں جو اس اصول کو تسلیم نہ کرتے تھے۔ بورڈ کا بڑا حصّہ میرے ہی خیال کے آدمیوں کا تھا۔ لیکن آپ کی قربانیوں نے اور آپ کے لیڈروں کی جاں بازیوں نے بورڈ کی خودسری پر فتح پائی۔ اور آج میں اس فتح پر آپ کو مبارک باد دیتا ہوں۔ اور اس فتح کا سہرا اس دیوی کے سر ہے جس کا جنازہ آپ کے کندھوں پر ہے۔ لالہ سمرکانت میرے پُرانے رفیق ہیں۔ ان کا سپوت بیٹا میرے لڑکے کا دلی دوست ہے۔ امرکانت جیسا شریف نوجوان میری نظر سے نہیں گزرا۔ اسی کی صحبت کا اثر ہے کہ آج میرا لڑکا سول سروس چھوڑ کر جیل میں بیٹھا ہوا ہے۔ نینا دیوی کے دل میں اس شہادت سے پہلے برسوں سے جو کشمکش ہوئی ہوگی اس کا اندازہ ہم اور آپ نہیں کرسکتے۔ ایک طرف باپ اور بھائی اور بھاوج جیل میں۔ دوسری طرف شوہر اور خسر ملکیت اور جائداد کی دُھن میں مست، دھنی رام مجھے معاف کریں گے، میں ان پر فقرہ نہیں کستا۔ یہ فقروں کا موقع نہیں ہے۔ جس ہوس میں وہ گرفتار تھے اسی میں ہم اور آپ اور ساری دنیا گرفتار ہے۔ ان کے دل پر اس وقت ایک ایسے غم کی چوٹ ہے جس سے زیادہ دل شکن کوئی صدمہ نہیں ہوسکتا۔ ہم کو اور میں یقین کرتا ہوں کہ آپ کو بھی ان سے کمال ہمدردی ہے۔ ہم سب ان کے غم میں شریک، نینا دیوی کے دل میں میکے اور سسرال کی یہ جنگ شاید اس تحریک کے ساتھ ہی شروع ہوئی، اور آج اس کا حسرت ناک انجام ہوا۔ مجھے یقین ہے کہ اس کی اس پاک قربانی کی یادگار ہمارے شہر میں ہمیشہ قائم رہے گی۔ میں بت پرست نہیں ہوں لیکن سب سے پہلے تجویز کروں گا کہ اس پلاٹ پر جو بستی آباد ہو اس کے وسط میں اس دیوی کی یادگار نصب کی جائے تاکہ آنے والی نسلیں اس کی شاندار قربانی کی یاد تازہ کرتی رہیں۔

”دوستو! میں اس وقت آپ کے سامنے کوئی تقریر نہیں کررہا ہوں، نہ یہ تقریر کرنے کا موقع ہے نہ سُننے کا۔ روشنی کے ساتھ تاریکی ہے، جیت کے ساتھ ہار اور خوشی

کے ساتھ غم، تاریکی اور روشنی کا میل سہانی صبح ہے۔ جیت اور ہار کا میل صلح ہے۔ یہ خوشی اور غم کا میل ایک نئے دور کا آغاز ہے اور خدا سے ہماری دعا ہے کہ یہ دور ہمیشہ قائم رہے۔ ہم میں ایسی ہی حق پر جان دینے والی ہستیاں پیدا ہوتی رہیں کیونکہ ایسی ہستیوں سے دنیا کا نظام قائم ہے۔ آپ سے ہماری گزارش ہے کہ اس فتح کے بعد ہارنے والوں کے ساتھ وہی سلوک کیجیے جو بہادر دشمن کے ساتھ کیا جانا چاہیے۔ ہماری اس پاک سرزمین پر ہارے ہوئے دشمنوں کو دوست سمجھا جاتا ہے۔ لڑائی ختم ہوتے ہی ہم غصہ اور رنجش کو دل سے نکال ڈالتے تھے اور دل کھول کر دشمن سے گلے مل جاتے تھے۔ آیئے ہم اور آپ گلے مل کر اس دیوی کی روح کو خوش کریں۔ جو ہماری سچی رہنما، تاریکی میں صبح کا پیغام لانے والی سفیدی تھی۔ خدا ہمیں توفیق دے کہ اِس سچے شہید سے ہم حق پرستی اور خدمت کا سبق حاصل کریں۔"

حافظ جی کے خاموش ہوتے ہی "نینا دیوی جی کی جے" ایسی عقیدت میں ڈوبی ہوئی آواز تھی کہ آسمان تک ہل اُٹھا۔ پھر "حافظ جی زندہ باد" کے نعرے بلند ہوئے۔ حافظ حلیم میونسپلٹی کے دفتر میں جا بیٹھے اور پولیس کے حکام سے قیدیوں کی رہائی کے متعلق مشورہ کرنے لگے۔

جس یگیہ کو چھ مہینے پہلے ایک دیوی نے شروع کیا تھا اسے آج ایک دوسری نے اپنی جان کی قربانی دے کر ختم کردیا۔

(۱۰)

ادھر سکینہ زنانہ جیل میں پہنچی، اُدھر سکھدا، پٹھانی اور راما دیوی کی رہائی کا پروانہ آپہنچا۔ اس کے ساتھ ہی نینا کی شہادت کی خبر بھی پہنچی، سکھدا سر جھکائے ہوئے بت کی طرح بیٹھی رہ گئی۔ گویا تن میں جان نہ ہو۔ کتنی مہنگی فتح تھی۔

راما بائی نے گہری سانس کھینچ کر کہا۔"دنیا میں ایسے ایسے کٹھ کلیجے بھی پڑے ہوئے ہیں جو خود غرضی کے نشے میں بیوی کا خون بھی کرسکتے ہیں۔" سکھدا جنون کی کیفیت میں بولی۔"اس نے نینا کو قتل نہیں کیا اماں اس فتح کے لیے قربانی دی۔ بغیر اس کے یہ فتح ناممکن تھی۔" پٹھانی نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔"مجھے تو یہی رونا آتا ہے کہ امر بھیّا کو کتنا رنج ہوگا۔ بھائی بہن میں اتنی محبت نہیں دیکھی۔"

جیلر نے آکر کہا۔ "آپ لوگوں کو رہائی کی خوش خبری اور اس پر مبارک باد۔ تیار ہوجایئے۔ شام کی گاڑی سے سکھدا دیوی، پٹھانی اور راما دیوی کو جانا ہے ہم لوگوں سے جو خطا ہوئی ہو اسے معاف کیجیے گا۔"

کسی نے اس کا جواب نہ دیا، گویا کچھ سنا ہی نہیں۔ فتح کی خوشی بھی اس غم میں ڈوب گئی تھی۔

سکینہ نے سکھدا کے کان میں کہا۔ "جانے سے پہلے ذرا بابو جی سے مل لیجیے گا۔ اس سانحے کی خبر سن کر معلوم نہیں دشمنوں پر کیا گزرے مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔"

بچّہ راما کانت سامنے صحن میں کیچڑ سے پھسل کر گر گیا تھا اور پیروں سے زمین کو اس شرارت کی سزا دے رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ گلا پھاڑ پھاڑ کر فریاد بھی کرتا تھا۔ سکینہ اور سکھدا دونوں اسے اُٹھانے دوڑیں اور درخت کے نیچے کھڑی ہوکر اسے چپ کرنے لگیں۔

سکینہ کل صبح آئی تھی۔ لیکن اب تک سکھدا اور اس میں رسمی آداب و سلام کے سوا اور کوئی بات چیت نہ ہوئی تھی۔ سکینہ جھینپتی تھی کہ کہیں سلیم کا ذکر نہ چھڑ جائے۔ اور سکھدا اس طرح اس سے آنکھیں چراتی تھی، گویا سکینہ کی تپسیا اس کی بے وفائی کا داغ مٹانے کے لیے کافی نہیں ہوئی۔ وہی سکھدا جو امرکانت کو ظالم اور بے وفا سمجھتی تھی۔ اس وقت سکینہ کو موردِ الزام ٹھہرا رہی تھی۔ اس کے خیال میں ایک بار جس سے پریم ہوجائے اس کے نام پر زندگی کاٹ دینی چاہیے تھی۔

مگر اس کی اصلاح میں جو ہمدردی اور دل سوزی تھی اس نے سکھدا کو مغلوب کردیا بولی۔ "ہاں ارادہ تو کر رہی ہوں۔ تمھارا بھی کوئی سندیسہ کہنا ہے؟"

سکینہ اس بے رحمانہ چوٹ سے تلملا اُٹھی۔ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔ "میں کیا سندیسہ کہوں گی بہو جی، اتنا ہی کہہ دیجیے گا کہ نینا دیوی چلی گئیں مگر جب تک سکینہ زندہ ہے آپ اسے نینا ہی سمجھتے رہیے۔"

سکھدا نے اسی بے رحمانہ تبسّم کے ساتھ کہا۔ "میں سمجھتی تھی تم سے ان کا کوئی دوسرا رشتہ تھا۔"

سکینہ نے گویا اس وار کو رد کیا۔ "تب انھیں معشوق کی ضرورت تھی آج بہن کی

ضرورت ہے۔"

سکھدا خفیف ہوگئی بولی۔"میں تو تب بھی زندہ تھی۔"

سکینہ نے دیکھا کہ جس موقعہ سے وہ کانپ رہی تھی وہ آج ناخواستہ سر پر آپہنچا۔ اب اپنی صفائی پیش کرنے کے سوا اس کے لیے اور کوئی راستہ نہ تھا۔

اس نے پوچھا۔"میں کچھ کہوں بُرا تو نہ مانیے گا۔"

"بالکل نہیں۔"

"تو سنیے، تب آپ نے انھیں گھر سے نکال دیا تھا۔ آپ پورب جاتی تھیں وہ پچھم جاتے تھے۔ اب آپ اور وہ ایک دل، ایک جان ایک خیال ہیں۔ جس بات کو وہ زندگی کی معراج سمجھتے تھے، وہ آپ نے پوری کر دکھائی۔ آج وہ آپ کو پاجائیں تو آپ کے قدموں کا بوسہ لیں۔"

سکھدا کو اس کے جواب میں وہی لطف آیا، جو ایک شاعر کو دوسرے شاعر سے دادِ سخن پاکر حاصل ہوتا ہے۔ اس کے دل میں جو بدگمانی اور کدورت اب بھی چمٹی ہوئی تھی وہ جیسے آپ ہی آپ نکل پڑی۔

"یہ تو تمھارا خیال ہے سکینہ! ان کے دل میں کیا ہے وہ کون جانتا ہے۔ مردوں پر اعتبار کرنا میں نے چھوڑ دیا۔ اب وہ چاہے میری کچھ عزت کرنے لگیں۔ عزت تو پہلے بھی کم نہ کرتے تھے لیکن تمھیں وہ دل سے نکال سکتے ہیں؟ اس میں مجھے شک ہے۔ تمھاری شادی میاں سلیم سے ہوجائے گی۔ پھر بھی دل میں وہ تمھاری پوجا کرتے رہیں گے۔"

سکینہ کا بشرہ خشک ہوگیا۔ نہیں وہ سہم اُٹھی۔ جیسے کوئی دشمن اسے دم دے کر اس کے گلے میں پھندا ڈالنے جا رہا ہو۔ اس نے گویا گلے کو بچاتے ہوئے کہا۔"تم ان کے ساتھ پھر ظلم کر رہی ہو بہن! وہ ان آدمیوں میں نہیں ہیں جو دنیا کے ڈر سے کوئی کام کریں۔ انھوں نے خود سلیم سے میری خط و کتابت کروائی۔ میں ان کی منشاء سمجھ گئی مجھے معلوم ہوگیا تم نے اپنے روٹھے ہوئے دیوتا کو منا لیا۔ مجھے اس پر رنج کے بدلے خوشی ہوئی۔ اس لیے نہیں کہ میں کوئی دیوی ہوں بلکہ محض اس لیے کہ مجھے خوف تھا میں انھیں خوش رکھ سکوں گی یا نہیں۔ میں دل میں کانپ رہی تھی۔ اپنی کم لیاقتی پر، اپنے گنوارپن پر، میری حالت اس کنگلے کی سی ہو رہی تھی جو خزانہ پاکر بوکھلا گیا ہو، اپنی جھونپڑی میں اسے کہاں

رکھے۔ کیسے اس کی حفاظت کرے۔ ان کی اصلی منشاء سمجھ کر میرے دل کا بوجھ ہلکا ہوگیا۔ میں باتیں نہیں بنا رہی ہوں، دل کی اصلی کیفیت بیان کر رہی ہوں۔ دیوتا پوجا کرنے کی چیز ہے۔ وہ ہمارے گھر میں آجائے تو اسے کہاں بٹھائیں، کہاں کھلائیں، کہاں سُلائیں، مندر میں جاکر ہم ایک لمحے کے لیے کتنے دین دار، کتنے پرہیزگار بن جاتے ہیں، گھر میں آکر اگر دیوتا ہماری اصلی صورت دیکھے تو شاید ہم سے نفرت کرنے لگے۔ سلیم کو میں سنبھال سکتی ہوں۔ وہ اسی دنیا کے آدمی ہیں۔ میں انھیں سمجھ سکتی ہوں۔ امرکانت کو سمجھنا میرے لیے مشکل ہے۔"

اُسی وقت زنانے وارڈ کا دروازہ کُھلا، اور تین قیدی اندر داخل ہوئے۔ تینوں گھٹنوں تک جانگیے اور آدھی بانہہ کے اونچے کُرتے پہنے ہوئے تھے۔ ایک کے کندھے پر بانس کی سیڑھی تھی دوسرے کے سر پر چونے کی بوری، تیسرا چونے کی ہانڈی، کونچیاں اور بالٹیاں لیے ہوئے تھا۔ آج سے زنانہ جیل کی پتائی ہوگی۔ سالانہ صفائی اور مرمت کا زمانہ آگیا ہے۔

سکینہ نے قیدیوں کو دیکھتے ہی اچھل کر کہا۔"وہ تو جیسے بابو جی ہیں، ڈول اور رسّی لیے ہوئے۔ سلیم سیڑھی لیے ہوئے ہیں۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے بچّے کو گود میں اُٹھا لیا اور اسے بھینچ بھینچ کر پیار کرتی ہوئی دروازے کی طرف لپکی۔ لیکن بار بار اس کا منہ چومتی اور کہتی جاتی تھی "چلو تمھارے بابو جی آئے ہوئے ہیں۔ دوڑ چلو، دوڑ چلو، مسرّت نے جیسے دیوانہ کردیا ہو۔ دل میں پیار اُمڈ رہا ہو۔

سکھدا بھی آرہی تھی، مگر آہستہ آہستہ اسے رونا آرہا تھا۔ آج اتنے دنوں بعد ملاقات بھی ہوئی تو اس دشا میں۔

یکایک منّی جانے کدھر سے دوڑتی ہوئی آئی اور امر کے ہاتھ سے رسّی اور ڈول چھینتی ہوئی بولی۔"ارے یہ تمھارا کیا حال ہے لالہ؟ آدھے بھی تو نہیں رہے چلو آرام سے بیٹھو۔ میں پانی کھینچے دیتی ہوں۔"

امر نے ڈول کو مضبوط پکڑ کر کہا۔"نہیں نہیں تم سے نہ بنے گا۔ ڈول بہت بھاری ہے چھوڑو۔ اونہہ کیا کرتی ہو۔ جیلر دیکھے گا تو مجھ پر ڈانٹ پڑے گی۔"

منّی نے ڈول چھین کر کہا۔ ”میں جیلر کو جواب دے دوں گی۔ ایسے ہی تھے تم وہاں؟

ایک طرف سے سکینہ اور سکھدا، دوسری طرف سے پٹھانی اور راما آپہنچیں مگر کسی کے منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔ سبھوں کی آنکھیں نم تھیں اور گلے بھرے ہوئے۔ چلی تھیں خوشی کے ولولے میں، پر ہر قدم کے ساتھ پانی گہرا ہوتے ہوتے بالآخر سر تک آپہنچا تھا۔

امرکانت ان دیویوں کو دیکھ کر پُرغرور عقیدت سے پھول اُٹھا، ان کے مقابل میں وہ کتنا حقیر تھا، کتنا ناچیز۔ کن الفاظ میں ان کی تعظیم کرے، کیسے اپنی عقیدت کا اظہار کرے۔ کیا پیش کش لے کر ان کے سامنے حاضر ہو۔ اس کی امید پرور نگاہوں میں بھی قوم کا مستقبل کبھی اتنا روشن نہ تھا۔ اس کے سر سے پاؤں تک قومی غرور کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ آنکھوں میں ذوقِ پرستش سے آنسو جھلک آئے، مست ہوگیا۔

دوسروں کی گرفتاری کی خبر تو اسے مل چکی تھی مگر راما بائی کو وہاں دیکھ کر اس پر وجدانی کیفیت طاری ہوگئی، اس کے قدموں پر گر پڑا۔ راما بائی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ اسے دعا دیتے ہوئے کہا۔ ”آج چلتے چلاتے تم سے خوب ملاقات ہوگئی بیٹا! ایشور تمھاری مرادیں پوری کرے۔ مجھے تو یہاں آئے آج پانچواں دن ہے۔ پر ہماری رہائی کا حکم آگیا۔ نینا نے ہمیں قید سے چھڑا لیا۔“

امر نے دھڑکتے ہوئے دل سے کہا۔ ”تو کیا نینا بھی آگئی، اس کے گھر والے تو بہت بگڑے ہوں گے۔“

سب دیویاں رو پڑیں، اس سوال نے گویا ان کے کلیجے مسوس لیے، کیسے کہہ دیں کہ تمھاری نینا نے خود ہستی کی قید سے آزاد ہوکر ہمیں جیل کی قید سے چھڑایا۔ اتنی ہمت کہاں سے لائیں۔ بہن کا عاشق بھائی یہ خبر سن کر کیا چھاتی نہ پیٹنے لگے گا۔

امر نے حیرت کی آنکھوں سے ہر ایک کے منہ کی طرف دیکھا۔ ایک الہامی دہشت سے اس کا سارا جسم تھرا اُٹھا۔ ان چہروں پر فتح کی مسرّت نہیں، غم کی افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ بے صبر ہوکر بولا۔ ”کہاں ہے وہ؟ یہاں کیوں نہیں آئی، اس کی طبیعت اچھی نہیں کیا؟“

راما بائی نے دل کو سنبھال کر کہا۔ "نینا کو آکر چوک میں دیکھنا بیٹا، جہاں اس کی مورت کھڑی کی جائے گی۔ اس نئے چوک میں جو بننے والا ہے، وہ شہر کی دیوی ہے، ہر ایک کے دل میں تم اسے عقیدت کے سنگھاسن پر بیٹھا پاؤ گے۔"

امر کی کیا حالت ہوئی، اس پر بجلی گر پڑی یا پہاڑ ٹوٹ پڑا، وہ جملے اس کے دل کی کیفیت نہیں ظاہر کرسکتے۔ وہ وہیں زمین پر بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اسے چاروں طرف ایک خلا محسوس ہوا، اب دنیا میں اس کا زندہ رہنا بے کار ہے۔ نینا گویا جنت کے دروازے پر کھڑی اسے بلا رہی تھی۔

راما دیوی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "بیٹا اس کے لیے کیا روتے ہو وہ مری نہیں امر ہوگئی، اس کی قربانی سے یہ یگیہ پورا ہوا۔"

سلیم نے گلا صاف کر کے پوچھا۔ "کیا بات ہوئی وہ تو کسی تحریک میں حصّہ نہ لیتی تھیں؟"

راما نے جواب دیا۔ "وہیں میدان میں جلسہ ہو رہا تھا، لالہ سمرکانت مَیں اور ڈاکٹر صاحب گرفتار ہو چکے تھے۔ اسی وقت نینا پہنچی اور سب آدمیوں کو ساتھ لے کر میونسپل بورڈ کے دفتر کو چلی۔ ایک لاکھ سے کم مجمع نہ تھا، اسی وقت منی رام نے آکر اس پر گولی چلا دی۔ وہیں گر پڑی، کچھ منہ سے کہنے بھی نہ پائی۔"

امر کو جوں جوں اس معصوم زندگی کے واقعات یاد آتے تھے، اس کے دل میں گویا غم کا ایک نیا سوتا کھل جاتا تھا۔ اس دیوی کے ساتھ اس نے اپنا ایک فرض بھی تو نہ ادا کیا۔ یہ سوچ کر اس کا دل مسوس اُٹھا۔ وہ اگر گھر چھوڑ کر نہ بھاگا ہوتا تو لالہ سمرکانت کیوں اسے حریص اور بدمزاج منی رام کے گلے باندھتے، اور کیوں اس کی یہ افسوس ناک موت ہوتی۔ اس تحمل اور وفا اور پریم کی دیوی کے ساتھ اس نے اپنا کوئی فرض نہ پورا کیا۔ یہ داغ اس کے دل سے کبھی نہ مٹے گا۔

لیکن دفعتاً اس دریائے غم میں ڈوبتے ہوئے اسے مشیتِ غیب کی ایک کشتی سی مل گئی۔ غیبی تحریک کے بغیر کسی میں خدمت اور قربانی کا یہ جوش کیسے پیدا ہوسکتا تھا۔ خانہ داری کی فکروں میں اور نفس کی پرستش میں اور دنیا کی نعمتوں کی ہوس میں تو ساری دنیا مرتی ہے۔ عوام کی خدمت میں شہید ہونے کا فخر تو خاصانِ خدا ہی کو حاصل ہوسکتا ہے۔

امر کی حرماں نصیب آنکھوں میں چاروں طرف مشیتِ ایزدی کے جلوے نظر آئے۔ سارے لامحدود و روشن۔

سلیم نے پھر پوچھا۔"بے چارے لالہ جی کو تو بہت رنج ہوا ہوگا؟"

راما دیوی نے فخر کے ساتھ کہا۔"وہ تو پہلے ہی گرفتار ہو چکے تھے بیٹا، اور ڈاکٹر صاحب بھی۔"

امر کو ایسا معلوم ہوا، اس کی آنکھوں کا نور دوچند ہوگیا۔ اس کے بازوؤں میں چوگنی طاقت آگئی ہے۔ اس نے وہیں ایشور کے قدموں پر سر جھکا دیا اور اب اس کی آنکھوں سے جو آنسو گرے وہ رنج کے نہیں، غرور اور مسرّت کے تھے۔ اس کے دل میں ایمان اور یقین کا ایک نغمہ سا گونج اُٹھا۔ جو کچھ ہے رضائے الٰہی ہے، جو کچھ کرتا ہے وہ کرتا ہے، وہی حیات کا مخزن اور مسرّت کا منبع ہے۔

سکینہ اور منّی دونوں اس کے سامنے کھڑی تھیں۔ جس نظارے سے اس کے دل میں خواہشات کا ایک طوفان سا اُٹھنے لگتا تھا، اسی نظارے میں آج اس نے پاکیزہ محبت کے درشن پائے جو خواہشات کو فنا کردیتا ہے اور ان ہی خاک سے ایثار اور بیداری کے پھول کھلاتا ہے۔ جو انسان کو شوق اور تمنا کی پستی سے اُٹھا کر نیاز اور قربانی کے عروج پر لے جاتا ہے۔ اسے ایسا گمان ہوا، وہ خود اپاسک ہے اور یہ عورتیں اس کی دیویاں ہیں جن کے قدموں کی خاک کو پیشانی پر لگانا ہی اس کی زندگی کی معراج ہے۔

راما دیوی نے بچّے کو سکینہ کی گود سے لے کر امر کی طرف اُٹھاتے ہوئے کہا۔"یہی تیرے بابو جی ہیں، ان کے پاس جا۔"

بچّے نے امرکانت کا وہ قیدیوں کا بانا دیکھا تو چلّا کر راما دیوی سے چمٹ گیا۔ پھر اسی گود میں منہ چھپائے کنکھیوں سے امر کو دیکھنے لگا گویا میل تو کرنا چاہتا ہے لیکن خوف یہی ہے کہ یہ سپاہی اسے پکڑ نہ لے کیوں کہ اس دھج کے آدمی کو اپنا بابو جی سمجھنے میں اس کے بھولے بھالے دل کو تامل ہو رہا تھا۔

سکھدا کو بچّے پر غصّہ آیا "کتنا ڈرپوک ہے، گویا وہ اسے کھا جاتے۔"

امر نے سکھدا کی طرف روئے سخن کرکے کہا۔"سوچتا ہوگا یہ بن مانس بھلا بابو جی ہوسکتا ہے۔" (ایک لمحے کے بعد) "آپ لوگ اس میدان میں ہم سے بازی لے گئیں۔

آپ نے جس کام کا بیڑا اُٹھایا اسے پورا کردکھایا۔ ہم تو جہاں کھڑے تھے وہیں کھڑے ہیں۔ جو تھوڑی بہت ہل چل یہاں ہوئی ہے اس کا جس بھی منّی بہن کو ہے۔ ان دونوں دیویوں کے دل میں قومی خدمت کا جو ولولہ اور فرض کے لیے جو عشق ہے اس نے ہمارا سر اونچا کردیا۔ سکھدا نے جو کچھ کیا وہ آپ لوگ مجھ سے زیادہ جانتی ہیں۔ تین سال کے قریب ہوئے جب میں باغی ہوکر گھر سے بھاگا تھا۔ سمجھتا تھا کہ ان کے ساتھ میری زندگی برباد ہوگئی۔ لیکن آج میں ان کے قدموں کی خاک کو اپنی پیشانی پر لگانے میں اپنی عزت سمجھتا ہوں۔ میں سب ہی ماؤں اور بہنوں کے سامنے ان سے معافی مانگتا ہوں۔"

سلیم نے مسکرا کر کہا۔"یوں زبانی نہیں، پہلے آپ قدموں کی خاک ماتھے پر ملیے اور تب کان پکڑ کر ایک لاکھ بار اٹھیے اور بیٹھیے۔"

امر نے جواب دیا۔"اب تم مجسٹریٹ نہیں ہو بھائی۔ بھولو مت ایسی سزا اب نہیں دے سکتے۔"

سلیم نے پھر شرارت کی، سکینہ سے بولا۔"تم چپ چاپ کیوں کھڑی ہو سکینہ! تمھیں بھی تو ان سے کچھ کہنا ہے یا موقع تلاش کر رہی ہو؟"

پھر امر سے بولا۔"آپ اپنے قول سے پھر نہیں سکتے جناب۔ جو وعدہ کیے ہیں وہ پورے کرنے پڑیں گے۔"

سکینہ کا چہرہ مارے شرم کے سُرخ ہوگیا۔ جی چاہتا تھا کہ جاکر سلیم کی چٹکی لے۔ چہرے پر مسرّت اور شگفتگی کا ایسا شوخ رنگ تھا جو چھپائے نہ چھپتا تھا۔ گویا اس کے چہرے پر بہت دنوں سے جو سیاہی لگی ہوئی تھی آج دھل گئی ہو اور وہ دنیا کے سامنے اپنی صفائی کا ڈھنڈورا پیٹنا چاہتی ہو اس نے پٹھانی کو ایسی نظروں سے دیکھا جو ملامت آمیز لفظوں میں کہہ رہی تھیں۔ اب تمھیں معلوم ہوا تم نے کتنی بڑی حماقت کی تھی، اپنی نظروں میں وہ کبھی اتنی اونچی نہ اُٹھی تھی۔ زندگی میں اسے اتنی نیک نامی اور عزت ملے گی، اس کا تو اسے خواب میں بھی گمان نہ تھا۔

سکھدا کے چہرے پر بھی غرور اور مسرّت کی جھلک کچھ کم نہ تھی۔ وہاں جو حسرت اور افسردگی چھائی رہتی تھی اس کی جگہ ایک دل آویز شگفتگی نظر آرہی ہے۔ آج اسے کوئی ایسی نعمت مل گئی ہے جس کی تمنا پنہاں رہ کر بھی اس کی زندگی میں ایک خلا کی، ایک تشنگی

کی یاد دلاتی رہتی تھی۔ اس خلا میں جیسے آج شہد بھر گیا ہے۔ وہ تشنگی گویا بارش کے قطروں سے ہریالی بن گئی ہے۔

رہی منّی وہ الگ بے دل سی سر جھکائے کھڑی ہے۔ اس کی زندگی کی سونی منڈیر پر ایک طائر نہ جانے کہاں سے اُڑتا ہوا آکر بیٹھ گیا تھا۔ وہ آنچل میں دانے بھرے آآکرتی، پاؤں دبائے اسے پکڑنے کے لیے لپکی۔ اس نے دانے زمین پر بکھیر دیے۔ طائر نے دانے چگے۔ اُسے پُراعتبار نظروں سے دیکھا گویا پوچھ رہا ہو تم مجھے محبت سے پالو گی یا چار دن من بہلا کر پر کاٹ لوگی، اور دیواروں سے سر ٹکرانے کے لیے چھوڑ دوگی؟ لیکن اس نے جوں ہی طائر کو پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھایا وہ پھُر سے اُڑ گیا اور تب ایک اونچی شاخ پر پھدکتا ہوا اسے شبہے کی نظروں سے دیکھنے لگا۔ گویا کہہ رہا ہو میں آسمان کا سیّاح ہوں، تمھارے پنجرے میں میرے لیے سوکھے دانے اور کلھیا میں پانی کے چند قطروں کے سوا اور کیا ہے۔

سلیم نے ناند میں قلعی ڈال دی، سکینہ اور منّی نے ایک ایک ڈول اُٹھا لیا اور پانی لانے چلیں۔

امر کانت نے کہا۔"بالٹی مجھے دے دو، میں بھرے لاتا ہوں۔"

منّی بولی۔"تم پانی بھروگے اور ہم بیٹھے دیکھیں گے۔"

امر نے ہنس کر کہا۔"اور کیا تم پانی بھروگی اور میں تماشا دیکھوں گا؟"

منّی بالٹی لے کر بھاگی، سکینہ بھی اس کے پیچھے دوڑی۔

راما دیوی امر کانت کے لیے کچھ ناشتہ بنانے چلے گئی تھی۔ یہاں جیل میں بے چارے کو روٹی دال کے سوا اور کیا ملتا ہے۔ وہ بھی گت کی نہیں، وہ چاہتی تھی پکوان کا ایک تھال لائے اور اسے کھلاکر خوش ہو۔ راما دیوی کو جیل میں بھی گھر کی ساری سہولتیں حاصل تھیں۔ لیڈی ڈاکٹر، چوکیدارنیں اور دیگر عمال سب ہی اس کے غلام تھے۔ پٹھانی کھڑی کھڑی تھک جانے کے باعث جاکر لیٹ رہی تھی۔ منّی اور سکینہ پانی لانے چلی گئیں۔ سلیم کو بھی سکینہ سے نہ جانے کتنی باتیں کہنی تھیں وہ بھی ملبے کی طرف چلا گیا۔ یہاں صرف امر اور سکھدا رہ گئے۔

امر نے سکھدا کے قریب آکر بچّے کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔"یہ جیل تو میرے لیے جنت ہوگئی، سکھدا جتنی تپسیا کی تھی اس سے کہیں زیادہ پھل پایا۔ اگر دل کھول کر دکھانا

ممکن ہوتا تو دکھا دیتا کہ مجھے تمھاری کتنی یاد آتی تھی۔ بار بار اپنی حماقت پر پچھتاتا تھا۔"

سکھدا نے بات کاٹی۔ "اچھا اب تم نے باتیں بنانے کا فن بھی سیکھ لیا۔ تمھارے دل کا کچھ کچھ حال مجھے بھی معلوم ہے اسے کھول کر دکھانے کی ضرورت نہیں۔ اس میں نیچے سے اوپر تک غصّہ ہی غصّہ بھرا ہوا ہے۔ عفو یا رحم کا نام بھی نہیں۔ میں شوقین سہی، فیشن پرست سہی لیکن اس خطا کی یہ سزا، اور جب یہ جانتے تھے کہ یہ میری خطا نہیں، میری پرورش اور تربیت کی خطا تھی۔"

امر نے شرمندہ ہوکر کہا۔ "تم بے انصافی کر رہی ہو سکھدا۔"

سکھدا نے اس کی ٹھڈّی کو اوپر اُٹھا کر کہا۔ "میری طرف دیکھو! میری ہی بے انصافی ہے۔ تم انصاف کے پُتلے ہو، بجا۔ تم نے سیکڑوں خط بھیجے میں نے ایک کا بھی جواب نہ دیا۔ کیوں؟ میں کہتی ہوں تمھیں اتنا غصّہ آیا کیسے؟ اور ایک بیکس عورت پر جو تمھارے قدموں تلے پڑی ہوئی تھی۔ آدمی کو اپنے پالے ہوئے جانوروں سے بھی محبت ہوجاتی ہے۔ میں تو پھر بھی انسان تھی۔ روٹھ کر ایسا بھول گئے گویا میں مر گئی۔"

امرکانت اس الزام کا کوئی جواب نہ دے سکا۔ پھر بھی ہٹ دھرمی کرتا ہوا بولا۔ "تم نے بھی تو کوئی خط نہیں لکھا۔ اور میں لکھتا بھی تو کیا تم جواب دیتیں؟ دل سے کہنا۔"

"تو تم مجھے سبق دینا چاہتے تھے؟"

"نہیں نہیں، یہ بات نہیں ہے سکھدا، ہزاروں بار ارادہ ہوا کہ تمھیں خط لکھوں لیکن ...."

سکھدا نے جملے کو پورا کیا۔ "لیکن خوف یہی تھا کہ شاید میں تمھارے خطوط کو آنکھ اُٹھا کر دیکھتی بھی نہیں۔ اگر عورت کے دل کا تمھیں یہی علم ہے تو میں کہوں گی تم نے اسے بالکل نہیں سمجھا۔"

امر نے اپنی شکست کا اعتراف کیا۔ "تو میں نے یہ دعویٰ کب کیا تھا کہ میں عورت کے دل کا پرکھی ہوں؟"

امرکانت نے یہ دعویٰ نہ کیا ہو، لیکن سکھدا کے خیال میں اسے دعویٰ تھا۔ میٹھے شکوے کے ساتھ بولی۔ "مرد کی بہادری تو اس میں نہیں ہے کہ عورت کو اپنے پیروں پر گرائے۔ میں نے اگر تمھیں خط نہ لکھا تو اس کا سبب تھا، تم نے میرے ساتھ ظلم کیا تھا،

میری توہین کی تھی مجھے پیروں سے کچلا تھا .... لیکن ان باتوں کو جانے دو، کہیں بڑھ نہ جائیں۔ یہ بتاؤ جیت کس کی ہوئی۔ میری یا تمھاری؟"

امر نے کہا۔ "میری۔"

"اور میں کہتی ہوں میری۔"

"کیسے؟"

"تم نے بغاوت کی تھی۔ میں نے تشدّد کے زور سے اسے فرو کر دیا۔"

"نہیں، تم نے میرے مطالبات منظور کر لیے۔"

اسی وقت سیٹھ دھنی رام جیل کے افسروں اور عملوں کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔ لوگ حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگے۔ سیٹھ جی اتنے لاغر ہوگئے تھے کہ بڑی مشکل سے لکڑی کے سہارے چل سکتے تھے۔ قدم قدم پر کھانستے بھی جاتے تھے۔

امر نے آگے بڑھ کر ان کی تعظیم کی۔ انھیں دیکھتے ہی اس کے دل کا غبار گویا دھل گیا۔

سیٹھ جی نے اسے دعا دے کر کہا۔ "مجھے یہاں دیکھ کر تمھیں تعجب ہو رہا ہوگا بیٹا! تم سمجھتے ہوگے یہ کھوسٹ ابھی تک جیتا ہے۔ اسے موت کیوں نہیں آتی۔ کیا کروں؟ موت کو بلاتے بلاتے ہار گیا۔ یہ بدنصیبی ہے کہ دنیا نے مجھے ہمیشہ بدگمانی کی نظروں سے دیکھا۔ میں نے جو کچھ کیا اس میں لوگوں کو غرض کی بو آئی۔ مجھ میں بھی کچھ سچائی ہے، کچھ درد ہے، کچھ غیرت ہے، کچھ انسانیت ہے، یہ کسی نے تسلیم نہیں کیا۔ دنیا کی نظروں میں نرا حیوان ہوں، حریص خود غرض۔ اسی لیے کہ میں سمجھتا ہوں کہ ہر ایک کام کا وقت معیّن ہے۔ کچا پھل پال میں ڈال دینے سے پکتا نہیں ہے۔ پکتا جب ہی ہے جب پکنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ جب میں اپنے چاروں طرف پھیلی ہوئی گہری تاریکی کو دیکھتا ہوں تو مجھے صبح کی روشنی کے سوا اسے بتانے کی کوئی دوسری تدبیر نہیں سوجھتی۔ کسی دفتر میں جاؤ بغیر رشوت کے کام نہیں چلتا۔ کسی گھر میں جاؤ حسد کا راج پھیلا ہوا ہے کسی قومی تحریک کو دیکھو وہی نفسانیت، وہی خود غرضی۔ اسے ایشور کی مرضی ہی دور کر سکتی ہے۔ اس طرح کی تحریکوں پر مجھے اعتبار نہیں ہے ان سے محبت کی جگہ نفرت بڑھتی ہے۔ جب تک مرض کی ٹھیک تشخیص نہ ہوگی باہر کی ٹیم ٹام سے کچھ نہ ہوگا۔"

امرکانت نے پوچھا۔"تو ہم لوگ اس مبارک دن کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں؟"

ایک وارڈر دوڑ کر کئی کُرسیاں لایا۔ سیٹھ جی اور جیل کے دونوں افسر بیٹھے۔ سیٹھ جی نے پان نکال کر کھایا اور اتنی دیر میں اس اعتراض کا جواب سوچ لیا۔ تب بزرگانہ شفقت کے انداز سے بولے۔"نہیں میں یہ نہیں کہتا، یہ اپاہجوں اور ناکاروں کی دلیل ہے۔ ہمیں عوام میں دل و دماغ کی بیداری پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہنا چاہیے۔ جس وقت قوم کی روح بیدار ہوجائے گی اسے جبر سے قابو میں رکھنا مشکل ہوجائے گا۔ میں اسے کبھی نہیں مان سکتا کہ آج آدھی مالگزاری ہوتے ہی رعایا خوش حالی کی چوٹی پر جا پہنچے گی۔ اس میں ایسے کتنے ہی ذہنی اور معاشرتی نقائص ہیں کہ آدھی تو کیا پوری مال گزاری بھی چھوڑ دی جائے پھر بھی ان کی حالت میں کوئی نمایاں فرق نہ ہوگا۔ اس مسئلے پر گورنر صاحب سے میرا خوب مباحثہ ہوا اور ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ ایسے پیچیدہ معاملے میں کافی غور و خوض سے کام نہیں لیا گیا۔ تم جانتے ہو ان سے میری کتنی بے تکلفی ہے۔ منی رام کی وفات پر انھوں نے خود ماتم پُرسی کا تار بھیجا تھا۔ شاید تمھیں معلوم نہ ہو، گورنرصاحب نے بذاتِ خاص اس علاقے کا دورہ کیا۔ پہلے تو کوئی آدمی ان سے ملنے آتا ہی نہ تھا۔ وہ ہنس رہے تھے کہ ایسی سوکھی اکڑ نہیں دیکھی۔ جسم پر ثابت کپڑے نہیں ہیں لیکن مزاج یہ ہے کہ ہمیں کسی سے کچھ نہیں کہنا ہے۔ بڑی مشکل سے تھوڑے سے آدمی جمع ہوئے۔ جب ہزاکسلنسی نے انھیں تسلی دی اور کہا تم لوگ ڈرو مت، ہم تمھارے ساتھ بے انصافی نہیں کرنا چاہتے۔ ہم کو خوب معلوم ہے کہ تمھاری حالت قابل رحم ہے تب سب کے سب رونے لگے۔ ہزاکسلنسی اس قضیے کو جلد سے جلد ختم کرنا دینا چاہتے ہیں۔ اور اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ سب کے سب قیدی رہا کردیے جائیں۔ اور ایک کمیٹی بنائی جائے جس میں تین آدمی سرکار کے ہوں اور پانچ علاقے سے اور اس کمیٹی کا فیصلہ ناطق ہو۔ اس میں تم اور میاں سلیم تو ہوں گے ہی۔ تین آدمیوں کو تمھیں چُننے کا اور اختیار ہوگا۔ صدر جلسہ اتفاق رائے سے چُنا جائے گا۔ بس میں تمھیں یہی خبر دینے آیا ہوں۔ اور مجھے امید ہے کہ تمھیں اس تجویز کے قبول کرنے میں کوئی عذر نہ ہوگا۔ موجودہ حالات میں اس سے بہتر شرطیں نہیں مل سکتی تھیں۔ اور اگرچہ اس میں خودستائی کا پہلو ہے۔ لیکن یہ کہے بغیر نہیں

رہا جاتا کہ اس موقعہ پر ہزاکسلنسی سے میری اچھی خاصی جھوڑ ہوئی۔ اور کئی بار تو ایسا معلوم ہوا کہ موقع میرے ہاتھ سے نکل رہا ہے۔ لیکن میں نے تحمل سے کام لیا اور اس کا نتیجہ تمھارے سامنے ہے۔"

سکینہ اور منّی میں کانا پھوسی ہونے لگی۔ سلیم کے چہرے پر بھی رونق آگئی۔ لیکن امر اسی طرح خاموش خیالات میں ڈوبا بیٹھا رہا۔

سلیم نے بے صبری کے ساتھ پوچھا۔"ہمیں کامل اختیار ہوگا جسے چاہیں چُنیں؟"

"کامل۔"

"اور جیسا آپ نے فرمایا اس کا فیصلہ ناطق ہوگا۔"

سیٹھ جی ہچکچا کر کہا۔"میرا تو ایسا ہی خیال ہے۔"

"ہمیں آپ کے خیال کی ضرورت نہیں۔ ہم تو ان شرطوں کو تحریر میں دیکھنا چاہتے ہیں۔"

"اور اگر تحریر نہ ملے؟"

"تو ہمیں یہ معاہدہ منظور نہیں۔"

"نتیجہ یہی ہوگا کہ یہیں پڑے رہوگے اور رعایا تباہ ہوتی رہے گی۔"

"جو کچھ بھی ہو۔"

"تمھیں تو یہاں کوئی خاص تکلیف نہیں ہے۔ لیکن غریبوں پر کیا بیت رہی ہے یہ سوچو۔"

"خوب سوچ لیا ہے۔"

"نہیں سوچا۔"

"سوچ لیا ہے۔"

"بالکل نہیں سوچا۔"

"خوب اچھی طرح سوچ لیا ہے۔"

"سوچتے تو ایسا نہ کہتے۔"

"سوچا ہے اسی لیے ایسا کہہ رہا ہوں۔"

امر نے تحکمانہ انداز سے کہا۔"کیا کر رہے ہو سلیم۔ کیوں حجت کر رہے ہو، اس سے

فائدہ؟"

سلیم نے تیز ہوکر کہا۔"میں حجت کر رہا ہوں، واہ ری آپ کی سمجھ! سیٹھ جی مالدار ہیں، حکام رس ہیں اس لیے وہ حجت نہیں کرتے، میں غریب ہوں، قیدی ہوں، مظلوم ہوں۔ اس لیے حجت کر رہا ہوں۔"

"سیٹھ جی بزرگ ہیں۔"

"یہ آج سُنا کہ حجت کرنا بزرگی کی نشانی ہے۔"

امر اپنی ہنسی نہ روک سکا بولا۔"شاعری نہیں ہے، بھائی جان! کہ جو منہ میں آیا بک گئے۔ یہ ایسے معاملے ہیں جن پر لاکھوں آدمیوں کی زندگی بنتی بگڑتی ہے۔"

"شاعری کی آپ نے اچھی قدر کی۔ مانتا ہوں جناب کی سخن فہمی کو، شاعری آپ کے خیال میں بکواس ہے، معقول، یہ شاعری نہیں ہے بھائی جان کہ جو منہ میں آیا بک گئے۔ یہ الفاظ بہت دن یاد رہیں گے۔ اس کے بعد میری نظروں میں تمھاری آدھی عزت بھی نہیں رہی۔ جس نے دل نہیں پایا اسے میں انسان نہیں سمجھتا۔"

"اچھا میں حیوان سہی، وحشی سہی، کیا گردن مارو گے، محترم سیٹھ جی نے اس مسئلے کو حل کرنے میں ہماری مدد کی ہے۔ جیسا کہ ان کا فرض تھا۔ اور اس کے لیے ہمیں ان کا شکرگزار ہونا چاہیے۔ ہم اس کے سوا اور کیا چاہتے تھے کہ غریب کسانوں کے ساتھ انصاف کیا جائے اور جب اس مقصد سے ایک کمیٹی بنائی جارہی ہے تو ہمارا فرض ہے کہ اس کا خیر مقدم کریں۔"

سیٹھ جی نے خوش ہوکر کہا۔"کیسی اچھی تشریح کی ہے کہ واہ! طبیعت خوش ہوگئی۔ ہزاکسلنسی نے خود تمھاری تعریف کی۔"

جیل کے دروازے پر موٹرکار کا ہارن سُنائی دیا۔ جیلر نے کہا۔"لیجیے دیویوں کے لیے کار آگئی۔ آیئے ہم لوگ چلیں اور دیویوں کو تیاریاں کرنے دیں۔ بہنو! مجھ سے جو کچھ خطا ہوئی اسے معاف کیجیے گا، میری نیت آپ کو تکلیف دینے کی نہ تھی ہاں ضابطے کی پابندیوں سے مجبور تھا۔"

یہ طے پایا کہ سب کے سب ایک ہی لاری میں جائیں۔ دیویاں تیاریوں میں مصروف ہوئیں۔ امر اور سلیم کے کپڑے بھی یہیں منگوا لیے گئے۔ آدھ گھنٹے میں قافلہ جیل سے نکلا۔

دفعتاً ایک دوسری کار پہنچی اور اس سے لالہ سمرکانت، حافظ حلیم، ڈاکٹر شانتی کمار، اور سوامی آتمانند اُتر پڑے۔ امر نے دوڑ کر باپ کے قدموں کو بوسہ دیا۔ آج اس کا دل سعادت مندانہ عقیدت سے اُمڈا پڑتا تھا۔ نینا گویا آنکھوں میں آنسو بھرے اس سے کہہ رہی تھی کہ بھیّا دادا کو کبھی ناراض نہ کرنا۔ ان کے طور و طریق تمھیں ناگوار بھی گزریں پھر بھی زبان مت کھولنا۔ وہ ان کے قدموں کو آنسوؤں سے دھو رہا تھا۔ اور سیٹھ جی اس کے اوپر موتی نثار کر رہے تھے۔

سلیم بھی حافظ جی کے گلے سے جا لپٹا۔ حافظ جی نے دعا دے کر کہا۔"خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے تمھاری قربانیاں بارآور ہوئیں۔ کہاں ہے سکینہ، اُسے بھی دیکھ کر کلیجہ ٹھنڈا کرلوں۔"

سکینہ سر جھکائے آئی اور دست بستہ آداب بجا لاکر مؤدب کھڑی ہوگئی۔ حافظ جی نے اسے ایک نظر دیکھ کر سمرکانت سے کہا۔"سلیم کا انتخاب تو ایسا بُرا نہیں رہا۔"

سمرکانت مسکرا کر بولے۔"حسن کے ساتھ جہیز میں دیویوں کے اوصاف بھی ہیں۔"

خوشی کے موقعوں پر ہم اپنے غم بھول جایا کرتے ہیں۔ حافظ جی کو سلیم کے سول سروس سے الگ ہونے کا۔ سمرکانت کو نینا کا اور سیٹھ دھنی رام کو بیٹے کا غم کچھ کم نہ تھا۔ مگر اس وقت سب ہی خوش تھے۔ کسی جنگ میں فتح پاجانے کے بعد اہل سیف مرنے والوں کے نام کو رونے نہیں بیٹھتے۔ وہ تو جشن کا موقع ہوتا ہے۔ شادیانے بجتے ہیں۔ محفلیں جمتی ہیں۔ مبارک بادیاں دی جاتی ہیں۔ رونے کو ہم تنہائی ڈھونڈھتے ہیں اور ہنسنے کے لیے مجمع۔

سب لوگ خوش تھے۔ صرف امرکانت اُداس تھا نہ جانے کیوں۔

جب لوگ اسٹیشن پہنچے تو سکھدا نے پوچھا۔"تم اتنے اُداس کیوں ہو؟"

امر نے جیسے جاگ کر کہا۔"میں اُداس تو نہیں ہوں، اُداس کیوں ہوتا؟"

"اُداسی کہیں چھپانے سے چھپتی ہے۔"

"اُداس نہیں ہوں صرف یہ سوچ رہا ہوں کہ میرے ہاتھوں بلاوجہ جان و مال کا اتنا نقصان ہوا۔ جس مصلحت سے اس وقت کام لیا گیا کیا اس سے اُس وقت نہ لیا جاسکتا تھا؟ اِس ذمّے داری کا بوجھ مجھے دبائے ڈالتا ہے۔"

"میں تو سمجھتی ہوں ان قربانیوں کے بغیر اس معاہدے کی نوبت نہ آتی۔"

اسی وقت لالہ سمرکانت پوتے کو کندھے پر بٹھائے ہوئے آکر بولے۔
"ابھی تو گھر ہی چلنے کے ارادے ہیں؟"
سکھدا بولی۔
"تو ہم سب وہیں چلیں گے۔'
سمرکانت نے مایوس ہوکر کہا۔"اچھی بات ہے، تو میں ذرا بازار سے سلونی کے لیے ساڑیاں لیتا آؤں۔"
سکھدا نے آنکھ مار کر کہا۔
"سلونی ہی کے لیے کیوں، منّی بھی تو ہے۔"
منّی ادھر ہی آرہی تھی۔ اپنا نام سن کر پوچھ بیٹھی "کیا مجھ سے کچھ کہتی ہو بہو جی؟"
سکھدا نے اس کے گلے میں ہاتھ ڈال کر کہا۔
"میں کہہ رہی تھی کہ اب منّی دیوی بھی ہمارے ساتھ گھر چلیں گی اور وہیں ہمارے ساتھ رہیں گی۔"
منّی نے چونک کر کہا۔"تو کیا تم لوگ دہلی جا رہی ہو؟"
سکھدا ہنسی "اور تم نے کیا سمجھا تھا؟"
"میں تو ہردوار جاؤں گی۔"
"ہمارے ساتھ نہ رہو گی۔"
"تو کیا لالہ بھی دہلی جا رہے ہیں؟"
"اور کیا، تمھاری کیا مرضی ہے؟"
منّی افسردہ خاطر ہوگئی۔ بولی۔
"کچھ نہیں، یوں ہی پوچھتی تھی۔"
امر نے تشفی دی۔"یہ تمھیں چڑھا رہی ہیں، ہم سب ہردوار چل رہے ہیں۔"
منّی کھِل گئی۔

پریم چند کے ادبی کارناموں پر تحقیقی کام کرنے والوں میں مدن گوپال کی اہمیت مسلم ہے پریم چند کے خطوط کے حوالے سے بھی انھیں اولیت حاصل ہے۔ ان کی پہلی کتاب انگریزی میں بہ عنوان "پریم چند" 1944 میں لاہور سے شائع ہوئی۔ اسی کتاب کی وجہ سے غیر ممالک میں بھی پریم چند کے بارے میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ "ٹائمز لٹریری سپلیمنٹ لندن" نے لکھا ہے کہ مدن گوپال وہ شخصیت ہے جس نے مغربی دنیا کو پریم چند سے روشناس کرایا۔ اردو، ہندی ادیبوں کو غیر اردو ہندی حلقے سے متعارف کرانے میں مدن گوپال نے تقریباً نصف صدی صرف کی ہے۔

مدن گوپال کی پیدائش اگست 1919 میں (ہانسی) ہریانہ میں ہوئی۔ 1938 میں سینٹ اسٹیفن کالج سے گریجویشن کیا۔ انھوں نے تمام زندگی علم و ادب کی خدمت میں گزاری۔ انگریزی، اردو اور ہندی میں تقریباً 60 کتابوں کے مصنف ہیں۔ پریم چند پر اکسپرٹ کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ ویسے پرنٹ میڈیا اور الکٹرانک میڈیا کے ماہر ہیں۔ مختلف اخبارات، سول ملیٹری گزٹ لاہور، اسٹیٹس مین اور جن ستہ میں بھی کام کیا۔ بعدازاں حکومتِ ہند کے پبلکیشن ڈویژن کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے 1977 میں ریٹائر ہوئے اس کے علاوہ دینک ٹریبون چندی گڈھ کے ایڈیٹر کی حیثیت سے 1982 میں سبکدوش ہوئے۔